سخن ہائے گسترانہ

خامہ بگوش کی منتخب تحریریں

ڈاکٹر انور سدید

سخن ہائے گسترانہ

خامہ بگوش کی منتخب تحریریں

مرتب : ڈاکٹر انور سدید

فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
اردو بازار، کراچی۔

Sukhan Haae Gustarana

BY: MUSHFIQ KHWAJA

عنوان کتاب	:	سخن ہائے گسترانہ
مصنف	:	مشفق خواجہ
مرتب	:	ڈاکٹر انور سدید
طبع اوّل	:	2007ء
ناشر	:	فضلی سنز (پرائیوٹ) لمیٹڈ
قیمت	:	250 روپے

ملنے کا پتہ

فضلی بک سپر مارکیٹ
اُردو بازار، کراچی
فون: 2629724
2212991

کتاب سرائے
اُردو بازار، لاہور
فون 7320318

ای میل: fazleebook@hotmail.com
ویب سائٹ: www.fazleebooks.com

انتساب

مشفق خواجہ مرحوم کے بھتیجے ڈاکٹر خواجہ خسرو طارق

اور خواجہ خرم طارق کی بیٹی حبہ خرم کے نام

جن سے مرحوم بے انتہا محبت اور شفقت کا اظہار فرماتے تھے۔

ترتیب

☆ ...... ☆ ...... ☆

عرضِ سدید

دنیائے ادب کے مشفق خواجہ ان خوش قسمت ادیبوں میں سے تھے، جنھیں اپنے عنفوانِ شباب میں بابائے اردو مولوی عبدالحق کے ساتھ ان کی زندگی کے آخری چند برسوں میں علمی و ادبی کام کرنے، ان کی خدمت میں حاضر رہنے اور ان کا اعتماد اور مؤانست حاصل کرنے کا اعزاز حاصل ہوا۔ مشفق خواجہ کی بابائے اردو سے ملاقات اور انجمن ترقی اردو پاکستان سے وابستگی کا پس منظر یوں ہے کہ اپنی طالب علمی کے زمانے میں مشفق خواجہ انجمن کے کتب خانے میں مطالعے کی غرض سے جایا کرتے تھے۔ ایک دن بابائے اردو نے انھیں دیکھا تو پوچھا: "تم کون ہو اور یہاں کیوں آتے ہو؟"..... انھوں نے بتایا: "میں طالب علم ہوں اور مجھے قلمی کتابوں سے دلچسپی ہے۔" بابائے اردو نے یہ جواب سنا تو بہت خوش ہوئے۔ پھر ایک دو مرتبہ ایسا ہوا کہ بابائے اردو نے کسی قلمی نسخے کے اقتباسات مشفق خواجہ کو نقل کرنے کے لیے دیے۔ انھوں نے نقل شدہ اقتباسات بابائے اردو کو پیش کیے تو وہ بولے:

"حیرت ہے تم نے اس دکنی زبان کے مسودے کو بالکل صحیح صحیح پڑھ لیا؟"

مشفق خواجہ نے عرض کیا:

"میں پنجابی ہوں، اسی وجہ سے اسے پڑھنے میں دقت نہیں ہوئی۔ پنجابی اور دکنی زبانوں میں بڑی مشابہت ہے، اس لیے پنجابی جاننے والوں کے لیے دکنی زبان کا پڑھنا اور سمجھنا بہت آسان ہے۔"

اس کے بعد بابائے اردو ان کو انجمن کے مختلف ادبی کام دینے لگے۔ مشفق خواجہ کا ان سے باقاعدہ تعارف ابنِ انشا نے کرایا تھا، جن کے بابائے اردو (مولوی صاحب) سے گہرے مراسم تھے۔ مشفق خواجہ

جامعہ کراچی سے اپنی تعلیم مکمل کر چکے تو بابائے اُردو نے ان کا تقرر انجمن میں کر دیا۔ ان کی علمی اور ادبی رفاقت مشفق خواجہ کے سمندِ تحقیق کے لیے تازیانہ ثابت ہوئی۔ اس دوران انھیں انجمن ترقی اردو پاکستان کے ماہنامہ "قومی زبان"، سہ ماہی "اردو" اور "قاموس الکتب" کا مدیر مقرر کر دیا گیا اور تھوڑے سے عرصے کے بعد شعبۂ تحقیق و مطبوعات بھی ان کی نگرانی میں دے دیا گیا، اس طرح وہ بابائے اُردو کے ساتھ ساڑھے چار سال (۱۹۵۷ء تا ۱۹۶۱ء) تک منسلک رہے۔ مشفق خواجہ نے طاہر مسعود کو بتایا:

"جب میجر آفتاب حسن کے ساتھ تنازع کے نتیجے میں (انجمن کی) لائبریری بند کر دی گئی تو وہ (بابائے اُردو) اپنے کمرے میں بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ انھوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ کام پر لگا رکھا تھا۔ ان کے پاس لغت کا مسودہ ہوتا اور میرے پاس پرچیاں، جن پر اسناد لکھی ہوتی تھیں۔ میں سند پڑھتا اور مولوی صاحب متعلقہ جگہ پر اسے درج کر دیتے۔ یہ کام بعض اوقات تین چار گھنٹے تک جاری رہتا تھا۔ میں تھک جاتا، لیکن مولوی صاحب (بابائے اُردو) نہیں تھکتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ ایک نوے سال کا بوڑھا ایک ایسی کتاب پر کام کر رہا تھا، جس کو اپنی زندگی میں مکمل کرنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔"

بابائے اُردو نے زبانی اور تحریری طور پر خواجہ صاحب کی شاندار صلاحیتوں، محنت اور لگن کا بھی اظہار بارہا کیا۔

مشفق خواجہ کے ذوقِ تحقیق میں بابائے اُردو کے ادبی کردار کے متعدد زاویے نمایاں نظر آتے ہیں لیکن تحقیق سے بنیادی دلچسپی انھیں اپنے گھر کے علمی ماحول سے ودیعت ہوئی تھی۔ ان کے خاندان نے بہت سے ادیب اور عالم پیدا کیے تھے، جن کے خمیر میں کتاب دوستی رچی بسی ہوئی تھی۔ ان کے دادا خواجہ کریم بخش اردو اور فارسی کے کلاسیکی ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتے تھے اور اندرون بھاٹی دروازے کی ادبی محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ حکیم احمد شجاع نے اپنی آپ بیتی "خوں بہا" میں لکھا ہے کہ ان محفلوں میں شیخ عبدالقادر (مدیر "مخزن" لاہور)، علامہ اقبال اور مفتی عبداللہ ٹونکی بھی تشریف لایا کرتے تھے۔ ان کے والد خواجہ عبدالوحید اُردو، فارسی، عربی اور انگریزی پر قدرت رکھتے تھے۔ وہ اٹھارہ برس تک ان ادبی محفلوں کے عینی شاہد رہے، جو "فقی لاج" میں منعقد ہوئی تھیں اور جن میں علامہ اقبال شرکت فرمایا کرتے تھے۔ خواجہ عبدالوحید نے ۱۹۲۸ء میں "اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی، جس کے زیرِ اہتمام ۶ رجنوری ۱۹۳۲ کو لاہور میں "یومِ اقبال" منایا گیا اور اس میں اقبال کے فکر و فن پر مقالات پڑھے گئے۔ اس خاندان کی ایک اور ادب نواز شخصیت کا اسمِ گرامی مولوی احمد دین ہے۔ انھوں نے ۱۹۲۳ء میں علامہ اقبال پر ایک کتاب لکھی تھی، جس کے تمام نسخے بوجوہ نذرِ آتش کر دیے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد

مولوی احمد دین نے اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کیا، لیکن وہ بھی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ ان دونوں ایڈیشنوں کے اصل نسخے مشفق خواجہ نے بازیافت کیے اور تیسرا تحقیقی ایڈیشن ۱۹۷۱ء میں انجمن ترقی اردو (پاکستان) سے شائع کیا۔ اس علمی ماحول کو دیکھ کر ہی مشفق خواجہ تحقیق کی طرف مائل ہوئے اور پرانی کتابوں میں ان کی دلچسپی بڑھ گئی۔ انھوں نے سب سے پہلے جو کتاب پڑھی، وہ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کی "کیفیہ" تھی اور انھیں یہ اتنی دلچسپ معلوم ہوئی کہ وہ اس قسم کی کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھنے لگے۔ قدیم شعرا اور ان کے کلام و تاریخ میں ان کی دلچسپی بڑھتی گئی اور انجمن ترقی اُردو پاکستان سے وابستگی کے زمانے میں وہ باقاعدہ تحقیق کی طرف آ گئے۔ "تذکرہ خوش معرکۂ زیبا"..... "جائزہ مخطوطاتِ اردو"..... "غالب اور صفیر بلگرامی"..... "تحقیق نامہ" اور "کلیاتِ یگانہ" ان کی تحقیقی بصیرت کی روشن مثالیں ہیں۔

یہاں اس بات کا تذکرہ بھی ضروری ہے کہ مشفق خواجہ کی ادب میں دلچسپی پیدا ہوئی تو شاعری نے انھیں سب سے پہلے اپنی طرف متوجہ کیا۔ انھوں نے "بانگِ درا" آٹھ دس سال کی عمر میں پڑھ ڈالی تھی اور اس کے پسندیدہ اشعار اپنی ایک بیاض میں نقل کر لیے تھے۔ ۱۹۵۱۔۵۲ء میں انھوں نے خود بھی شعر تخلیق کرنے کی طرف توجہ مبذول کی اور آغاز میں ہی اردو کے ممتاز ادبی جرائد میں چھپنے لگے۔ قریباً ربع صدی کی شاعری کا انتخاب "ابیات" کے نام سے ۱۹۷۸ء میں شائع کیا، لیکن بے نیازی کا عالم یہ تھا کہ اس کتاب پر کسی کو تقریظ نما مضمون لکھنے کی اجازت نہ دی۔ جو مضامین نقادوں نے از خود لکھے، وہ شائع نہ کروائے۔ یہ مضامین ان کے کمرے میں ایک پلندے میں بند کونے میں پڑے ہوئے میں نے دیکھے ہیں۔ مشفق خواجہ کی شاعری کے سلسلے میں یہاں چند باتوں کا ذکر ضروری ہے۔

اول: انھوں نے شاعری کے فن میں کسی کی شاگردی اختیار نہیں کی۔ وہ فطری شاعر تھے اور ان کا مطالعہ اور ذوقِ سخن ان کا راہنما تھا۔

دوم: انھوں نے کسی کو اصلاح کے لیے اپنا کلام نہیں دکھایا۔ فطرت نے اس لالۂ خودرو کی پرداخت خود کی۔

سوم: انھوں نے اپنا کلام کبھی مشاعرے میں پیش نہیں کیا حتیٰ کہ مشاعرہ سننے کے لیے بھی کبھی نہیں گئے۔ دوستوں کی نجی محفلوں میں بھی کبھی اشعار سنانے کے آرزو مند نہیں رہے۔

چہارم: ابوالخیر کشفی نے لکھا تھا:

"تحقیق نے ان کی شاعری کو دبا دیا ہے۔ اگر محقق نہ ہوتے تو اردو کے اچھے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا۔"

بلاشبہ تحقیق مشفق خواجہ کی ادبی شخصیت کی بقائے دوام کا باعث بنی، لیکن ان کے ذاتی اغماض کے باوجود ان کی شاعری کا نقش بھی مٹ نہیں سکتا اور ان کی وفات کے بعد ان کی شاعری کو بہت زیادہ یاد کیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری سے ان کی تحقیقی بصیرت، موضوعی نکتہ شناسی، مشاہدۂ جمال کے گوناگوں زاویے اور ان کی شخصیت کے فکری، نظری اور داخلی گوشے عیاں ہوتے ہیں۔

میں نے مشفق خواجہ کی تحقیق نگاری اور شاعری کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے مشہور زمانہ کالم "سخن در سخن" میں تلاشِ حقیقت، جستجوئے صداقت اور اظہارِ حق کے جو عناصر ہیں، وہ ان کے تحقیقی مزاج ہی کے مظہر ہیں۔ ان کی شگفتہ نگاری ان کی شاعرانہ برجستگی کی آئینہ دار ہے۔ اول الذکر عنصر میں تحقیق کا فنی افراط سے استعمال ہوا ہے اور موخر الذکر کی صریرِ خامہ میں نوائے سروش سنی جا سکتی ہے۔ ان کی برجستہ نکتہ آفرینی تمام تر تخلیقی ہے۔ ان دونوں کا معنی آفریں اور دلکش سنگم "سخن در سخن" ہے۔ ان کے کالموں کے سابقہ تین مجموعوں "خامہ بگوش کے قلم سے" (۱۹۹۵ء)، "سخن در سخن" اور "سخن ہائے ناگفتنی" (۲۰۰۴ء) کے بارے میں ڈاکٹر حنیف فوق نے رائے دی:

"یہ ان (مشفق خواجہ) کے ایسے کالموں کے انتخابات ہیں جنھیں ان کی تحقیقی بصیرت سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں ایسی شگفتہ نگاری بھی ملتی ہے، جو مطالعۂ ادب اور جامعیتِ نظر سے متصل ہے۔"

مشفق خواجہ نے کالم نگاری ۱۵ رنومبر ۱۹۷۰ء کو الطاف حسن قریشی کے اخبار روزنامہ "جسارت" سے شروع کی۔ کالم کا عنوان "اندرونِ شہر" تھا اور اس کے لیے انھوں نے قلمی نام "غریبِ شہر" اختیار کیا۔ تاریخی اعتبار سے دیکھیے تو ..... کالم نگاری کو فروغ صحافت سے ملا تھا، لیکن اخبار کی خبروں اور اداریے کی معلومات اور تبصرے اور تجزیے کے مقابلے میں کالم میں زندگی کے کسی شعبے کے بارے میں کالم نگار ہلکے پھلکے، شگفتہ اور لطیف انداز میں اظہارِ خیال کرتا اور انشائیے کے انداز میں موضوع کے انوکھے زاویے ابھارتا۔ انگریزی میں کالم نویسی کا آغاز امریکہ میں اٹھارھویں صدی کے اواخر میں جریدہ "ویکلی میوزیم" میں جوزف ڈینی نے کیا۔ انگریزی زبان کے ادیب ایڈیسن اور سٹیل، جنھیں سرسید احمد خان نے تہذیب کے پیغمبر شمار کیا ہے، اخبار ٹیٹلر اور سپیکٹیٹر میں کالم لکھتے تھے، جو بعد میں انشائیے شمار کیے گئے۔ امریکی خانہ جنگی کے ایام میں مارک ٹوین، آرٹیمس وارڈ اور ڈیوڈ آر لاک نے فکاہی کالم لکھ کر امریکی قوم کا تشنج رفع کرنے کی کوشش کی۔ بیسویں صدی میں لپ مین اور آرٹ بکوالڈ کو بہت شہرت حاصل ہوئی اور ان کے کالم متعدد اخبارات میں شائع کیے جاتے تھے۔ اردو صحافت میں کالم نویسی کے نقوش منور صورت میں بیسویں صدی کے دوسرے عشرے کے اخبارات میں نظر آتے ہیں، تاہم بعض محققین نے کالم نگاری کے

ابتدائی آثار اردو کے پہلے اخبار "جام جہاں نما" (آغاز ۲۷ رمارچ ۱۸۲۲ء) کی خبروں میں بھی تلاش کیے ہیں۔ تاہم ۱۸۷۷ء میں جاری ہونے والے اردو کے اخبار "اودھ پنچ" میں احمد علی شوق، نواب سید آزاد، اکبر حسین، مچھو بیگ ستم ظریف، تربھون ناتھ ہجر، جوالا پرشاد برق اور منشی احمد علی کسمنڈوی کی شگفتہ تحریروں کا سلسلہ شروع ہوا تو پنڈت برج نرائن چکبست نے لکھا:

"ان لوگوں کی عبارت نظم و نثر کے مضامین دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض ایک طرز نو کے موجد ہی نہیں ہیں، بلکہ زبان و قلم کے دھنی بھی ہیں۔ ان کی عبارت شوخی و تازگی اور خداداد بے تکلفی سے معمور ہے اور ان کی زبان لکھنؤ کی ٹکسالی زبان ہے۔"

برصغیر کے سیاسی امور کو زیر بحث لانے اور قومی و سیاسی شخصیات کو طنز و مزاح کے شگفتہ انداز میں ہدف بنانے کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے اخبار "الہلال" میں ۱۹۱۲ء میں کالم "افکار و حوادث" کا آغاز کیا اور بعض کالموں پر اپنا اصلی نام لکھنے کی بجائے قلمی نام "ناصح مشفق" لکھا۔ اردو صحافت میں اسے باقاعدہ کالم نگاری کے فروغ کی طرف اہم قدم شمار کیا جاتا ہے اور یہ سلسلہ اتنا مقبول ہوا کہ بعد میں الہلال نے اپنے کالم نگار الگ الگ متعارف کرائے، چناں چہ مولانا ظفر علی خان ۱۹۱۷ء میں "ستارۂ صبح" میں "مسافات"، چراغ حسن حسرت نے ۱۹۲۱ء میں روزنامہ "نئی دنیا" کلکتہ میں سندباد جہازی کے قلمی نام سے کالم لکھتے تھے۔ آزادی سے قبل جو کالم نگار صحافتی دنیا میں مقبول و معروف ہوئے، ان میں مولانا عبدالمجید سالک (افکار و حوادث)، مولانا محمد علی جوہر (کشکول)، حمید نظامی (سر راہے)، حاجی لق لق (مسافات)، چراغ حسن حسرت (حرف و حکایت)، بلال احمد زبیری (حوادث و احکام)، عبدالسلام خورشید (گرد و پیش)، ساگر چند گورکھا (گپ شپ)، صالح محمد صدیق (فکاہات) اور حیات اللہ انصاری (گھوریاں) کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ آزادی کے بعد پاکستان کی اردو صحافت میں نصر اللہ خان عزیز کا کالم "تکلف بر طرف"، ظہور الحسن ڈار کا "اندھیرے اجالے"، سعادت خیالی کا "کیا بات"، انتظار حسین کا "لاہور نامہ"، انعام درانی کا "تلخ و شیریں"، ابن انشا کا "دخل در معقولات"، ابراہیم جلیس کا "وغیرہ وغیرہ"، عطاء الحق قاسمی کا "روزن دیوار سے"، اطہر جاوید کا "محفل محفل"، منو بھائی کا "گریبان"، نصر اللہ خان کا "آداب عرض"، مجید لاہوری کا "حرف و حکایت"، "نوائے وقت" میں مجید نظامی، وقار انبالوی، محمد سلیم اور اسرار بخاری کا "سر راہے"، عبدالقادر حسن کا "غیر سیاسی باتیں" اور حمید اختر کا "پرسشِ احوال" دلچسپی سے پڑھے جانے والے چند مقبول کالم ہیں۔ ادبی صحافت میں محمد حسن عسکری نے رسالہ "ساقی" میں خالص ادبی مسائل پر "جھلکیاں" کے عنوان سے کالم شروع کیے۔ اس سلسلے کو بعد میں محمد سعید شیخ کے رسالہ "علامت" لاہور میں ڈاکٹر جمیل جالبی،

ضیا جالندھری اور جیلانی کامران نے توسیع دی۔

مشفق خواجہ بنیادی طور پر ایک محقق تھے اور ان کا مقصد جستجوے صداقت اور تلاشِ حقیقت تھا۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو (پاکستان) سے بھی اس لیے فراغت حاصل کرلی تھی کہ روزانہ دفتر جانے کی پابندی ان کے تحقیقی کام میں مخل ہوتی تھی۔ اس عرصے میں انھوں نے ریڈیو کے لیے تقریباً ایک ہزار سکرپٹس لکھے۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے دوران خواجہ صاحب کا کالم "سنا آپ نے" روزانہ نشر ہوتا تھا، لیکن وہ ریڈیو اسٹیشن بھی نہیں گئے۔ مطالعۂ کتب کا ذوق انھیں ورثے میں ملا تھا، ان کے خاندان میں کتابیں جمع کرنے اور لائبریری بنانے کی اعلیٰ روایت بھی موجود تھی۔ ان کی طالب علمی کے زمانے میں ادب اردو کے بیشتر تابندہ ستارے ہندوستان سے پاکستان منتقل ہو چکے تھے اور کئی نامور ادیبوں نے کراچی میں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔ مشفق خواجہ کا حلقۂ احباب بھی ایسے لوگوں پر مشتمل تھا، جن کی زندگی کی سب سے زیادہ بامعنی سرگرمی ادب تھا۔ مشفق خواجہ اس دور میں نہ صرف افراط سے کتابوں کا مطالعہ کرتے، بلکہ اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے بچوں کی کہانیاں بھی لکھتے تھے، جنھیں ناشرین خرید لیتے تھے۔ طارق خواجہ صاحب نے مجھے بتایا کہ ایک مرتبہ مشفق خواجہ اور ان کے بڑے بھائی عبدالقیوم خواجہ کو پیسوں کی ضرورت پڑی اور ناشر نے پیشگی رقم ادا کرنے سے انکار کردیا تو دونوں بھائیوں نے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر ایک کتاب لکھ ڈالی اور ناشر سے اپنی ضرورت کی رقم حاصل کرلی۔ اہم بات یہ کہ ان کا ذوق کسی ایک صنف تک محدود نہ تھا اور وہ تمام اصنافِ سخن کی کتابیں بالاستیعاب مطالعہ کرتے تھے اور گمانِ غالب ہے کہ ان کے باطن میں جو ایک حیوانِ ظریف موجود تھا، وہ انھیں طنز و مزاح کی کتابوں کی طرف بھی مسلسل راغب رکھتا تھا۔ ان کا حافظہ اتنا تیز تھا کہ جو کچھ پڑھتے، اسے نہ صرف تا دیر یاد رکھتے بلکہ اپنی تحریروں میں اشعار اور نثر کے اقتباسات بھی برجستہ استعمال کرتے۔ ان کی اس خصوصی صلاحیت کو دیکھ کر ہی الطاف حسن قریشی نے انھیں "جسارت" میں کالم لکھنے کی دعوت دی۔ اور ایک دفعہ یہ کام شروع ہوا تو اس کا دائرہ پھیلتا چلا گیا، لیکن یہ بھی واضح ہے کہ وہ اس کالم نگاری کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ممتاز ادیب مختارالدین احمد کو ایک خط میں انھوں نے لکھا:

"... آپ نے میری کالم نویسی کی تفصیلات دریافت کی ہیں تو عرض ہے کہ یہ کالم میں نے ۱۵ر نومبر ۱۹۷۰ء سے شروع کیا تھا۔ الطاف حسن قریشی نے کراچی سے روزنامہ "جسارت" جاری کیا تھا۔ ۱۲ر اپریل ۱۹۷۱ء تک میں اس میں روزانہ ایک کالم "اندیشۂ شہر" کے عنوان سے اور "غریب شہر" کے نام سے لکھتا رہا۔ پھر ۱۹۷۷ء اور ۱۹۷۸ء میں نو ماہ تک یہ کام کیا۔ پھر ۱۹۸۱ء سے ۱۹۸۳ء تک ۲۷ء کو کالم لکھا۔ "سخن در سخن" (خامہ بگوش) کا سلسلہ ہفتہ وار

تھا، جو ۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۴ء کے شروع تک "جسارت" میں لکھا۔ پھر ۲۳ مارچ ۱۹۸۴ء سے "تکبیر" میں لکھ رہا ہوں۔ ۱۹۷۱ء میں کچھ عرصہ "ورق ناخواندہ" اور "خامہ بدوش" کے نام سے "زندگی" میں کچھ کالم لکھے۔ ۱۹۷۴ء میں روزنامہ "صداقت" کراچی میں "سخن در سخن" اور "میر جملہ" کے نام سے کالم نگاری کی۔ ۱۹۶۵ء میں "سنا آپ نے" کے عنوان سے ریڈیو پاکستان سے ایک روزانہ کالم نشر ہوتا تھا۔ غرضیکہ اس کام میں خاصا وقت صرف کیا۔ سچی بات ہے کہ اس کام میں کبھی دل نہیں لگا۔ جب بھی لکھا، اپنی طبیعت پر جبر کرکے لکھا۔ مجھ سے فرمائش پر کچھ نہیں لکھا جاتا اور یہی وجہ ہے کہ بار بار میں اس کام کو چھوڑتا رہا، مگر تقاضوں سے مجبور ہو کر دوبارہ شروع بھی کرتا رہا۔ میں کسی طرح نہیں چاہتا کہ یہ کام میری پہچان بنے۔" (مکتوب بنام مختارالدین احمد۔ ۲۳ مارچ ۱۹۹۰ء۔ بحوالہ "فنون" لاہور، شمارہ ۱۲۹، صفحہ ۳۷)

مندرجہ بالا اقتباس کے مطابق کالم نگاری کی طرف انھیں روزنامہ "جسارت" کے اجرا کے بعد الطاف حسن قریشی لائے تھے جنھوں نے "اخبارِ جہاں" کراچی میں کتابوں پر ان کے تبصرے پڑھے تھے۔ یہ تبصرے عام انداز سے ہٹے ہوئے ہوتے اور قدرے شگفتہ انداز میں لکھے جاتے تھے۔ یہاں "سات رنگ" کے ان تبصروں کی مثال بھی دی جا سکتی ہے، جن میں مشفق خواجہ نامور مصنفین کی ان کی غلطیاں نشان زد کرتے تو مصنفین کو طنز و مزاح کا ہدف بھی بناتے تھے۔ ان کے بہت قریبی دوستوں میں ابن انشا بھی شامل تھے، جن کے اسلوبِ نثر میں طنز و مزاح کا فطری عنصر شامل ہے۔ اور "خمارِ گندم" کے اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

آخری بات یہ کہ خواجہ صاحب کی والدہ کے مطابق عبدالحی (جو بعد میں مشفق خواجہ کے نام سے معروف ہوئے) بچپن میں بہت شرارتی تھے۔ شاہ نواز فاروقی نے لکھا ہے کہ ممکن ہے، بچپن کا یہی شرارتی مزاج خواجہ صاحب کے طنز و مزاح کا بنیادی سرچشمہ بن گیا ہو اور اس دوران فطرت خواجہ صاحب کے اندر کے حیوانِ ظریف کی پرورش و پرداخت خود کرتی رہی ہو کیونکہ انھیں اپنی زندگی میں تحقیق کا خشک اور بے ثمر کام لمبے عرصے تک انجام دینا تھا اور تحقیق سے عہدہ برآ ہونے کے لیے صبر و تحمل کے ساتھ شائستہ تفریح کی ضرورت بھی تھی۔ انھوں نے شاعری، تحقیق اور کالم نگاری کو اپنی شخصیت کے تین پہلو قرار دیا اور کہا "جب وہ شاعری کرتے ہیں تو اپنے آپ کو تلاش کرتے ہیں۔ جب تحقیق کرتے ہیں تو دوسروں کو تلاش کرتے ہیں اور جب کالم نگاری کرتے ہیں تو زندگی سے لطف اندوز ہو رہے ہوتے ہیں۔"

زندگی کا حقیقی لطف اٹھانے کے لیے ہی مشفق خواجہ نے فکاہیہ کالم نگاری اختیار کی اور اپنے اہداف پر طنز و مزاح کے سیدھے وار کرنے اور ان کے اثرات دیکھنے کے لیے انھوں نے تمام کالم اپنے اصل نام

عبدالحی یا قلمی نام مشفق خواجہ سے پیش کرنے کی بجائے فرضی ناموں سے شائع کیے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب سالہا سال تک ''عنقا'' کے نام سے لکھتے رہے۔ مولانا چراغ حسن حسرت نے ''سند باد جہازی'' کے نام سے کالم نویسی کی۔ ابن انشا نے کم از کم نو فرضی ناموں سے کالم لکھے اور پطرس بھی فرضی ہی نام ہے جو بالآخر اصل نام کا حصہ بن گیا۔

مشفق خواجہ نے دوسری اہم وجہ یہ بیان کی:

''قلمی نام اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ طنز و مزاح کے کالم میں بعض غلط چیزوں کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اصل نام سے لکھنے میں خرابی یہ ہے کہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ کیا لکھا گیا ہے، بلکہ اس پر توجہ دینے لگتے ہیں کہ کس نے کیا لکھا ہے۔ چوں کہ میرے پیش نظر مقصد اہم تھا، اس لیے میں نے فرضی نام اختیار کر لیا۔ اب یہ میری بدقسمتی ہے کہ کالموں کی اشاعت کے بعد لوگ اس تحقیق میں پڑ گئے کہ لکھنے والا کون ہے؟''

اس اقتباس سے یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ قلمی نام سے لکھنے میں نہ صرف اظہار کی آزادی مل جاتی ہے، بلکہ لکھنے والے کے بارے میں تحیر بھی پیدا ہوتا ہے اور جب تک نام پردۂ راز میں رہتا ہے، قلمی نام سے لکھنے والا اپنے اہداف کے جوابی ردعمل سے، جو شدید منفی بھی ہو سکتا ہے، محفوظ رہتا ہے اور مصنف اپنا دوسرا کام سلامت روی سے انجام دیتا رہتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ مشفق خواجہ اپنے مزاج کو معتدل اور متوازن رکھنے کے لیے ہی تھوڑے تھوڑے وقفوں سے قلمی نام تبدیل کرتے رہے، چناں چہ انھوں نے روزنامہ ''انجام'' کراچی میں تبصرے ''ابن مخطوط'' کے قلمی نام سے، روزنامہ ''صداقت'' کراچی میں ادبی اور سیاسی کالم ''میر جملہ'' کے نام سے، ہفت روزہ ''زندگی'' لاہور میں ادبی کالم ''خامہ بدوش'' کے نام سے، روزنامہ ''جسارت'' کراچی میں سیاسی کالم ''غریب شہر'' اور ادبی کالم پہلے ''حاشیہ نگار'' اور پھر ''خامہ بگوش'' کے نام سے لکھا، موخر الذکر کالم کا عنوان ''سخن در سخن'' تھا، جو روزنامہ ''جسارت'' سے شروع کیا گیا اور جب محمد صلاح الدین صاحب نے ۱۹۸۴ء میں اپنا ہفت روزہ ''تکبیر'' کراچی سے جاری کیا تو یہ دو اَدوار میں ۱۹۹۷ء تک جاری رہا۔ 'سخن در سخن' کے عنوان اور 'خامہ بگوش' کے نام سے ہفت روزہ 'تکبیر' میں خواجہ صاحب نے سب سے زیادہ کالم لکھے اور یہ اتنے مقبول ہوئے کہ پاکستان و ہندوستان کے متعدد اخبارات و رسائل میں بھی نقل ہونے لگے۔ (ان کالموں کا پہلا انتخاب ''خامہ بگوش کے قلم سے'' بھی مکتبہ جامعہ دہلی نے ہندوستان سے پہلے شائع کیا۔ پاکستان سے بعد میں شائع ہوا۔)

ہفت روزہ ''تکبیر'' میں پہلا ''سخن در سخن'' ۲۳ مارچ ۱۹۸۴ء کو شائع ہوا۔ خامہ بگوش (مشفق خواجہ) نے اس آغاز کا تذکرہ اپنے شگفتہ سخن گسترانہ انداز میں یوں کیا ہے:

''محمد صلاح الدین صاحب کے ''جسارت'' سے الگ ہونے کا جہاں ہمیں بے حد ملال تھا، وہیں اس بات کی خوشی بھی تھی کہ کالم نگاری سے جان چھوٹے گی۔ ہم چوں کہ صلاح الدین صاحب کی وجہ سے اور انھیں کے لیے لکھتے ہیں، اس لیے سوچا، اب وہ بھی آرام کریں گے اور ہم بھی، لیکن افسوس کہ ہماری یہ خوشی بہت جلد ختم ہو گئی اور محمد صلاح الدین نے نہ صرف آرام کرنے کا، یعنی ''تکبیر'' کی اشاعت کا اعلان کر دیا، بلکہ ہمیں بھی پابند کر دیا کہ ہم اس ہفتہ وار کے لیے باقاعدگی سے لکھیں گے۔ باقاعدگی سے لکھنا ہمارے لیے ایک مشکل کام ہے۔ غزل یا علامتی افسانے تو باقاعدگی سے کیا، بلا ضرورت لکھنا بھی کوئی مسئلہ نہیں، کیوں کہ غیب سے خیال میں مضامین اسی طرح آتے ہیں، جس طرح بعض لوگوں کو انتخاب نہ کرانے کے سلسلے میں دلیلیں سوجھتی ہیں، لیکن ''کالم چیزے دیگر است''۔ اس کے لیے پہلے تو خبریں تلاش کرنی پڑتی ہیں، مل جائیں تو انھیں اپنے مقصد کے مطابق تراشنا پڑتا ہے۔ نہ ملیں تو وضع کرنی پڑتی ہیں۔ جب تین چوتھائی توانائی اس کام میں صرف ہو جاتی ہے تو پھر کہیں کالم لکھنے کا مرحلہ آتا ہے ..... کالم نگاری کا کام وہی لوگ کر سکتے ہیں، جنھیں اور کچھ نہ کرنا ہو۔''

حقیقت یہ ہے کہ محمد صلاح الدین، مدیر ''تکبیر'' جب روزنامہ ''جسارت'' کے ساتھ وابستہ تھے تو خامہ بگوش کے کالم ''سخن در سخن'' کی مقبولیت کا مشاہدہ کر چکے تھے اور یہ بھی جانتے تھے کہ خامہ بگوش کا مقصد معاشرے کی بالعموم اور ادبی معاشرے کی ناہمواریوں کو بالخصوص نشان زد کر کے عوام اور ادبا کو اپنی [illegible] اور ادبی صورت دیکھنے پر آمادہ کرنا ہے۔ اس کالم میں وہ اپنے بسیط مطالعے سے بھی استفادہ کرتے اور قاری کو علمی، ادبی اور تہذیبی معلومات، فکر و نظر کے زاویوں اور اہل دانش کے خیالات سے بھی آگاہ کرتے جاتے تھے اور یہ سب کچھ اس سادگی، معصومیت اور پرکاری سے کرتے کہ پڑھنے والوں کے لبوں پر مسکراہٹ رقص کناں ہو جاتی، لکھنے والے گرویدہ ہو جاتے۔ آخری بات یہ کہ مشفق خواجہ دوستوں کے دوست تھے۔ وہ اپنا کالم محمد صلاح الدین صاحب کے لیے لکھتے تھے۔ انھوں نے روزنامہ ''جسارت'' سے علیحدگی اختیار کی تو خواجہ صاحب نے بھی وابستگی ختم کر دی اور ''تکبیر'' جاری ہوا تو محمد صلاح الدین نے انھیں مائل کر لیا کہ وہ ان کے لیے ''سخن در سخن'' کا کالم لکھتے رہیں اور مشفق خواجہ نے بھی حق دوستی ادا کرنے میں تاخیر نہ کی اور وہ کالم لکھنے لگے تو اس کی دھوم مچ گئی، کیوں کہ ایسا کالم اس سے پہلے کبھی لکھا نہیں گیا تھا۔ طاہر مسعود نے پچھلے دنوں خواجہ عبدالرحمن طارق سے کہا کہ خواجہ صاحب نے جس نوعیت کے ادبی کالم لکھے ہیں، وہ اس نوع کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ اس رائے کا اثبات متعدد اصحاب کی

آراستہ ہوتا ہے، مثلاً ہندوستان کے ممتاز نقاد ڈاکٹر شمیم حنفی نے لکھا:

"خامہ بگوش کی تحریریں ہمیں اپنے ادبی معاشرے کے موسم، مزاج اور درجہ حرارت میں اتار چڑھاؤ کی خبریں دیتی ہیں اور ہماری موجودہ روایت کی اقدار پیمائی بھی کرتی ہیں۔ یہ تحریریں ایک سچے اخلاقی زوال کے علاوہ ایک سوچی سمجھی برگشتگی، غصے، جلال اور افسردگی کی ترجمان بھی ہیں۔ خامہ بگوش کا اسلوب بیان مکمل طور پر بے لوث اور بے تصنع ہے۔ اس میں کسی طرح کی ادعائیت نہیں ہے۔ نہ بے جا پندار کی نمائش ہے..... خامہ بگوش کے فقروں میں ہمیشہ ارتکاز، بلاغت اور ایجاز پایا جاتا ہے، جس کا تصور زبان و بیان پر گرفت کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ میرا خیال ہے کہ ان تحریروں کے کسی بھی پڑھنے والے کی شخصیت اگر اپنی انا کی قتیل اور اپنی محبت میں بہت زیادہ خراب نہیں ہوئی تو وہ اپنے بارے میں بھی خامہ بگوش کے فقروں کی داد ضرور دے گا، چاہے وار کتنا ہی کاری کیوں نہ ہو۔ ان تحریروں کے مزاج میں برہمی سے زیادہ جلال، اہانت سے زیادہ افسردگی، مزاح سے زیادہ سنجیدگی کا اور تضحیک سے زیادہ تربیت اور تنبیہ کا پہلو نمایاں ہے۔"

ہندوستان کے ایک اور اہم دانشور ادیب محمود ہاشمی کی رائے میں:

"......" خامہ بگوش" نے اپنے ادبی کالموں کے ذریعے اصناف ادب میں محاسباتی تبصروں کی ایک نئی صنف کو فروغ دیا ہے..... خامہ بگوش کے کالم برصغیر میں بے حد مقبول ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس پردۂ زرنگاری میں "خامہ بگوش" اپنے عہد کے ادیبوں، ان کی تحریروں اور ان کے بیانات کا محاسبہ کرتے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ کالم ادبی تنقید میں ایک نئے ذائقے اور طرز فکر کے غماز ہیں۔"

معروف مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے خامہ بگوش کی انفرادیت کا ذکر کیا تو لکھا:

"......" خامہ بگوش" کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ صرف ادبی موضوعات پر ہی کالم لکھتے ہیں اور کالم لکھتے وقت کسی مصلحت کا شکار نہیں ہوتے۔ ادب سماج کو سدھارنے کا ذریعہ ہوتا ہے، لیکن جب تک خود ادب سدھار نہ ہو، جب تک وہ سماج کو کیسے سدھار سکتا ہے، اس لیے خامہ بگوش نے ساری توجہ ادب کو سدھارنے پر مرکوز کر رکھی ہے..... "خامہ بگوش" نے اپنے گہرے طنز کے ذریعے ادب کے بڑے لوگوں کو ان کا چھوٹا پن دکھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔"

دلچسپ بات یہ ہے کہ مشفق خواجہ جب اپنے ہمزاد "خامہ بگوش" اور کالم "سخن در سخن" کی وجہ سے

[illegible] کے لطف اظہار پر پہنچے ہوئے تھے تو ان کے دل و دماغ پر یہ خیال حاوی تھا کہ اصل میں کالم نگاری [illegible] کا میدان نہیں ہے۔ بلاشبہ یہ ان کا مقصد اور منزل بھی نہیں تھا۔ چناں چہ انھوں نے اسے اپنے راستے [illegible] کے منظروں میں سے ایک منظر قرار دیا۔ تحقیق ان کا اصل میدان تھا، جو نہ صرف کل وقتی کام تھا، [illegible] کے علاوہ ارتکاز نظر اور مسلسل کتب بینی کا تقاضا بھی کرتا تھا۔ انھیں یہ احساس بھی ہونے لگا تھا کہ ہندوستان میں ان کی شہرت مزاح نگار کی حیثیت میں مستحکم ہوتی جا رہی تھی۔ ان کا داخلی ملال اس [illegible] سے بھی عیاں ہے:

"اتنا تحقیقی کام کیا، ایک کتاب دس دس جلدوں میں لکھی، شعر کہے، تنقیدی مضامین لکھے، کوئی ان کا ذکر نہیں کرتا۔ ہر جگہ میرے فرضی نام سے لکھے ہوئے کالموں کا ذکر ہوتا ہے۔"

یہاں پر خواجہ صاحب نے محمد صلاح الدین صاحب سے معذرت کر لی کہ وہ "سخن در سخن" نہیں لکھ سکیں گے۔ خواجہ صاحب کے دیگر اہم ادبی کاموں کے پیش نظر صلاح الدین صاحب نے ان کی معذرت [illegible] قبول کر لی، لیکن "تکبیر" کے قارئین، جن کا وسیع حلقہ پوری اردو دنیا میں پھیلا ہوا تھا، ان سے [illegible] کالم کے اجرا کا مسلسل مطالبہ کرتے رہے۔ انھوں نے مشفق خواجہ صاحب کی خدمات کا بجا طور پر [illegible] اور انھیں لکھا:

"آپ نے "تکبیر" کے عہد طفولیت میں کالم نہیں لکھا، بلکہ اسے قوت و توانائی بہم پہنچانے اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنانے کے لیے انتہائی ایثار سے کام لیا اور اعلیٰ [illegible] کی سرپرستی فرمائی۔ مشکلات کے اس دور میں ہم آپ کی کوئی خدمت بھی نہ کر سکے، لیکن اللہ گواہ ہے کہ آپ کے ایثار اور جذبہ سرپرستی نے نہ صرف مجھے، بلکہ "تکبیر" کے ہر رکن کو بہت متاثر کیا اور آپ ہمارے دلوں میں اس طرح بس گئے کہ جب اپنی [illegible] کے باعث آپ نے کالم بند کرنے کی اطلاع دی، ہم ایک بڑے صدمے کی سی کیفیت سے دوچار ہوئے۔" (مشفق خواجہ کے نام مکتوب سے اقتباس)

محمد صلاح الدین کی مشفق خواجہ سے ٹیلی فون پر ملاقات ہوتی تو ضرور پوچھتے کہ جس کام کی وجہ سے آپ نے کالم نگاری چھوڑی تھی، وہ مکمل ہوا ہے یا نہیں؟ لیکن خواجہ صاحب سے حسب مطلب جواب [illegible] مایوس نہ ہوتے اور اصرار جاری رکھتے۔ مارچ ۱۹۹۳ء میں صلاح الدین صاحب کو حج کی [illegible] نصیب ہوئی تو واپس آ کر خواجہ صاحب کو فون پر کہا:

"اب تک تو میں آپ ہی سے کہتا رہا ہوں کہ "تکبیر" کے لیے لکھیے، لیکن اس مرتبہ میں نے حرمین میں دعا کی ہے کہ آپ لکھنے پر آمادہ ہو جائیں۔"

مشفق خواجہ نے سنا تو کانپ گئے۔ کہا: "صلاح الدین صاحب! اتنے چھوٹے سے کام کے لیے اتنی بڑی بارگاہ میں دعا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔" محمد صلاح الدین اس جواب پر بہت خوش ہوئے اور اس دعائے حرمین کے مستجاب ہونے کی علامت قرار دیا۔

"تکبیر" میں "سخن در سخن" کا دوسرا دور ۳۱ مارچ ۱۹۹۳ء کو شروع ہوا۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ دسمبر ۱۹۹۴ء میں محمد صلاح الدین صاحب کو شقی القلب دہشت گردوں نے دن دہاڑے شہید کر دیا اور اب مشفق خواجہ ان کی رحلت پر ایک داخلی صدمے سے دوچار ہو گئے۔ پہلے ۱۹۹۷ء کے اوائل میں کالم لکھنا بند کر دیا اور پھر اپنے بکھرے ہوئے کالم سمیٹتے سمیٹتے ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء کو یہ مادی دنیا چھوڑ کر عقبیٰ کو سدھار گئے۔ اس کے ساتھ ہی کسی خوشگوار موسم میں "سخن در سخن" کی تجدید کے امکانات بھی ختم ہو گئے، تاہم غنیمت یہ ہے کہ ان مشہور زمانہ ادبی کالموں کا انتخاب مظفر علی سید نے کیا اور تین کتابیں "خامہ بگوش کے قلم سے"، "سخن در سخن" اور "سخن ہائے ناگفتنی"، مشفق خواجہ کی زندگی میں چھپ گئیں۔

میں نے اوپر کالم نگاری کے سلسلے میں محمد حسن عسکری، ڈاکٹر جمیل جالبی، ضیا جالندھری اور جیلانی کامران کا ذکر کیا ہے، لیکن واضح رہے کہ ان کے ادیبوں نے اپنے کالم ادبی مسائل پر لکھے اور یہ ان کے ذاتی اسلوب میں ان کی مقالہ نگاری کے آئینہ دار ہوتے تھے۔ مشفق خواجہ ہمارے عہد کے واحد ادیب تھے، جنھوں نے ادب، ادیب اور ادبی معاشرے کی ناہمواریوں کو ایک مستقل موضوع کی حیثیت دی۔ مجھے اس کی وجہ (جو میں نے مشفق خواجہ سے ملاقاتوں کے دوران اخذ کی) یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ ادیب کو معاشرے کا حساس ترین فرد تصور کرتے تھے۔ ان کی نظر میں ادیب دیدۂ بینائے قوم ہے۔ معاشرے میں دکھ کہیں بھی ہو، ادیب کی آنکھ اس دکھ پر آنسوؤں سے چھلک پڑتی ہے اور وہ نظم، غزل یا افسانہ لکھنے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے، لیکن ہمارے معاشرے میں صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ آج کا ادیب دکھ کو اپنے اوپر وارد کرنے اور ذہنی کشاکش سے گزرنے کی بجائے مفاہمت، مصلحت اور سہل انگاری کا شکار ہے، مقصد پرست اور منفعت پسند ہے اور درِ شہرت پر ہر وقت دستک دیتا رہتا ہے۔ ادبی فضا کے اس تکدر نے نہ صرف مشفق خواجہ کو غمزدہ کر دیا، بلکہ ادبی معاشرے کی ناہمواریوں اور ادبا کی بوالعجبیوں کا احساس بھی دلایا تو ان کے کالموں میں ایسی طنزِ لطیف پیدا ہو گئی، جو کبھی نوکِ خار بن جاتی، کبھی پھولوں کی چھڑی بن کر ہلکی سی سرسراہٹ پیدا کرتی اور کبھی یہ اتنی شفاف ہو جاتی کہ موضوع کی تہہ میں بیٹھی ہوئی کثافت بھی قاری کو نظر آنے لگتی۔ ڈاکٹر اسلم انصاری نے درست لکھا تھا:

"وہ ادب میں ہر چیز کو برداشت کر سکتے ہیں، لیکن خود نمائی، خود فروشی اور اچھلے پن کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اسی طرح محض "زبان" کے نام پر برتری جتانے والے بھی ان سے

داد و تحسین پانے کی توقع نہیں کر سکتے۔ جھوٹے، نقلی اور "نان سینس" ادیبوں، سرقے کے مرتکب سفرنامہ نگاروں اور اس قبیل کے Petty تنقید نگاروں کو معاف کرنا ان کے مسلک میں جائز نہیں..... وہ یہ سب کچھ ایسے انداز میں کرتے ہیں جو انھی سے مخصوص نظر آتا ہے یہ سب کچھ وہ ادب کے سنجیدہ نقاد کی حیثیت سے کرتے ہیں، محض طنز و مزاح لکھنے والے ادیب کی حیثیت سے نہیں۔" (بحوالہ "ادب دوست" لاہور، جون ۲۰۰۰ء)

مظفر علی سید نے لکھا ہے کہ "ہر کتاب کے جنگل میں کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی گیدڑ چھپا ہوتا ہے تو خامہ بگوش کی نظر نہایت تیزی سے اس گیدڑ کو برآمد کر لیتی" اور پھر بقول مقتدر زمن "خواجہ صاحب کے [illegible] سچ بات کو اکثر اپنے انداز میں ایسے بیان کر دیتا کہ لوگوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جاتی۔" طنز میں گہرائی پیدا کرنے کے لیے انھوں نے ایک کردار لاغر مراد آبادی بھی تخلیق کر رکھا تھا، [illegible] مقامات پر ان کی مدد کرتا اور بادشاہ سلامت کو ننگا کہنے کی جرأت بھی کر لیتا۔ خواجہ صاحب کو [illegible]

"جن ادیبوں کے متعلق میں نے کالم لکھے، ان میں بعض بے حد حساس تھے۔ ان کا یہی خیال ہے کہ میں نے کسی خاص وجہ سے ان کے خلاف کالم لکھے ہیں، حالاں کہ میں نہ کسی کے خلاف لکھتا ہوں اور نہ ہی اس میں کوئی وجہ کارفرما ہوتی ہے۔ اگر کسی کتاب میں مجھے کوئی مضحکہ خیز بات نظر آتی ہے تو میں اس کی طرف اشارہ کر دیتا ہوں۔"

[illegible] ہے کہ "خامہ بگوش" (مشفق خواجہ) کے کالم کی صداقت کو قبول کرنے اور طنز و مزاح کا لطف اٹھانے کے لیے اعلیٰ ظرفی اور وسیع النظری کی ضرورت تھی، جو ادبی معاشرے سے کمیاب ہوتی [illegible]، چناں چہ جب کوئی شخص ناراضی کا اظہار کرتا تو خواجہ صاحب معذرت سے گریز نہ کرتے۔ شاہ [illegible] نے لکھا ہے کہ احمد ندیم قاسمی نے خواجہ صاحب کے کالموں پر سخت ردِ عمل ظاہر کیا تو خواجہ صاحب نے ان سے معافی مانگ لی۔ باقر مہدی اور ظفر امام سے عفو خواہی کی مثالیں بھی موجود ہیں، [illegible] اپنی کتاب پر اصرار سے کالم لکھواتے اور پھر اس کی مکرر اشاعت رسالہ "کتاب نما" میں بھی کرا دیتے تھے۔ اہم بات یہ ہے کہ ۲۱ فروری ۲۰۰۵ء کو کچھ عرصہ علیل رہنے کے بعد جب مشفق خواجہ خالقِ حقیقی کے پاس چلے گئے تو پوری ادبی دنیا میں صفِ ماتم بچھ گئی اور وہ لوگ زیادہ رو رہے [illegible] خامہ بگوش نے زیادہ سخت کالم لکھے تھے اور جنھیں بار بار اپنے کالم کا موضوع بنایا تھا۔ انھیں غم یہ [illegible] کے بعد اسے شگفتہ انداز میں ان کا تذکرہ اپنے کالموں میں کون کرے گا۔ اس قسم کے غم زدگان [illegible] سدید بھی شامل ہے، جس کی بیشتر کتابوں پر انھوں نے سخن گسترانہ باتوں کے ڈھیر

لگا دیے۔

خامہ بگوش (مشفق خواجہ) کے کالموں کی تین کتابوں کا انتخاب مظفر علی سید نے کیا تھا۔ خواجہ صاحب کی وفات کے بعد ان کے اہل خاندان نے ان کے ادھورے کاموں کو تکمیل تک پہنچانے کا فیصلہ کیا تو سب سے پہلے ہفت روزہ ''تکبیر'' میں ''سخن در سخن'' کے عنوان کے تحت چھپے ہوئے کالموں کو پیش کرنے کا منصوبہ بنایا۔ ان کالموں کی تلاش و جستجو کا فرض جناب خواجہ عبدالرحمان طارق نے انجام دیا ہے اور وہی اس کتاب کے حقیقی مرتب ہیں۔ میں نے ان کالموں کا مطالعہ کیا تو خواجہ طارق صاحب کو لکھا کہ ''کسی کو ان نامرتبہ کالموں میں ترمیم و تنسیخ کا حق حاصل نہیں۔ یہ خواجہ صاحب کی امانت ہے اور جس طرح چھپ چکی ہے، اسی طرح کتابی صورت میں بھی منظر عام پر آنی چاہیے۔'' ان کے سامنے علامہ عبداللہ یوسف علی کے ترجمہ قرآن اور تفسیر کی مثال تھی، جو ترمیم و تنسیخ کے بعد سعودیوں نے شائع کیے تو ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے فرمایا تھا کہ کسی مصنف کی کتاب میں کسی کو تبدیلی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' انھوں نے میری یہ تجویز منظور فرمائی۔ اب یہ کالم اسی طرح پیش کیے جا رہے ہیں جس طرح مشفق خواجہ کی زندگی میں چھپے تھے۔

''سخن در سخن'' کی پہلی کتاب ''سخن ہائے گسترانہ'' کے نام سے پیش کی جا رہی ہے۔ اس کا پیش لفظ لکھنے کا اعزاز مجھے حاصل ہوا ہے تو میں اس پر فخر کا اظہار کرتا ہوں کہ مجھے اپنے محسن دوست مشفق خواجہ کی معیت میں کچھ وقت گزارنے کا موقع نصیب ہوا۔ حق تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ آمین

انور سدید

☆..........☆..........☆

غیر نوشتہ کتابوں پر انعامات

محمد صلاح الدین صاحب کے ''جسارت'' سے الگ ہونے کا جہاں ہمیں بے حد ملال تھا، وہیں اس بات کی خوشی بھی تھی کہ کالم نگاری سے جان چھوٹے گی۔ ہم چوں کہ صلاح الدین صاحب کی وجہ سے اور انھی کے لیے لکھتے تھے، اس لیے سوچا، اب وہ بھی آرام کریں گے اور ہم بھی، لیکن افسوس کہ ہماری یہ خوش فہمی بہت جلد ختم ہو گئی اور صلاح الدین صاحب نے نہ صرف آرام نہ کرنے کا، یعنی ''تکبیر'' کی اشاعت کا ارادہ کر لیا، بلکہ ہمیں بھی پابند کر دیا کہ ہم اس ہفتہ وار کے لیے باقاعدگی سے لکھیں۔ باقاعدگی سے لکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ غزل یا علامتی افسانے کا معاملہ ہو تو باقاعدگی سے کیا، بلا ضرورت لکھنا بھی کوئی مشکل نہیں، کیوں کہ غیب سے خیال میں مضامین اسی طرح آتے ہیں، جس طرح بعض لوگوں کو انتخاب نہ جیتنے میں دلیلیں سوجھتی ہیں۔ لیکن کالم چیزے دیگر ہست۔ اس کے لیے پہلے تو خبریں تلاش کرنا پڑتی ہیں، مل جائیں تو انھیں اپنے مقصد کے مطابق تراشنا پڑتا ہے۔ نہ ملیں تو وضع کرنی پڑتی ہیں۔ [illegible] توانائی اس کام میں صرف ہو جاتی ہے تو پھر کہیں کالم لکھنے کا مرحلہ آتا ہے۔

کالم نگاری کا کام وہی لوگ کر سکتے ہیں، جنھیں اور کچھ نہ کرنا ہو۔ ہمیں تو ابھی بہت کچھ کرنا ہے، مثلاً اپنے کالموں کا ایک مجموعہ مرتب کرنا ہے۔ اسے چھپوانا ہے اور پھر ایڈمرل ارشد کی صدارت میں تقریب رونمائی کا اہتمام کرنا ہے۔ کتاب کے تین سو نسخے تو ایڈمرل صاحب خرید لیں گے۔ باقی سات سو نسخے گلی [illegible] فروخت کرنے ہوں گے۔ اتنے کاموں کے ہوتے ہوئے کالم نگاری کے لیے وقت نکالنا خاصا مشکل کام ہے۔

ہم نے اوپر کی سطور میں کالم نگاری سے جان چھوٹنے کی جو بات لکھی ہے، اس کا تعلق صرف ہم سے نہیں، ان لوگوں سے بھی ہے، جن کے بارے میں ہم گاہے گاہے لکھتے رہے ہیں۔ ''جسارت'' سے ہمارے کالم غائب ہوئے تو ہمارے ''موضوعات سخن'' میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ صہبا لکھنوی صاحب نے تو

باقاعدہ مٹھائی تقسیم کی اور اپنے دفتر (دبستانِ افکار) میں چراغاں بھی کیا۔ یہی نہیں، اس خوشی میں ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی خود نوشت ''گردِ راہ'' پر طلب بھی لکھ ڈالا، تاکہ یہ کتاب اپنے نام کی مناسبت سے گردآلود ہو جائے۔

جو لوگ ''جسارت'' میں ہمارا کالم بند ہونے سے خوش ہوئے تھے، ''تکبیر'' میں اسے دیکھیں گے تو خدا جانے ان پر کیا گزرے گی۔ ہماری دلی ہمدردیاں ان لوگوں کے ساتھ ہیں اور ہم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں، بلکہ شریکِ غالب ہیں کہ یہ سب کچھ ہماری وجہ سے ہو رہا ہے۔

ہمارے بعض کرم فرماؤں کا خیال ہے کہ کالم کو ایک روزنامے سے ہفتہ وار پرچے میں منتقل کرنا مناسب ہے۔ اس طرح پڑھنے والوں کا حلقہ محدود ہو جائے گا۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں۔ یہ کوئی انتقالِ اقتدار کا مسئلہ تو ہے نہیں کہ معاملہ ادھر سے ادھر ہوا اور صورتِ حال تشویشناک ہو گئی۔ کالم روزنامے میں چھپے یا ہفتہ وار اخبار میں، بات ایک ہی ہے۔ پڑھنے والوں کا حلقہ، حلقۂ اربابِ ذوق کی طرح نہ وسیع ہوگا، نہ محدود۔ یعنی جتنا ہے، اتنا ہی رہے گا، البتہ ہفتہ وار جریدے کو روزنامے پر ایک اعتبار سے فوقیت حاصل ہے کہ روزنامے کی زندگی صرف ایک دن کی ہوتی ہے اور ہفتہ وار جریدہ پورے ہفتے تک خریداروں کے انتظار میں بک اسٹالوں پر پڑا رہتا ہے اور بعض ہفتہ وار جریدے تو کئی کئی ہفتوں تک بک اسٹالوں پر پڑے رہتے ہیں۔ اور خریدار تو کیا، ناشرین بھی انھیں واپس لینے کے لیے نہیں آتے۔

ہم تقریباً تین ماہ کے ناغے کے بعد قارئین کرام کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں۔ معلوم نہیں، انھیں ہماری کمی محسوس ہوئی یا نہیں، لیکن ہمیں اپنے قارئین اکثر یاد آتے رہے۔ جب بھی کوئی دلچسپ خبر اخباروں میں شائع ہوتی تھی تو افسوس ہوتا تھا کہ ہمارے تبصرے کے بغیر یہ خبر ضائع جا رہی ہے۔ بہت سی خبریں تو فیض صاحب ہی کے تعلق سے ضائع ہو گئیں۔ وہ کراچی آئے، ڈیڑھ ماہ تک یہاں مقیم رہے، ہر روز ان کے حوالے سے ایک آدھ خبر شائع ہوتی رہی۔ خصوصاً ایک خبر تو ہمیں کبھی نہیں بھول سکتی۔ فیض صاحب نے ایک ہوٹل کے کاروبار کو فروغ دینے کے لیے مہدی حسن کی سنگت میں محفل جمائی اور یہ اعلان کیا کہ ان کی جو غزلیں مہدی حسن گاتے ہیں، وہ ان کی نہیں، مہدی حسن کی تصنیف ہیں۔

اس پر استاد لاغر مراد آبادی نے تبصرہ کیا، فیض صاحب ٹھیک کہتے ہیں، کیونکہ ان کی شاعری مہدی حسن ہی کے کام کی رہ گئی ہے۔ لاغر صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ کاش! فیض صاحب اپنی نثر کے بارے میں بھی اس قسم کا کوئی اعلان کر دیتے کہ ''متاعِ لوح و قلم'' کے نام سے جو مجموعہ مرزا ظفر الحسن صاحب نے مرتب کر کے شائع کیا ہے، وہ ان کی نہیں، مرزا صاحب کی تصنیف ہے۔ اس مجموعے میں جو شادی بیاہ کے رقعے، کتابوں کی تقریظیں، فلیپ اور آٹو گرافس وغیرہ شامل ہیں، ان سے فیض صاحب کی نیک نامی میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا، جب کہ مرزا صاحب کی نیک نامی میں اضافہ ہو سکتا ہے۔

حضرت لاغر کی اس رائے سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ فیض صاحب کے فلیپوں، تقریظوں، شادی بیاہ کے رقعوں اور آٹو گراف میں نثری نظموں کی سی شان پائی جاتی ہے۔ ممکن ہے، آیندہ کبھی مرزا صاحب کو فیض صاحب کی نثری نظموں کا مجموعہ شائع کرنے کا خیال آئے، اس وقت یہی متفرق تحریریں کام آئیں گی۔ فیض صاحب کی نثری نظموں کا مجموعہ چھپے گا تو مصنف اور مرتب دونوں کی نیک نامی میں اضافہ ہوگا۔ نثری نظم کا کمال یہ ہے کہ اس کے حوالے سے شائع ہونے والی کوئی تحریر ضائع نہیں ہوتی۔ نثری نظم کے نام سے آپ حکیم محمد سعید صاحب کا کوئی طبی نسخہ بھی شائع کر دیجیے تو قمر جمیل اس کی تعریف میں دو چار کالم لکھ کر ثابت کر دیں گے کہ ادب عالیہ یہی ہے۔ قمر جمیل، فیض صاحب کو شاعر نہیں مانتے، لیکن نثری نظمیں چھپیں گی تو فیض صاحب کا شمار بھی شاعروں میں ہونے لگے گا۔

اخبار سے ہماری غیر حاضری کے دوران ایک اہم خبر یہ بھی شائع ہو چکی ہے کہ منصوبہ بندی اور ترقیات کے وفاقی وزیر ڈاکٹر محبوب الحق خدا کے فضل سے شاعر بھی ہیں۔ وہ بہت سی غزلیں اور نظمیں تصنیف فرما چکے ہیں۔ ایک اخباری نمایندے نے ان سے پوچھا کہ مجموعۂ کلام کب تک شائع ہو رہا ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ حکومت کے ایک رکن کی حیثیت سے فی الحال ان کی ساری توجہ ملک کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے پر ہے، مجموعۂ کلام شائع کرنے کی کوئی جلدی نہیں۔

ڈاکٹر محبوب الحق موجودہ حکومت کے واحد رکن ہیں، جو شاعر ہوتے ہوئے بھی شاعری کی طرف توجہ نہیں دے رہے ہیں، ورنہ ہمارا مشاہدہ تو یہ ہے کہ موجودہ حکومت کے اراکین سے پہلے شاید ہی کسی نے شعر و ادب کی طرف اتنی توجہ کی ہو، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پہلی بار ملک کو شاعرانہ اور ادبی مزاج رکھنے والی حکومت ملی ہے۔ بعض اراکینِ حکومت تو باقاعدہ صاحبِ دیوان بھی ہیں۔ اہل کاروں میں بھی متعدد ایسے افراد موجود ہیں جنھوں نے ادب کی خدمت کو اپنے فرائضِ منصبی میں شامل کر رکھا ہے اور پیشہ ور مصنفوں سے بھی زیادہ کتابوں کے مصنف بن چکے ہیں۔

موجودہ حکومت کی ادب دوستی کا ایک ثبوت یہ ہے کہ اکیڈمی آف لیٹرز المتخلص بہ مسیح الدین صدیقی جیسا فعال ادارہ موجود ہے، جس کا سالانہ بجٹ پچاس لاکھ روپے سے زیادہ ہے اور جس کی توجہ سے اب ادیب کہلانے کے لیے قرطاس و قلم کے استعمال کی ضرورت نہیں رہی۔

حکومت کی ادب سے دلچسپی کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ ادیبوں کو مختلف طرح کے بیسیوں انعامات دیے جاتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ ایک ''غیر سرکاری'' رسالے کے نام پر بھی سالانہ انعامات کا سلسلہ سرکاری امداد اور اعانت سے شروع ہو چکا ہے۔ توقع ہے کہ آیندہ انتخابات تک ہر مطبوعہ کتاب پر انعام مل جائے تو کوئی عجب نہیں، اگر کسی معقول وجہ سے انتخابات نہ ہو سکے تو پھر غیر مطبوعہ اور غیر تحریر شدہ کتابوں پر بھی انعامات ملنے لگیں۔

جس دور میں ادب اور شعر و شاعری سے اتنی دلچسپی لی جا رہی ہو اس دور میں ڈاکٹر محبوب الحق کا اپنے مجموعۂ کلام سے ... پہ تو بھی برتنا کچھ عجیب سے لگتا ہے۔ ہم نہایت ادب سے گزارش کریں گے کہ ملک کی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کا خیال اپنی جگہ، ادبی حالت کو بھی بہتر بنانا ضروری ہے۔

ڈاکٹر صاحب کا مجموعۂ کلام چھپے گا تو ادبی حالت دو سطحوں پر بہتر ہوگی۔ ایک تو یوں کہ ایک اچھی کتاب منظر عام پر آئے گی اور دوسرے یوں کہ اس کتاب کی تقریب رونمائی میں بہت سے مختلف الخیال ادیبوں کو ایک جگہ جمع ہونے کا موقع ملے گا۔ لاہور سے احمد ندیم قاسمی آئیں گے، جن کے ساتھ عطاء الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد ہوں گے۔ سرگودھا سے ڈاکٹر وزیر آغا کو بلایا جائے گا، جن کے ساتھ ڈاکٹر انور سدید ہوں گے کہ وہ اکیلے ہی دو آدمیوں کے برابر ہیں۔ اسلام آباد ہی ایک ایسی جگہ ہے، جس کے آسمان کے دبستان سرگودھا اور دبستان فنون یکجا ہو سکتے ہیں۔ یہ دونوں دبستان پچھلی مرتبہ بھی یکجا ہوئے تھے۔ اب دوبارہ موقع ملے گا تو مزید قربت پیدا ہوگی، جس کے نتیجے میں ممکن ہے، آگے چل کر ان کے باہمی اختلافات ختم ہو جائیں اور یہ دونوں دبستان ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں۔ ضم ہونے کا عمل "ض" سے ہو یا "ذ" سے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیوں کہ طوطا "ت" سے لکھا جاتا ہے اور "ط" سے بھی۔

اسلام آباد میں کتابوں کی پردہ پوشی کا کام اکیڈمی آف لیٹرز کے ذمے ہے اور وہ تقریب کا انتظام "دائرہ" نامی ادبی تنظیم کرتی ہے۔ دائرے والوں سے گزارش ہے کہ اب کوئی تقریب ہو تو وہ ٹکٹ بھیج کر ہمیں بھی بلا سکتے ہیں۔ ہم ہر قسم کی کتاب کے محاسن پر مقالہ لکھ ہی نہیں سکتے، بلکہ ہم دیدہ دلیری سے پڑھ بھی سکتے ہیں۔ اسلام آباد میں رونمائی کی تقریب میں حصہ لینے کا یہ فائدہ ہوتا ہے کہ ملک کے کثیر الاشاعت اخبارات مقررین کی رنگین تصویریں چھاپتے ہیں (یہ دوسری بات ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا ادیب مر بھی جائے تو ان اخبارات میں رنگین کیا، سیاہ و سفید تصویر بھی نہیں چھپتی)۔ عطاء الحق قاسمی اور امجد اسلام امجد کی رنگین تصویریں دیکھ دیکھ کر ہمیں رشک آتا ہے کہ یہ کتنے خوش نصیب ہیں کہ محض دو میٹھے بول سنا کر رنگین تصویریں چھپوا لیتے ہیں۔ کیا ہم اس سلوک کے مستحق نہیں ہیں!

(۱۳ مارچ ۱۹۸۴ء)

☆ ☆ ☆

لفظ و معنی کی جدائی

"اور پھر اس کی زبان اکڑ گئی اور وہ صرف قرأت کر سکتا تھا اور بھجن گا سکتا تھا۔ اور غالب مر گئے اور ذوق نے میدان چھوڑ دیا اور میر دلی واپس چلے گئے اور داغ داغ دے گئے اور مومن نے افغانوں سے ڈرایا اور سلام مچھلی شہری ناچنے لگے اور جگر آنندی بیل کے ساتھ ہو لیے اور جوش نے ہٹلر کو سلام کیا اور اس نے رلریٹ کا بگل بجایا اور فیکٹری کی نعت پڑھنے لگا اور کھیت سے سوئی توڑنے لگا اور پھر بندوق الحذنی اور قاتل کا قصیدہ کہا اور خون کا تلک لگایا اور ممتاز مغل کو الوداع کہا اور گورے رنگ پر سیاہی اور مالن سے گجرا چھینا اور نظر جوانی اور پسینہ پونچھا اور کشکول اٹھایا اور بھیک مانگی اور چوری کی اور زہر پیا اور مر گیا اور پھر زندہ ہوا کہ سرہانے پستول رکھ رہی تھی۔"

یہ اقتباس جس کتاب سے لیا گیا ہے، اس کی خوبی یہ ہے کہ پوری کتاب اس اسلوب سے لکھی گئی ہے۔ ایک لفظ کا دوسرے لفظ سے اور ایک جملے کا دوسرے جملے سے اتنا بھی تعلق نہیں ہے، جتنا صہبا لکھنوی کا ادب سے یا مولانا کوثر نیازی کا سیاست سے ہے۔ ہم نے مذکورہ اقتباس تلاش کرنے کے لیے کتاب کی ورق گردانی نہیں کی، کتاب کو آنکھیں بند کر کے کھولا، صفحہ ۸۵ سامنے آیا اور اس کا پہلا پیراگراف مثال کے لیے منتخب کر لیا۔ اس اقتباس کو کتاب کے کسی بھی صفحے کے کسی بھی پیراگراف سے تبدیل کر دیا جائے تو صورت حال میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگی۔

یہ عجیب و غریب کتاب، جو "جنم کنڈلی" کے نام سے شائع ہوئی ہے، اسے مصنف نے "تجرباتی ناول" کہا ہے اور ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے فلیپ پر اس کی تصدیق ہی نہیں کی، بلکہ یہ پیشین گوئی بھی کی ہے "جنم کنڈلی" ایک ایسا انوکھا اور کامیاب تجربہ ہے، جو اردو فکشن میں سنگ میل قرار پائے گا۔" اگر "سنگ میل" سے موصوف کی مراد "سنگ طفلاں" نہیں ہے تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اب تنقید اور زائچہ

نولیس میں کوئی فرق نہیں رہا۔ چوں کہ ہم بھائی محمد علی صدیقی کے علم و فضل کے دل سے قائل ہیں، اس لیے ان کا فلیپ پڑھ کر ہم نے "جنم کنڈلی" کو اول تا آخر پڑھنے کا ارادہ کیا۔ خوشی کا مقام ہے کہ ہم نے یہ مہم سر کر لی ہے۔ یہ نہ پوچھیے کہ اس دوران میں ہمارا کیا حال ہوا۔ افسوس کہ اکیڈمی آف لیٹرز کتابیں لکھنے پر تو انعام دیتی ہے، لیکن کتابیں پڑھنے پر کوئی انعام نہیں دیا جاتا، ورنہ اس سال ہمارا نام بھی انعام یافتگان کی فہرست میں شامل ہوتا۔

"جنم کنڈلی" کے ۲۴۹ صفحوں میں ہمیں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی، جس کی بنا پر اس کتاب کو "تجرباتی ناول" کہا جا سکے، البتہ ایک تبصرہ نگار کا وہ مشہور فقرہ ضرور آیا، جو اس نے ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا..... "اس کتاب کے تمام ابواب ایک دوسرے سے مسلط ہیں اور یہ مصنف کا نہیں، جلد ساز کا کمال ہے۔" ...... "جنم کنڈلی" پڑھنے کے بعد ہمیں تو یہی محسوس ہوا، جیسے مصنف نے اپنے بے شمار پسندیدہ الفاظ کو ان کے معانی سے جدا کر کے اس کتاب میں یکجا کر دیا ہو۔ جمال الدین عالی نے بھی کہا تھا..... "لفظ و معنی ہوئے رو رو کے جدا میرے بعد" ..... عالی صاحب کو خوش ہونا چاہیے کہ ان کی زندگی ہی میں ایک ایسی کتاب شائع ہو گئی ہے، جس میں لفظ و معنی کی جدائی اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔

"جنم کنڈلی" کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں بلا سوچے سمجھے الفاظ کے انبار لگا دیے گئے ہیں۔ لفظوں سے اس خصوصی برتاؤ کا یعنی بے تکلفی کا خود مصنف کو بھی احساس ہے۔ انھوں نے کئی جگہ علامتی انداز میں اپنی اس خوبی کا اعتراف کیا ہے۔

"اور الفاظ نے بچپن سے اس کا پیٹ خراب کر رکھا تھا۔ وہ الفاظ کھاتا تھا اور الفاظ کھیلتا تھا۔ الفاظ سوتا تھا، الفاظ جاگتا تھا۔" ص ۴۳

"اور اس نے حقے کی فرشی گیس میں پانی بھر لیا اور گڑگڑانے لگا اور ہوا میں الفاظ بکھیر دیے اور ساری فضا میں الفاظ چیخنے لگے اور میر اور غالب اور ناسخ اپنی اپنی قبروں سے نکل کر جھانکنے لگے اور مجروح سلطان پوری نے اپنی چلتی پھینک دی اور لیلیٰ کی اماں نے مجنوں کا گریبان سی دیا۔" ص ۵۶

مصنف کو فحاشی و عریانی سے خاص دلچسپی ہے۔ اس کا کچھ اندازہ تو کتاب کے سرورق ہی سے ہو جاتا ہے۔ سرورق میں استعمال کی گئی علامتوں کی تشریح کتاب کے ہر صفحے پر ملتی ہے اور وہ بھی کھلے لفظوں میں۔ فلیپ نگاروں نے کہا ہے کہ مصنف نے علامتی و استعاراتی انداز اختیار کیا ہے، لیکن ہمارا خیال ہے کہ عریانی و فحاشی کے معاملات میں مصنف نے علامتوں اور استعاروں کا لبادہ نہیں اوڑھا، ہر بات صاف صاف اور واضح الفاظ میں کہی گئی ہے۔ افسوس کہ ہم مثالیں پیش نہیں کر سکتے، تاہم اس قدر ضرور کہیں گے کہ مردوں اور عورتوں کے کپڑوں کے حوالے سے جو باتیں کہی گئی ہیں، ان سے مصنف کے ذہن اور ذہنیت کو با آسانی

سمجھا جا سکتا ہے۔ صرف پتلون اتارنے اور زپ کھولنے کا ذکر کم از کم پچاس جگہ ملتا ہے۔ عورتوں اور مردوں کے کپڑوں کا ذکر اس کثرت سے ملتا ہے کہ یہ کتاب کسی لانڈری کی رسیدوں کا مجموعہ معلوم ہوتی ہے۔

مصنف کے "جدید" ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اس نے کئی جگہ موقع و محل کی مناسبت کے بغیر قرآنی آیات کو استعمال کیا ہے۔ پیغمبروں کا تذکرہ مضحکہ خیز انداز میں کیا ہے۔ مثلاً:

"اور حضرت یونس نے کہا: اس لیے تو میں مچھلی کے پیٹ میں گھس گیا۔ یہ بہتر اور پُرشور ہے، مگر تنہائی میں میرا دم گھٹتا ہے۔ اور مچھلی نے ہنس کر کہا: چپ چاپ بیٹھے رہو، دم لے کر کیا کرو گے۔ باہر انسانوں کا مجمع ہے، وہ پکڑ ڈنڈے لے کر تمھیں کھدیڑیں گے۔" ص ۹۰

اولیاء اللہ کا مذاق بھی جی بھر کے اڑایا گیا ہے۔ مثلاً:

"اور ایک دن فرنگی روپ گیا اور پیش امام لنڈی ڈانس کرنے لگا۔ اور اس نے ظہر کی نماز ڈانس فلور پر پڑھائی اور مردے زندہ ہو گئے اور بہرے سننے لگے۔" ص ۱۱۷

"جنم کنڈلی" پڑھ کر ہمیں مولانا محمد حسین آزاد کی عالم جنون کی تصانیف یاد آ گئیں۔ دیوانگی کے زمانے میں انھوں نے متعدد کتابیں لکھی تھیں، جن میں سے بعض (مثلاً "سپاک و ناپاک" اور "جانورستان") شائع ہو چکی ہیں۔ معلوم نہیں، یہ کتابیں محمد علی صدیقی کی نظر سے گزری ہیں کہ نہیں۔ آزاد کا تجربہ بھی انوکھا تھا، فرق یہ ہے کہ "جنم کنڈلی" مبینہ طور پر عالم ہوش میں لکھی گئی اور آزاد کی کتابیں عالم دیوانگی میں...... اس لیے آزاد کی کتابیں کہیں کہیں سے سمجھ میں آ جاتی ہیں۔

"جنم کنڈلی" کا دیباچہ انجم اعظمی نے لکھا ہے اور اسے ایک عظیم تصنیف قرار دیا ہے۔ مصنف اور دیباچہ نگار، دونوں جب "مقدس" ہوں تو تصنیف کے عظیم ہونے میں شک نہیں ہو سکتا۔ لیکن دیباچہ نگار کی بے بسی کا یہ عالم ہے، مصنف نے جس کردار...... چمارن ...... کا ذکر انتہائی فحش انداز میں کیا ہے (ص ۳۷) اسے انھوں نے "مقدس" بنا کر پیش کیا ہے۔ اس دیباچے کو دیکھ کر یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ کتاب کے مصنف کو غالب کے برعکس اتنا مقدور ہے کہ وہ "نوحہ گر" کو ساتھ رکھ سکتے ہیں۔

کام تمام ہونے کو آیا تو خیال آیا کہ اس میں مصنف کا نام کہیں نہیں آیا۔ لہٰذا عرض ہے کہ ان کا [illegible] ہے اور عرفیت "دلارے میاں" ہے۔ اس عرفیت پر مصنف کو اتنا ناز ہے کہ آخری سرورق پر جہاں ان کے حالات شائع کیے گئے ہیں، عرفیت کا بطور خاص ذکر کیا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جوش کی "یادوں کی برات" میں بھی "دلارے میاں" کا حوالہ ملتا ہے۔

ہم نے "یادوں کی برات" کو جوش صاحب کے ماضی کی تلاش میں پڑھا تھا۔ اب دلارے میاں کی تلاش میں دوبارہ پڑھنا پڑا۔ ...... افسوس کہ دلارے میاں کہیں نظر نہ آئے، البتہ دیباچے میں جوش صاحب کی یہ سطریں نظر سے گزریں۔ "شاعری میں وہ بدبلا ہے کہ ہر موزوں طبع تخلص دار کے کان

میں یہ افسوں پھونک دیتی ہے کہ بیٹا! تم اپنے دور کے سب سے بڑے شاعر ہو۔ اور اسی لیے بادر یکا ٹولے کا ہر پونڈا اپنے آپ کو نعمت خان عالی سمجھتا ہے۔" .... لیکن ان سطروں سے دلارے میاں کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

ہم نے دوستوں سے مشورہ کیا تو ایک صاحب نے بتایا کہ "دلارے میاں" کا ذکر "یادوں کی برات" کے دوسرے ایڈیشن میں ہے، جس میں انھوں نے ایک ضمیمے کا اضافہ کیا ہے اور اسلام آباد میں اپنے زمانۂ قیام کی یادداشتیں لکھی ہیں۔ ہم نے دوسرا ایڈیشن منگوا کر ضمیمہ دیکھا تو واقعی اس میں دلارے میاں موجود تھے۔ اس ضمیمے میں جوش صاحب نے اپنے ہر ملاقاتی کا ذکر کیا اور ہر اس شخص کی تعریف کی ہے، جو انھیں پینے پلانے کی محفلوں میں مدعو کرتا تھا۔ کہاں تو پہلے ایڈیشن میں فانی، جگر، پنڈت نہرو، سروجنی نائیڈو اور فراق گورکھپوری جیسے لوگوں کا ذکر ہے اور کہاں دوسرے ایڈیشن میں جمال خان اور کمال خان نام کے لوگوں کا تذکرہ ہے۔ اس ضمن میں دلارے میاں کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے:

"پہلے فوج میں ونگ کمانڈر تھے، پھر فوجی فاؤنڈیشن میں کام کرنے لگے، اور اب یہ غضب کیا کہ پنڈی کو ویران کر کے کراچی چلے گئے۔ ان کا گھریلو نام ہے دلارے میاں اور واقعی وہ دوستوں کی آنکھوں کے تارے اور یادوں کے دلارے ہیں بھی۔ اور شعر بھی خوب کہتے ہیں۔ ماشاءاللہ ان کے گھر پر اکثر دعوتیں ہوا کرتی تھیں اور یہ خصوصیت تھی ان دعوتوں کی کہ ان میں خاصانِ جام و سبو اور صاحبانِ سجادہ و وضو دونوں کو مدعو کیا جاتا تھا اور میکدے اور صومعے ایک ہی حلقے میں تعمیر کر دیے جاتے تھے اور عرصۂ رندی کے غازی اور گوشۂ تقویٰ کے نمازی، دوش بدوش بیٹھ کر اپنا اپنا کلام سناتے تھے اور جب آفتاب غروب ہو جاتا تھا تو ایک طرف تو مصلے دراز ہو جاتے تھے اور دوسری طرف بساطِ بادہ نوشی بچھا دی جاتی تھی اور اذانوں کی آوازوں کے سائے میں قلقلِ مینا تھرکنے لگتی تھی اور پھر مصلوں پر نمازی غروب اور بساطِ رنگ پر غازی طلوع ہو جایا کرتے تھے۔" (ص ۷۵۱)

جوش صاحب نے دلارے میاں کی شاعری کی تعریف کی ہے۔ واقعی یہ شاعری تعریف کے قابل ہے۔ "جشن کندنی" میں موصوف نے جگہ جگہ اپنے شعر درج کیے ہیں۔ شاید اس لیے کہ کہیں اور ان کے درج ہونے کی گنجائش نہیں نکل سکتی تھی۔ بطور نمونۂ کلام و شعر ملاحظہ کیجیے:

مَیں تم سے اندھیرے میں کئی بار ملا ہوں
اب دن ہے، بتاؤ تو بھلا کون ہوں، کیا ہوں
ڈر ہے، تری چاہت سے کہیں ٹوٹ نہ جاؤں
مَیں گرم کس گھر کے قرینے میں جدا ہوں

نعیم اعظمی صاحب کو چاہیے کہ اب اپنا دیوان بھی چھپوا ڈالیں۔ دیباچے کی فکر نہ کریں، انجم اعظمی اب آپ کی پہلی دو کتابوں پر اظہارِ خیال کر چکے ہیں تو تیسری کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور لکھ دیں گے۔ یہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا۔

(۳۰ مارچ ۱۹۸۳ء)

☆.........☆.........☆

والا ہے، جبکہ ان میں مروجہ سفرناموں والی کوئی بات نہیں ہے۔ مثلاً انھوں نے ہندوستان کی سیاحت کرتے ہوئے کسی شہر کی تاریخ بیان کی ہے نہ کسی عمارت کے طرزِ تعمیر پر بحث کی۔ حد تو یہ ہے کہ غالب کے مزار پر گئے اور کتبے پر درج میر مہدی مجروح کا لکھا ہوا وہ قطعۂ تاریخ بھی نقل نہیں کیا، جسے پروفیسر ممتاز حسین نے عروج سلطان پوری سے منسوب کیا تھا۔ چلیے اور کچھ نہیں تو کم از کم یہی بتا دیتے کہ دلی کی جامع مسجد کو کس مغل بادشاہ نے اور کب تعمیر کرایا تھا۔ ایسے سفرنامے کا کیا فائدہ، جو قاری کو ضروری معلومات بھی فراہم نہ کر سکے۔ انتظار حسین صاحب! مانا کہ آپ بہت بڑے افسانہ نگار ہیں، لیکن سفرنامہ لکھنا آپ کے بس کی بات نہیں۔ کاش آپ نے نمونے کے طور پر حکیم محمد سعید صاحب کے سفرنامے ہی پڑھ لیے ہوتے۔ حکیم صاحب جس ملک کا سفرنامہ لکھتے ہیں، پھر اس ملک کی تاریخ تو کیا، جغرافیہ بھی پڑھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ ایک آپ ہیں کہ آپ کے سفرناموں کو پڑھ کر یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ آپ کا قصبہ ڈبائی مدھیہ پردیش میں ہے یا آندھرا پردیش میں۔

"زمین اور فلک اور" میں چار سفرنامے ہیں اور چار مرتبہ ہندوستان جانے کا ذکر ملتا ہے، لیکن واپس آنے کا ذکر صرف ایک مرتبہ کیا گیا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ باقی تین مرتبہ انتظار حسین کی واپسی ہوئی یا نہیں۔ ابہام کا یہ انداز افسانوں میں تو ٹھیک ہے، سفرناموں میں غلط فہمیوں کا باعث بن سکتا ہے۔

ان سفرناموں سے کہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انتظار حسین نے ہندوستان کے سفر کب کیے تھے۔ پڑھنے والا سیاق و سباق ہی سے زمانے کا تعین کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں خاصی پریشانی اٹھانی پڑی۔ ان میں باقر مہدی، بلراج، مین را اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے ملاقاتوں کا حال ہے۔ اس سے ہم نے سفر کا زمانہ قبل مسیح متعین کیا، لیکن جب تاج محل اور چار مینار وغیرہ کا ذکر پڑھا تو ہم مشکل میں پڑ گئے، کیونکہ یہ عمارات زمانہ قبل مسیح کی نہیں۔ آخر ہم بہت سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ خود انتظار حسین کو بھی یاد نہیں رہا کہ وہ کب ہندوستان گئے تھے۔ اگر یاد ہوتا تو وہ ہرگز باقر مہدی وغیرہ سے ملنے کا اور تاج محل وغیرہ کو دیکھنے کا ذکر ایک ساتھ نہ کرتے۔

صرف یہی نہیں کہ انتظار حسین تاریخ اور جغرافیے میں کمزور ہیں اور ان کا تصورِ زمان و مکان خاصا کمزور ہے، بلکہ انھیں یہ بھی معلوم نہیں کہ جدید زمانے میں سفرنامے لکھنے کے طریقے تبدیل ہو چکے ہیں۔ آج کل سفرنامہ یوں لکھا جاتا ہے کہ گھر سے ایئرپورٹ پہنچنے کے واقعات ۳۰-۴۰ صفحات میں بیان کیے جائیں، اس کے بعد ۵۰-۶۰ صفحوں میں ہوائی جہاز میں موجود ایئر ہوسٹسوں کا ذکر ہو اور پھر منزلِ مقصود پر پہنچ کر ان خواتین کا تذکرہ ہو، جو مسافر کے لیے عرصۂ دراز سے چشم براہ تھیں۔ انتظار حسین کے چاروں سفرناموں میں خواتین کا ذکر برائے نام ہے۔ بس ایک جھانسی کی رانی کا ذکر آیا ہے اور ان سے بھی ملاقات نہیں ہوئی۔ ہاں یوں کہ سفر کے دوران جھانسی کے ریلوے اسٹیشن سے گزرتے ہوئے انتظار حسین کو

سفرنامے یا افسانے

ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے انتظار حسین کو جو منفرد مقام حاصل ہے، اس سے بعض لوگ خوش نہیں ہیں۔ ان خوش نہ ہونے والوں میں سردار جعفری بھی شامل ہیں اور خود انتظار حسین بھی۔ سردار جعفری یوں کہ انھوں نے اپنے ترقی پسند ادب کے انتخاب میں انتظار حسین کا ایک افسانہ ("کشتی") شامل کر کے انھیں ترقی پسندوں کی قطار میں کھڑا کر دیا ہے۔ اور خود انتظار حسین اس لیے کہ وہ پے در پے ایسی کتابیں شائع کرتے چلے جا رہے ہیں، جن کا افسانوں سے کوئی تعلق نہیں۔ پہلے انھوں نے اپنے کالموں کا انتخاب (ذرے) شائع کیا، پھر تنقیدی مضامین کا مجموعہ (علامتوں کا زوال) اور اب سفرناموں کا گلدستہ (زمین اور فلک اور) زیورِ طبع سے آراستہ کر کے بازار میں بھجوا دیا ہے۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے محنت سے کمائی ہوئی شہرت کو ایسی بے دردی سے غیر منافع بخش کاموں میں صرف کرنا، سردار جعفری والی ترقی پسندی ہو تو ہو، عاقبت اندیشی نہیں ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی تحقیق کو چھوڑ کر شاعری کر رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مقتدرہ قومی زبان کے صدر ہیں۔ نفاذِ اردو ان کے فرائض میں شامل ہے۔ ظاہر ہے، اردو کو نافذ کرنے کا ایک ذریعہ شاعری بھی ہے۔ انتظار حسین بھی شاید نفاذِ اردو کے خیال سے افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ دوسری اصنافِ ادب کو اپنائے ہوئے ہیں۔

انتظار حسین نے اپنی غیر افسانوی کتابوں کے نام ایسے رکھے ہیں کہ ہم جیسے سادہ لوح دھوکا کھا جاتے ہیں۔ "زمین اور فلک اور" کو ہم نے قصے کہانیوں کی کتاب سمجھ کر خریدا اور یہی کچھ سمجھ کر پڑھ گئے، لیکن کتاب کے آخر میں معذرت نامہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہم جو کچھ پڑھ چکے ہیں، وہ افسانے نہیں سفرنامے تھے۔ اگر معذرت نامہ نہ ہوتا تو ہرگز معلوم نہ ہوتا کہ یہ سفرناموں کی کتاب ہے۔ اگر معذرت نامہ شامل کرنا ہی تھا تو کتاب کے شروع میں شامل کیا ہوتا، تاکہ پڑھنے والا نتائج کا ذمہ دار خود ہوتا۔

ہمیں اس کا افسوس ہے کہ انتظار حسین نے معذرت پیش کر کے اچھے خاصے افسانوں کو سفرنامہ

رانی یاد آ گئیں اور اُن کا نام سفرنامے میں ٹانک لیا .... نام لیا تھا تو ملاقات کرنے میں کیا قباحت تھی۔ ملاقات ہوتی تو دونوں طرف کے مکالمات بھی درج ہوتے، آئندہ خط و کتابت کرنے کے وعدے ہوتے اور یوں سفرنامے میں جان پڑ جاتی۔

”زمین اور فلک اور“ کا بنیادی فلسفہ یہ ہے کہ ہندوستان میں ہر چیز پر زوال آ چکا ہے۔ ہاتھی پر زوال آ چکا ہے کہ اب اسے اشتہاری مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ناگپور کے سنگتروں پر زوال آ چکا ہے کہ یہ پہلے کی طرح رسیلے نہیں رہے۔ سندیلے کے لڈوؤں پر زوال آ چکا ہے کہ اب ہانڈی میں دستیاب نہیں ہوتے۔ لکھنؤ کے چوک کی ربڑی پر زوال آ چکا ہے کہ اب یہ بے مزہ ہوگئی ہے۔ بنارس کے رس گلوں پر زوال آ چکا ہے کہ گلے میں پھنستے ہیں۔ لیکن جو بتانے کی بات تھی، وہ انتظار حسین نے نہیں بتائی کہ ہندوستان میں ادب پر بھی زوال آ چکا ہے کہ وہاں احمد ہمیش کو پاکستان کا بہت بڑا افسانہ نگار سمجھا جاتا ہے۔

احمد ہمیش پر یاد آیا کہ انتظار حسین نے اس بڑے افسانہ نگار کا ذکر معاصرانہ چشمک کے ساتھ کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں .... ”احمد ہمیش جنپت (ہوٹل) میں کتنا خوش ہے کہ فوٹوگرافر کو خصوصی طور پر بلا کر اپنی تصویر کھنچوا رہا ہے۔ کبھی فوم کے گدے والے بستر پر لیٹ کر، کبھی بیٹھ کر، کبھی کھڑے ہو کر۔“ فوٹوگرافر کو خصوصی طور پر بلانے والی بات غلط ہے۔ ہم نے تو یہ سنا ہے کہ احمد ہمیش یہیں سے فوٹوگرافر ساتھ لے کر گئے تھے۔

احمد ہمیش کے بارے میں انتظار حسین کا ایک اور بیان بھی سن لیجیے:

”کتنے اچھے تھے وہ لوگ کہ جس یکسوئی سے انھوں نے پہلی محفل میں احمد ہمیش سے افسانہ یعنی اُن کے ایک طویل افسانے سے اقتباس سنا تھا۔ اسی یکسوئی سے ہر محفل میں اس افسانے کو یا اقتباس کو سنتے چلے گئے اور جب ایک خاص مقام پر پہنچ کر احمد ہمیش پر رقت طاری ہوتی تو ان وضع دار سامعین کی بھی آنکھ بھر آتی۔ ہاں، ایک چائے پر باتیں کرتے کرتے مظفر حنفی نے احمد ہمیش سے مؤدبانہ استفسار کیا کہ ”ہمیش صاحب! یہ جو افسانے میں ایک خاص مقام پر پہنچ کر آپ پر رقت طاری ہوتی ہے، یہ بے اختیاری ہے یا آپ نے اس کے لیے کوئی مشق کی ہے؟“ احمد ہمیش نے تامل کیا، پھر کہا: صاحب! یہ بے اختیاری ہے۔ ویسے میں ریڈیو آرٹسٹ بھی ہوں۔

اپنا تجربہ تو یہ ہے کہ احمد ہمیش کا افسانہ کسی رسالے میں نظر آ جائے تو عنوان دیکھ کر ہی ہم پر رقت طاری ہو جاتی ہے، حالانکہ ہم ریڈیو آرٹسٹ نہیں ہیں۔ اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ احمد ہمیش کا افسانہ سننے والوں پر کیا گذرتی ہوگی۔

ایک جگہ انتظار حسین صاحب نے قرۃ العین حیدر سے اپنی گفتگو بھی درج کی ہے۔ محترمہ فرماتی ہیں:

”آپ کے یہاں سے ایک شاعرہ آئی تھی۔ معاف کیجیے انتظار صاحب! وہ تو بہت چھچھوری لڑکی تھی۔ اس نے وہاں جا کر جھوٹ سچ کیا کیا لکھ ڈالا۔ اور ہاں، فہمیدہ ریاض بھی آئی تھیں۔ افسوس کرنے لگیں کہ (ہندوستان کے) ادیب کیسی عسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ مجھ سے پوچھنے لگیں کہ آپ کے پاس کار نہیں ہے؟ تو گویا آپ لوگ ادیب کو اس طرح پرکھتے ہیں۔“

قرۃ العین حیدر نے پاکستانی شاعرہ کے تعلق سے جو کچھ کہا ہے، وہ غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتا ہے۔ اس بے چاری شاعرہ کا جرم صرف اتنا ہے کہ اس نے قرۃ العین حیدر پر ایک نظم لکھی تھی، جس میں بڑے مخلصانہ جذبات کا اظہار کیا گیا تھا۔ کاش! قرۃ العین حیدر اس نظم کو سرسری اور سطحی نظر سے دیکھتیں۔ رہی فہمیدہ ریاض کی بات تو ان سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ پریشان ہونے کے لیے ان کی شاعری کافی ہے۔

انتظار حسین نے دو ایک جگہ مظفر علی سید کا بھی ذکر کیا ہے۔ کنہیا لال کپور سے انتظار حسین نے کہا:

”کپور صاحب! اپنے دوست مظفر علی سید آپ پر کام کر رہے ہیں۔“

کپور صاحب نے جواب دیا:

”ہاں سید صاحب کا خط آیا تھا۔ میں نے انھیں لکھ بھیجا ہے کہ یہاں ایک سکھ مجھ پر کام کرنے کے درپے تھا، مگر ایک سکھ کے ہاتھوں جھٹکا ہونے کے مقابلے میں مجھے ایک سید کی چھری سے ذبح ہونا منظور ہے۔“

اس سے لوگ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ سید صاحب جس پر لکھتے ہیں، اسے ذبح کر ڈالتے ہیں۔ یہ بات نہیں، واقعہ یہ ہے کہ موضوع خود ہی راہِ فرار اختیار کر لیتا ہے۔ کنہیا لال کپور ہی کی مثال سامنے ہے۔ سید صاحب کا مضمون ابھی شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ کپور صاحب ختم ہوگئے۔ یہی کچھ افسانہ نگار غلام عباس کے ساتھ ہوا۔ سید صاحب نے ان پر ایک طویل مضمون لکھا۔ مضمون کی اشاعت سے پہلے ہی اُن کا انتقال ہو گیا۔ پچھلے سال سید صاحب نے میر کی فارسی شاعری پر ایک مضمون لکھا، جس پر انھیں دس ہزار روپے کا ایوارڈ ملا ہے۔ میر صاحب کو اس مضمون کے لکھے جانے کی پیشگی اطلاع ہوگی۔ اسی لیے تو وہ دو سو سال پہلے انتقال کر گئے۔

(۳۰ر اپریل ۱۹۸۴ء)

☆..........☆..........☆

تنقید یا طنزیہ اور مزاحیہ مضامین

ہندوستان کی ادبی صورت حال کے بارے میں ہماری معلومات واجبی سی ہیں۔ کبھی کوئی بھولا بھٹکا مہمان شاعر آ گیا یا کسٹم والوں کی نظر سے بچ بچا کر کوئی رسالہ مل گیا تو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہاں ادب کس حال میں ہے۔ مثلاً کنور مہندر سنگھ بیدی آتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے مطالبات منوانے کے لیے ایجی ٹیشن ہی نہیں کرتے، گاہ گاہ شاعری بھی فرماتے ہیں۔ سردار جعفری آتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہاں شاعری بھی آثار قدیمہ کے شعبے سے تعلق رکھتی ہے۔ ظ انصاری آتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں تحریر سے زیادہ تقریر کی آزادی ہے۔ اتنی زیادہ کہ تقریروں سے خواب آور دواؤں کا کام لیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ آتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کہ ہندوستان کے نقاد کتنے صاحب نظر ہیں۔ تقریر کے دوران ایک ہی نظر میں جان لیتے ہیں کہ حاضرین میں کون کون ادیب بیٹھا ہے اور پھر بیٹھے ہوئے ادیب کا نام لے کر اس کے کمالات کا ذکر کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نقاد تو تقریر کے بعد اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے، لیکن صاحبانِ کمال عمر بھر کے لیے چین سے نہ بیٹھنے کا تہیہ کر لیتے ہیں۔

کتابوں رسالوں کی صورت حال اس سے بھی خراب ہے۔ ہندوستانی فلمی رسالے تو خیر کراچی میں باقاعدہ فروخت ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں کہاں سے آتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے، دوبئی سے آتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے، کسٹم والے ضبط کر کے انھیں بازار میں پہنچا دیتے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ لیکن ادبی کتابیں اور رسالے خال خال ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ آنے جانے والوں کی مہربانی ہے کہ وہ تحفتاً لا دیتے ہیں۔ گزشتہ ہفتے ایک مہربان نے دو ہندوستانی کتابیں عاریتاً عنایت کیں۔ ایک ہے باقر مہدی کی ''اظہار'' اور دوسری یوسف ناظم کی ''ذکر خیر''۔ جی چاہتا ہے کہ ہم اپنے قارئین کو بھی شریک مطالعہ کریں۔

''اظہار'' دراصل ایک رسالہ ہے، جسے کتاب کے نام سے باقر مہدی شائع کرتے ہیں۔ پاکستان میں کتابی سلسلے اس لیے شائع ہوتے ہیں کہ رسالوں کے لیے ڈیکلریشن حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے

مترادف ہے۔ معلوم نہیں ہندوستان والوں کو کیا مشکل درپیش ہے کہ انھوں نے بھی کتابی سلسلوں کے نام پر رسالے جاری کر رکھے ہیں۔ شاید اس کا سبب یہ ہے کہ جن تحریروں کے لیے رسالوں میں گنجائش نہیں نکلتی، ان کے لیے کتابی سلسلے موزوں رہتے ہیں۔ ''اظہار'' کو دیکھ کر اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس میں محقق رشید حسن خاں اور شاعرہ کشور ناہید پر سو سو صفحات کے سیکشن ہیں۔ ظاہر ہے کہ بیک وقت اتنی تحقیق اور اتنی شاعری کے لیے کسی معقول رسالے میں جگہ نہیں نکل سکتی اور اگر نکل بھی آئے تو رسالے کا مستقبل خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

''اظہار'' کے مدیر باقر مہدی شاعر بھی ہیں اور نقاد بھی۔ شاعری وہ تنقید میں کرتے ہیں اور تنقید نظموں میں لکھتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے کشور ناہید پر ایک مضمون بھی لکھا ہے اور ایک نظم بھی۔ اول الذکر شاعری کی طرح شگفتہ ہے اور ثانی الذکر تنقید کی طرح ٹھوس اور ٹھس۔ باقر مہدی شاعر اور نقاد کے علاوہ ایڈیٹر بڑے اونچے درجے کے ہیں۔ جب وہ کوئی تحریر یا تخلیق اپنے پرچے میں چھاپنا نہیں چاہتے تو اس کے لیے ایک سے ایک عمدہ جواز تلاش کر لیتے ہیں۔ انھوں نے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر سلیم اختر اور مسعود اشعر سے ان کی تحریریں اشاعت کے لیے منگوائی تھیں، لیکن پھر کسی وجہ سے انھیں شائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اگر باقر مہدی ان لوگوں کی تحریریں واپس کر دیتے تو یہ لوگ نہ صرف ناراض ہوتے، بلکہ اپنی تحریروں کو کہیں اور چھپوا لیتے۔ دیکھیے باقر مہدی نے کتنی عمدگی سے ان دونوں مشکلوں پر قابو پایا۔ اداریے میں وہ لکھتے ہیں:

''دورانِ سفر میں تین غنڈوں نے مجھ سے خوبصورت ربن میں لپٹا ہوا پیکٹ قیمتی تحفہ سمجھ کر چھین لیا۔ اس پیکٹ میں پروفیسر نارنگ، ڈاکٹر سلیم اختر اور میرے مضامین اور مسعود اشعر کے افسانوں کے مسودے اور کتابت شدہ اوراق تھے۔ میں آہ کر کے رہ گیا۔ مجھے افسوس ہے کہ یہ تخلیقات شامل نہ ہو سکیں۔''

معلوم ہوتا ہے کہ غنڈے خاصے خوش ذوق تھے۔ انھوں نے باقر مہدی کے مضامین واپس کر دیے۔ جو کہ ''اظہار'' میں شامل ہیں۔ ۲۰۸ صفحات ضخیم رسالے کے تمام مندرجات کا ذکر کرنا تو ہمارے لیے ممکن نہیں، ہم چند خاص مضامین کے بارے میں کچھ عرض کرتے ہیں۔ مشہور محقق رشید حسن خان نے ترقی اردو بورڈ، کراچی کی شائع کردہ لغت کی جلد اول پر ایک طویل تبصرہ لکھا ہے۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:

''افسوس کی حد تک غلط اندیشی اور غلط نویسی کی شاید ہی کوئی ایسی مثال ہو، جو اس کتاب کے صفحات میں محفوظ نہ ہو۔ اور طرح طرح کی غلطیوں کی اس قدر بہتات ہے کہ آسانی اس کو مجموعۂ اغلاط کہا جا سکتا ہے۔ شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہوگا، جس میں چار چھ یا دس بارہ غلطیاں نہ ہوں۔ بلا شائبہ تکلف یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس لغت کے بیشتر اندراجات کسی نہ کسی

اعتبار سے گمراہ کن ہیں۔"

اپنے اس دعوے کے ثبوت میں رشید حسن خاں نے درجنوں نہیں، سیکڑوں غلطیاں گنوائی ہیں، جنھیں دیکھ کر خیال آتا ہے کہ اردو لغت بورڈ والوں نے اپنی لغت میں الفاظ سے زیادہ اغلاط جمع کرنے پر توجہ صرف کی ہے۔ لیکن رشید حسن خاں کا تبصرہ ہمیں پسند نہیں آیا۔ کسی غیر ملکی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ہمارے داخلی معاملات میں دخل دے۔ اگر ہماری لغت میں غلطیاں ہیں تو آپ کو اس سے کیا! زبان ہماری خراب ہوگی، آپ کی گرہ سے کیا جائے گا! خدا نے ہمیں اتنی توفیق دی ہے کہ اگر ہم بیس جلدوں میں لغت شائع کر سکتے ہیں تو چالیس جلدوں میں اس کا غلط نامہ بھی چھاپا جا سکتا ہے۔ ہندوستانی محقق کے تعصب کا اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے صرف پہلی جلد میں سیکڑوں غلطیاں نکال دی ہیں، اگر نہیں شائع شدہ باقی چار پانچ جلدیں بھی ان کی نظر سے گزر چکی تھیں تو خدا جانے وہ کیا کام کر جاتے۔

"اظہار" میں دو مضمون وارث علوی کے بھی ہیں۔ ایک ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں ہے اور دوسرا قرۃ العین حیدر کے ناول "آخر شب کے ہم سفر" کے متعلق۔ دونوں مضمونوں کا بنیادی وصف ان کی طوالت ہے۔ اس میدان میں ڈاکٹر عبادت بریلوی بھی امتیازی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن وہ تکرار سے طوالت پیدا کرتے ہیں، جب کہ علوی انحرافات سے یہ مہم سر کرتے ہیں۔ انھیں اگر قرۃ العین حیدر پر لکھنا ہوگا تو وہ پہلے جوش ملیح آبادی، انتظار حسین اور قاضی عبدالستار پر طبع آزمائی کریں گے اور جب قاری تھک جائے گا تو قرۃ العین حیدر کی باری آئے گی۔

علوی کی دوسری خوبی ان کا اسلوب ہے۔ ان کی شگفتہ بیانی اور شگفتہ نگاری سے باغ و بہار کا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ پڑھے لکھے آدمی ہیں، لیکن تنقید میں طنز و مزاح سے اس حد تک کام لیتے ہیں کہ ان کے سارے پڑھے لکھے پر پانی پھر جاتا ہے۔ مثلاً انھوں نے ڈاکٹر وزیر آغا پر جو مضمون لکھا ہے اس میں ایسا مزاحیہ انداز اختیار کیا ہے کہ قاری مزیدار اور سنسنی خیز قسم کے جملوں میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ مضمون کس موضوع پر ہے۔

بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ علوی موضوع پر لکھیں یا موضوع سے ہٹ کر، ان کی باتیں مزیدار ہوتی ہیں۔ وزیر آغا والے مضمون میں کہیں محققوں کا ذکر آ گیا تھا۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:۔۔۔۔۔۔۔

"تحقیق پڑھنا میں نے اس وقت سے بند کر دیا ہے، جب سے تحقیقی مقالوں کا کام یونیورسٹیوں میں محمد حسن، قمر رئیس، تخم چند نیر اور گوپی چند نارنگ وغیرہ ڈاکٹروں کی سرپرستی میں ہو رہا ہے، چنانچہ قاضی عبدالودود کے سامنے ایسا خاموش بیٹھا رہتا ہوں، گویا قاضی صاحب میرا نکاح پڑھا رہے ہوں۔ رشید حسن خاں کے سامنے اتنا مسکین صورت، گویا پٹھان کا سود پانچ سال سے ادا نہیں کیا۔۔۔۔۔۔"

طنز و مزاح کے ساتھ ساتھ علوی میں بے رحمی اور سفاکی کا عنصر بھی خاصا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ہمارے نام نہاد ثقہ نقادوں نے ہمارے عظیم ترین فن کاروں کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، اسے دیکھتے ہوئے تو ابھی میرا قلم بکری حلال کرنے والی چھری ہے۔ کلہاڑی چاہیے کلہاڑی کہ بیل کی کھوپڑیوں سے واسطہ پڑا ہے۔"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علوی نے قلم سے چھری کا کام لیا ہے، لیکن یہ کام بقرعید کے قصائیوں جیسا ہو کر رہا ہے۔ عجلت وہ "مذبوح" سے انصاف نہیں کر پاتے اور بعض اوقات تو اتنی عجلت میں ہوتے ہیں کہ ایک وقت کئی بکروں کی گردنوں پر ان کی چھری چلتی ہے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ وارث علوی کے خلاف اچھا خاصا محاذ قائم ہو چکا ہے۔

دو سال پہلے علوی کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ "تیسرے درجے کا مسافر" شائع ہوا تھا تو اس پر [illegible] کے رسالے "افکار" میں ایک دلچسپ تبصرہ لکھا گیا تھا۔ تبصرہ نگار نے اس قسم کی باتیں لکھی تھیں:

"وارث علوی ناقدین کے اس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، جو ہوائی تنقید کا عادی ہے۔ مغربی تنقید کی کتابوں سے اصول لے کر اردو پر مسلط کرنا یا نظریاتی بحث میں الجھے رہنا اور عملی تنقید کی بے صلاحیتی کو چھپانے کے لیے چھچھورے پن پر اتر آنا، ادب کی تفہیم کی معذوری کو ظاہر کرتا ہے۔"

اسی تبصرہ نگار نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ:

"وارث علوی پر کاغذ کے اس بڑی مقدار میں ضائع کرنے پر قومی ملکیت کے اتلاف کے اصول کے تحت مقدمہ چلایا جائے۔"

معلوم نہیں، اس تبصرے کی اشاعت کے بعد علوی پر مقدمہ چلایا گیا یا نہیں، البتہ یہ معلوم ہے کہ علوی نے لکھنے لکھانے کا شغل ترک نہیں کیا۔ وہ اب تین کتابوں کے مصنف بن چکے ہیں، جن میں سے ایک باقر مہدی کے نام معنون کی گئی ہے۔ اس کے جواب میں باقر مہدی نے "اظہار" کا زیر نظر شمارہ علوی کے نام معنون کیا ہے۔

"کیا خوب سودا نقد ہے۔"

وارث علوی کا تذکرہ ان کے مضامین کی طرح کچھ اتنا طویل ہو گیا ہے کہ یوسف ناظم کی کتاب [illegible] کے ذکر کی گنجائش نہیں نکل سکی۔ یہ کام ہم آئندہ پر اٹھا رکھتے ہیں۔

(۲۷ اپریل ۱۹۸۲ء)

☆۔۔۔۔۔۔☆۔۔۔۔۔۔☆

[illegible]

اعتراف میں انحراف ...... اقرار میں انکار

افسانہ نگار غلام عباس اس اعتبار سے خوش قسمت تھے کہ وہ جیسے ترقی پسند نقادوں اور پبلشروں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہے۔ سوائے حسن عسکری کے کسی نقاد نے ان پر کچھ نہیں لکھا، اور سوائے ایک آدھ کتاب کے اپنی تمام کتابیں غلام عباس نے خود چھاپیں۔ ان کا خیال تھا کہ پبلشرز مصنفین کی دنیا اور نقاد ان کی آخرت خراب کرتے ہیں .... لیکن غلام عباس کو کیا معلوم تھا کہ ان کی یہ ہوشیاری احتیاط ان کی زندگی تک ہے۔ ادھر ان کی آنکھیں بند ہوں گی اور ادھر نقادوں اور پبلشروں کی آنکھیں کھل جائیں گی۔

سنا ہے، آج کل ایک ادبی رسالے کے غلام عباس نمبر پر بڑی تیزی سے کام ہو رہا ہے۔ اس کے لیے پاک و ہند کے تمام اہم نقاد مضامین لکھ چکے ہیں یا لکھ رہے ہیں۔ جب یہ رسالہ شائع ہوگا تو اسی وقت اندازہ کیا جا سکے گا کہ نقادوں نے غلام عباس کو تختۂ مشق بنانے میں کیا کیا کمال دکھائے ہیں، لیکن پبلشروں نے اپنی جارحانہ کارروائیاں شروع کرنے میں دیر نہیں کی اور غلام عباس کے افسانوں کا ایک ایسا مجموعہ شائع کر دیا ہے، جو ان کی زندگی میں شائع ہوتا تو یہی ان کی موت کا سبب بن جاتا۔

غلام عباس نے اپنے تینوں افسانوی مجموعوں اور غیر مدوّن افسانوں کو ایک جلد میں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے خاصا کام بھی کر لیا تھا، لیکن موت نے انھیں اتنی مہلت نہ دی کہ یہ منصوبہ مکمل ہوتا۔ کراچی کے ایک ناشر کو غلام عباس کے اس منصوبے کا علم ہوا تو اس نے سوچا، کیوں نہ اس منافع بخش کام میں ہاتھ ڈالا جائے۔ "زندگی نقاب چہرے" کے نام سے جو مجموعہ شائع ہوا ہے، وہ اسی سوچ کا نتیجہ ہے۔

کتاب کا یہ نام خود ناشر نے تجویز کیا ہے اور کسی سے مشورہ نہیں کیا، حالاں کہ لوگ اپنے بچوں کے

نام رکھتے وقت بھی دوسروں سے مشورہ کر لیتے ہیں۔ یہ نام کسی اعتبار سے بھی غلام عباس کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتا۔ غلام عباس نے "آنندی"، "جاڑے کی چاندنی" اور "کن رس" جیسے خوبصورت ناموں سے اپنے مجموعے چھاپے تھے۔ نئے مجموعے کا نام ایسا ہے، جیسے کسی فلم یا ٹی وی ڈرامے کا نام ہو یا پھر یہ نام کسی ایسے شاعر کے مجموعہ کلام کے لیے موزوں ہو سکتا ہے، جسے ادب سے زیادہ ترقی پسندی عزیز ہو۔

دوسری حیرت ناک بات یہ ہے کہ یہ صراحت نہیں کی گئی کہ یہ مجموعہ غلام عباس کے تمام افسانوں پر مشتمل ہے یا ان کے افسانوں کا انتخاب۔ جس شخص کی نظر سے غلام عباس کے تمام افسانے گذرے ہیں، وہ ایک نظر میں جان سکتا ہے کہ صورت حال خاصی دگرگوں ہے۔ اس مجموعے میں "آنندی" اور "جاڑے کی چاندنی" کے سارے افسانے شامل ہیں۔ "کن رس" کے دو افسانے چھوڑ کر باقی تمام افسانوں کو شامل کیا گیا ہے۔ غلام عباس کے آخری زمانے کے پانچ افسانے ایسے ہیں، جو ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ "زندگی نقاب چہرے" میں، ان میں سے دو افسانے شامل کیے گئے ہیں۔ باقی تین افسانوں کے بارے میں تو کہا جا سکتا ہے کہ ناشر کو ان کا علم نہیں ہوگا، لیکن "کن رس" کے جن دو افسانوں کو نظر انداز کیا گیا ہے، ان کے بارے میں وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ناشر نے ایک خاص مقصد کے تحت ایسا کیا ہے۔ یہ دو افسانے (چک اور اوتار) غلام عباس کے بہترین افسانوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ "چک" کا موضوع یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اردو چھوڑنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ "اوتار" کا موضوع [illegible] بھارت میں مسلم کشی کا جنون ہے۔ کتاب کا ناشر، چونکہ بزعم خود "ترقی پسند" ہے اور سجاد [illegible] اسی قسم کے بھارتی ادیبوں کی کتابیں شائع کرنے میں خاص شہرت رکھتا ہے، اس لیے [illegible] ایسے افسانے ناقابل اشاعت ہیں، جن میں مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہو۔ یہ غلام عباس مرحوم کے ساتھ ایک ایسا سنگین مذاق ہے، جس کی داد وہی دے سکتے ہیں، جو پاکستان میں رہتے [illegible] نقطۂ نظر کی نمائندگی کرتے ہوں۔

اس کتاب میں ناشر نے یہ کمال بھی دکھایا ہے کہ غلام عباس اور ان کی تصانیف کے بارے میں کسی [illegible] معلومات فراہم نہیں کیں۔ فلیپ پر صرف یہ لکھا ہے .... "مرحوم غلام عباس کسی تعارف کے [illegible]۔ ان کی چابک دستی کا اعتراف فیض جیسے شاعر بھی کر چکے ہیں۔ ان کی حقیقت پسندی اور [illegible] کو اردو ادب کے تنقید نگاروں نے (پروفیسر ممتاز حسین وغیرہ) تسلیم کیا ہے۔ ان افسانوں [illegible] مزید کچھ کہنا غیر ضروری ہے۔" .... قطع نظر اس سے کہ ممتاز حسین کے نام کے ساتھ [illegible] اس طرح لکھا ہے، جیسے یہ ان کا تخلص ہو...... فیض اور ممتاز حسین نے غلام عباس کی چابک دستی

اور حقیقت پسندی کو تسلیم کر کے غلام عباس پر ہی نہیں اُردو ادب پر بھی بہت بڑا احسان فرمایا ہے۔ ان دونوں بزرگوں نے تو درجنوں ادیبوں کو ان کی چابک دستی اور حقیقت پسندی پر داد دی ہے، پھر ان ادیبوں میں اور غلام عباس میں فرق کیا ہوا؟

"زندگی نقاب چہرے" کی اشاعت سے پہلے غلام عباس یقیناً محتاجِ تعارف نہیں تھے، لیکن اب ان کی تصانیف سے "چک" اور "اوتار" کے خارج ہونے کے بعد تعارف کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اگر یہ فریضہ بھی فیض احمد فیض اور ممتاز حسین انجام دیں تو بہتر ہوگا۔

جس طرح پاکستان میں کالم نگاروں کی بہتات ہے کہ ہر وہ شخص، جو کچھ نہ کر سکتا ہو، کالم نگاری ضرور کرتا ہے، اسی طرح ہندوستان میں طنز و مزاح لکھنے والے اس کثرت سے ہیں کہ ہر دوسرا ادیب اپنی تحریروں سے نہیں تو عادات و اطوار سے طنز و مزاح نگار ضرور معلوم ہوتا ہے۔ طنز و مزاح کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ وہاں ہر شہر اور ہر قصبے میں طنز و مزاح سیمینار منعقد ہوتے ہیں، جن میں طویل مضامین پڑھے جاتے ہیں اور ان مضمونوں کے ہر جملے پر اس طرح داد ملتی ہے، جیسے سیمینار نہ ہوا سادات امروہہ کا مشاعرہ ہو..... ہمارے اس جملے سے غیر محتاط لوگ یہ نتیجہ نہ نکالیں کہ سادات امروہہ کے مشاعرے کو طنز و مزاح سیمینار سمجھا جا سکتا ہے۔ سیمینار میں بہر حال کچھ کام کی باتیں بھی ہوتی ہیں۔

ہندوستان کے مقبول ترین طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین اور یوسف ناظم ہیں۔ مجتبیٰ حسین سے ہمیں شکایت ہے کہ انھوں نے ہمارے ایک بڑے نقاد کا نام چوری کر رکھا ہے، جس کے نتیجے میں اس نقاد کی سنجیدہ تصانیف کو ہندوستان میں طنزیہ و مزاحیہ تصانیف سمجھ کر پڑھا جاتا ہے۔ جوابی کارروائی کے طور پر ہم نے بھی ہندوستانی مجتبیٰ حسین کی کتابوں کو تنقیدی کتابیں سمجھ کر پڑھا۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر وہ ذرا اور توجہ سے لکھیں تو ہمارے مجتبیٰ حسین کی طرح کامیاب نقاد بن سکتے ہیں۔

یوسف ناظم کثیر التصانیف مصنف ہیں۔ کثیر العیال لوگ اپنے لیے اور کثیر التصانیف مصنف دوسروں کے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں، لیکن یوسف ناظم اس کلیے سے مستثنیٰ ہیں۔ وہ جتنی تیزی سے کتابیں لکھ رہے ہیں، اتنی ہی تیزی سے اُن کی مقبولیت کا حلقہ وسیع ہو رہا ہے اور وہ دن دور نہیں، جب ان کی تصانیف کی تعداد اتنی زیادہ ہو جائے گی کہ انھیں طنز و مزاح کا تیرتھ رام فیروز پوری تسلیم کر لیا جائے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ اس اعزاز پر یوسف ناظم خوش ہوں گے، تیرتھ رام فیروز پوری کے ناخوش ہونے کا سوال پیدا نہیں ہوتا، کیوں کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

پچھلے دنوں یوسف ناظم کی تازہ کتاب "ذکر خیر" پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ یہ شخصی خاکوں کا مجموعہ ہے۔ اس قسم کی ایک کتاب "سائے اور ہم سائے" کے نام سے وہ پہلے بھی لکھ چکے ہیں، جس کی وجہ سے انھیں

کافی پریشانی اٹھانی پڑی تھی۔ اس کتاب میں جن لوگوں کے شخصی خاکے تھے، اُن میں سے بعض نے ازالۂ حیثیت عرفی کے مقدمے کی دھمکی دی تھی۔ وہ تو یہ کہیے کہ اس قسم کا مقدمہ دائر کرنے سے پہلے حیثیت عرفی کا تعین کرنا پڑتا ہے، اس لیے یوسف ناظم مقدمہ بازی سے بچ گئے، تاہم یہ نقصان اٹھانا پڑا کہ کئی دوست ہمیشہ کے لیے ناراض ہو گئے۔ عام طور پر مصنفین قارئین سے تعلقات خراب کرنے کے لیے کتابیں لکھتے ہیں، لیکن یوسف ناظم عجیب آدمی ہیں کہ کتابیں لکھ کر دوستوں سے تعلقات خراب کر لیتے ہیں۔

"ذکر خیر" بھی کچھ اسی قسم کی کتاب ہے۔ اس میں کئی ممتاز ادیبوں کی قلمی تصویریں ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، سکندر علی واجد، مجروح سلطان پوری اور ظ انصاری کے شخصی خاکے نہایت دلچسپ ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے ہم ان ادیبوں سے براہ راست ملاقات کر رہے ہوں۔ خصوصاً ظ انصاری کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اسے پڑھ کر تو ظ انصاری کے ساتھ ساتھ خود یوسف ناظم سے بھی ملاقات ہو جاتی ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ یہ پورا خاکہ یہاں نقل کر دیا جائے، لیکن ہمارا کالم نیوز پرنٹ پر چھپتا ہے اور اور یہ خاکہ بڑا اکثر ور کا غذ ہوتا ہے، اس میں زیادہ بوجھ اٹھانے کی سکت نہیں ہوتی، اس لیے اس خاکے کے چند اقتباسات پر قناعت کی جاتی ہے۔

"لذت تحریر اور قدرت تحریر کی یکجائی کی بدولت ظ انصاری دو آتشہ بن گئے ہیں۔ اس پر ان کا مزاج۔ وہ ہمیشہ آتش زیر پا رہے ہیں۔ تقریری حادثوں نے تقریر کا اتنا خوگر بنا دیا ہے کہ وہ کہیں بھی بیٹھیں، یہ سمجھتے ہیں، ڈائس پر بیٹھے ہیں۔ جس طرح غالب خلوت کو انجمن سمجھتے تھے، غالب شناس ظ انصاری بھی دو آدمیوں کے ایک جگہ جمع ہو جانے کو مجمع سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی تقریر کے لیے تیسرے آدمی کا انتظار نہیں کرتے۔"

"ظ انصاری کے ہاں منفی اور مثبت خوبیوں کا عجیب و غریب امتزاج ہے۔ ان کی انکساری میں تعلی، اعتراف میں انحراف، اقرار میں انکار، سید ھے پن میں ٹیڑھ اور بزرگی میں بال پن ہے .... وہ ہر بات کچھ ایسے ڈھب، ڈھنگ اور ٹھاٹ سے کہتے ہیں کہ وہ سچ معلوم ہونے لگتی ہے۔ یہ ساحری انداز گفتگو برسوں کی ریاضت کا پھل ہے۔ اور ہر پھل کا میٹھا ہونا ضروری نہیں۔"

"ظ انصاری تقریر کرتے وقت ہر لفظ کو پہلے تولتے اور پھر بولتے ہیں۔ وہ تولنا بھول سکتے ہیں، لیکن بولنا نہیں بھول سکتے۔"

"بہت زیادہ پڑھے لکھے لوگوں میں یہ وصف ہوتا ہے کہ وہ کسی مضر شے سے پرہیز کریں نہ کریں، عام آدمی بننے سے ضرور پرہیز کرتے ہیں۔ جو شخص ۲۴ گھنٹے ادیب، شاعر، نقاد بنا

رہے گا، وہ آدمی کب بنے گا۔ لیکن ظ انصاری ہفتے میں ایک آدھ گھنٹہ آدمی بننے میں تکلف محسوس نہیں کرتے۔ میں اسی ایک آدھ گھنٹے میں ان سے مل لیا کرتا ہوں۔ اپنی عافیت کے عزیز نہیں ہوتی۔

"بعض شرارت پسند لوگ کہتے ہیں: ظ انصاری میں بناوٹ بہت ہے۔ میں اسے نہیں مانتا۔ جو چیز نہ صرف رگوں میں دوڑنے لگے، بلکہ آنکھوں سے بھی ٹپکنے لگے، وہ بناوٹ کیسے ہوئی؟ ہاں اگر اس بناوٹ سے لوگوں کی مراد کپڑے کی بناوٹ ہے تو ٹھیک ہے۔ کپڑے کی بناوٹ تو کپڑے کا وصف اور حصہ ہوتی ہے، جس کے بغیر کپڑا صرف کپاس رہتا ہے اور ظ انصاری تو مکمل لباس ہیں۔"

(۱۳ رمئی ۱۹۸۳ء)

☆......☆......☆

سرگودھا میں انشائیہ پر سواری

سید ضمیر جعفری اور کرنل محمد خان نے اپنی خوبصورت تحریروں کی صورت میں اردو ادب کو بہت کچھ دیا [illegible] جعفری صاحب کو یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ وہ نثر کے ساتھ ساتھ شاعری بھی فرماتے ہیں۔ کرنل [illegible] کی امتیازی حیثیت کا سبب بھی شاعری ہے۔ یعنی یہ کہ وہ شاعری نہیں فرماتے۔ خدا اپنے بندوں پر [illegible] طریقوں سے کرم کرتا ہے۔ کبھی شاعر بنا کر اور کبھی شاعر نہ بنا کر۔ یہ دوسری بات ہے کہ کرنل [illegible] کے بعض جملے لوگوں کو شعروں کی طرح یاد ہو جاتے ہیں، لیکن اس کی ذمہ داری کرنل صاحب پر [illegible] لوگوں کے حافظے پر ہے کہ حافظہ بعض اوقات دھوکا بھی دے جاتا ہے اور نثر کو نظم سمجھ لیتا ہے۔

جعفری صاحب اور کرنل صاحب کا ایک مشترک کمال یہ بھی ہے کہ وہ نہ صرف خود فکاہی ادب لکھتے [illegible] دوسروں کو بھی لکھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ گویا:

ہم تو ڈوبے ہیں صنم، تم کو بھی لے ڈوبیں گے

[illegible] عمل کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے "اردو پنچ" کے نام سے ایک رسالہ جاری کر رکھا [illegible] جس کے اب تک ۶ شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ چھٹا ابھی کچھ دن پہلے منظر عام پر آیا ہے، اور یہی [illegible] آج کے کالم کا موضوع ہے۔ اس پرچے ہمارا ارادہ محسن بھوپالی اور حمایت علی شاعر کے جھگڑے پر [illegible] جو لاہور کے روزنامہ "کلیم" میں قسط وار شائع ہوتا رہا ہے۔ جب ہم کالم لکھنے بیٹھے تو معلوم ہوا کہ یہ [illegible] گم ہو گئی ہیں۔ محسن بھوپالی اور حمایت علی شاعر سے گزارش ہے کہ وہ اس سلسلے کے اپنے شائع [illegible] کی مصدقہ نقول ہمیں بھجوا دیں، تا کہ ان دونوں کے جھگڑے کو کلیم سے اردو پنچ میں منتقل کر کے [illegible] صلح کرا دی جائے۔ ہمارا صلح کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ ہم کمزور فریق کا ساتھ دیتے ہیں۔ "کلیم" [illegible] مراسلات کو دیکھ کر ہی ہم فیصلہ کر سکتے ہیں کہ دونوں میں کمزور کون ہے [illegible] کہ [illegible] کمزور ہونے کا معاملہ در پیش نہیں، ورنہ ہم دونوں شاعروں کے دیوان دیکھ لیتے، اور اگر

اس طرح کام نہ نکلا تو قرعہ اندازی کر لیجئے۔)

ہاں تو اس وقت "اردو پنچ" کا چھٹا شمارہ ہمارے سامنے ہے، جس کے سرورق پر سید ضمیر جعفری اور کرنل محمد خان کے ناموں کے ساتھ سلطان رشک اور ڈاکٹر صفدر محمود کے نام بھی بطور مدیران گرامی درج ہیں۔ اول الذکر دونوں نے رسالے کو اپنے قلمی تعاون سے نوازا ہے، یعنی ایک ایک مضمون بھی لکھا ہے۔ سلطان رشک نے صرف اتنی زحمت کی ہے کہ اپنی تصویر چھاپ کر ایڈیٹری کا حق ادا کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صفدر محمود نے اتنا بھی نہیں کیا۔ سرورق پر صرف نام کے چھپ جانے کو کافی سمجھا ہے۔ لیکن ایڈیٹروں کا اصل کمال مضامین کے انتخاب میں نظر آتا ہے۔ چند مضامین تو نہایت عمدہ ہیں، خصوصاً مشتاق احمد یوسفی کا مضمون "حویلی" طنز و مزاح کا بہترین نمونہ ہے، لیکن یہ مضمون صرف طنز و مزاح ہی نہیں، اور بہت کچھ بھی ہے۔ یوسفی صاحب نے ایک مخصوص کردار کے ذریعے ماضی کے بعض فراموش شدہ مناظر کی از سر نو تشکیل اس طرح کی ہے کہ ان کے مشاہدے کی گہرائی اور گیرائی پر حیرت ہوتی ہے۔ اس مضمون میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یوسفی صاحب نے اردو کے بہت سے خوابیدہ الفاظ کو استعمال کر کے انھیں نئی زندگی دی ہے۔ افسوس کہ راءِٹرز گلڈ کے اراکین لغت کی مدد کے بغیر اس مضمون سے محظوظ نہیں ہو سکتے۔

یہ مضمون ایک اخبار میں قسط وار شائع ہو چکا ہے، لیکن ہم نے اسے نہیں پڑھا تھا، کہ قسط وار مضمون کے پڑھنے سے مضمون اور قاری دونوں ضائع ہو جاتے ہیں۔ اب "اردو پنچ" میں اسے مکمل پڑھ کر خوشی ہوئی کہ یوسفی صاحب کا فن ابھی تک ترقی کے مراحل طے کر رہا ہے، حالانکہ اصولاً تین کتابوں کے مصنف بن جانے کے بعد انھیں بعض مشہور لکھنے والوں کی طرح تھک جانا چاہیے تھا۔

تھک جانے کے ذکر پر ہمیں ایک زود نویس ادیب کا لطیفہ یاد آ گیا۔ ان سے کسی نے پوچھا "آپ اتنا لکھتے ہیں، کیا کبھی تھکتے نہیں؟" انھوں نے فرمایا۔ "یہ کام میرے پڑھنے والے کرتے ہیں۔"

یوسفی صاحب نے "زرگزشت" کے بعد کچھ نہیں لکھا تھا۔ وہ ایک عرصے تک خاموش رہے اور انھوں نے اس خاموشی کی تلافی "حویلی" سے کی ہے۔ اگر یوسفی صاحب ہر پانچویں سال اس قسم کا مضمون لکھنے کا وعدہ کریں تو ہمیں ان کے خاموش یا منقار زیر پر رہنے پر اعتراض نہیں۔ کیا ہی اچھا ہو، اگر وہ دوسروں کو بھی اس قسم کا وعدہ کرنے پر آمادہ کریں۔ جب صحافت میں ضابطۂ اخلاق ہو سکتا ہے تو طنز و مزاح میں کیوں نہیں ہو سکتا؟ خدانخواستہ ہمارا اشارہ محمد خالد اختر کی طرف نہیں ہے۔ وہ واحد طنز و مزاح نگار ہیں کہ اگر زیادہ نہ لکھیں تو ان کے طنز و مزاح نگار ہونے کا علم نہیں ہو سکتا۔ ہم ان کے زیادہ لکھنے کو تھوڑا اس لیے جانتے ہیں کہ ان کے ہر دسویں مضمون میں خوش مذاقی کی کچھ باتیں ضرور ہوتی ہیں۔ اس دسویں مضمون کی خاطر ان کے باقی نو مضامین بھی ہم بہ رضا و رغبت پڑھ جاتے ہیں۔

کرنل محمد خان نے ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے، لیکن اس پر نام انھوں نے کسی غیر ملکی ادیب کا دیا

ہے۔ ابن انشا بھی یہی کیا کرتے تھے۔ جب انھیں اپنی کوئی طبع زاد نظم پسند نہیں آتی تھی تو اس پر یہ لکھ دیتے کہ چینی سے ترجمہ کی گئی ہے۔ ان کی اس قسم کی شاعری کا مجموعہ "چینی نظمیں" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ممکن ہے کرنل صاحب بھی اپنے اس قسم کے مضامین کا ایک الگ مجموعہ شائع کریں۔

ایک مضمون ڈاکٹر انور سدید نے "رکشا کی سواری" کے عنوان سے لکھا ہے۔ مضمون بہت مزے کا ہے، لیکن علامتی معلوم ہوتا ہے۔ رکشا سے مراد شاید انشائیہ ہے۔ اگر ان معنوں کو ذہن میں رکھ کر مضمون پڑھا جائے تو اس کی دلچسپی اور بڑھ جاتی ہے، کیونکہ سرگودھا والے زیادہ تر انشائیہ پر ہی سواری کرتے ہیں، یا انشائیہ ان پر سوار رہتا ہے۔

"اردو پنچ" والوں نے مزاحیہ شاعری کا بھی خاصا اہتمام کیا ہے۔ قتیل شفائی اور فارغ بخاری جیسے سنجیدہ شاعروں سے مزاحیہ اشعار لکھوائے ہیں، حالانکہ ان سے بطور خاص کچھ لکھوانے کی ضرورت نہیں تھی۔ جو کچھ اب تک ان کے نام سے چھپ چکا ہے، اسی کا انتخاب شائع کیا جا سکتا تھا۔ بہر حال قتیل شفائی کے قطعات ہمیں بہت پسند آئے۔ ہمارا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آیندہ انھیں اسی قسم کی شاعری کرنا چاہیے، کیوں کہ اب ہمارے ملک میں فلمی شاعری کا مستقبل خطرے میں ہے۔ قتیل صاحب کا ایک قطعہ ملاحظہ کیجیے:

مرے رہبر! یہ کب تجھ سے کہا ہے
کہ تو منزل مری نزدیک کر دے
ولی اس دور کا مانوں گا تجھ کو
جو رکشاؤں کے میٹر ٹھیک کر دے

ایک میٹر شاعری کا بھی ہوتا ہے، جسے عروض کہتے ہیں۔ نثری نظم والوں کے پاس سرے سے ہی یہ نہیں ہے۔ کیا ہی اچھا ہو، اگر قتیل شفائی اس موضوع پر بھی ایک قطعہ لکھ دیں، کیوں کہ شاعری ہو یا رکشا، دونوں میں میٹر کا ہونا ضروری ہے۔ خواہ وہ قتیل صاحب کی حالیہ شاعری کے میٹر کی طرح خراب ہی کیوں نہ ہو۔

قتیل صاحب کے ذکر پر مرزا ظفر الحسن کا یاد آ جانا لازمی ہے، بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اب قتیل صاحب اپنی شاعری سے نہیں، مرزا صاحب کے حوالے سے ہی پہچانے جاتے ہیں۔ "اردو پنچ" میں ایک نظم مرزا صاحب کے بارے میں بھی ہے۔ یہ نظم خسروی صاحب کی ہے، جس میں انھوں نے غالب سے مرزا صاحب کا ذکر کیا ہے۔ غالب مرزا ظفر الحسن کی شکایت ان الفاظ میں کرتے ہیں:

اس بڑھاپے میں مگر یہ دن دکھایا ہے مجھے
ایک مرزا نے تماشا یوں بنایا ہے مجھے

اک کتب خانہ ہے میرے نام پہ کھولا ہوا
مجھ کو بھی رسوا کیا اور آپ بھی رسوا ہوا
فیض کے فیض جنوں نے کر دیا اس کو خراب
تھا بھلا چنگا نجانے کیا اسے سودا ہوا

شاعری تو خیر جیسی ہے، ویسی ہے لیکن شکایت بے بنیاد ہے۔ مرزا صاحب کو فیض نے خراب نہیں کیا، بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ بہرحال حضرت شاعر سے گزارش ہے کہ مرزا صاحب سے اتنی بے تکلفی بعض پیچیدگیوں کا باعث بن سکتی ہے۔ مرزا صاحب آج کل اپنی سوانح عمری لکھ رہے ہیں۔ اگر انھوں نے ان شعروں کو اپنی تعریف سمجھ کر سوانح عمری میں شامل کر لیا تو کون ذمہ دار ہوگا؟

''اردو پنچ'' کے آخری حصے میں قارئین کے خطوط ہیں۔ ایک خط شاعر جمیل یوسف کا بھی ہے، جس میں انھوں نے منظور حسین یاد کے ایک خط پر ناراضگی کا اظہار کیا ہے، جو ''اردو پنچ'' کے کسی پچھلے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس خط میں یاد صاحب نے بعض اہل قلم کا تمسخر آمیز لہجے میں ذکر کیا تھا اور ''اردو پنچ'' کو محض اس بنا پر پسند کیا تھا کہ اس میں ان کی تحریریں شائع ہوتی ہیں۔ حیرت ہے کہ جمیل یوسف نے یاد صاحب کا صرف ایک خط پڑھ کر برسر عام ناراضگی کا اظہار کر دیا، حالانکہ ہم نے یاد صاحب کے درجنوں مضامین پڑھے ہیں اور کبھی اپنی ناراضگی ظاہر نہیں کی۔

''اردو پنچ'' میں بھرتی کے مضامین بھی خاصے ہیں۔ مدیروں کے لیے صرف معیار ہی کو نہیں، ضخامت کو بھی برقرار رکھنا ایک اہم مسئلہ ہوتا ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ ''اردو پنچ'' کے مدیران گرامی نے ضخامت کے مسئلے کو خوش اسلوبی سے حل کیا ہے۔ اور ایسے مضامین بھی شامل کیے ہیں، جنھیں صرف ان کے مصنف ہی شوق سے پڑھ سکتے ہیں۔ اس طرح ان مصنفوں کو لکھنے کے ساتھ ساتھ پڑھنے کی بھی مشق ہو جائے گی۔

(۱۱ رمئی ۱۹۸۴ء)

☆..........☆..........☆

شعرا سامعین کے ہاتھوں لٹ گئے

مصحفی کا شمار اردو کے بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ بقول خود، دلی کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے دلی سے اپنے تعلق کو بڑے فخر کے ساتھ بیان کیا ہے۔ مثلاً:

دلی کہیں ہیں جس کو زمانے میں مصحفی!
میں رہنے والا ہوں اسی اجڑے دیار کا
اب تو میں دلی سے کوسوں دور ہوں، اے مصحفی!
رہنے والا تھا کبھی اس کشورِ معمور کا

اس صورتِ حال کے باوجود مصحفی کو امروہے سے اور امروہے کو مصحفی سے پہچانا گیا۔ اس کا سبب شاید یہ ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' میں مصحفی کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''مطلب تو بہت خوبی اور خوش اسلوبی سے ادا کرتے ہیں، مگر کیا کریں کہ امروہہ پن نہیں جاتا۔''

اب نہ امروہہ رہا، نہ مصحفی ہوتے رہے کے سادات امروہہ رہ گئے ہیں۔ خدا انھیں خوش رکھے کہ اور کچھ کریں یا نہ کریں، سال کے سال ایک مشاعرہ کر کے کراچی کی کاروباری زندگی میں ادبی ہلچل پیدا کرتے رہتے ہیں۔

اب کے بھی سادات امروہہ کا مشاعرہ بہت دھوم دھڑکے سے ہوا۔ ہندوستان سے اختر الایمان، علی سردار جعفری، کنور مہندر سنگھ بیدی، کیفی اعظمی، ندا فاضلی اور ڈاکٹر شہریار آئے۔ لاہور اور مضافات لاہور سے کشور ناہید، قتیل شفائی، حبیب جالب اور منیر نیازی وغیرہ کو بلوایا گیا۔ کراچی کے خاص خاص شاعروں کو پڑھنے کا تو نہیں، کم از کم سننے کا ضرور موقع دیا گیا۔ کراچی والوں میں سے حالی صاحب نے مشاعرہ لوٹا اور باقی سب شعرا سامعین کے ہاتھوں لٹ گئے۔ اب کے ہوٹنگ بہت زوروں پر رہی۔ سامعین شور مچا کر

اور شعرا کلام سنا کر ایک دوسرے کو ہوٹ کرتے رہے۔

مشاعرے میں جدید نسل کے شعرا کی بھی نمایندگی اچھی خاصی تھی۔ کراچی کے پیرزادہ قاسم اور جاذب قریشی اتنے ہی کامیاب رہے، جتنے وہ مشاعروں سے باہر سمجھے جاتے ہیں۔ لاہور سے جو نوجوان شعرا آئے، ان میں حسن رضوی اور سعادت سعید بھی تھے۔ حسن رضوی کا آنا تو سمجھ میں آتا ہے کہ ان کا تعلق سادات امروہہ کی لاہور شاخ سے ہے، لیکن سعادت سعید کی تشریف آوری کا سبب نہ کھلا۔ وہ اپنے خرچ پر لاہور سے آئے اور اپنی ذمہ داری پر کلام سنا کر چلے گئے۔

اہل کراچی کو شکوہ ہے کہ بہت سے اہم شاعروں کو منتظمین نے مدعو نہیں کیا۔ مثلاً .... اب نام کیا لکھیں کہ کراچی میں ہزاروں شاعر ہیں اور ہر شاعر دوسروں کی نظر میں نہ سہی، اپنی نظر میں بڑی اہمیت رکھتا ہے، لیکن ہمارا خیال ہے کہ وہ شعرا خوش قسمت ہیں، جنھیں اس مشاعرے میں کلام سنانے کا موقع نہیں ملا۔ شاید ہی کوئی شاعر ہوگا، جس سے وہ سلوک نہ کیا گیا ہو، جو خود شعرا کے کرام اپنے فرضی محبوب سے کرتے رہتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ قتیل شفائی جیسے محترم شاعر کو بھی نہیں بخشا گیا۔ وہ جب کلام سنانے آئے تو سامعین نے تالیاں بجا کر اور نعرے لگا کر ان کا استقبال کیا اور اس وقت تک مسلسل تالیاں بجاتے رہے اور نعرے لگاتے رہے، جب تک کہ قتیل شفائی رخصت نہ ہو گئے۔ قتیل صاحب بزرگ شاعروں میں شمار ہوتے ہیں، ان کے ساتھ ایسی بے تکلفی مناسب نہ تھی۔ اگر ایسا سلوک ہمارے ساتھ ہوتا تو ہم آیندہ کے لیے مشاعروں میں شرکت ہی سے نہیں، شاعری سے بھی توبہ کر لیتے۔ افسوس کہ ہم شاعر نہیں ہیں، اس لیے یہ کام قتیل صاحب کو خود ہی انجام دینا چاہیے۔

ہندوستانی شاعر ندا فاضلی کو جب کسی شعر پر داد نہیں ملتی تھی تو وہ سامعین کو مخاطب کر کے کہتے تھے۔ 'میرے شعروں پر شاعر داد نہیں دیں گے۔' جب وہ کلام سنا چکے تو محسن بھوپالی نے ان سے شکایت کی۔ "میں تو آپ کو مسلسل داد دیتا رہا، لیکن جب میں کلام پڑھ رہا تھا تو آپ نے مجھے داد نہیں دی۔" ندا فاضلی نے جواب دیا۔ "جب آپ کلام سنا رہے تھے تو میں ہوٹنگ کرنے والوں کو مسلسل داد دے رہا تھا کہ کیسے خوش ذوق لوگ ہیں۔"

خوشی کی بات ہے کہ ہمارے کرم فرما منظر علی خان منظر نے بھی مشاعرے میں شرکت کی، شاعر کی حیثیت سے نہیں، بطور سامع کے۔ منظر صاحب مشاعروں میں شاعر کی حیثیت سے کامیاب ہوں نہ ہوں، سامع کی حیثیت سے کامیاب رہتے ہیں۔ جہاں کہیں کسی نے بے مزہ شعر پڑھنے شروع کیے، وہ اپنے کان سے آلۂ سماعت نکال لیتے ہیں۔ منظر صاحب سے ہم نے اس مشاعرے کے بارے میں ان کے تاثرات پوچھے تو انھوں نے فرمایا۔ "اگر اس مشاعرے میں میں آلۂ سماعت کے بغیر بھی جاتا تو کوئی فرق نہ پڑتا۔"

بہر حال سادات امروہہ کے مشاعرے کا یہ فائدہ ہوا کہ ہندوستانی مہمانوں کی وجہ سے شہر کی رونق بڑھ گئی۔ اس مشاعرے کے دوسرے روز سکھر میں بھی ایک مشاعرہ تھا۔ اس کے لیے ہندوستان سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر بشیر بدر آئے۔ اس طرح پہلے سے موجود مہمانوں میں دو کا اضافہ ہو گیا۔

بعض لوگوں کو اس پر حیرت ہے کہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ تو پڑھے لکھے آدمی ہیں، ان کا مشاعروں سے کیا تعلق۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ڈاکٹر صاحب مشاعروں میں شعر سنانے نہیں جاتے، مہمان خصوصی بن کر جاتے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مشاعروں میں بیٹھ کر وہ شعر سنتے بھی نہیں۔ بس آنکھیں بند کر لیتے ہیں اور پھر انھیں یاد نہیں رہتا کہ وہ کہاں ہیں۔ پچھلے سال ایک مشاعرے میں جگن ناتھ آزاد کلام سنا رہے تھے اور ڈاکٹر نارنگ مسند صدارت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے، آنکھیں موندے، کسی اور عالم میں پہنچے ہوئے تھے۔ آزاد نے یہ حالت دیکھی تو انھیں مخاطب کر کے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب! میرے شعر سن کر تو مردے بھی جاگ پڑتے ہیں اور آپ ہیں کہ مسلسل سوئے جا رہے ہیں۔" ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔ "تو پھر آپ اپنے شعر انھیں سنایا کیجیے، زندوں کی نیند کیوں خراب کرتے ہو۔"

ڈاکٹر نارنگ کے اعزاز میں کئی تقریبات منعقد ہوئیں۔ انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام انھوں نے "اسلوبیات میر" پر توسیعی خطبہ دیا۔ توسیعی ان معنوں میں کہ خطبہ خاصا وسیع و طویل تھا۔ طوالت کی ذمہ داری ڈاکٹر صاحب پر نہیں، میر تقی میر پر ہے کہ جن کی کلیات کی ضخامت ایک ہزار صفحے سے زیادہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اگر ایک صفحے سے ایک شعر بھی انتخاب کیا ہو تو آپ اندازہ کر لیجیے کہ انھوں نے کتنے شعر پڑھے ہوں گے۔

ڈاکٹر صاحب کے خطبے کے بعد حاضرین سے کہا گیا کہ وہ اگر کوئی سوال کرنا چاہیں تو کریں۔ مرزا ظفر الحسن اگلی نشستوں پر بیٹھے تھے، کہنے لگے۔ "اپنے پاس سوال تو نہیں دست سوال ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب اپنے خطبے کا مسودہ عنایت کر دیں تو ہم اُسے غالب لائبریری میں محفوظ کر دیں گے۔" اس پر ایک صاحب نے کہا۔ "غالب لائبریری میں جب کلیات میر موجود ہے تو پھر اس خطبے کی کیا ضرورت ہے۔"

حاضرین میں سے جب کسی نے جرأت سوال نہ کی تو ڈاکٹر حنیف فوق جوش میں آ گئے۔ انھوں نے ایک طویل تقریر سے حاضرین کو محظوظ کیا اور پھر حاضرین ہی کے اصرار پر تقریر ختم کی۔ اختر الایمان بھی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے ڈاکٹر فوق کو مخاطب کر کے کہا۔ "سوال مختصر ہونا چاہیے، طویل تقریر نہیں ہونی چاہیے۔" ڈاکٹر فوق نے جواب دیا۔ "میں آپ کی رائے سے متفق ہوں۔ میری تقریر کے بارے میں اگر کوئی صاحب سوال کریں تو وہ مختصر ہونا چاہیے، تاکہ جواب کے لیے مجھے کچھ وقت مل سکے۔"

اختر الایمان اور ڈاکٹر نارنگ کے اعزاز میں ایک تقریب غالب لائبریری میں بھی ہوئی۔ اختر الایمان نے بہت سی خوبصورت نظمیں سنائیں اور ڈاکٹر صاحب نے علامتی افسانے پر تقریر کی۔ اختر الایمان آج کل دونوں میں مقبول ہیں۔ مشاعروں میں مجبوراً شرکت کرتے ہیں، لیکن جب سننے والے چند ہوں

اور باذوق ہوں تو وہ کلام سنا کر خود بھی خوش ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی خوش کرتے ہیں۔ مشاعروں سے اجتناب کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ مشاعروں میں ہر شخص سخن فہم نہیں ہوتا، بلکہ اکثر اوقات "غلط فہم" قسم کے لوگ زیادہ ہوتے ہیں۔ انھوں نے ایک واقعہ سنایا کہ ایک مرتبہ ایک فلم کی شوٹنگ کے دوران کھانے کے بعد دلیپ کمار نے ان سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ محفل میں ایک انجینئر بھی موجود تھے۔ انھوں نے کلام سننے کے بعد اختر صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ تو بہت اچھے قوال ہیں۔"

خدا کرے ہمارا یہ کالم کسی قوال کی نظر سے نہ گزرے، ورنہ وہ برا مان جائے گا کہ کسی شاعر کو قوال کیوں کہا گیا۔

ڈاکٹر نارنگ نے علامتی افسانے پر بہت عمدہ تقریر کی۔ اس موضوع پر ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ پاکستان کے افسانہ نگاروں کے بارے میں بھی ان کی معلومات پاکستانی نقادوں سے زیادہ ہیں، لیکن اب کے انھوں نے اپنی روایت کے برعکس تقریر میں کئی ایسے افسانہ نگاروں کے نام لیے، جو تقریب میں موجود نہیں تھے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ اس کی ذمہ داری ڈاکٹر نارنگ پر نہیں، غالب لائبریری والوں پر ہے۔ ورود برگردن روای، تقریر سے پہلے ڈاکٹر صاحب نے فرمائش کی تھی کہ ایسے افسانہ نگاروں کی فہرست دی جائے، جو تقریب میں موجود ہوں گے۔ غالب لائبریری والوں نے فہرست بنا دی۔ اتفاق سے ان میں کوئی نہ آیا اور ان کی جگہ علی حیدر ملک، امراؤ طارق، فردوس حیدر اور سلطان جمیل نسیم آ گئے۔

بعد میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اپنی تقریر میں پہلے تین افسانہ نگاروں کے موجود ہونے کا ذکر کیا اور ڈاکٹر نارنگ نے ایک کاغذ پر ان تینوں کے نام لکھ لیے۔ سلطان جمیل چوں کہ بہت پیچھے بیٹھے تھے، اس لیے وہ ڈاکٹر فرمان کو نظر نہ آئے۔ اگر ڈاکٹر نارنگ کی نظر سے یہ کالم گزرے تو ان سے گزارش ہے کہ وہ سفرنامہ پاکستان لکھیں تو افسانہ نگاروں کی فہرست میں سلطان جمیل کا نام ضرور شامل کر لیں۔ سلطان جمیل کا ذکر ہم نے بطور خاص اس لیے کیا ہے کہ ان کے افسانوں کی کتاب آنے والی ہے۔ کتاب کے آنے سے پہلے مصنف کی اگر تھوڑی بہت تشہیر ہو جائے تو اچھا ہے، لہٰذا مذکورہ واقعے کو اسی تشہیری مہم کا حصہ سمجھا جائے۔

ڈاکٹر فرمان صاحب نے اپنی تقریر میں فیض اور اختر الایمان کا موازنہ بھی کیا اور کہا۔ "اختر الایمان کی شاعری براہ راست دل پر اثر کرتی ہے، جب کہ فیض کی شاعری ادھر ادھر سے ہوتی ہوئی دل کے قریب آتی ہے۔" فرمان صاحب سے پوچھا گیا۔ "ادھر ادھر سے آپ کی کیا مراد ہے؟" وہ ہنس دیے، جس کا مطلب یہ سمجھا گیا کہ "ادھر ادھر" سے مراد ماسکو ہے۔

فیض صاحب غالب لائبریری کے صدر ہیں۔ فرمان صاحب نائب صدر ہیں۔ کسی نائب صدر کو اپنے صدر کے بارے میں "ادھر ادھر" کی باتیں کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔

(۱۸ مئی ۱۹۸۴ء)

شاعری میں سرقہ اور توارد

ہو اللہ ہوئے کہ ہم نے محسن بھوپالی اور حمایت علی شاعر کے تازہ ترین جھگڑے کو ختم کرانے کا ارادہ کیا تھا، لیکن جب ہم اس مسئلے پر لکھنے بیٹھے تو معلوم ہوا کہ اس معرکہ آرائی سے متعلق طرفین کے مراسلات کہیں گم ہو گئے ہیں۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کی شاعری گم ہو جاتی تو ہمیں اتنا افسوس نہ ہوتا، جتنا ان مراسلوں کے گم ہونے کا ہوا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ شاعری تو آدمی کسی وقت بھی کر سکتا ہے، مراسلہ نگاری خاص خاص موقعوں پر اور ضرورت کے تحت ہی کی جاتی ہے۔ ہم نے محسن بھوپالی اور حمایت علی شاعر سے گزارش کی تھی کہ وہ ہمیں اپنے اپنے شائع شدہ مراسلات کے تراشے ارسال فرمائیں۔ جناب شاعر نے کہلوا دیا ہے کہ وہ آج کل بہت پریشان ہیں اور اپنے ایسے مضامین کا مجموعہ مرتب فرما رہے ہیں، جن کا تعلق ان کی ذات سے ہے۔ اس مجموعے کا نام انھوں نے "شخص و عکس" رکھا ہے، حالانکہ مناسب نام "عکس و اصل" تھا۔ محسن بھوپالی صاحب کے ہم ممنون ہیں کہ انھوں نے مشاعروں کی بے پناہ مصروفیت کے باوجود ہماری درخواست پر توجہ فرمائی اور اپنے ایک مراسلے کا تصحیح شدہ تراشہ بھیج دیا۔ تصحیح شدہ ہم نے اس لیے کہا کہ انھوں نے اپنے دست مبارک سے دو ایک جگہ کتابت کی غلطیوں کو درست کر دیا ہے۔ اس پر ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک شاعر نے اپنا مجموعہ کلام شائع کیا، اس میں کتابت کی غلطیاں بہت تھیں۔ وہ کسی کو مجموعہ پیش کرتے، پہلے کتابت کی غلطیاں درست کر دیتے۔ ایک نقاد کو تصحیح شدہ مجموعہ دیا گیا تو انھوں نے ورق گردانی کے بعد کہا۔ "آپ نے ناحق زحمت کی، بعض اشعار کتابت کی غلطیوں کی وجہ سے بہتر ہو گئے تھے، تصحیح کے بعد وہ دوبارہ اپنی اصلی حالت پر آ گئے ہیں۔"

محسن بھوپالی کی شاعری تو سہل ممتنع کا درجہ رکھتی ہے کہ پہلے مصرعے ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ دوسرا مصرع کیا ہوگا، لیکن ان کی نثر میں پہلا جملہ دوسرے جملے سے اپنے تعلق کو ظاہر نہیں کرتا۔ قاری اگر ذرا سا بھی ذہین ہو تو بات کی تہ تک پہنچ جاتا ہے۔ ہم جس حد تک ذہین ہیں، وہ کچھ ہمیں جانتے ہیں، تاہم جو کچھ

ہم سمجھ سکتے ہیں، اس کا اندازہ ذیل کی سطور سے ہوگا۔

حمایت علی شاعر نے محسن بھوپالی پر الزام لگایا تھا کہ ان کے اور سرشار صدیقی کے ایک شعر میں حیرت ناک حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ سرشار کا شعر ہے:

میں نے اس حال میں اک عمر بسر کی سرشار
ایک ہی دن بھی اس طرح گزارے کوئی

محسن کا شعر ہے:

میں نے جس طرح زیست کاٹی ہے
ایک ہی دن کی بسر تو کر

معلوم نہیں، جناب شاعر کو ان شعروں کی مماثلت پر حیرت کیوں ہوئی۔ جس طرح سرشار صاحب نے ناگفتہ بہ حالت میں زندگی گزاری، کیا اسی طرح محسن بھوپالی صاحب نہیں گزار سکتے؟ ناگفتہ بہ حالت سے ہماری مراد صرف یہ ہے کہ دونوں شاعر ہیں اور کئی شعری مجموعوں کے مصنف ہیں اور سب سے بڑی مماثلت یہ ہے کہ دونوں اخباری کالم نویس ہیں۔ اور کالم بھی ایسے لکھتے ہیں، جو بہت سے شاعروں کی شاعری سے زیادہ مقبول ہیں۔

حمایت علی شاعر کے الزام کا جواب محسن بھوپالی نے ان الفاظ میں دیا ہے:

"اس فن شریف یعنی شعر گوئی میں جو کچھ میرا تجربہ ہے، اس کی رُو سے میرا تو ایمان ہے کہ توارد، مماثلت اور چراغ سے چراغ جلانا سب بعد کی باتیں ہیں، اصل چیز صحت مند خیالات اور احساسات کو دیانت فن کے ساتھ کاغذ پر منتقل کرتے رہنا ہے۔ اہل نظر کہتے آئے ہیں اور ٹھیک ہی کہتے آئے ہیں کہ کوئی خیال اور تخیل نیا نہیں ہوتا۔ اب بات خیال کی یا مضمون کی نہیں، بلکہ جدت خیال، اسلوب اور انداز کی رہ جاتی ہے کہ شاعر نے اسے کس طرح ادا کیا ہے۔"

قطع نظر اس سے کہ محسن صاحب نے شعر گوئی کو فن شریف کہا ہے، ہمیں ان کے اس خیال سے پورا اتفاق ہے کہ توارد، مماثلت، چراغ سے چراغ جلانا (یعنی سرقہ) ایسے مسائل نہیں ہیں کہ جن پر غور کیا جائے، اصل مسئلہ شعر کہنا ہے۔ اگر ایک شاعر کو دوسرے شاعر کا کوئی مضمون پسند آجائے تو اسے لفظی تبدیلیوں کے ساتھ اپنا لینا قابل اعتراض نہیں۔ جب غالب اور میر کے کلام میں توارد اور سرقے کی مثالیں ملتی ہیں تو عام شاعروں کو کیوں روکا اور ٹوکا جائے۔

محسن صاحب کی یہ بات بھی درست ہے کہ کوئی خیال اور تخیل نیا نہیں ہوتا، اس کی تصدیق ان کے کلام سے بھی ہوتی ہے۔ اصل چیز انداز بیاں ہے۔ اس معیار سے دیکھا جائے تو مذکورہ دونوں شعروں میں محسن

بھوپالی کا شعر سرشار صدیقی کے شعر سے بڑھ گیا ہے۔ سرشار کے ہاں لہجہ بڑا دھیما، بلکہ معذرت آمیز ہے، جیسے انھوں نے عمر بسر نہیں کی، کوئی غلط کام کیا ہے۔ اس کے برعکس محسن کے شعر کا لہجہ پُر شکوہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے وہ مخاطب کو ذرا دھتکار رہے ہوں، اور پھر زیست کاٹنے اور گھاس کاٹنے میں جو صوتی مماثلت ہے، اس سے بھی شعر کی معنویت میں اضافہ ہوتا ہے۔

"جواب آں غزل" کے طور پر محسن نے شاعر کی ایک ثلاثی کو سیماب اکبر آبادی کے ایک شعر کی صدائے بازگشت قرار دیا ہے:

سیماب کا شعر یہ ہے:

عقیدت کچھ بنا دے، ورنہ پتھر صرف پتھر ہے
حرم کے در میں ہو یا بت کدے کے آستانے میں

ان کی ثلاثی یہ ہے:

یہ ایک پتھر جو راستے میں پڑا ہوا ہے
اسے محبت تراش لے تو یہی صنم ہے
اسے عقیدت نواز دے تو یہی خدا ہے

اگر یہ سلسلہ چل نکلا تو حمایت علی شاعر یہ کہہ سکتے ہیں کہ محسن بھوپالی کا یہ شعر:

زیست ہمسائے سے مانگا ہوا زیور تو نہیں
ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کھو جانے کا

[illegible] کے اس شعر کی تشکیل نو ہے:

مجبوریوں نے ڈالے ہیں پردے
میری ہنسی ہے مانگے کا زیور

ہمارے خیال میں یہ اعتراض نامناسب ہوگا۔ جب کوئی شاعر دوسروں سے زیور مانگ سکتا ہے تو مضمون کیوں نہیں مانگ سکتا۔

محسن بھوپالی نے اپنے مراسلے میں یہ بھی بتایا ہے کہ ۱۹۶۱ء میں جب ان کا پہلا مجموعہ کلام "شکست شب" شائع ہوا تھا تو اس کی تقریب رونمائی میں حمایت علی شاعر نے ایک تنقیدی مضمون پڑھا تھا۔ اس کی وجہ سے ان میں اور شاعر صاحب میں دو تین سال تک بات چیت بند رہی تھی اور پھر اخبارات میں قلمی جنگ ہوئی تھی۔ اسی زمانے میں محسن بھوپالی نے حمایت علی شاعر کے کلام میں سرقے اور توارد کی نشان دہی کی تھی۔ بعد میں قمر جمیل اور شمیم احمد نے محسن بھوپالی کی تحقیق سے فائدہ اٹھا کر حمایت علی شاعر کے خلاف مضامین لکھے۔

قمر جمیل اور شمیم احمد پر ہمیں حیرت ہے کہ ان دونوں نے محسن بھوپالی کی شاعری سے تو کبھی فائدہ نہیں اٹھایا، لیکن تحقیق سے فائدہ اٹھایا۔ سنا ہے، قمر جمیل نے بعد میں نقصان بھی اٹھایا، یعنی انھیں حمایت علی شاعر کے سامنے معذرت پیش کرنی پڑی۔

محسن بھوپالی نے اپنے مراسلے میں یہ بھی لکھا ہے:

"حمایت علی شاعر مجھ سے عمر میں دو سال بڑے ہیں اور میں نے ان کی اس بڑائی کا ہمیشہ خیال رکھا۔ میں ان سے گزارش کروں گا کہ مجھے اور آپ کو توارد اور مماثلت تلاش کرنے کی بجائے اچھے مصرعے کہنا چاہیے اور آپ نے تو کہے بھی ہیں۔"

محسن صاحب کی فراخ دلی قابلِ قدر ہے کہ انھوں نے شاعر صاحب کی "بزرگی پہ سال" کو تسلیم کیا ہے اور یہ بھی مانا ہے کہ انھوں نے اچھے مصرعے کہے ہیں، لیکن انھوں نے خود اپنے بارے میں اچھے مصرعے کہنے کی جو بات کی ہے، وہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ اچھے مصرعوں کے بغیر جب کام نہیں چل سکتا ہے تو پھر کوئی خطرہ مول لینے سے فائدہ! خطرے سے ہماری مراد یہ ہے کہ آدمی اچھے مصرعوں کی تلاش میں برے مصرعوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

محسن صاحب نے اپنے مراسلے میں یہ مسئلہ بھی اٹھایا ہے کہ کتابوں کی تقریبِ رونمائی کی بنیاد کس نے ڈالی تھی۔ اب تک کئی مصنف اس اعزاز کو حاصل کرنے کے لیے اپنے اپنے دعوے پیش کر چکے ہیں۔ محسن صاحب نے سب کے دعووں کو جھٹلا کر خود یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان کی تصنیف "شکستِ شب" پہلی کتاب ہے، جس کی تقریبِ رونمائی منعقد ہوئی تھی۔ ہمارے خیال میں اس دعوے کو اعترافِ جرم سمجھنا چاہیے کیوں کہ کتابوں کی تقاریبِ رونمائی سے ہمارے ادب میں جھوٹی تعریف کرنے اور جھوٹی تعریف سننے کا رجحان عام ہوا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ جب کوئی غلط کام کرتے تھے تو اس پر شرماتے تھے۔ اب [illegible] کرتے ہیں اور اخباروں میں اعلان کرتے ہیں کہ اس غلط کام کو کسی اور سے منسوب نہ کیا جائے۔

محسن بھوپالی نے اپنی کتاب کی تقریبِ رونمائی کی تاریخ ۵ اکتوبر ۱۹۶۱ء بتائی ہے۔ اتفاق سے اس وقت مرزا ظفر الحسن کی تصنیف "عمر گزشتہ کی کتاب" ہمارے سامنے ہے۔ اس کے صفحہ ۲۴۲ پر لکھا ہے کہ فیض کی کتاب "دستِ صبا" کی تعارفی تقریب ۲۳ دسمبر ۱۹۵۳ء کو لاہور میں منعقد ہوئی تھی، جس میں شاعروں اور دانشوروں کی بڑی تعداد نے شرکت کی تھی۔ احمد ندیم قاسمی اور ڈاکٹر عبادت بریلوی نے مقالے پڑھے تھے۔

مرزا ظفر الحسن کو اپنی کتاب میں یہ واقعہ نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ محسن بھوپالی کو اپنے جس کارنامے پر فخر تھا، مرزا صاحب نے اس کا سہرا بھی فیض کے سر باندھ دیا۔ آخر مرزا صاحب کب تک فیض کے سر پر سہرے باندھتے رہیں گے۔ اس سہرا بندی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔

(۲۵ مئی ۱۹۸۳ء)

شاعری یا گناہِ بے لذت

کسی زمانے میں رسالہ "ادبِ لطیف" "ترقی پسند تحریک کا ترجمان تھا۔ یہ تحریک اپنی بہار جا نفزا دکھلا [illegible] چکی ہے، اس لیے اب "ادبِ لطیف" کا دارومدار ترجمانی پر نہیں، ترجمے پر ہے۔ اس کے ہر [illegible] میں عالمی ادب پاروں کے تراجم اس کثرت سے شائع ہوتے ہیں کہ کشور ناہید اور انیس ناگی کی [illegible] پر بھی ترجمے کا گمان ہوتا ہے۔ بہر حال "ادبِ لطیف" کی اس خدمت کو ہمیشہ قدر کی [illegible] سے دیکھا جائے گا کہ اس نے عالمی ادب کے بہت سے فن پاروں کو اہلِ اردو تک پہنچایا ہے۔ [illegible] ہمارے ہاں جس طرح کا ادب تخلیق ہو رہا ہے، اس کے پیشِ نظر یہی مناسب ہے کہ [illegible] ادب کے تراجم زیادہ سے زیادہ شائع کیے جائیں، تا کہ ہمارے "طبع زاد" مصنفین کو [illegible] مشکل کام ہے۔

[illegible] "ادبِ لطیف" کا خاص نمبر شائع ہوا ہے، جو خاص ان معنوں میں ہے کہ تخلیقات کے [illegible] اس طریقے سے شائع کیے گئے ہیں کہ پڑھنے والا یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ کسے تخلیق سمجھے اور [illegible] بعض اشتہارات تخلیقات کے مقابلے پر زیادہ ادبی قدر و قیمت رکھتے ہیں اور [illegible] کے بعد ہم نے یہ رائے قائم کی ہے کہ ادبِ لطیف کا یہ سالنامہ ایک اہم ادبی دستاویز ہے۔ [illegible] کی دوسری خوبی یہ ہے کہ اس کا آغاز فیض صاحب کے ایک انٹرویو سے ہوتا ہے۔ فیض [illegible] میں جو چند مہینے وطن میں گزارے ہیں، ان میں وہ زیادہ تر انٹرویو لینے والوں کے [illegible] ان کے تقریباً دو درجن انٹرویو اخباروں اور رسالوں میں ہماری نظر سے گزرے ہیں۔ ہر [illegible] سوال اور ایک ہی جیسے جواب دکھائی دیے۔ بقول شخصے اتنی یکسانیت تو فیض [illegible] میں بھی نہیں ملتی، جتنی ان کے انٹرویوز میں نظر آتی ہے، لیکن "ادبِ لطیف" کا انٹرویو [illegible] اس میں فیض صاحب نے بعض ایسی باتیں کہی ہیں، جن سے ان کی شخصیت کا ایک نیا پہلو

سامنے آتا ہے، مثلاً ایک سوال کے جواب میں انھوں نے فرمایا۔ ”شاعری میں ایک لذت کا پہلو بھی ہے، اس میں عیاشی کا پہلو بھی تو ہے، وہ بھی قائم رہنا چاہیے۔“

ہم نے اس جملے کو بار بار پڑھا ہے۔ ہمیں یقین نہیں آتا کہ فیض صاحب ایسی بات بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہاں تو وہ زندگی بھر شاعری سے انقلاب پیدا کرنے اور معاشرے کو تبدیل کرنے کی باتیں کرتے رہے ہیں اور کہاں اب انھوں نے اس میں لذت اور عیاشی کے پہلو ڈھونڈ لیے ہیں۔ چلیے، لذت کی حد تک تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاں بہت سے شاعروں کی شاعری گناہ بے لذت ہوتی ہے، وہاں دو چار شاعر ایسے بھی نکل آتے ہیں، جن کے شعروں کی کمی کام و دہن دور ہو جاتی ہے۔ لیکن شاعری سے عیاشی کا کوئی تعلق ہماری سمجھ میں نہیں آسکا۔ ہم نے اپنی مشکل جناب لاغر مراد آبادی کے سامنے پیش کی تو انھوں نے کہا۔ ”فیض صاحب نے درست فرمایا ہے، شاعری سے عیاشی کا بہت گہرا تعلق ہے۔“ ہم نے جب اس کی تفصیل چاہی تو لاغر صاحب نے کہا۔ ”فیض صاحب کے پانچ شعری مجموعے ہیں، جن کی مجموعی قیمت پچاس روپے سے کم ہے، لیکن ان پانچوں مجموعوں کو یکجا کر کے ”نسخہ ہائے وفا“ کے نام سے جو کلیات شائع کی گئی ہے، اس کی قیمت پونے دو سو روپے ہے۔ اب ظاہر ہے، جسے فیض صاحب کے کلام سے لذت حاصل کرنی ہوگی، وہ الگ الگ مجموعے خریدے گا اور جسے عیاشی کرنی ہوگی، کلیات خریدے گا۔“

مذکورہ انٹرویو میں فیض صاحب سے پوچھا گیا۔ ”آپ نے اپنی شاعری میں غزل کی علامتوں کا کثرت سے استعمال کیا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟“ فیض صاحب نے فرمایا۔ ”اس کے دو فائدے ہیں۔ ایک فائدہ تو یہ ہے کہ آپ کریں گل و بلبل کی باتیں، گلشن کی، دربان اور قفس کی باتیں اور لوگ سمجھ جائیں کہ ان کا مطلب کیا ہے۔ آپ نہایت گھسی پٹی ترکیب اور امیج لے کر تھوڑی سی جستجو سے بالکل اور معنی بنا سکتے ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس پر گرفت نہیں ہو سکتی۔ آپ نے خالص سیاسی شعر لکھا ہے، اس میں قاتل، مقتل، زنداں اور قفس کا ذکر ہے۔ اگر کوئی گرفت کرنا چاہے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے تو [illegible] غزل لکھی ہے۔“

لیجیے ہم تو یہ سمجھتے تھے کہ فیض صاحب نے غزل کی علامتوں کو ایک نئی معنویت دی ہے۔ اب معلوم ہوا کہ وہ تو گرفت سے بچنے کے لیے شاعری کرتے رہے ہیں۔ فیض صاحب کا کارنامہ اپنی جگہ، لیکن [illegible] مستحق ان کے شارحین ہیں، جو روایتی شاعری سے سیاسی مفہوم برآمد کر لیتے ہیں۔ بہر حال گرفت سے [illegible] کا یہ اچھا طریقہ ہے۔ شاید اس کا علم سجاد ظہیر کو نہیں تھا، ورنہ وہ بھی بار بار انڈر گراؤنڈ جانے کی بجائے گل و بلبل اور قفس و دربان والی شاعری شروع کر دیتے۔

فیض صاحب نے اس انٹرویو میں خالص علمی گفتگو بھی کی ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

”ہمارے عروض اور عربی عروض کا ماخذ تو ایک ہے، لیکن ہمارا عروض وہ نہیں، جو عربی کا

ہے۔ آپ عربی شعر موزوں پڑھ ہی نہیں سکتے۔ ہم نے عربی عروض میں اتنی زحافات ڈالی ہیں کہ اس کی صورت ہی بدل ڈالی۔ اگر اساتذہ یہ کام کر سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں کر سکتے۔“

یہ ایک فنی بحث ہے۔ ہم اس پر تبصرہ کرنے کی استعداد و صلاحیت نہیں رکھتے۔ ہم نے ایک مرتبہ حضرت لاغر مراد آبادی کو زحمت دی تو انھوں نے فرمایا:

”اب فیض صاحب زحافات کو مذکر سے مؤنث بنا سکتے ہیں تو وہ عروض میں تبدیلی کیوں نہیں لا سکتے۔ فیض صاحب کو بتانا چاہیے تھا کہ وہ کون سے اساتذہ ہیں، جنھوں نے عربی عروض کی صورت بدل ڈالی، ورنہ ہم نے تو یہی سنا ہے کہ عربی عروض صدیوں پہلے جس صورت میں تھا، اسی صورت میں آج بھی مروج ہے۔“

لاغر صاحب کی اس رائے سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ ہمارے شاعروں نے عروض میں بڑی تبدیلیاں کی ہیں، یہاں تک کہ ناموزوں اور خارج از بحر اشعار بھی لکھے ہیں۔ فیض صاحب کہتے ہیں کہ آپ عربی شعر موزوں پڑھ نہیں سکتے۔ ہم اس پر اتنا اضافہ کریں گے کہ اردو شعروں کو موزوں پڑھنا بھی کوئی آسان کام نہیں۔ ہم نے کئی ایسے لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ فیض صاحب کے ایک مصرعے کو یوں پڑھتے ہیں:

بیٹھے ہیں عدل فہم سزا وار کھڑے ہیں

فیض صاحب دوسروں کے توجہ دلانے پر اس مصرعے کو اب اس صورت میں تبدیل کر چکے ہیں:

بیٹھے ہیں ذوی العدل سزا وار کھڑے ہیں

فیض صاحب کے ہر انٹرویو میں ایک آدھ جملہ نثری نظم کے خلاف ضرور ہوتا ہے۔ اس انٹرویو میں انھوں نے فرمایا ہے:

”یا تو نظم کہو یا نثر، یہ نثری نظم کیوں کہتے ہو۔ اگر وہ شاعری ہے تو شاعری ہے، نثر ہے تو نثر ہے۔“

ہم جناب سے ادب سے عرض کریں گے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ شاعری کے نام سے جو چیز لکھی جائے وہ شاعری ہو اور نثر کے نام سے جو کچھ لکھا جائے، وہ لازماً نثر ہو۔ ترقی پسندوں کی شاعری کہیں کہیں پڑھیں تو اس پر نثر کا گماں گزرتا ہے۔ عبدالعزیز خالد کی نثر پڑھیے تو وہ شاعری نظر آتی ہے۔ اس میں ردیف، قافیہ ہی نہیں، عروض کی پابندی بھی ملتی ہے۔ ایسی نثر کو شاعری نہیں کہا جائے گا تو اور کیا کہا جائے گا۔

فیض صاحب نے یہ جو کہا ہے کہ ”یا تو نظم کہو یا نثر، یہ نثری نظم کیوں کہتے ہو۔“ ...... اس کا جواب یہ ہے کہ جو لوگ نظم لکھ سکتے ہیں نہ نثر، وہ کیا کریں۔ آخر انھیں بھی تو اسی دنیا میں رہنا ہے اور کچھ نہ کچھ کرنا

ہے۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کہ آدمی نثری نظم ہی لکھتا رہے۔

سوشلسٹ حقیقت نگاری کے نام پر ادب کو پروپیگنڈہ بنا دینے کی روش کے جواز میں فیض صاحب نے روسی ادیب ایلیا اہرن برگ کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ یورپ کے بعض ادیبوں نے ایلیا اہرن برگ سے کہا۔ "آپ کے ہاں جو ادب پیدا ہوتا ہے، وہ ادب کہاں ہے، محض پروپیگنڈہ ہے۔" ایلیا اہرن برگ نے اس کے جواب میں کہا۔ "یہ ٹھیک ہے، ہم نے ٹالسٹائی اور چیخوف پیدا نہیں کیے، لیکن ہم نے ایک ایسی چیز پیدا کی ہے، جو تم لوگ ہزار سال میں پیدا نہیں کر سکے۔ ہم نے بہت بڑا پڑھنے والا پیدا کیا ہے۔ تم نے اب تک جتنی کتابیں چھاپی ہیں، ہم اتنی ایک سال میں چھاپ لیتے ہیں۔"

روس والے جب ادب پیدا نہ کر سکے تو انھوں نے پڑھنے والے پیدا کر لیے، لیکن ہمارے ترقی پسند تو ان سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں کہ ادب پیدا کر سکے نہ پڑھنے والے۔ ہمارے ہاں سوشلسٹ حقیقت نگاری ادب اور قاری دونوں سے بے نیاز ہے۔

انٹرویو کے آخر میں فیض صاحب سے پوچھا گیا کہ آیندہ کا پروگرام کیا ہے؟ فیض صاحب نے فرمایا۔ "اتنے سال باہر رہنے کی وجہ سے پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا — چنانچہ پچھلے دو تین سال کے رسالے اور کتابیں منگائی ہیں، تاکہ اس عرصے میں جو زنگ لگ گیا ہے، اسے صاف کیا جائے۔"

فیض صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ زنگ کسے لگا ہے؟ کتابوں اور رسالوں ہی کو لگا ہوگا ..... اور ابھی مزید لگے گا، کیوں کہ ایک مرتبہ پھر فیض صاحب سیر و سیاحت کے لیے ملک سے باہر جا چکے ہیں۔

(یکم جون ۱۹۸۴ء)

☆ ☆ ☆

جیب تراش نے بیاض کو بٹوہ سمجھ لیا

کچھ عرصے سے ادبی حلقوں میں یہ بحث چل رہی ہے کہ اخبارات کے ادبی صفحات نے ادب کو فائدہ پہنچایا ہے یا نقصان؟ سنا ہے، اس موضوع پر عنقریب ایک سیمینار بھی ہونے والا ہے، جس میں ادیب اور دانشور مسئلے کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر ٹھوس تجاویز پیش کریں گے، تاکہ مستقبل میں احتیاطی تدابیر اختیار کی جائیں۔ سیمینار کی حد تک تو بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اس طرح کی تقریبات میں آپس میں مل بیٹھنے اور جو ادیب موجود نہ ہوں، ان کی غیبت کرنے کا موقع ملتا ہے، لیکن احتیاطی تدابیر والی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ آگ، سیلاب اور وبائی امراض وغیرہ کے سلسلے میں تو احتیاطی تدابیر کا ذکر سنا تھا، لیکن ادب کے معاملے میں احتیاطی تدابیر اختیار کرنا بذات خود ایک بے احتیاطی ہے۔ ہمیں تو اخبارات کے ادبی صفحات میں کوئی ایسی خرابی نظر نہیں آتی، جس کی بنا پر یہ کہا جائے کہ ادب کو نقصان پہنچ رہا ہے، بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ان صفحات کی وجہ سے ادب خاصا فائدے میں ہے۔ ادب پڑھنے والوں کا حلقہ وسیع ہو گیا ہے۔ خصوصاً جب سے سیاسی خبروں پر پابندی لگی ہے، لوگ ادبی صفحات سے کچھ زیادہ ہی دلچسپی لینے لگے ہیں۔ گویا ادب، سیاست کا نعم البدل ثابت ہو رہا ہے۔

اس مسئلے پر ہماری جس ادیب سے بھی گفتگو ہوئی، اس نے ہم سے اخبارات کے ادبی صفحات کی تعریف سنی۔ بس ایک حضرت لاغر مراد آبادی ایسے تھے کہ ان کی رائے دوسروں سے مختلف ہے۔ لاغر صاحب سے ہماری جو گفتگو ہوئی، وہ آپ ملاحظہ فرمائیے:

ہم: قبلہ یہ فرمائیے کہ اخبارات کے صفحات سے ادب کو نقصان پہنچا ہے یا فائدہ؟

وہ: ادبی صفحات ہی سے نہیں، اخبار کے تمام صفحات سے صرف مالکان کو فائدہ پہنچتا ہے۔ باقی سب نقصان میں رہتے ہیں۔

ہم: ادب کو کس طرح کا نقصان پہنچا ہے؟

وہ: ہر طرح کا، مثلاً یہ کہ ادب اور صحافت میں کوئی فرق نہیں رہا۔ اب ان لوگوں کا شمار بھی ادیبوں میں ہونے لگا ہے، جو ادبی جلسوں کی رپورٹیں لکھتے ہیں۔ غضب تو یہ ہے کہ وہ لوگ بھی ادیب کہلانے لگے ہیں، جن کے نام ادبی رپورٹوں میں حاضرین جلسہ کے طور پر درج ہوتے ہیں۔

ہم: ادبی رپورٹیں لکھنا بھی تخلیقی کام ہے؟

وہ: تو پھر جلسوں میں شریک ہونا بھی تخلیقی کام ہوا۔

ہم: آج کل جس قسم کا ادب لکھا جا رہا ہے، اس کے مقابلے پر کسی جلسے میں شرکت کرنا زیادہ محنت کا کام ہے۔

وہ: مجھے آپ کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ میں اپنی ایک غزل پر ہفتوں محنت کرتا ہوں۔

ہم: آپ کی بات اور ہے قبلہ۔ اگر آپ نے اتنی محنت کسی مفید کام پر کی ہوتی تو آپ کا عکس اخبار میں بلکہ اس کے برعکس ہوتا۔ خیر یہ الگ موضوع ہے، یہ فرمائیے کہ اخبار کے ادبی صفحات سے ادیبوں کے علاوہ بھی کوئی فائدہ اٹھاتا ہے؟

وہ: ہاں، وہ لوگ جو ان صفحات کے انچارج یا نگران ہوتے ہیں۔

ہم: وہ کیسے؟

وہ: یہ لوگ اپنی پبلسٹی زیادہ سے زیادہ کرتے ہیں۔ اپنی تعریف میں مضامین لکھ کر فرضی ناموں سے شائع کرتے ہیں۔ خبروں میں بھی اپنا ذکر بڑھا چڑھا کر کرتے ہیں اور تصویریں تو صرف وہی چھپتی ہیں جن میں یہ خود موجود ہوتے ہیں۔ کسی بھی اخبار کا ادبی صفحہ اٹھا کر دیکھ لیجیے، اس کے ہر کالم میں نگران کی شخصیت کا عکس نظر آئے گا۔ وہ مشہور واقعہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔ ایک اخبار کے ادبی صفحے کے نگران نے ۸۳ء میں انتقال کرنے والوں کی فہرست مرتب کر کے کاتب کے حوالے کی۔ کاتب نے نگران کا نام بھی شامل فہرست کر دیا۔ فہرست چھپی تو کاتب سے جواب طلبی کی گئی۔ اس نے کہا "ادبی صفحے پر جتنی خبریں چھپتی ہیں، اس میں نگران صاحب اپنے نام کا اضافہ کر دیا کرتے ہیں۔ میں یہ سمجھا کہ اس فہرست میں وہ اضافہ کرنا بھول گئے ہیں، لہٰذا یہ کام میں نے کر دیا۔"

ہم: یہ تو لطیفہ ہے۔

وہ: جی نہیں، سچا واقعہ ہے۔

ہم: یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ اخبارات نے ملک کے عام شہری کو ادب سے روشناس کرایا ہے۔ فلمی ستاروں، کھلاڑیوں اور سیاستدانوں کی طرح اب ادیب بھی اہمیت حاصل کر چکے ہیں۔ ان کے بارے میں خبریں باقاعدگی سے شائع ہوتی ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ اخباروں میں ادیبوں کا نام صرف اس وقت آتا تھا، جب وہ انتقال فرما جاتے تھے، لیکن اب ان کی دیگر مصروفیات کی خبریں بھی چھپتی ہیں۔

وہ: ایسی خبروں کا کیا فائدہ، جس سے ادیبوں کی عزت میں کوئی اضافہ نہ ہو۔ ابھی پچھلے دنوں ایک مشہور شاعر کے بارے میں خبر شائع ہوئی تھی کہ ایک جیب کترے نے ان کی جیب سے بیاض اڑا لی اور بذریعہ ڈاک سے واپس بھیج دی۔ بیاض کے ساتھ اس مضمون کا خط بھی لکھا۔ "میں نے اس بیاض کو روپوں کا بٹوہ سمجھ کر نکالا تھا، لیکن اسے تو کوئی کباڑی بھی خریدنے پر تیار نہیں۔" اس خبر کی اشاعت سے مشہور شاعر کی جو رسوائی ہوئی، اس کا اندازہ آپ کر سکتے ہیں۔

ہم: اس سے جیب کترے کی محنت کے ضائع ہونے کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

وہ: اخباروں میں اس قسم کی خبریں بھی چھپتی ہیں کہ احمد ہمیش افسانہ سیمینار میں شرکت کے لیے دہلی جا رہے ہیں، ان کے ساتھ انتظار حسین بھی جائیں گے۔ گویا انتظار حسین کی تو کوئی اہمیت نہیں، اصل اہمیت کسی اور کی ہے۔ پھر انھیں صاحب نے دہلی سے واپس آ کر خبر چھپوائی کہ برصغیر کے مشہور اور ممتاز افسانہ نگار دہلی سے واپس آ گئے ہیں۔ خبر کا مسودہ "مشہور اور ممتاز" افسانہ نگار نے اپنے ہاتھ سے تیار کیا تھا۔ اخبار والوں نے اسی کا عکس چھاپ دیا۔ آپ ہی بتائیے، جب اس قسم کی خبریں چھپیں گی تو لوگوں کے دلوں میں ادیبوں کی عزت بڑھے گی یا گھٹے گی؟

ہم: مگر شہرت تو بڑھے گی۔

وہ: جی نہیں، ادبی صفحات پر مضحکہ خیز خبریں بھی چھپتی ہیں۔ اس قسم کی خبریں تو آپ نے دیکھی ہوں گی کہ فلاں مشہور شاعر کے ماموں زاد بھائی کے نواسے کی سالگرہ پر تہنیتی مشاعرہ ہوا، جس میں نواسے نے بھی کلام سنایا۔

ہم: اس میں اعتراض کی کیا بات ہے۔ اصل چیز مشاعرہ ہے اور خبر اسی کے بارے میں ہے۔

وہ: جی نہیں، اصل چیز فلاں مشہور شاعر ہے، جس کے ماموں زاد بھائی کے نواسے کی سالگرہ تھی۔

ہم: اس قسم کی چیزیں تو رسالوں میں بھی چھپتی ہیں۔ ماہنامہ "افکار" کا اسی مہینے کا شمارہ دیکھ لیجیے۔ اس میں ایک صاحب نے ڈاکٹر عبادت بریلوی کے ایک مضمون کی تعریف کرتے ہوئے اپنے خط میں لکھا ہے۔ "عبادت صاحب سے میری ایک نسبت یہ ہے کہ میرے سگے خالہ زاد بھائی حبیب احمد خاں افغن، ان کے بھتیجے ہوتے ہیں۔" اب بتائیے ڈاکٹر عبادت بریلوی کے مضمون کا اس اعلان سے کیا تعلق؟

وہ: بہتر تھا کہ اس بات کو یوں بھی لکھا جا سکتا تھا کہ عبادت بریلوی میرے خالہ کے بھائی ہیں۔ اس طرح عبادت صاحب کا تنقیدی مرتبہ بھی بڑھ جاتا اور افغن صاحب کو زحمت دینے کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔ بہر حال "افکار" میں اس قسم کی چیزوں کے چھپنے پر تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ یہ رسالہ اب اچھا خاصا اخبار بنتا جا رہا ہے۔ اس میں اخباری نوعیت کی چیزیں اب زیادہ چھپتی ہیں۔ طنز و مزاح کے

نام پر غیر ترقی پسند ادیبوں کی کردار کشی بھی خوب کی جاتی ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ایک بزرگ ادیب کے خلاف پہلے تو ایک مضمون چھاپا گیا اور پھر تائیدی مراسلات شائع کیے گئے۔

ہم: جب رسالوں کا یہ حال ہے تو پھر آپ اخباروں کو کیوں برا کہتے ہیں۔

وہ: اس لیے کہ اخباروں ہی کے اثر کے تحت رسالوں نے سنسنی خیز تحریریں شائع کرنی شروع کی ہیں۔

ہم: اچھا قبلہ! یہ بتائیے کہ اخباروں میں جو انٹرویو چھپتے ہیں، کیا ان میں بھی کوئی کام کی بات نہیں ہوتی۔

وہ: بے شمار کام کی باتیں ہوتی ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں لاہور کے ایک نوجوان ادیب سعادت سعید کراچی تشریف لائے تھے۔ یہاں کے ایک اخبار میں ان کا انٹرویو چھپا ہے۔ ان سے پوچھا گیا۔ ”لاہور میں اہم شاعر کون کون سے ہیں؟“ انھوں نے جواب دیا۔ ”فی الحال تو میں ہی سب سے اہم شاعر ہوں۔“

ہم: یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ آپ کو اس پر کیا اعتراض ہے؟

وہ: اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو لاہور تک کیوں محدود کیا۔ سعادت امروہوی کے مشاعرے میں کلام سنانے کے بعد تو انھیں اپنے آپ کو پورے پاکستان کا سب سے اہم شاعر سمجھنا چاہیے تھا۔

ہم: یہ بات وہ شاید اگلے انٹرویو میں کہیں گے ... قبلہ! آخری سوال یہ ہے کہ ہمیں اخبارات کے ادبی صفحات کی ضرورت ہے یا نہیں؟

وہ: اب تو اخبارات ہی کی ضرورت نہیں رہی تو ادبی صفحات کا کیا سوال؟

(۸ جون ۱۹۸۴ء)

☆......☆......☆

نئے تیشے، نئے کوہکن

سیاسی خبروں پر پابندی لگنے سے اخباروں میں دلچسپی کا جو عنصر کم ہوا ہے، اس کی تلافی اگرچہ ڈکیتی، اغوا، قتل و غارت گری کی خبروں اور صوبائی وزیروں کے بیانات سے ہو رہی ہے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ اب اخبار پڑھنے میں وہ مزہ نہیں رہا، جو کبھی پہلے تھا۔ اب اخبار آتا ہے تو بقول فیض احمد فیض اس طرح آتا ہے جیسے قاصد

کوچۂ یار سے بے نیل مرام آتا ہے

ہم یہ بھی نہیں کہ اخبار، غالب کا ”ورقِ ناخواندہ“ بن کر رہ گیا ہو اور اس میں پڑھنے کے لائق کوئی چیز ہی نہ ہو۔ اور کچھ نہیں تو مولانا کوثر نیازی صاحب کے مضامین ہوتے ہی ہیں۔ خدا مولانا صاحب کو خوش رکھے کہ ان کی سیاست کی طرح ان کا قلم بھی سدا بہار ہے۔ جوش ملیح آبادی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے رہتے ہیں۔ مولانا صاحب کا یہ عالم ہے کہ جب وہ مضمون لکھنے بیٹھتے ہیں تو معانی ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس خصوصیت کی بنا پر ہمارا خیال تھا کہ جس طرح سیاست میں مولانا صاحب کے نقشِ قدم پر چلنا دشوار ہے، اسی طرح ان کے اسلوبِ تحریر کی پیروی کرنا بھی مشکل ہے، لیکن ادھر کچھ عرصے سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ بعض اہلِ قلم مولانا صاحب کے اسلوب کو اپنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ گویا مولانا صاحب بھی اس مقام پر پہنچ گئے ہیں، جہاں وہ علامہ اقبال کی طرح یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ:

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

آج ہمیں ان کے ایک مقلد ہی کا تذکرہ مقصود ہے، جن کا ایک دلچسپ مضمون ۳ جون کے روزنامہ [illegible] کراچی کے ادبی صفحے پر شائع ہوا ہے، جس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

"دہکتے ہوئے عارض و رخسار سے محبت ماہ و سال کے چھینٹے سرد کر دیتی ہے، لیکن حسن سے عقیدت کی آگ تا حیات لو دیتی ہے، اس لیے تیرگی نے ہر عہد میں روشنی پر پابندی کو روا رکھا ہے۔ جلتے ہوئے حکم نامے صادر کیے، توڑے دے کر قوت احساس کو سلب کیا، جرأت اظہار پر کرم ہاتھوں سے شامیانے تانے، پھر بھی جب عشق کی لے تیز ہوئی تو راہ میں جھاڑ جھنکار بچھائے، گنگا کی کوکھ میں زہر گھولا، کوثر و تسنیم کو خطرے میں مبتلا کیا، گل بداماں جسم میں سرنگیں بچھائیں، خوں بار ہونٹوں کو لہولہان کیا، ہجر کا درد پھیلتا گیا۔"

یہ لفظی شکوہ سودا کے کسی بہاریہ قصیدے کی تشبیب میں بھی نظر نہیں آتا۔ لفظوں کو ایک دوسرے کی رعایت سے کس خوبصورتی سے استعمال کیا گیا ہے۔ عارض و رخسار اگرچہ ہم معنی ہیں، لیکن انھیں یہاں اس طرح برتا گیا ہے، جیسے یہ دو مختلف چیزیں ہوں۔ یہی صورت خیال خوں بار ہونٹوں کے لہولہان ہونے میں بھی پائی جاتی ہے۔ جو ہونٹ پہلے ہی خوں بار ہوں، انھیں لہولہان کرنا ایک اچھوتا مضمون ہے، جو نثر سے زیادہ نظم میں مزہ دیتا ہے۔ بہرحال یہ اقتباس بھی کسی نثری نظم سے کم نہیں ہے۔ تمام جملوں کو یکے بعد دیگرے الگ الگ سطروں میں لکھ دیجیے تو اچھی خاصی نثری نظم وجود میں آ جائے گی۔

ممکن ہے، آپ یہ پوچھیں کہ جس مضمون کا آغاز ان شاندار الفاظ سے ہو رہا ہے، آخر اس کا موضوع کیا ہے۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے آپ کو مضمون کا دوسرا پیراگراف پڑھنے کی زحمت اٹھانا ہوگی۔ ملاحظہ فرمایئے:

"سیاسی سرمائے کی تقدیر ہے۔ دست قدرت میں سونا چاندی رکھنے کے لیے گلعذاران چمن نیلام کو بکاؤ مال ہیں، چمن کا ہوس کا ایندھن بننا لازم ہے۔ یہی وجہ تھی کہ زندگی کا گلشن تین بار لٹا، مامتا کے شجر کٹے، غرور سرنگوں ہوا، غنچے آنسوؤں میں تر ہوئے، شفق رنگ بوٹے مقتل بنے، لیکن تابکے۔ ہجر کا درد مٹا، وصل کا چہرہ تمتما اٹھا، چنگاری کی لویں چمکنے لگیں، نگار وطن کے آتشیں رخسار پر پیار کی بجلی کوندنے لگی، نئے تیشے، نئے کوہکن دشت وفا میں آ گئے اور جوئے شیر بہنے لگی۔"

ممکن ہے، آپ ابھی معاملے کی تہ تک نہ پہنچے ہوں اور آپ پر مضمون کا موضوع واضح نہ ہوا ہو۔ قصہ یہ ہے کہ یہاں مدعا عنقا نہیں ہے، بلکہ بات علامتوں اور استعاروں کی زبان میں کی گئی ہے۔ آج کل ادب کا سارا کاروبار علامتوں اور استعاروں کے سہارے چل رہا ہے اور اب اخباری مضامین بھی اسی نمک میں داخل ہو چکے ہیں۔ آیئے مذکورہ اقتباس کی علامتوں کو ذہن نشین کر لیں۔

دست قدرت میں سونا چاندی رکھنے والوں سے مراد حکمران طبقہ ہے۔ گلعذاران چمن کا مطلب پاکستان اور بھارت کے عوام۔ تین بار زندگی کا چمن لٹا، یعنی تین مرتبہ پاکستان اور بھارت میں [illegible]

[illegible] ہجر کا درد مٹا یعنی دونوں ملکوں میں مفاہمت کا آغاز ہوا۔ وصل کا چہرہ تمتما اٹھا سے مراد ہے، دونوں ملکوں کے تعلقات خوشگوار ہو گئے۔ نئے تیشے، نئے کوہکن آ گئے، یعنی ہندوستانی شاعر اپنے دیوان بغل میں دبا کے پاکستان آ گئے۔ جوئے شیر بہنے لگی، یعنی مشاعرے ہونے لگے۔

ممکن ہے ہماری اس تشریح سے بعض لوگوں کو اتفاق نہ ہو، لیکن ہم آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم نے [illegible] لکھا ہے، بقید ہوش و حواس لکھا ہے اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ مندرجہ بالا دونوں پیراگرافوں کے [illegible] سادات امروہہ والے اور بھارتی قونصل جنرل کے ہاں منعقد ہونے والے مشاعروں کی روداد [illegible] ہے۔

باقی سارا مضمون بھی اسی خوبصورت اسلوب میں لکھا گیا ہے۔ سادات امروہہ کے مشاعرے کی [illegible] ملاحظہ ہو:

"ایوان ادب میں چراغاں ہوا، زمین کی ہتھیلی پر گلستان کھلا، چہرۂ تاباں لیے ہندوستان کے ادیب آ گئے۔ سوکھی ڈوب لہلہا اٹھی، زنگ خوردہ رشتوں کے پہیوں میں تیل پڑا، ادب کی [illegible] محفل پر جھوم کر گھٹا آئی، سادات امروہہ کے سجیلے صادقین نے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر جام و مینا اٹھا لیا۔"

مضمون کے لکھنے والے نے یہ نہیں بتایا کہ "جام و مینا" کس جگہ رکھا ہوا تھا کہ جہاں سے باوجود بندش [illegible] اٹھا لیا گیا۔

[illegible] کا ذکر ہندوستانی قونصل جنرل کے مشاعرے کے سلسلے میں زیادہ شاعرانہ انداز سے آیا ہے۔ "تمام [illegible] ہاتھ میں جام چھلک رہے تھے۔" یہ اس مضمون کا واحد جملہ ہے، جو غیر [illegible] ہے۔

اس مضمون میں شاعروں کا ذکر بہت خوبصورت پیرائے میں کیا گیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ کیجیے:

(1) "کنور مہندر سنگھ بیدی کی من موہنی اور قندیل صفت ذات جسم کا پرتو لیے گویا تھی۔" ...... ذات کو قندیل اور جسم کو شمع بنا دینا، ایک نازک شاعرانہ خیال ہے۔ اس کی جس قدر داد بھی دی جائے کم ہے۔

(2) "ندا فاضلی نے خوب رنگ جمایا۔ ان کا ہر شعر قبا کے انداز قد کو للکارتا، زخم پر مرہم رکھتا اور [illegible] پھول کھل کر بار بار نچھاور کر رہا تھا۔" ...... افسوس کہ ندا فاضلی واپس چلے گئے، ورنہ ہم ان سے پوچھتے کہ آپ کے شعر قبا کے انداز قد کو کس طرح للکارتے ہیں اور [illegible] کس طرح نچھاور کرتے ہیں۔ ندا صاحب سے ہم رنگ جمانے کی وضاحت طلب نہ کرتے، کیوں کہ ہم [illegible] مشاعروں میں ہتھیلی پر سرسوں جماتے دیکھ چکے ہیں۔

(۳ "ڈاکٹر شہر یار باشعور ادیب ہیں۔ وہ سبب و نتیجے کے تعلق کو تجریدی شکل میں نہیں، بلکہ ہر آن بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں جانچتے اور تولتے ہیں۔"...... بچارے ڈاکٹر شہر یار کو مشاعرے میں تو لتے کا تو کیا، بولنے کا بھی موقع نہ مل سکا۔ (منیر نیازی اور جمیل الدین عالی کی سفارش کے باوجود)

(۴ "ڈاکٹر بشیر بدر ...... کی آواز غزل کی روایت عظمیٰ سے جڑے ہونے کے باوجود نئی نسل کے لیے نمونۂ بہار ہے۔"...... ہمارا تعلق پرانی نسل سے ہے، اس لیے ہم اس جملے ہی کو نمونۂ بہار سمجھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

مضمون نگار نے اپنا سارا زورِ بیان شاعروں ہی پر ختم نہیں کیا۔ اس کا کچھ حصہ سامعین کے لیے بھی بچا کر رکھا۔ دیکھیے سامعین کا ذکر کس خوبصورت انداز میں کیا...... "سامنے گلرنگ ذہن، سوناں بدن نوجوان مسکرا مسکرا کر گلباری کر رہے تھے۔ محبت اگر شدت اختیار کرے تو زبان مختصر ہو جاتی ہے، صرف آنکھیں بولتی ہیں، جو کہہ رہی تھیں، مہمان فن کارو، تم ہمارا چہرہ نہیں پہچانتے، لیکن تمھارا تم سے گہری ذہنی رفاقت ہے۔ ہم لہو سے گلشن سینچتے ہیں، تم اس میں گل کھلاتے ہو۔ ہم معمار ہیں، تم تاج محل ہو۔ ہم چمن آرا ہیں، تم سراپا چمن ہو۔ ہم میدانی درخت ہیں، تم پھولوں سے لدی ہوئی شاخ......"

معاف کیجیے آج تو ہمارا کالم بھی پھولوں سے لدی ہوئی شاخ بن گیا۔

(۱۵ر جون ۱۹۸۳ء)

☆............☆............☆

مخالفوں کا شہر...... لاہور

ہمارے ادیبوں میں ڈاکٹر انور سدید کی طرح زرخیز ذہن رکھنے والے دو چار ہی ہوں گے۔ ادب کی شاید ہی کوئی وادی ہو، جسے ان کے اشہبِ جہدہ قلم نے پامال نہ کیا ہو۔ نقاد وہ ایسے ہیں کہ دودھ کا دودھ، پانی کا پانی دکھا دیتے ہیں۔ محقق وہ ایسے ہیں کہ اڑتی ہوئی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں۔ غزلیں وہ ایسی لکھتے ہیں کہ انھیں فریدہ خانم ٹی وی اور ریڈیو سے اپنی آواز میں سنا دیتیں تو ڈاکٹر انور سدید بہ حیثیت شاعر فیض صاحب کی طرح مشہور ہو جاتے۔ طنز و مزاح میں انھوں نے یہ کمال دکھایا ہے کہ غالب کے انداز میں ایسے خطوط لکھے ہیں کہ نقل پر اصل کا گمان ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں رسا ہمدانی نے غالب کے جعلی خطوط چھاپے تھے تو قاضی عبدالودود نے فوراً اس جعل سازی کا بھانڈا پھوڑ دیا تھا۔ ڈاکٹر انور سدید کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ انھوں نے غالب کے نام سے فرضی خطوط لکھ کر قاضی عبدالودود سے بھی داد حاصل کی، اور یہ بھی قاضی صاحب کے انتقال کا سبب بھی تھا۔ انشائیہ نگار کی حیثیت سے بھی ڈاکٹر انور سدید نے اپنے علاقے کے ادیبوں کو ڈاکٹر وزیر آغا کے مشہور جیسی یاد کو اپنے دفاع میں فنِ انشائیہ نگاری پر پوری ایک کتاب لکھنی پڑی۔ سنا ہے، اس کتاب کے رد میں ڈاکٹر انور سدید نے بھی پوری ایک کتاب لکھ ڈالی ہے، جو عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ ڈاکٹر صاحب لوہے کو لوہے سے کاٹنے کے قائل ہیں، یعنی مراسلے کا رد مراسلے سے، مضمون کا رد مضمون سے اور کتاب کا رد کتاب سے کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا قلم تحسین و تردید دونوں میں یکساں روانی سے چلتا ہے۔ وہ چاہیں تو راغب شکیب کو غالب سے بڑا شاعر ثابت کر دیں اور چاہیں تو قتیل شفائی کو راغب شکیب سے بھی کم درجے کا شاعر بنا دیں۔ دونوں صورتوں میں فائدہ راغب شکیب ہی کو پہنچے گا، اور ڈاکٹر صاحب دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے معاملے میں نہایت فراخ دل ہیں۔

تحسین و تردید کے شغل ہی کا نتیجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے دوستوں اور مخالفوں میں آئے دن

اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ تاہم دوستوں کی تعداد میں جس تیزی سے اضافہ ہوتا ہے، مخالفوں کی تعداد اتنی تیزی سے نہیں بڑھتی۔ وجہ یہ ہے کہ لوگ دوستی بے اختیار ہو کر کرتے ہیں اور مخالفت کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی کرنی پڑتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب دوستوں کی راہ میں خوشبو کی طرح بکھر جاتے ہیں اور مخالفوں کے راستے میں دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں اور اکیلے ہی ان سے لڑتے ہیں۔ جن دنوں لاہور والوں نے دبستان سرگودھا کی اینٹ سے اینٹ بجانے کی مہم شروع کر رکھی تھی، ڈاکٹر صاحب نے اپنے قلم سے منجنیق کا کام لے کر ایسے بھاری بھرکم پتھر لڑھکائے کہ حریف میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

یوں تو پاکستان کے ہر شہر میں ڈاکٹر صاحب کے دوست اور مخالف موجود ہیں، لیکن تین شہروں کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ سرگودھا اور کراچی میں ان کے دوست اور نیاز مند زیادہ ہیں، لیکن لاہور مخالفوں کا شہر ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا بڑا حصہ سرگودھا میں گزرا ہے۔ ظاہر ہے کہ اہل سرگودھا کے لیے یہ ایک اعزاز ہے۔ کراچی میں ڈاکٹر صاحب اول تو بہت کم آتے ہیں اور آتے بھی ہیں تو ہوا کے جھونکے کی طرح کہ ادھر آئے اور اُدھر گئے۔ اتنے کم وقت میں کراچی والے دوستی ہی کر سکتے ہیں۔ مخالفت کی فضا کے لیے کم از کم دو چار ماہ کا قیام ضروری ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب اس کی نوبت ہی نہیں آنے دیتے۔

لاہور میں مخالفین کی تعداد اس لیے زیادہ ہے کہ یہاں دبستان سرگودھا کا حریف دبستان خاصا فعال ہے۔ قارئین سمجھ جائیں گے کہ ہمارا اشارہ کس طرف ہے اسی لیے ہم نے دبستان فنون کا نام نہیں لیا۔ ویسے بھی لاہور والے مخالفت کرنے پر آتے ہیں تو کسی کی پروا نہیں کرتے۔ اس شہر میں تو صوبائی اسمبلی کے انتخاب کے سلسلے میں علامہ اقبال کے خلاف بھی پوسٹر بازی ہو چکی ہے تو بیچارے انور سدید مخالفت سے کیسے بچ سکتے تھے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لاہور میں ڈاکٹر صاحب کے مخالفین کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہتی ہے۔ کبھی کبھی ان کے حامیوں کی تعداد بھی زیادہ ہو جاتی ہے مثلاً پچھلے دنوں ان کے حامی تعداد میں مخالفوں سے کہیں زیادہ ہو گئے تھے، لیکن جب عطاء الحق قاسمی کی دعاؤں کے نتیجے میں سکھ یاتریوں کی اسپیشل ٹرین واہگہ کی سرحد عبور کر گئی تو صورت حال حسب سابق ہو گئی۔

یہ لطیفہ ہم نے عطاء الحق قاسمی کو خوش کرنے کے لیے لکھا ہے، لیکن قاسمی صاحب کو زیادہ خوش نہیں ہونا چاہیے کہ ہم نے بہت سے ایسے لطیفے آیندہ کے لیے محفوظ کر رکھے ہیں، جن سے ڈاکٹر انور سدید خوش ہوں گے۔

خیر، یہ سب تو مذاق کی باتیں تھیں، اصل قصہ یہ ہے کہ ہم ابھی ابھی ڈاکٹر انور سدید کی تازہ تصنیف ''اردو افسانے میں دیہات کی پیش کش'' کے مطالعے سے فارغ ہوئے ہیں۔ اسے پڑھ کر ہمارے علم میں جو اضافہ ہوا ہے، اس کے اعتراف کے طور پر ہم نے آج ڈاکٹر صاحب کو اپنے کالم کا موضوع بنایا ہے۔

خدا ڈاکٹر صاحب کو خوش رکھے کہ انھوں نے اردو تنقید کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

اس کتاب کی پہلی خوبی تو یہ ہے کہ یہ نصابی نوعیت کی تنقیدی کتاب نہیں ہے کہ دو کتابیں پڑھ کر تیسری کتاب تصنیف کر ڈالی۔ اس میں اُردو افسانے کا مطالعہ ایک اچھوتے پہلو سے کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بے شمار افسانوں کا مطالعہ کر کے یہ بتایا ہے کہ ہمارے افسانہ نگاروں نے دیہات اور دیہاتی زندگی کی عکاسی کس طرح کی ہے۔ کون افسانہ نگار کس حد تک کامیاب رہا ہے۔ کس نے نئی راہیں تراشی ہیں اور کون تقلید کی راہ پر چلا ہے۔ یہی نہیں، ڈاکٹر صاحب نے چالیس سے زیادہ افسانہ نگاروں کی انفرادی خصوصیات کو بھی اجاگر کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے مطالعے کی وسعت کا اس سے اندازہ کیجیے کہ انھوں نے صرف افسانوی مجموعوں ہی کو پیش نظر نہیں رکھا، بلکہ بے شمار ایسے افسانوں کے بھی حوالے دیے ہیں، جو رسالوں کے انبار میں دفن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دیہاتی زندگی سے متعلق شاید ہی کوئی اہم افسانہ ہو جس کا ذکر اس کتاب میں نہ آیا ہو۔ یہاں تک کہ کراچی کے فکشن گروپ کے بانی شہزاد منظر کے بھی دو ''دیہاتی'' افسانوں کا ذکر موجود ہے۔ ممکن ہے فکشن گروپ کی مخالف تنظیم گلشن گروپ کے بانی سلطان جمیل نسیم اس سے خوش نہ ہوں اور وہ یہ اعتراض کریں کہ شہزاد منظر نے کبھی دیہات دیکھا ہی نہیں تو پھر وہ دیہاتی زندگی پر افسانے کس طرح لکھ سکتے ہیں۔ متوقع معترض کی خدمت میں عرض ہے کہ موجودہ ترقی یافتہ زمانے میں دیہاتی زندگی پر افسانہ لکھنے کے لیے دیہات دیکھنے کی ضرورت نہیں رہی۔ ان فلموں کا دیکھ لینا کافی ہے، جن میں دیہاتی زندگی دکھائی جاتی ہے۔ لاہور والے تو فلمیں دیکھ کر خودکشی تک کر لیتے ہیں، کیا شہزاد منظر افسانے بھی نہیں لکھ سکتے؟

اس کتاب میں ڈاکٹر انور سدید کی تنقید توازن اور اعتدال کی عمدہ مثال ہے۔ انھوں نے کہیں کوئی ایسی بات نہیں کہی، جس کی وجہ سے ان پر بے جا تعریف یا تنقیص کا الزام لگایا جا سکے۔ محترم احمد ندیم قاسمی صاحب سے ان کے جو تعلقات ہیں، ان کا سب کو علم ہے۔ ڈاکٹر انور سدید نے قاسمی صاحب کی خوب تعریف کی ہے اور ان کے بارے میں تقریباً اٹھارہ صفحے لکھے ہیں اور یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ ''میں ندیم کا پرانا قاری اور مداح ہوں۔'' قاسمی صاحب کی نظر سے اگر ہمارا کالم گزرے تو ہم ان سے درخواست کریں گے کہ اپنے نئے قاریوں اور مداحوں کے طفیل یا باقی میں اپنے ایک پرانے قاری اور مداح کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں۔

اس کتاب میں دو ''حرف'' بھی شامل ہیں۔

''حرف اول'' خود مصنف نے اور ''حرف آخر'' راغب شکیب نے لکھا ہے۔ پہلا حرف کتاب کے بارے میں ہے اور آخری حرف مصنف کے بارے میں۔ راغب شکیب نے ڈاکٹر انور سدید پر خاصی تحقیق کی ہے اور تفصیل سے بتایا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی ادبی زندگی کا آغاز افسانہ نگاری سے ہوا تھا اور

انھوں نے دیہاتی زندگی کے بارے میں کئی عمدہ افسانے لکھے ہیں۔ راغب شکیب نے ان افسانوں پر تنقیدی نظر بھی ڈالی ہے، جس سے ڈاکٹر صاحب کی افسانہ نگاری کے ساتھ ساتھ خود راغب شکیب کی تنقیدی و تحقیقی صلاحیتوں کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ راغب شکیب کو ہم اب تک شاعر کی حیثیت سے جانتے تھے، لیکن ان کے "حرف آخر" کو پڑھ کر اندازہ ہوا کہ وہ تنقید و تحقیق کے میدان میں بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ کیا اچھا ہو، اگر وہ شاعری چھوڑ کر تنقید و تحقیق کی طرف توجہ کریں۔ اس سے ان کا بھی بھلا ہوگا اور شاعری کا بھی۔

منظر علی خان کے مجموعۂ کلام کے دیباچہ نگار نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ اگر وہ شاعری کی بجائے نثر کی طرف توجہ کریں تو زیادہ کامیاب رہیں گے۔ منظر صاحب نے اس مشورے پر عمل کیا اور آج ان کا شمار ملک کے مشہور مزاح نگاروں اور انشائیہ نویسوں میں ہوتا ہے۔ ان کے مضامین رسالوں میں اس کثرت سے چھپتے ہیں کہ اتنی کثرت سے تو رنگ گورا کرنے والی کریم کے اشتہار بھی نہیں چھپتے۔ راغب شکیب کو منظر علی خاں منظر کے نقش قدم پر چلنا چاہیے، تاکہ اگر وہ گمراہ ہوں تو اس کا الزام منظر صاحب کے سر جائے۔ شعر کہتے رہنے کی صورت میں نتائج کے ذمہ دار وہ خود ہوں گے۔

(۲۹ ربیع ۱۹۸۳ء)

☆..........☆..........☆

ناول نگاری یا فحش نگاری

اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ سب سے بڑا ادبی رسالہ کون سا ہے تو ہم بلا سوچے سمجھے جواب دیں گے۔ "نیرنگ خیال"۔ اور اگر ہمیں سوچنے سمجھنے کے لیے مناسب وقت دیا جائے تو تب بھی ہمارا جواب یہی ہوگا۔ اس رسالے نے اُردو زبان کی ترویج و اشاعت اور اُردو ادب سے دلچسپی عام کرنے میں جو کام کیا ہے، وہ خود اردو زبان کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ خیبر سے راس کماری تک "نیرنگ خیال" کا طوطی بولتا تھا۔ یہ طوطی بولتا تو اب بھی ہے، لیکن ضعیف العمری کی وجہ سے اس کی آواز دب گئی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے:

بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

مسیحا سے مراد سلطان رشک ہیں، جو اس کے مدیر ہیں اور جن کی کوششوں سے یہ تاریخ ساز جریدہ زندہ ہے۔ جناب رشک کی مسیحا نفسی کا تازہ ترین ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے ایک خاصا ضخیم "فن و شخصیت ایڈیشن" شائع کیا ہے، جس کے مطالعے سے ہم ابھی ابھی فارغ ہوئے ہیں۔ میر تقی میر کی طرح ہم اس سے فارغ نہیں ہوئے، بلکہ اس کام میں کئی دن لگے ہیں۔ اس خصوصی شمارے میں متعدد ادیبوں کے فن اور شخصیت پر مقالے ہیں، جن سے پہلی مرتبہ یہ معلوم ہوا کہ ہمارے بعض ادیبوں کے پاس فن بھی ہے اور شخصیت بھی ہے۔ جن ادیبوں پر مقالے شائع کیے گئے ہیں، ان کا انتخاب شاید قرعہ اندازی کے ذریعے ہوا ہے۔ راغب مراد آبادی، جوہر نظامی، شوکت واسطی، وقار انبالوی، تصور کرتپوری، شاہد انوری اور ... خوش قسمت ہیں کہ قرعۂ فال ان کے نام پڑا۔ ان ناموں ہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ... نے کیسی کیسی شخصیتیں اور کیا کیا فنون لطیفہ جمع کیے ہیں۔ خیر یہ بات تو ہم نے ازراہِ مذاق کہی ہے ورنہ اس شمارے میں فراق گورکھپوری، ڈاکٹر تاثیر، فیض، شفیق الرحمٰن، ظہیر کاشمیری، ڈاکٹر وزیر آغا، بانو قدسیہ، افتخار عارف، انور سجاد اور انیس ناگی پر بھی کئی مضامین ہیں۔ سلطان رشک مبارک باد کے لائق ہیں

کہ انھوں نے یہ نمبر بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ کاش اتنی محنت یا اس سے کچھ کم محنت مقالہ نگار حضرات بھی کرتے تو رسالے کا مجموعی معیار بہت بلند ہو سکتا تھا۔ مثلاً ڈاکٹر گوپی چند نارنگ سے اگر ان کے مضمون کی کتابت بھی کروالی جاتی تو یہ مضمون مزید بہتر ہو جاتا۔ ڈاکٹر صاحب خوش گو، خوش شکل اور خوش نظر [illegible] نہیں، خوش خط بھی ہیں۔ وہ لکھتے کیا ہیں، الفاظ و معنا موتی پروتے ہیں۔

آج کل کاتب حضرات کے نرخ بہت بڑھ گئے ہیں، اس مشکل پر قابو پانے کا یہی طریقہ ہے کہ خوش خط مصنفین کے مضامین انھی کے خط میں شائع کیے جائیں۔ اس قسم کا تجربہ عبدالعزیز خالد کر چکے ہیں، انھوں نے اپنی دو یا تین کتابیں بقلم خود شائع کی تھیں، لیکن ان کی بات اور ہے۔ انھیں فائدے کے ساتھ ساتھ نقصان بھی ہوا۔ فائدہ یہ کہ کتابت کے پیسے بچ گئے، نقصان یہ کہ کاتب کی صورت میں انھیں جو واحد قاری دستیاب تھا، وہ بھی ہاتھ سے گیا۔

اس رسالے کے بعض مضامین بہت دلچسپ ہیں مثلاً ڈاکٹر نذیر احمد نے ڈاکٹر تاثیر کے بچپن کے واقعات سنائے ہیں، جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ابتدائے عمر ہی سے بڑے معرکہ آرا قسم کے آدمی تھے۔ ان کی ادبی معرکہ آرائیوں کے پس منظر کو جاننے کے لیے اس مضمون کا مطالعہ بہت مفید ہو سکتا ہے۔ پروفیسر محمد رضا کاظمی نے شفیق الرحمٰن کے بارے میں ایک اچھا تنقیدی مضمون لکھا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انھوں نے شفیق الرحمٰن کی تحریروں کو گھول کر پی لیا ہو۔ سنا ہے کاظمی صاحب نے نظیر صدیقی کی شاعری پر بھی ایک مضمون لکھا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے شاید مزاح کو اپنا مستقل موضوع بنا لیا ہے۔ ویسے بھی شفیق الرحمٰن کی تحریروں کو گھول کر پی لینے کے بعد نظیر صدیقی کی شاعری پر مضمون لکھنے کے علاوہ اور کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا۔

نظیر صدیقی کی بات چلی ہے تو لگے ہاتھوں ان کے اس مقالے کا بھی ذکر کر دیا جائے، جو زیرِ نظر نمبر میں شامل ہے۔ نظیر صاحب نے بانو قدسیہ کے ناول "راجہ گدھ" کو موضوع بنایا ہے اور اس میں بانو قدسیہ کی بجائے راجہ گدھ کے فن اور شخصیت پر بحث کی ہے۔ اس مضمون میں نظیر صاحب نے ناول کے بعض حصے ایسے ذوق و شوق سے نقل کیے ہیں، جیسے یہ ناول بانو قدسیہ کی نہیں، خود ان کی تصنیف ہو۔ ان حصوں کو پڑھ کر یقین نہیں آتا کہ ایک مسلمان خاتون کے قلم سے ایسی فحش نگاری بھی ہو سکتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ایسے الفاظ بھی بے باکی سے استعمال ہوئے ہیں، جو کسی ناول میں تو کیا، کسی لغت میں بھی نظر آ جائیں تو پڑھنے والے شرما جاتے ہیں۔ ہمیں یہ اقتباسات دیکھ کر شبہ ہوا کہ کہیں مقالہ نگار نے کوئی شرارت تو نہیں کی کیونکہ آج کل تنقید اور شرارت بطور مترادفات کے استعمال ہوتے ہیں۔ ہم نے اصل ناول دیکھا تو معلوم ہوا کہ بیچارے نظیر صرف نقل کرنے کے گناہ گار ہیں۔ اور اصل میں تو اس سے بھی زیادہ فحش نگاری کے نمونے [illegible] ہیں۔ افسوس کہ ہم نمونہ کلام کے طور پر اس قسم کا کوئی اقتباس نہیں پیش کر سکے، جنھیں اس قسم کی چیزیں [illegible]

[illegible] ناول ہو، وہ پورا ناول نہ سہی، اس کے صرف دس صفحات (صفحہ ۳۰۴ تا ۳۱۳) پڑھ ڈالیں۔ ہماری یہ دعوت [illegible] اطلاعات کے بزرجمہروں کے لیے نہیں ہے، جو فحاشی کے معاملے میں اتنے حساس ہیں کہ عزیز [illegible] کے ناول "جہنم" کے اقتباسات شائع کرنے پر انجمن ترقی اردو جیسے علمی ادارے کو "شو کاز نوٹس" جاری کر دیتے ہیں۔ محکمۂ اطلاعات والوں سے گزارش ہے کہ اس ناول کے مطالعے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں کیوں کہ اس سے ان کے اخلاق کے مزید بگڑنے کا اندیشہ ہے اور اگر ہمارا کالم پڑھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آیا اور ناول کو پڑھ ہی ڈالیں تو مصنفہ کو شو کاز نوٹس بھیجنے کی جسارت نہ کریں۔ بانو قدسیہ اور ان کے شوہر اشفاق احمد کی سرکار دربار میں اتنی رسائی ہے کہ انھیں شو کاز نوٹس بھیجنا عاقبت نا اندیشی کا ثبوت ہوگا۔

ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے افتخار عارف کی شاعری پر لکھا ہے۔ انھوں نے دلیلوں سے ثابت کیا کہ افتخار عارف اعلیٰ درجے کے شاعر ہیں اور ان کا لب و لہجہ دوسرے شاعروں سے بالکل مختلف ہے۔ اس سلسلے میں فاروقی صاحب نے جو بے شمار دلیلیں پیش کی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے ...."اردو شاعری کے بہت سے نئے اور پرانے دیوان اور مجموعے اب تک نہایت دیدہ زیب اور نظر فریب چھپے ہیں، ان کی اگر کوئی مختصر ترین فہرست بھی بنائی جائے تو افتخار عارف کے مجموعے "مہر دو نیم" کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہوگا۔" یہ دلیل اتنی مضبوط ہے کہ ہم تو کیا، ساقی فاروقی بھی قائل ہو جائیں گے۔

یہ افتخار عارف کے کلام کا اعجاز ہے کہ پاک و ہند کے تقریباً ہر اہم نقاد نے ان کی شاعری کو سراہا ہے۔ انھیں وہ روایتی بین بجانے والا یاد آتا ہے، جس کی بین کی آواز سن کر لوگ اس کے پیچھے چل پڑے۔ ایک مرتبہ وہ بین بجاتا ہوا سمندر میں اتر گیا۔ لوگ اس کے پیچھے پیچھے چلتے رہے۔ بین بجانے والا [illegible] میں [illegible] اور سمندر سے باہر نکل آیا، لوگ وہیں رہ گئے۔ افتخار عارف کی شاعری نے [illegible] نقادوں کے ساتھ یہی سلوک کیا ہے۔

[illegible] کے دوسرے حصے میں عام نوعیت کے مضامین نظم و نثر ہیں۔ جمال پانی پتی اور مظفر [illegible] کے مقالے ہمیں بہت پسند آئے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں نے ہمارے کالموں سے [illegible] کے بعد مقالے لکھے ہیں۔ جمال پانی پتی کے مقالے کا موضوع ہے۔ "سلیم احمد اور دبستانِ [illegible]" اس میں انھوں نے تفصیل سے بتایا ہے کہ دبستان قرون والے محمد حسن عسکری اور سلیم احمد کی مخالفت [illegible] سے کرتے رہے ہیں۔ جمال پانی پتی صاحب نے اپنے مقالے میں وزن اور وقار پیدا کرنے کے لیے ہمارے دو پورے کے پورے کالم بطور اقتباس درج کیے ہیں۔ بالکل ویسے ہی، جیسے ڈاکٹر [illegible] نے غالب پر مضمون لکھتے ہوئے پورا دیوانِ غالب نقل کر دیا تھا۔ اس پر کسی ستم ظریف نے [illegible]: "مضمون تو میری بھی یہی تھی، لیکن کیا کروں غالب کا دیوان ہی مختصر تھا۔"

[illegible] پانی پتی صاحب نے ہمارے کالم نقل کرنے کے ساتھ ہمارا حوالہ بھی دیا ہے، حالاں کہ اس کی

ضرورت نہیں تھی۔ شاید یہ احتیاط انھوں نے اس لیے برتی ہے کہ کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ پورا مضمون [illegible] لکھا ہوا ہے، حالاں کہ یہ اندیشہ بالکل غلط ہے۔ جمال پانی پتی نثر لکھیں یا نظم، ان کا انداز منفرد ہے [illegible] میں اور ان میں یہ فرق ہے کہ ہم اپنی تحریروں میں کوشش کر کے مزاح پیدا کرتے ہیں، جمال صاحب کو [illegible] خاص کوشش نہیں کرنی پڑتی۔

مظفر علی سید نے باقاعدہ حوالہ دے کر ہمارے ایک جملے پر اپنے مضمون کی بنیاد رکھی ہے۔ ہمارا [illegible] یہ ہے۔ ”ہمارے ملک میں کسی نے تاریخ بنائی ہے نہ لکھی ہے، ہم تو بس اپنے جغرافیے ہی کو بگاڑتے رہے ہیں۔“ ...... بنیاد چوں کہ مضبوط تھی، اس لیے سید صاحب کا مقالہ خاصا فکر انگیز ہے۔

ہمیں خوشی ہے کہ صاحبانِ فکر و نظر ہمارے کالموں سے سنجیدہ مقالوں میں فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جوابی کارروائی کے طور پر آیندہ ہم بھی ان صاحبانِ فکر و نظر کی تحریروں سے اپنے کالموں میں استفادہ کریں گے۔ بہرحال ہمارے کسی کالم یا جملے کا جمال پانی پتی اور مظفر علی سید جیسے پڑھے لکھے لوگوں کو پسند آنا ہماری عزت افزائی ہے۔

ہم کالم لکھ چکے تھے کہ یہ اطلاع ملی کہ جناب مظفر علی سید عارضۂ قلب کے علاج کے لیے [illegible] تشریف لے گئے ہیں، جہاں کراموبل اسپتال میں ان کا آپریشن ہوگا۔ ہماری دعا ہے کہ [illegible] کامیاب ہو اور سید صاحب صحت یاب ہو کر جلد وطن واپس آ جائیں۔ قارئینِ کرام سے بھی درخواست [illegible] وہ سید صاحب کی صحت یابی کے لیے دعا کریں۔ اگر ہمارا یہ کالم جناب ساقی فاروقی اور جناب افتخار عارف کی نظر سے گزرے تو ان دونوں سے گزارش ہے کہ وہ لندن میں سید صاحب کی عیادت کرتے رہیں [illegible] انھیں دیارِ غیر میں اجنبیت محسوس نہ ہونے دیں اور اگر کسی خدمت کی ضرورت ہو تو اس سے بھی دریغ [illegible] فرمائیں۔ سادات کی خدمت تو ویسے بھی ہمارا فرض ہے اور سید صاحب تو علم و فضل کے اعتبار سے بھی [illegible] مقام پر فائز ہیں۔

(۱۳/ جولائی ۱۹۸۴ء)

☆............☆............☆

محقق یا ادبی گورکن

[illegible] گوپی چند نارنگ کا پاکستان میں چند روزہ قیام اس اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ وہ اپنے [illegible] یادیں، خوبصورت تصویروں اور فکر انگیز انٹرویوز کا ایک انبار چھوڑ گئے ہیں، جو اب تک [illegible] اور کالم نگاروں کے کام آ رہا ہے۔ گزشتہ دو مہینوں کے اخبارات کے ادبی ایڈیشن دیکھیے [illegible] میں ہمارے ڈاکٹر نارنگ اور عطاء الحق قاسمی کے اور کچھ نظر نہیں آئے گا۔ قاسمی صاحب پہلے بھی [illegible] لیکن جب سے انھیں اے پی این ایس کی طرف سے بہترین کالم نگار کا ایوارڈ ملا ہے، [illegible] میں ان کی دھوم مچ گئی ہے۔ ان کے اعزاز میں پے در پے استقبالیے، ظہرانے، عصرانے اور [illegible] یہ سب باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہیں، مگر ہم تو قاسمی صاحب کو ایوارڈ ملنے سے پہلے بھی [illegible] تھے اور اگر آگے چل کر کسی وجہ سے خدانخواستہ یہ ایوارڈ واپس لے لیا گیا یا انھوں نے [illegible] رفتہ سمجھ کر خود ہی واپس کر دیا تو پھر بھی ہم انھیں بہترین کالم نگار [illegible] گے۔ ہماری دعا ہے کہ عطاء الحق قاسمی کے درجات میں مزید اضافہ ہو اور اگلے سال انھیں [illegible] ایوارڈ بھی مل جائے۔ شاعری کا ایوارڈ آخر کسی نہ کسی کو تو ملنا ہی ہے۔ تو کیوں نہ کسی ایسے [illegible] اس کے بہانے لوگوں کو ظہرانوں، عصرانوں اور عشائیوں میں شرکت کا موقع ملے۔ قاسمی [illegible] کے لیے ہی نہیں، ان سے محبت کرنے والوں کے لیے بھی تقویتِ قلب کا باعث

[illegible] نارنگ صاحب کی ۱۳/ جولائی کے ایک اخبار میں ان کا ایک انٹرویو شائع ہوا [illegible] انھوں نے اردو میں تحقیق کے حوالے سے بڑی فکر انگیز باتیں کی ہیں۔ مثلاً انھوں نے یہ کہا [illegible] طرف دار نہیں، سخن فہم ہونا چاہیے۔ محققوں پر اتنی کڑی شرط لگانا زیادتی ہے اور [illegible] کا اندیشہ ہے، کیوں کہ جو سخن فہم ہوگا، وہ تحقیق میں کیوں جان کھپائے گا، کوئی

بہتر اور مفید کام کرے گا۔ تحقیق کی طرف تو جاتے ہی وہی لوگ ہیں، جو سخن فہم اور سخن شناسی کی منزل سے آگے نکل جاتے ہیں۔ ہم نے بہت سے ایسے محقق دیکھے ہیں، اگر ان کے سامنے اچھا شعر پڑھا جائے تو شعر سن کر خوش ہونے کی بجائے یہ سوچنے لگتے ہیں کہ شعر کے کسی مصرعے سے شاعر یا اس کے کسی [illegible] مادہ تاریخ وفات برآمد کیا جا سکتا ہے۔ ایک مرتبہ ہم نے ایک محقق کے سامنے میر کا یہ شعر پڑھا:

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

شعر سن کر وہ جھوم اٹھے اور فرمایا: "لفظ چراغ پر غور کیجیے، کیا برمحل استعمال ہوا ہے۔ چراغ کے عدد ہیں ۱۲۰۴۔ یہی میر کے بیٹے کا ہجری سالِ وفات ہے۔" ہم نے عرض کیا: "اس شعر کا میر کے بیٹے کی وفات سے کیا تعلق؟" کہنے لگے: "اس قسم کے شعر ایسے ہی موقعوں پر کہے جاتے ہیں۔"

بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں محقق عموماً وہی ہوتے ہیں، جن کے پاس ضرورت سے زیادہ وقت ہوتا ہے۔ یہ لوگ کرم خوردہ، آب رسیدہ، دریدہ، بوسیدہ اور سرد و گرم زمانہ چشیدہ کتابوں اور [illegible] شاعروں کے بارے میں ایسی معلومات فراہم کرنے میں عمریں بسر کر دیتے ہیں، جن سے ادب کو [illegible] محقق حضرات کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، بلکہ الٹا نقصان ہی پہنچتا ہے کہ پہلے نظر، پھر سماعت اور مجموعی صحت خراب ہو جاتی ہے اور جب ان محققوں کے نتائجِ تحقیق سامنے آتے ہیں تو ان سے [illegible] کرنے والوں کی صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔

ایک صاحب نے اپنی عمرِ عزیز کے دس سال اس مسئلے کو حل کرنے میں صرف کر دیے کہ میر نے [illegible] سے دہلی کا سفر پیادہ طے کیا تھا یا گاڑی کے ذریعے، لیکن وہ کسی نتیجے تک نہ پہنچ سکے۔ ہم نے ان سے کہا:

"میر خواہ مخواہ دہلی سے لکھنؤ گئے۔ اپنا وقت بھی ضائع کیا اور آپ کا بھی۔"

انھوں نے فرمایا:

"میر کا وقت ضائع ہوا ہوگا، لیکن الحمد للہ کہ میرا وقت ضائع نہیں ہوا۔ اس تمام عرصے میں مجھے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی طرف سے تحقیقاتی وظیفہ ملتا رہا۔"

ہم نے ایک مرتبہ اپنے ایک محقق دوست سے کہا:

"حضرت! آپ پرانے شاعروں پر ہی تحقیق کرتے رہتے ہیں، کبھی زمانہ حال کے شاعروں کی طرف بھی توجہ کیجیے۔ ہمارے زمانے میں قتیل شفائی، صہبا اختر اور محسن بھوپالی جیسے متعدد شاعرانِ نغز گفتار موجود ہیں۔ آخر آپ ان پر تحقیق کیوں نہیں کرتے۔"

جنابِ محقق نے فرمایا:

"مجھے کسی شاعر سے اس وقت تک دلچسپی پیدا نہیں ہوتی، جب تک اس کے انتقال کو کم از کم

سو برس نہ گزر چکے ہوں۔"

ہم نے عرض کیا:

"یہ تو قتیل شفائی وغیرہ سے بڑی زیادتی ہے۔"

انھوں نے جواب دیا:

"جی نہیں! ایک سو برس بعد کوئی محقق انھیں ضرور تلاش کرے گا اور دلائل سے ثابت کر دکھائے گا کہ یہ لوگ اپنے زمانے میں بہت مشہور تھے۔"

یہ سن کر ہمیں غصہ آ گیا اور ہم نے کہا:

"تو کیا یہ شاعرانِ نغز گفتار سو سال بعد کے محققوں کے لیے شاعری کر رہے ہیں۔"

انھوں نے فرمایا:

"یاد رکھیے، ہر دور میں ننانوے فیصد شاعروں کی شاعری محققوں کے کام آتی ہے۔ صرف ایک فیصد کی شاعری عام لوگوں کے مطلب کی ہوتی ہے۔"

ڈاکٹر نارنگ نے پاکستان اور ہندوستان میں تحقیق کی صورتِ حال کو نہایت عمدگی سے واضح کیا ہے [illegible] ایسے لوگوں کو بھی محقق ہونے کی سند عطا فرمائی ہے، جو خود محتاجِ تحقیق ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے [illegible] اشاریہ سازی کا کام کیا ہے اور اتنے محققوں کے نام گنوائے ہیں کہ ہمیں اس تعداد سے خوف [illegible]۔ محققوں کو عام طور پر ادبی گورکن کہا جاتا ہے، گورکنوں کی تعداد کا بڑھ جانا کوئی اچھی بات نہیں۔

ڈاکٹر نارنگ نے محققوں کی درجہ بندی بڑی خوش اسلوبی سے کی ہے۔ ایک گروہ انھوں نے لسانی [illegible] دریافت کیا ہے [illegible] فرمایا ہے کہ ڈاکٹر شوکت سبزواری نے ڈاکٹر ابواللیث صدیقی اور شان الحق حقی کے ساتھ مل کر لغتِ کبیر کے سلسلے میں بنیادی کام کیا تھا۔ نارنگ صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ یہ واقعہ [illegible] سبزواری کی وفات سے پہلے کا ہے یا بعد کا۔ ہمیں تو یہ معلوم ہے کہ ایک زمانے میں شوکت سبزواری اور شان الحق حقی نے مل کر لغت کا کام کیا تھا، جو آج کل ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے نام سے شائع [illegible]۔ لیکن ہمیں اس پر اعتراض نہیں، کیوں کہ اس قسم کے واقعات و حادثات ادبی دنیا میں پہلے بھی [illegible]۔ ایک صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ "بانگِ درا" میں جو [illegible] کلام ہے، وہ علامہ اقبال کا [illegible] اقبال علی پوری کا ہے، اسی لیے تو بعض لوگ ثانی الذکر کو علامہ اقبال [illegible] پوری کہتے ہیں۔

ڈاکٹر نارنگ نے ایک بات یہ بھی کہی ہے کہ جو شخص جتنا بد ذوق ہے اور کسی انتہائی معمولی قدیم نسخے [illegible]، وہ اتنا ہی بڑا محقق سمجھا جاتا ہے۔ .... گویا ڈاکٹر صاحب دوسرے لفظوں میں یہ [illegible] کہ محقق ہونے کے لیے بد ذوق ہونا ضروری ہے۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ اصل [illegible] جو اپنے پیچھے اپنے کلام کا انتہائی معمولی نسخہ چھوڑ گیا۔ لہٰذا ہماری تجویز یہ ہے کہ زمانہ حال

کے شعرائے کرام اپنا کلام خود ہی ضائع کر دیں، تاکہ مستقبل کے مورخ کو بدذوقی کے الزام سے بچایا جا سکے۔ امید ہے شعرائے کرام ہماری اس تجویز پر کم از کم اتنی سنجیدگی سے ضرور غور فرمائیں گے، جتنی سنجیدگی سے وہ شعر کہتے ہیں۔

ادب کی خدمت محقق بہتر طور پر کر رہے ہیں یا شاعر، اس کا اندازہ آپ ایک واقعے سے کر سکتے ہیں۔ ایک شاعر نے اپنا مجموعہ کلام ایک محقق کو پیش کیا۔ محقق نے اسے ادھر اُدھر سے دیکھا اور کہا:

"آپ نے اتنا عمدہ کاغذ ضائع کر دیا۔ اگر یہ کتاب سادہ اوراق پر مشتمل ہوتی تو میں اس پر اپنی کچھ تحقیقی یادداشتیں لکھ لیتا۔"

شاعر نے جواب دیا:

"کاغذ تو اس صورت میں بھی ضائع ہو جاتا۔"

(۲۰ جولائی ۱۹۸۴ء)

☆......☆......☆

دیباچہ لکھا ہے یا جھک ماری؟

(۱)

ہمارے عہد کے وہ چند اہل قلم، جن کا نام تاریخ ادب میں ہمیشہ زندہ رہے گا، ان میں جناب نظیر صدیقی بھی شامل ہیں۔ اگرچہ وہ نقاد، انشائیہ نویس، طنز و مزاح نگار اور شخصیت نگار اونچے درجے کے ہیں، لیکن تاریخ ادب میں انھیں اس وجہ سے بھی یاد رکھا جائے گا کہ وہ ہمارے کالم کا مستقل موضوع ہیں۔ جب ہمیں کوئی موضوع نہیں سوجھتا تو جناب صدیقی ہماری رہنمائی فرماتے ہیں اور ہمارے کالم کی رونق بڑھا دیتے ہیں۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم نے صدیقی صاحب کی تمام تصانیف کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، جس کے نتیجے میں ہمارے علم ہی میں نہیں، مشکلات میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ علم میں اضافے کا سبب تو ظاہر ہے کہ صدیقی صاحب کی تحریریں ان کے علم و فضل کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ مشکلات میں اضافے کی وجہ یہ ہے کہ صدیقی صاحب کی جب کوئی کتاب شائع ہوتی ہے تو ہم سب کام چھوڑ کر اسے پڑھتے ہیں اور پھر پڑھنے کے بعد بھی ایک عرصے تک کوئی کام کرنے کے لائق نہیں رہتے۔ ادھر کچھ عرصے سے صدیقی صاحب سال میں کم از کم دو کتابیں ضرور شائع کرتے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے علم اور مشکلات میں کس ناگفتہ بہ حد تک یہ اضافہ ہو چکا ہے۔

صدیقی صاحب کی تازہ ترین کتاب "[illegible] جو مرے نام آئے" ہے، جو ابھی چند روز پہلے طبع ہوئی ہے اور جس میں انھوں نے اکہتر مشاہیر، معاصرین اور قارئین کے وہ خطوط یکجا کر دیے ہیں، جو گزشتہ برسوں میں ان کے نام وصول ہوئے۔ مکتوب نگاروں میں اس عہد کے تقریباً سبھی اہم ادیب شامل ہیں، مثلاً سید سلیمان ندوی، بابائے اردو مولوی عبدالحق، وحشت کلکتوی، جوش ملیح آبادی، رشید احمد صدیقی، ڈاکٹر عندلیب شادانی، ڈاکٹر سید عبداللہ، پروفیسر احتشام حسین، آل احمد سرور، محمد حسن عسکری، احمد ندیم قاسمی، کنہیا لال کپور، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، مختار مسعود اور سلیم احمد وغیرہ۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ نظیر صدیقی کی دوسری کتابوں سے زیادہ فکر انگیز اور

دلچسپ ہے۔ صدیقی صاحب کی تمام کتابیں ان کی ذاتی کاوش کا نتیجہ ہیں اور یہ کتاب اکہتر افراد کی کوششوں کی حامل ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک کے مقابلے میں اکہتر افراد کی لکھی ہوئی کتاب میں سوچنے کے لیے زیادہ مواد ہوگا۔ اس کتاب کے دلچسپ ہونے کا سبب یہ ہے کہ تمام خطوط صدیقی صاحب کے نام ہیں۔ ان کے بارے میں بھی ہیں۔ صدیقی صاحب کی شخصیت اتنی پرکشش ہے کہ ان کے بارے میں جو لکھا جائے یا کام ان کا دلچسپ ہونا لازمی ہے۔

کتاب کے دیباچے میں صدیقی صاحب لکھتے ہیں:

"ممکن ہے، میرے بعض کرم فرما ان خطوط کی اشاعت کو میری خود ستائی اور خود نمائی پر محمول کرنے سے دریغ نہ کریں، لیکن ایسا کرنا غیر منصفانہ ہوگا، کیوں کہ میں شہرت اور اہمیت کے حصول کے لیے یہ خطوط شائع نہیں کر رہا ہوں، بلکہ شہرت اور اہمیت کے حصول (جتنی شہرت اور اہمیت میرے حصے میں آنا تھی، آ چکی ہے) کے بعد (اور مدتوں بعد) یہ خطوط شائع کر رہا ہوں۔ اصل مقصد ان خطوط کی حفاظت ہے، جو کسی نہ کسی اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں۔"

ہمیں صدیقی صاحب کی اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ انھیں جتنی شہرت اور اہمیت ملنا تھی مل چکی ہے، اس میں اضافے کی گنجائش نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ انھیں مزید شہرت اور اہمیت ابھی [illegible] حاصل ہوگی اور اس کا سبب یہی زیر تبصرہ کتاب ہوگی۔

صدیقی صاحب کی یہ بات درست ہے کہ انھوں نے یہ کتاب خود ستائی اور خود نمائی کے مقصد سے شائع نہیں کی، کیوں کہ یہ مقصد تو وہ اپنے تنقیدی مضامین سے حاصل کر لیتے ہیں، البتہ ہمیں اندیشہ ہے کہ زیر نظر کتاب کے بعض حصوں کو ان کے نادان دوست غلط معنی پہنانے کی کوشش کریں گے، کیوں کہ کتاب میں کچھ ایسی باتیں بھی آ گئی ہیں، جو عموماً زبان قلم پر نہیں آتیں۔ مثلاً کون ہے، جو اپنے بارے میں ایسی باتیں سنے گا اور پھر انھیں دوسروں تک پہنچائے گا۔

(۱) "آپ کے اشعار پڑھنے کے بعد کوئی لطف حاصل نہیں ہوتا۔" (نیاز فتح پوری، صفحہ ۵۱)

(۲) "(آپ کے) مضامین کی روح مدرسانہ ہے، یہ بڑا سخت آزار ہے۔ کیا آپ اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔" (سلیم احمد، صفحہ ۱۱۳)

(۳) "میں تمھاری طرف سے کافی تشویش میں ہوں، یعنی تمھاری تحریروں کی طرف سے۔ جب پچھلی بار کراچی آئے اور تم نے جو کچھ لکھا، اس میں واضح طور پر ایک انحطاط تھا۔ کچھ عرصے کے لیے باقاعدہ طور پر لکھنا پڑھنا دونوں بند کر دو۔" (سلیم احمد، صفحہ ۱۱۶)

(۴) "شاعری تمھاری طاقت نہیں، تمھاری کمزوری ہے۔" (سلیم احمد، صفحہ ۱۵۳)

(۵) "حسرت اظہار" میں شائع شدہ اشعار کی تعداد ۲۱۵ ہے۔۔۔۔ "ان میں سے مجھے بس ایک [illegible] ملا۔" (حسرت عارفی، صفحہ ۲۳۰)

(۶) "تمھیں شرم نہیں آتی، صہبا لکھنوی کو کتابیں بھیجتے ہو اور میرے خط کا جواب تک نہیں دیتے۔ اس کی تو سب پر عیاں ہے لیکن تمھارے جادو پرستانہ مزاج کا میرے سوا کسی کو علم نہیں۔ جہاں تم نے مالی لحاظ یا عہدے کے لحاظ سے کسی کو دیکھا، وہاں جھک گئے اور تماشا کی لاش کو روندتے گزر گئے۔ نہ معلوم تمھیں عقل کب آئے گی۔" (کامل القادری، صفحہ ۱۷۲)

اس اقتباس میں جہاں نقطے لگائے گئے ہیں۔ وہاں ایک ایسا لفظ تھا، جسے درج کرنا جناب صہبا لکھنوی تک کے لیے شایانِ شان نہیں تھا، اس لیے یہ لفظ حذف کیا گیا۔ قارئین یہاں اپنی پسند کا کوئی بھی لفظ فرض کر کے جملہ مکمل کر لیں۔

مذکورہ چند اقتباسات محض بطور نمونہ درج کیے گئے ہیں، ورنہ اکثر مکتوب نگاروں نے مکتوب الیہ سے اس طرح کی بے تکلفی کا اظہار کیا ہے کہ اسے نقل کرنا بھی ہمارے لیے ممکن نہیں، کیوں کہ ہم بے تکلفی اور بے ادبی میں فرق کرنا جانتے ہیں۔ حیرت ہے کہ نظیر صدیقی نے تنقید لکھ کر اور شاعری کر کے کون سا ثواب کمایا تھا کہ اب خطوں کا یہ مجموعہ بھی چھاپ ڈالا، جو پڑھنے والوں کی رائے کو اس حد تک متاثر کرتا ہے کہ انھیں ایسا محسوس ہوتا ہے ان بیانات کے درست ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔

اس مجموعے سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ نظیر صدیقی نے جتنا وقت کتابیں لکھنے میں صرف کیا ہے، اس سے کہیں زیادہ وقت انھوں نے اپنی کتابوں کے بارے میں دوسروں کی آرا جاننے میں صرف کیا ہے۔ شاید ہی کوئی مکتوب نگار ہوگا، جسے صدیقی صاحب نے مشکل میں نہ ڈالا ہو۔ کوئی فلیپ لکھ کر بھیج رہا ہے، کوئی اپنی معذرت کر رہا ہے اور کوئی خوبصورتی سے ٹال رہا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سید عبداللہ نے دلچسپ انداز کا اظہار کیا ہے۔ نظیر صدیقی نے اپنا ایک مضمون بھیج کر ڈاکٹر صاحب سے ان کی رائے طلب کی، ڈاکٹر صاحب نے جواب میں لکھا۔ "میں کوتاہ مجمل آرا کے حق میں نہیں ہوں ۔۔۔۔ کبھی موقع ملا تو ان شاء اللہ آپ کے کام پر مفصل اظہار رائے کروں گا۔ آپ نے مجھ پر اعتماد کیا ہے۔ اور اس کے جواب میں اس قدر دیر سے آپ ناراض تو ہوں گے مگر کیا کروں مجبوری ہے۔" (صفحہ ۲۰۴)

یہ خط ۱۹۵۷ء کا ہے۔ ۲۷ برس گزر چکے ہیں اور ابھی تک ڈاکٹر صاحب نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ اگر یہ کالم ڈاکٹر صاحب کی نظر سے گزرے تو ہم ان سے عرض کریں گے کہ اب تو وعدہ پورا کر دیجیے کیوں کہ ہر کوئی حد ہوتی ہے۔ آپ نے جب وعدہ کیا تھا تو اس وقت تک نظیر صدیقی کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی اور اب تو خدا کے فضل سے ایک درجن سے زیادہ کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور اتنی ہی زیر طبع ہیں۔

نظیر صدیقی نے اپنی تصانیف پر دوسروں کا ردعمل جاننے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیا ہے۔

صرف ادیبوں ہی سے نہیں، جسٹس کیانی اور جسٹس ایس اے رحمٰن جیسے ججوں سے بھی رائے مانگی ہے۔ وہ تو یہ کہیے کہ یہ حضرات نرم دل تھے۔ کوئی اور جج ہوتا تو رائے بھیجنے کی بجائے توہینِ عدالت کا نوٹس بھجوا دیتا۔ نظیر صدیقی کا مجموعۂ کلام ''حسرتِ اظہار'' مخلوط خاندانی منصوبہ بندی کے پمفلٹوں کی طرح مختلف اور ان پمفلٹوں ہی کی طرح وسیع پیمانے پر تقسیم کیا گیا تھا۔ شاید ہی کوئی خط ہوگا، جس میں ''حسرتِ اظہار'' کا ذکر نہ ہو۔ بعض حضرات نے اس پر رائے دینے میں کوتاہی کی تو ان سے کہا گیا کہ اپنے پسندیدہ اشعار کی نشاندہی کر دیجیے۔ بعض نے یہ فرمائش پوری کر دی، بعض ٹل گئے تو ان سے کہا گیا کہ یہی بتا دیجیے کہ پسندیدہ اشعار کون کون سے ہیں۔ اس صورتِ حال کے نتیجے میں زیرِ تبصرہ مجموعۂ خطوط اچھا خاصا مجموعۂ اشعار بن گیا ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق نظیر صدیقی کا ہر شعر کم از کم چار مرتبہ درج ہوا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ''حسرتِ اظہار'' پانچ مرتبہ شائع ہوئی ہے۔ ایک ایڈیشن تو وہ، جو الگ شائع ہوا اور چار ایڈیشن یہ، جو مجموعۂ مکاتیب میں شامل ہیں۔

یہ عجیب بات ہے کہ نظیر صدیقی ایک طرف تو یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنے بارے میں دوسروں سے لکھوائیں اور دوسری طرف جب ان سے کسی اور کے بارے میں کچھ لکھنے کو کہا جاتا ہے تو بعض اوقات ٹال جاتے ہیں۔ شفقت کاظمی مرحوم نے انھیں ایک تعریفی خط لکھ کر اپنے مجموعۂ کلام پر دیباچہ لکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ پھر ایک مشترکہ دوست کے ذریعے دباؤ ڈالا۔ نظیر صدیقی نے مجبور ہو کر دیباچہ لکھ دیا اور شفقت کاظمی کو بھیج دیا۔ کاظمی مرحوم نے دیباچے کے جواب میں یہ تین حرف لکھ بھیجے: ''یہ آپ نے دیباچہ لکھا ہے یا جگہ ماری ہے۔'' نظیر صدیقی چاہتے تو اس جملے کو زیرِ نظر مجموعے میں شامل نہ کرتے، لیکن ہر معاملے میں دستاویزی ثبوت فراہم کرنے کی عادت نے انھیں ایسا نہ کرنے دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ شفقت کاظمی مرحوم کی نظر سے صرف دیباچہ گزرا تھا، انھوں نے صدیقی صاحب کا کبھی کوئی تنقیدی مضمون نہیں پڑھا تھا، ورنہ نہ جانے وہ کتنے مشتعل ہوتے اور کیا کچھ کہہ گزرتے۔

(۲۷ جولائی ۱۹۸۳ء)

(۲)

ہم نے نظیر صدیقی کی نئی کتاب ''نامے جو میرے نام آئے'' کے حوالے سے جو کالم لکھا تھا، اس میں جگہ کی کمی کی وجہ سے صرف مکتوب الیہ کی خوبیوں کا ذکر کیا جا سکا تھا۔ اس مرتبہ ہمارے پیشِ نظر کتاب کی خوبیاں ہیں۔ ہم کوشش کریں گے کہ نظیر صدیقی کا ذکر بالکل نہ ہو، یہاں تک کہ ہم کتاب کے سرورق کے حوالے سے بھی گفتگو نہیں کریں گے، جس پر نظیر صدیقی کی وہ تصویر شائع کی گئی ہے جو تقریباً بیس برس پہلے ایک رسالے میں شائع ہوئی تھی، جس کا ذکر ایک مکتوب نگار نظام صدیقی نے اپنے ایک خط میں کیا ہے۔ نظام صدیقی لکھتے ہیں:

''آپ کی تصویر میں نے انھیں (فراق گورکھپوری کو) دکھائی تو برجستہ کہا...... برخوردار

کی صورت اچھی پائی...... پھر پروفیسر احتشام حسین کی اور اپنی تصویر دیکھ کر ہنسے اور بولے نظیر نے بھی احتشام کی طرح شادی وادی سے پہلے کی تصویر شائع کر کے قارئین کے احساسِ جمال کی تسکین کا سامان مہیا کیا ہے۔'' (صفحہ ۲۸۵)

ہم اس تصویر کے بارے میں یہ بھی نہیں بتائیں گے کہ اسے کتاب کے سرورق پر اس انداز سے لگایا گیا ہے، جیسے تلاشِ گم شدہ کے اشتہاروں میں تصویریں چھپتی ہیں۔ اوپر کی طرف تصویر، دائیں بائیں حلیہ اور نیچے تفصیلات، یعنی گم شدہ کا سراغ دینے والے کو انعام مع کرایہ آمد و رفت ملے گا...... اگرچہ ہم کسی انعام کے لالچ کے بغیر یہ کالم لکھ رہے ہیں۔

اور یہ ہے مطلب...... اس مجموعے کی تشکیل میں یوں تو اکہتر اہلِ قلم نے حصہ لیا ہے، لیکن مجموعے کی جان سلیم احمد کے خطوط ہیں، جن سے یہ حقیقت پہلی مرتبہ سامنے آتی ہے کہ سلیم احمد بڑے نقاد اور شاعر ہی نہیں، مکتوب نگار کی حیثیت سے بھی بلند مرتبے پر فائز ہیں۔ اس مجموعے میں ان کے خطوط تین درجن سے زیادہ ہیں اور ہر خط اپنی جگہ ایک چھوٹا سا مقالہ ہے۔ سلیم احمد نے متعدد ادبی مسائل پر بھی فکر انگیز باتیں لکھی ہیں اور اسلوب بھی نہایت دل کش ہے۔ ان خطوط کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ کاش کوئی سلیم احمد کے خطوط جمع کر کے انھیں کتابی صورت میں شائع کر دے۔ سلیم احمد کے خطوط کا مجموعہ اردو خطوط کے ذخیرے میں قابلِ قدر اضافہ ہوگا۔

مسائل کے ساتھ ساتھ افراد کے بارے میں بھی سلیم احمد نے اپنے باغ و بہار اسلوب میں بڑی دلچسپ باتیں لکھی ہیں، مثلاً ایک جگہ نثری نظم پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

''میرے خیال میں سب سے اچھی لا عروضی نظمیں احمد ہمیش نے لکھی ہیں۔ قمر جمیل بیچ میں خواہ مخواہ کو بڑے بنے ہیں اور اب تک ایک بھی قابلِ ذکر لا عروضی نظم نہیں لکھ سکے ہیں۔ ویسے کراچی میں انھوں نے اس کے نظریہ ساز کی حیثیت حاصل کر لی ہے، جو میرے خیال میں ان کے استحقاق سے زیادہ ہے۔ ایک زمانے میں جب وہ محبوب خزاں کے اثر میں تھے تو ... کو شاعری کا اہم ترین جزو تصور کرتے تھے۔ اب وہ اس سے منحرف ہو گئے ہیں۔ کیا سچے ادیب اور شاعر کے نظریات اس طرح موسموں کے تغیرات بدلا نہیں کرتے۔''

ہمیں خوشی ہے کہ احمد ہمیش کی نثری نظموں کے بارے میں سلیم احمد کی رائے بہت اچھی تھی، ورنہ ہم نے عام طور پر یہی دیکھا ہے کہ بے چارے احمد ہمیش کے بارے میں رائے دیتے وقت لوگ یا تو بہت بخل سے کام لیتے ہیں یا پھر بہت بے احتیاطی سے کام لیتے ہیں۔ سلیم احمد پہلے شخص ہیں، جنھوں نے انصاف سے کام لے کر احمد ہمیش کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا۔ نظیر صدیقی یہ سمجھے کہ سلیم احمد نے ذاتی تعلقات کی بنا پر ایسا کیا، انھوں نے جب اپنے اس خدشے کا اظہار کیا تو سلیم احمد نے ایک دوسرے خط میں واضح طور پر لکھا

کہ ......'' احمد ہمیش سے میرا کوئی ذاتی تعلق نہیں ہے۔'' (صفحہ ۱۳۸) .... سلیم احمد ہی نہیں، شہر کے دیگر عافیت پسند ادیب بھی ذاتی تعلقات قائم کرنے میں خاصے محتاط ہیں۔

ہمارا بھی احمد ہمیش سے کوئی تعلق نہیں ہے، لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ مردِ آزاد بلا کا ذہین ہے اور ادبی قد و قامت کے اعتبار سے بہتوں سے بلند و بالا ہے، مگر المیہ یہ ہے کہ اسے ادبی سرگرمیوں کی بجائے غیر ادبی حرکات و سکنات کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ کاش! احمد ہمیش صرف افسانے اور نثری نظمیں لکھیں، صلاح الدین پرویز کے لکھے پر وجد میں آنا چھوڑ دیں۔

سلیم احمد نے قمر جمیل کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، ہم اس پر رائے زنی کا حق نہیں رکھتے، کیوں کہ سلیم احمد ہم سے زیادہ قمر جمیل کو جانتے تھے۔ ہمیں تو صرف اس پر حیرت ہے کہ قمر جمیل ایک زمانے میں محبوب خزاں کے اثر میں بھی رہ چکے ہیں۔ جیسے محبوب خزاں کا اثر اردو شاعری پر کبھی قمر جمیل پر دیکھا جا سکتا ہے۔

سلیم احمد نے جمعرات کے جمعرات نظریات بدلنے کی جو بات لکھی ہے، وہ اب درست نہیں رہی۔ یہ کام اب جمعہ کے جمعہ ہوتا ہے، کیوں کہ قمر جمیل کا کالم جمعہ کے روز چھپتا ہے۔

سلیم احمد کے بعد زیرِ نظر مجموعے میں رشید احمد صدیقی کے خطوط بہت دلچسپ ہیں۔ ان خطوں سے ان کی شخصیت کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، مثلاً ایک بات تو یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے مخالفین کے بارے میں سخت سے سخت لفظوں میں ناپسندیدگی کا اظہار کرتے تھے۔ کسی صاحب نے نظیر صدیقی سے رشید صاحب کی برائی کی۔ اس کی اطلاع رشید صاحب کو ہوئی تو انھوں نے ایک خط میں لکھا:

'' حال ہی میں آپ کو جن صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا، ان کی تحریر و تقریر سے آپ بالکل مایوس اور ملول نہ ہوں۔ ان کو آپ سے یا آپ کی کتاب سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کا روئے سخن تمام تر میری طرف تھا۔ اس طرح کی باتیں وہ اکثر میرے بارے میں لکھ چکے ہیں۔ نئی تحقیقات کی رُو سے یہ مان لیا گیا ہے کہ انسان دراصل حیوان ہی کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بہتوں کی شکل تو انسانوں جیسی ضرور ہو گئی ہے، لیکن خواص جوں کے توں جانوروں کے ہیں۔ ڈارون کی تحقیقات تو یہ ہے کہ بندر کی قسم نے انسان کی شکل اختیار کر لی۔ میرا کچھ ایسا خیال ہے کہ بعض افراد ایسے بھی ہیں، جنھوں نے بندر سے ادنیٰ درجے کے کسی جانور کی ترقی یافتہ شکل و سیرت پائی ہے۔'' (صفحہ ۳۷)

ترقی پسندوں کے بارے میں ایک جگہ رشید صاحب لکھتے ہیں:

'' گرم ممالک میں لڑکے لڑکیاں بالغ بہت جلد ہو جاتی ہیں، عاقل بہت دیر میں ...... ہندوستان کے ترقی پسند شاعر ادیبوں کا یہی حال ہے۔ کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ عقل کی سرحد تک پہنچتے پہنچتے بلوغت سے فارغ ہو چکے ہوتے ہیں۔ جیسے آزادی سے پہلے

رئیسوں اور والیانِ ریاست کا حال تھا۔'' (صفحہ ۳۰)

دیگر مکتوب نگاروں میں پروفیسر اختر انصاری، جمیل مظہری اور احمد ندیم قاسمی کے خطوط بہت دلچسپ ہیں۔

پروفیسر اختر انصاری ایک جگہ فیض کے بارے میں لکھتے ہیں:

'' فیض کو میں ایک معمولی شاعر سمجھتا ہوں کہ نہ تو اس کے یہاں کوئی قابلِ ذکر تفکر ہے اور نہ شاعرانہ اظہار پر ایسی قدرت، جس کو اطمینان بخش کہا جا سکے۔ حیرت ہے کہ لوگ اس بونے شاعر کے ضمن میں میرؔ اور غالبؔ کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ کیا غزل ہے:

راز الفت چھپا کے دیکھ لیا
عشق میں جی جلا کے دیکھ لیا

کسی اسکول کے طالب علم کو بھی ایسی شاعری پر داد نہیں مل سکتی۔ اور آپ معاف کیجیے گا، ان اشعار کی بنا پر فیض کا رشتہ میرؔ اور داغؔ سے جوڑتے ہیں۔'' (صفحہ ۹۷)

پروفیسر اختر انصاری نے بعض اور بزرگانِ ادب کے بارے میں اس سے بھی زیادہ سخت باتیں لکھی ہیں، جنھیں پڑھ کر خیال آتا ہے کہ اگر پروفیسر صاحب شاعری، افسانہ نگاری اور تنقید لکھنے کی بجائے صرف مکتوب نگاری کرتے تو ان کی ادبی صلاحیتوں کا اظہار بہتر طور پر ہوتا۔ فیض نے تو عشق میں جی جلایا تھا، پروفیسر صاحب خطوں میں جلاتے ہیں۔

علامہ جمیل مظہری ایک خط میں لکھتے ہیں:

'' جو آپ سے کسی نے کہہ دیا کہ میں محبوب خزاں کے مضمون سے خفا ہوں۔ خفگی کی کیا بات ہو سکتی ہے، البتہ مجھے ان کا مضمون پڑھ کر ہنسی ضرور آئی کہ یہ صاحبزادے ایک پچپن سالہ بڈھے کو اپنی طرح نوجوان اور ترقی پسند بننے کے ساعی ہیں اور اس سے صرف اس بات پر خفا ہیں کہ وہ نئے نظریۂ شاعری کے ماتحت اپنے کو درست نہیں کر پاتا۔'' (صفحہ ۸۹)

علامہ جمیل مظہری بہت زیادہ خوش ذوق واقع ہوئے تھے، ورنہ کسی تنقیدی مضمون کو پڑھ کر ہنسنا عجیب سی بات ہے۔ اگر تنقیدی مضامین پر ہنسنے کی روایت چل نکلی تو لوگ طنزیہ و مزاحیہ تحریریں پڑھنے کی ضرورت محسوس نہیں کریں گے۔

نظیر صدیقی نے اپنا ایک مقالہ احمد ندیم قاسمی کو ان کے رسالے ''فنون'' میں چھپنے کے لیے بھیجا تھا۔ اس کے جواب میں قاسمی صاحب لکھتے ہیں:

'' آپ کے مقالے سے مجھ پر انکشاف ہوا کہ میری شاعری کے بارے میں آپ کی رائے اچھی نہیں ہے۔ ایسی رائے قائم کرنے کا بھی آپ کو حق حاصل ہے۔ آپ کا مقالہ کسی ایک

لفظ کی تبدیلی کے بغیر شائع ہوگا۔"

یہ قاسمی صاحب کی عظمت ہے کہ انھوں نے اپنے رسالے میں ایک ایسے مقالے کو شائع کیا، جس میں ان کی شاعری کے بارے میں اچھی رائے کا اظہار نہیں کیا گیا تھا، لیکن اس مقالے میں جن شاعروں کی شاعری کے بارے میں اچھی رائے دی گئی ہے، وہ بھی خوش نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ ان میں سے بعض کے نظیر صدیقی سے تعلقات خراب ہو گئے، جس کا ذکر زیرِ نظر مجموعہ مکاتیب کے دیباچے میں ان لفظوں میں کیا گیا ہے: .... "اس مجموعے میں ان لوگوں کے خطوط بھی شامل ہیں، جن سے میرے تعلقات باقی نہیں رہے۔" .... ہماری دعا ہے کہ جن لوگوں سے نظیر صدیقی کے تعلقات باقی ہیں، ان کی نظر سے یہ مجموعہ خطوط نہ گزرے، ورنہ اس کا امکان ہے کہ اپنے خطوط دیکھ کر وہ بھی ناراض ہو جائیں گے۔ متعدد مکتوب نگاروں نے نظیر صدیقی کو ہدایت کی ہے کہ ان کے خطوط شائع نہ کیے جائیں۔ صدیقی صاحب نے ایسے خطوط بطورِ خاص شائع کیے ہیں، جن میں یہ ہدایت واضح لفظوں میں موجود ہے۔

آخر میں ایک ادب دوست لڑکی کے خط کا ذکر ضروری ہے، جس کا پورا نام شائع نہیں کیا گیا۔ صرف "ع۔م" لکھا ہے۔ اس خط میں محترمہ ع۔م نے نظیر صدیقی کی تحریروں کی بے حد تعریف کی ہے اور ایک انشائیے کے بارے میں یہ لکھا ہے: .... "کیا آپ اسے میرے ہاتھ فروخت کریں گے۔ جو مانگیں گے ادا کیا جائے گا۔ سودا مہنگا نہیں۔" .... معلوم نہیں نظیر صدیقی نے اس پیش کش کا کیا جواب دیا۔ اگر وہ ہمارا مشورہ مانیں تو ان محترمہ سے یہ کہیں کہ وہ مطلوبہ انشائیے کے عوض پانچ دس اچھی سی غزلیں کہہ کر بھیج دیں، تاکہ "حسرتِ اظہار" کے اگلے ایڈیشن کی اشاعت پر محبِ عارفی یہ نہ کہیں کہ انھیں اس مجموعے کا صرف ایک شعر پسند آیا۔

یہ مفید اور دل چسپ مجموعۂ خطوط مشہور شاعر مصطفیٰ راہی نے مرتب اور شائع کیا ہے، جو اس سے پہلے جگر مرادآبادی کے بارے میں کئی مفید کتابیں مرتب کر چکے ہیں۔

(۱۳ر اگست ۱۹۸۴ء)

☆..........☆..........☆

ادب سے اخباروں کی شکم پری

جب سے سیاست کا بازار ٹھنڈا ہوا ہے، ہمارے اخبار اکیڈمی آف لیٹرز کا خبرنامہ بن کر رہ گئے ہیں۔ ہفتے میں ایک دن تو ادبی صفحات چھپتے ہی تھے، اب باقی دنوں میں بھی اخباروں کی شکم پری ادب سے کی جانے لگی ہے۔ ادبی خبریں اس کثرت سے شائع ہوتی ہیں کہ ماضی قریب میں اتنی کثرت سے تو ڈاکہ زنی کی خبریں بھی شائع نہیں ہوتی تھیں۔ گلی گلی مشاعرے اور ہر گھر میں ادبی محفلیں منعقد ہو رہی ہیں۔ ان مشاعروں اور محفلوں کی روداد یں سامعین کے ناموں کے ساتھ اخباروں میں بڑے اہتمام سے چھپتی ہیں۔ بعض پیشہ ور سامعین کے نام اس کثرت سے اخباروں میں شائع ہوتے ہیں کہ محض جرمِ سماعت کی بنا پر انھیں ادیبوں میں شمار کیا جانے لگا ہے۔

ایک تبدیلی یہ بھی رونما ہوئی ہے کہ ہمارے اچھے اچھے ادیب کالم نگار بن گئے ہیں۔ قمر جمیل کے بعد انجم اعظمی اور احمد ہمدانی بھی داخلِ صحافت ہو چکے ہیں۔ انجم اعظمی کی حد تک تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ صحافت سے انھیں کچھ مناسبت ہے، لیکن احمد ہمدانی جیسے خوب صورت شاعر، صاحبِ نظر نقاد کو خدا جانے کس نے کالم نگاری کی راہ پر لگا دیا ہے۔ یہ عام خیال ہے کہ جو کالم نگاری کی طرف گیا، وہ پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ خدا کرے، احمد ہمدانی کے ساتھ یہ معاملہ نہ ہو اور وہ کالم نگاری سے تائب ہو کر اپنے اصل کام کی طرف متوجہ ہوں۔ ابھی انھیں اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف "قصہ نئی شاعری کا" عرف تذکرۂ شعرائے ریڈیو پاکستان کی دوسری جلد لکھنی ہے، جس میں ان شاعروں کا ذکر ہوگا، جو ریڈیو میں باقاعدہ ملازم تو نہیں، لیکن ان کی غزلیں، ریڈیو سے گائی جاتی ہیں۔ گانے والوں کا ذکر تیسری جلد میں ہوگا۔

اخباروں میں پہلے سیاست دانوں اور فلمی ستاروں کے انٹرویو چھپا کرتے تھے۔ سیاست اور فلم والوں پر جب سے بُرا وقت آیا ہے، ادبی ستاروں کی قسمت جاگ اٹھی ہے۔ اب ادیبوں کے انٹرویو اخباروں کی زینت ہوتے ہیں، جن میں سوال از آسمان جواب از ریسمان والی کیفیت ہوتی ہے۔ ہر

انٹرویو کی اشاعت کے بعد تردیدی بیانات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ خود "صاحب انٹرویو" کو بھی اپنی بعض باتوں کی تردید کرنی پڑتی ہے۔ پچھلے دنوں ایک اخبار میں مشہور شاعر منیر نیازی کا ایک دلچسپ انٹرویو شائع ہوا تھا۔ اس انٹرویو میں انھوں نے اپنے ایک بیان کی نہایت عمدگی سے تردید کی ہے۔

منیر نیازی سے پوچھا گیا کہ آپ نے ایک انگریزی ادبی رسالہ نکالنے کا جو منصوبہ بنایا تھا، وہ کیا ہوا؟ منیر نیازی نے جواب دیا۔ "میرے پاس اخراجات کے لیے پیسے تو نہیں تھے، میں نے میٹر تیار کر دیا۔ ایک دو دوستوں سے کہہ کر کچھ اشتہار لے لیے۔ حنا بابر علی نے کہا، میں معاون ایڈیٹر ہوں گی اور سارا کام کروں گی۔ میں مطمئن ہو گیا کہ اچھا ہے، سارا کام احسن طریقے سے ہو جائے گا۔ وہ مسودہ لے گئی اور کہنے لگی کہ امریکہ جانے سے پہلے یہ کام کروا دوں گی۔ وہ امریکہ چلی گئی۔ اب واپس آئی تو میں نے کہا کہ وہ مسودہ دے دو۔ کہنے لگی کہ میں نے اس پر بہت کام کیا ہے، میں اب آپ کو نہیں دے سکتی۔ یہی نہیں، بلکہ اس نے میرے خلاف محاذ بنا لیا۔ جہاں بیٹھتی، میری برائیاں کرتی رہی۔ اب میں خاموش ہوں، عورت ذات کو کیا کہوں۔

یہ بیان چھپ گیا تو منیر نیازی کو احساس ہوا کہ گڑبڑ ہو گئی ہے۔ انھوں نے فوراً ایک تردیدی بیان اخبار میں چھپوا دیا، جس میں انھوں نے فرمایا:

"بعض سوالات کے جوابات خوش نویس کی مہربانی یا انٹرویو لینے والے احباب کی غلط فہمی سے کچھ کے کچھ ہو گئے ہیں۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ حنا بابر علی جہاں بیٹھتی ہے، میری برائیاں کرتی رہتی ہے۔ اصل میں ایک اور عورت کی طرف اشارہ تھا۔ ساری بات گڈمڈ ہو گئی۔"

گویا صورت حال اب یوں ہو گئی کہ جھگڑا تو منیر نیازی اور حنا بابر علی کے درمیان تھا، لیکن منیر نیازی کی برائیاں کرنے والی خاتون کوئی اور تھی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دونوں کے جھگڑے میں کسی دوسری خاتون کی طرف اشارہ کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ ہم اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہیں، البتہ منیر نیازی کے انٹرویو میں ایک اور خاتون کا بھی ذکر آیا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ کشور ناہید نے منیر نیازی کو حبیب جالب کے امدادی مشاعرے میں شرکت کی دعوت دی۔ منیر نیازی نے یہ دعوت قبول نہ کی۔ اس کے بعد (بقول منیر نیازی) یہ مشہور کیا گیا کہ مشاعرے میں شرکت کے لیے بوتل مانگی گئی تھی اور یہ کہا گیا تھا کہ پہلے میرا امدادی مشاعرہ کراؤ اور پھر حبیب جالب کا۔

ہم اس واقعہ پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے، البتہ اتنا ضرور عرض کریں گے کہ منیر نیازی کے دونوں مطالبات منظور کر لینے میں کوئی قباحت نہیں تھی۔ بوتل سے مراد شربت روح افزا کی بوتل بھی ہو سکتی ہے، جو ہمارا قومی مشروب ہے اور جسے پی کر شاعری میں مٹھاس پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرا مطالبہ بھی معقول تھا۔ آئے دن حبیب جالب کی امداد کے لیے کراچی اور لاہور میں مشاعرے ہوتے رہتے ہیں۔ اگر ایک آدھ مشاعرہ

منیر نیازی کے لیے بھی ہو جائے تو اس میں کیا برائی ہے۔ بعض لوگوں کا کیا خیال ہے کہ حبیب جالب کی امداد کے لیے بہت کچھ کیا جا چکا ہے، اب انھیں کوئی اور ذریعہ معاش تلاش کرنا چاہیے۔ امدادی مشاعروں پر دوسروں کا بھی حق ہے۔ اگر اسے حق کو تسلیم کر لیا جائے تو پھر ہم بھی اپنا کالم نثر کی بجائے نظم میں لکھنے پر غور کریں گے۔

منیر نیازی کے انٹرویو میں اور بھی بہت سی دلچسپ باتیں ہیں، مثلاً انھوں نے یہ فرمایا ہے کہ پچھلے دنوں کراچی میں بھارتی سفارت خانے کی تقریب میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے یہ کہا:

"پتہ نہیں، منیر نیازی کی پاکستان میں کیا حیثیت ہے، لیکن ہم ۲۶ سال سے منیر نیازی کی دیوتا کی طرح پوجا کرتے ہیں۔ ہندوستان میں ان کے بے شمار متاثرین ہیں۔"

ہمیں تو اب تک یہی معلوم تھا کہ زلزلے، قحط اور سیلاب وغیرہ کے ضمن میں "متاثرین" کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ شاعروں کے بھی "متاثرین" ہوتے ہیں۔ پوجا والی بات سے بھی ہماری معلومات میں اضافہ ہوا۔ یہ تو ہم جانتے تھے کہ بھارت میں گائے کی پوجا ہوتی ہے۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ منیر نیازی کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوتا ہے۔

سوال کیا گیا:

"آپ پٹھان ہیں اور اچھے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاعری کی طرف رجحان کیسے ہوا؟"

منیر نیازی نے جواب دیا:

"نہ مجھے معلوم ہے، نہ میرے گھر والوں کو۔ وہ تو کہتے ہیں کہ اس کو کیا بیماری لگ گئی ہے۔ اشفاق احمد بھی میرے قبیلے کا آدمی ہے۔ لوگوں نے کہا، اگر لکھنا ہے تو اشفاق کی طرح لکھو، کچھ پیسے کماؤ۔ میں نے کہا کہ اشفاق تو محنتی آدمی ہے۔ میں محنتی نہیں ہوں۔"

منیر نیازی نے اچھے خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود شاعر ہونے پر جس خوبصورت انداز میں معذرت کی ہے، وہ کچھ انھیں کا حصہ ہے۔ تاہم منیر نیازی کو زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ہمارا معاشرہ ہی ایسا ہے کہ اچھے اور اعلیٰ خاندانوں کے بعض افراد خراب صحبت کی وجہ سے غلط کاموں میں پڑ جاتے ہیں۔

منیر نیازی کی اس بات سے ہمیں اتفاق نہیں ہے کہ اشفاق احمد صرف پیسے کمانے کے لیے محنت کرتے ہیں۔ یہ کام تو وہ اب بغیر محنت کے بھی کر لیتے ہیں کہ ان کا نام سکۂ رائج الوقت بن چکا ہے۔

اپنی عظمت کے سلسلے میں منیر نیازی نے یہ واقعہ بھی سنایا ہے:

"میں منی بس میں سفر کر رہا تھا۔ میں ویگن میں کافی تنگ بیٹھا تھا۔ ایک شخص میرے پیچھے

بیٹھا تھا، اس نے مجھے دیکھا تو کہنے لگا، آپ منیر نیازی ہیں؟ میں نے جواب دیا، ہاں! پھر وہ کہنے لگا، جن لوگوں کو آرام سے سفر کرنا چاہیے، وہ بسوں میں بیٹھتے ہیں اور جن لوگوں کو بسوں اور ویگنوں میں سفر کرنا چاہیے وہ آرام سے سفر کرتے ہیں۔"

معلوم نہیں کہنے والے نے یہ بات اپنے بارے میں کہی تھی یا منیر نیازی کے بارے میں، بہر حال یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ منیر نیازی منی بس میں ہوں یا منی بس سے باہر، وہ ہر جگہ "کافی تنگ" ہو کر بیٹھتے ہیں۔

(۱۰راگست ۱۹۸۳ء)

☆..........☆..........☆

شاعری کا لائسنس اور رجسٹریشن

ہمارے نام جو خط آتے ہیں، انھیں شروع شروع میں تو ہم بڑے شوق سے پڑھتے تھے، لیکن اب یہ حال ہے کہ ہم لفافے ہی سے خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے نام آنے والے تقریباً سبھی خطوط میں ہماری کسی نہ کسی بات کی تردید ہوتی ہے یا ہم سے اختلافِ رائے کیا جاتا ہے۔ حد تو یہ ہے کہ اگر ہم بھولے سے کسی کی تعریف کر دیں تو بھی درجنوں تردیدی خطوط آ جاتے ہیں۔ لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ کچھ اہم مسائل کی طرف ہمیں متوجہ کرتے ہیں۔ اس وقت ایسے ہی دو خط ہمارے آج کے کالم کا موضوع ہیں۔

پہلا خط لاہور کے جناب محمد لیٰسین بجمل کا ہے، جو کراچی کے ایک اخبار میں لاہور کی ادبی ڈائری لکھتے ہیں۔ بجمل صاحب کے خط کا خلاصہ یہ ہے کہ انھوں نے ۷ر جولائی ۱۹۸۳ء کو ایک نئی موٹر سائیکل خریدی، ۱۸ر جولائی کو وہ پہلی مرتبہ اس پر سوار ہوئے اور ابھی...... اترنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہو گئے۔

اس اجمال کی تفصیل خود بجمل صاحب کی زبانی سنیے:

"جی پی او چوک پر ایک ٹریفک پولیس کانسٹیبل نے مجھے روکا اور کہا کہ گاڑی کے کاغذات دکھاؤ، میں نے اسے گاڑی کی رسید اور اپنا لرنر (Learner) لائسنس دکھایا تو اس نے کہا کہ ابھی تک گاڑی کی رجسٹریشن کیوں نہیں کرائی۔ اس پر میں نے اسے دوبارہ گاڑی کی رسید دکھاتے ہوئے کہا کہ جناب! یہ گاڑی میں نے ابھی کل ہی خریدی ہے اور ایک دو روز میں اس کی رجسٹریشن کرا لوں گا۔ اس نے کہا کہ اگر جان چھڑانی ہے تو مجھے رشوت میں کچھ دے دو، ورنہ میں سامنے کھڑے ہوئے ہیڈ کانسٹیبل کے پاس لے جا کر تمھارا چالان کروا دوں گا۔ میں نے رشوت دینے سے صاف انکار کر دیا۔ یہ سنتے ہی وہ میرے کاغذات، یعنی گاڑی کی رسید اور لائسنس ہیڈ کانسٹیبل کے پاس لے گیا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو بھی بڑے آرام سے ساری

صورت حال بتائی، لیکن اس نے میری باتوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کہا، میں تمہارا چالان ضرور کروں گا۔ اگر چالان نہیں کروانا چاہتے ہو تو کانسٹیبل کی بات مان لو، یعنی دوسرے لفظوں میں اسے رشوت دے دو۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ آپ میرا چالان کیوں کریں گے، جب کہ میں نے کوئی جرم کیا ہے اور نہ قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔ اور پھر میں نے اس سے کہا کہ میں رشوت بھی نہیں دوں گا۔ یہ سنتے ہی ہیڈ کانسٹیبل آپے سے باہر ہو گیا اور اس نے مجھ پر رشوت نہ دینے کی پاداش میں دفعات ۱۱۱، ۱۱۳ اور ۱۱۵ لگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ بات ہے تو پھر میں تمھاری گاڑی اور تمھیں ابھی حوالات میں بند کراتا ہوں۔''

اس کے بعد بسمل صاحب حوالات میں بند کر دیے گئے، لیکن خوش قسمتی سے بعض جاننے والوں کی کوشش سے کچھ دیر بعد انھیں رہا کر دیا گیا۔ یہ تمام واقعہ بتانے کے بعد بسمل صاحب اپنے خط میں تحریر کرتے ہیں:

''ٹریفک پولیس کے کانسٹیبل، ہیڈ کانسٹیبل اور تھانہ پرانی انارکلی کے عملے نے مجھے ناجائز تنگ کر کے دو دن گاڑی چھڑانے اور گاڑی کی رجسٹریشن کروانے میں ضائع کر دیے۔ اس کے ساتھ مجھے ذہنی پریشانی میں مبتلا کر کے میرے جذبات کو سخت مجروح کیا ہے، جو ادب کے ایک ادنیٰ خادم کے ساتھ سراسر ناانصافی ہے۔ کیا شریف شہری، ادب اور ملک و قوم کے خدمت گزاروں کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا جائے گا؟ اور کیا شریف شہری پولیس کے ہاتھوں یونہی رسوا ہوتے رہیں گے؟ اور رشوت نہ دینے کی پاداش میں حوالاتوں میں بند ہوتے رہیں گے۔''

بسمل صاحب سے ہمیں دلی ہمدردی ہے، لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اس معاملے میں سارا قصور خود بسمل صاحب کا ہے۔ قانون نافذ کرنے والوں کے کسی مطالبے کو تسلیم نہ کرنا قانون شکنی کے مترادف ہے۔ بسمل صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ رشوت دینے سے انکار کر کے عاقبت تو سنواری جا سکتی ہے، لیکن دنیا خراب ہو جاتی ہے۔ موصوف نے جس طرح دس پندرہ ہزار روپے خرچ کر کے موٹر سائیکل خریدی تھی، اسی طرح کچھ روپے پولیس والوں پر بھی خرچ کر دیتے تو وہ حوالات جانے سے بچ سکتے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بسمل صاحب کو عزت سے زیادہ روپیہ عزیز ہے۔ ہمارا مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ وہ آئندہ جب بھی موٹر سائیکل پر سوار ہوں تو جیب میں اتنی رقم ضرور رکھیں، جس سے راستے کی مشکلات پر قابو پایا جا سکے۔ بسمل صاحب کو شاید یہ معلوم نہیں کہ ہمارے ملک میں رشوت کے بغیر کام نہیں چل سکتا، یہاں تک کہ کوئی موٹر سائیکل بھی نہیں چل سکتی۔

بسمل صاحب چوں کہ شاعر ہیں، اس لیے ان کا خیال ہے کہ ادب کے خدمت گزاروں کے ساتھ پولیس کو نازیبا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارا خیال ہے کہ پولیس والوں نے بسمل صاحب کے ساتھ جو سلوک

کیا، وہ ادب کے حوالے سے نہیں تھا۔ پولیس والوں کو تو یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ وہ شاعر ہیں، ورنہ انھیں موٹر سائیکل چلانے کی بجائے شعر کہنے کی پاداش میں زیادہ آسانی سے سپرد حوالات کیا جا سکتا تھا، کیوں کہ شاعری کا لائسنس اور رجسٹریشن کے کاغذات کسی شاعر کے پاس نہیں ہوتے۔

دوسرا خط راولپنڈی کے ناصر زیدی صاحب کا ہے، جو شاعر بھی ہیں اور لاہور کے ایک اخبار میں کالم بھی لکھتے ہیں۔ ہمیں زیدی صاحب کی غزلیں اور کالم اس حد تک پسند ہیں کہ ہم ان کے کالموں کو غزل سمجھ کر اور غزلوں کو کالم سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ اسی لیے ہمیں آج تک یہی معلوم نہیں ہو سکا کہ غزل اور کالم میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ناصر زیدی صاحب اپنے مکتوب مورخہ ۲۵ر جولائی میں لکھتے ہیں:

''جسارت میں اکثر آپ کی نظرِ کرم مجھ پر رہی ہے۔ ''اکثر'' اس لیے لکھا ہے کہ ایک بار تو خود ''ذکرِ خیر'' پڑھا، اور دو تین بار محبِ مکرم نظیر صدیقی صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ نے ''ذکرِ خیر'' کیا ہے۔ اب آپ ''تکبیر'' میں ہیں تو اکثر آپ کا کالم پڑھنے کے لیے بک اسٹال پر کھڑے کھڑے ''تکبیر'' کی ورق گردانی کر لیتا ہوں۔ لیجیے آپ کے لیے پھر حاضر ہوں۔ تو مشقِ ناز کر..........''

اپنے گرامی نامے کے ساتھ زیدی صاحب نے مندرجہ ذیل دستاویزات منسلک کی ہیں:

(۱) ایک گشتی مراسلہ۔

(۲) اپنی ایک غزل کی فوٹو اسٹیٹ کاپی۔

(۳) اپنے ایک مطبوعہ کالم کی فوٹو اسٹیٹ کاپی۔

(۴) اپنی ایک تصویر۔

یہ سب چیزیں اس لائق ہیں کہ ہم انھیں اپنے کالم میں شامل کرتے، مگر افسوس کہ جگہ اور حوصلے کی کمی کی وجہ سے ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ زیدی صاحب کی تصویر البتہ ہم اس کالم کے ساتھ شائع کر رہے ہیں، تاکہ انھیں یہ شکایت نہ ہو کہ ہم نے ان کی ارسال کردہ چیزوں میں سے کسی ایک سے بھی مکمل استفادہ نہیں کیا۔

زیدی صاحب کے گشتی مراسلے میں یہ سنسنی خیز انکشاف کیا گیا ہے کہ ۸ر جولائی ۱۹۸۴ء کو کراچی ٹیلی ویژن سے ایک ''انتہائی خوب صورت غزل'' ''مغنی بیگم نے'' ''نہایت عمدگی'' سے گائی تھی۔ یہ غزل ناصر زیدی کی تھی، لیکن ٹی وی والوں نے اسے ناصر کاظمی سے منسوب کر دیا۔

پہلے تو ہمیں یقین نہ آیا کہ ٹی وی والے اتنی بڑی غلطی بھی کر سکتے ہیں، لیکن جب غزل دیکھی تو معلوم ہوا کہ ناصر زیدی صاحب کا بیان درست ہے۔ بطور نمونہ اس غزل کے دو شعر دیکھیے:

تھوڑا سا مسکرا کے نگاہیں ملائیے
مجھ کو مری حیات کا مقصد بتائیے

مدت ہوئی کہ آپ نے خط تک نہیں لکھا
اس بے رخی کا کوئی سبب تو بتایئے

غزل کے باقی شعر بھی خوبصورتی میں اسی قسم کے ہیں۔ یہ غزل ناصر زیدی صاحب کی یا مُنی بیگم ہی کی تصنیف ہوسکتی ہے، ناصر کاظمی مرحوم اس الزام کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ یہ الزام اتنا وزنی ہے کہ اگر ناصر کاظمی زندہ ہوتے تو یہی الزام ان کی موت کا سبب بن جاتا۔ اس غزل کے غلط انتساب پر ٹی وی والوں کو ناصر زیدی ہی سے نہیں، ان تمام لوگوں سے بھی معذرت کرنی چاہیے، جو ناصر کاظمی کے عقیدت مند ہیں۔ ٹی وی والوں کو چاہیے کہ اپنی تعلیمی و ادبی استعداد میں اتنا اضافہ ضرور کرلیں کہ ناصر زیدی اور ناصر کاظمی میں فرق کیا جاسکے۔ ناصر زیدی کا کلام کسی دوسرے شاعر سے منسوب نہیں ہونا چاہیے، تاکہ ایک کی محنت اور دوسرے کی ادبی شہرت ضائع نہ ہو۔

ناصر زیدی نے اپنے ایک کالم کی جو فوٹو اسٹیٹ کاپی بھیجی ہے، اس میں ہمارا "قرکرِ خیر" ان لفظوں میں ہے:

"کراچی کے ایک نئے ہفت روزہ میں خامہ بگوش لکھتے ہیں کہ دنیا کی سب سے مختصر ترین دو لفظی نظم حفیظ آذر نے کہی ہے جو یہ ہے:

"اندر
سمندر"

خامہ بگوش کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ آج سے برسوں پہلے دنیا کی مختصر ترین نظم قتیل شفائی کہہ چکے ہیں، وہ نظم یوں ہے:

"پیسے
کیسے؟"

اور یہ نظم ان کے ایک مجموعے میں شامل ہے۔

ناصر زیدی کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہم اپنا کالم بقید ہوش و حواس لکھتے ہیں، اس لیے "اندر سمندر" اور "پیسے کیسے" والی شاعری کے ذکر کی اس کالم میں گنجائش نہیں نکل سکتی۔ بات یہ ہے کہ ۱۶ راپریل کے کالم کے آخر میں کچھ جگہ بچ گئی تھی، وہاں کاپی پیسٹر نے حفیظ آذر کے مجموعے کے بارے میں خبر چپکا دی۔ زیدی صاحب نے اس خبر کو ہمارے کالم کا حصہ سمجھ لیا۔ گزارش ہے کہ زیدی صاحب بک اسٹال پر کھڑے کھڑے ہمارا کالم نہ دیکھا کریں، اسے ذرا اطمینان سے پڑھا کریں۔ ہمارے کالم کو کم از کم اتنا وقت تو دیا کریں، جتنا وہ "ایک انتہائی خوبصورت غزل" کے لکھنے میں صرف کرتے ہیں۔

(۲۳راگست ۱۹۸۴ء)

☆.........☆.........☆

دیمک زدہ نئی کتابیں اور تحقیق کا کھڑاگ

کچھ عرصہ ہوا، ہم نے اپنے پسندیدہ کالم نگار، شاعر، اور اب ٹی وی رائٹر جناب عطاء الحق قاسمی کی روز افزوں ترقی اور مارشل لاء کے ضابطوں کی طرح اثر و نفوذ کی صلاحیت پر دلی مسرت اور اطمینان کا اظہار کیا تھا۔ آج پھر ہم ان کی خدمت میں خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے حاضر ہیں۔ خدا انھیں نظرِ بد سے بچائے کہ انھوں نے کم عمری ہی میں وہ مقام حاصل کرلیا ہے، جو بعض لوگوں کو ریٹائرمنٹ کی عمر گزر جانے کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتا۔ قاسمی صاحب پاکستان کے مقبول ترین اہلِ قلم میں سے ہیں۔ ان کی مقبولیت کا اس سے اندازہ کیجیے کہ انھوں نے جب سے اپنی کتابوں کے سرورق پر اپنی تصویریں چھاپنی شروع کی ہیں، ان کی کتابیں پہلے سے زیادہ فروخت ہوتی ہیں۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر ہم نے ایک نوجوان ادیب کو مشورہ دیا تھا کہ وہ بھی اپنی کتاب کے سرورق پر اپنی تصویر چھاپے۔ اس عزیز نے ہمارے مشورے پر عمل کیا، نتیجہ یہ نکلا کہ سرورق تو سارے فروخت ہوگئے، کتاب جتنی چھاپی تھی، وہ سب کی سب محفوظ رہ گئی۔ قاسمی صاحب خوش قسمت ہیں کہ سرورق کے ساتھ ان کی کتاب بھی فروخت ہوتی ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ ہمارے ان چند لکھنے والوں میں سے ہیں، جن کی تحریریں دل اور دماغ دونوں پر خوشگوار اثر ڈالتی ہیں، ورنہ عام طور پر تو یہی دیکھنے میں آیا ہے کہ آج کل جو کتابیں چھپتی ہیں، انھیں پڑھ کر دل و دماغ کے ساتھ ساتھ پڑھنے والوں کی عمومی صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔

ہمارا خیال تھا کہ عطاء الحق قاسمی خوب سے خوب تر کا سفر جاری رکھیں گے، یعنی کالم نویسی کرتے کرتے کسی قومی اخبار کی اداریہ نویسی کرنے لگیں گے۔ ٹی وی سے نکل کر فلموں کی طرف جائیں گے کہ ہر ذہین فنکار چھوٹی اسکرین سے بڑی اسکرین کی طرف پرواز کرتا ہے۔ شاعری میں حفیظ جالندھری نہ سہی، قیا جالندھری تو ضرور بن جائیں گے اور پھر یہ مشہور شعر ان سے منسوب ہوجائے گا۔

خوش آگئی ہے کسی کو جلندھری میری
وگرنہ شعر مرا کیا ہے، شاعری کیا ہے

لیکن افسوس ...... بلکہ صدر افسوس کہ قاسمی صاحب نے اپنی مزید صلاحیتوں کے اظہار کے لیے تحقیق کا میدان منتخب کیا ہے، حالاں کہ اس میدان میں صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ خود آدمی بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ ہماری رائے میں تحقیق کا شغل صرف انھی لوگوں کو اپنانا چاہیے، جنھیں فرصت ہو اور کوئی ڈھنگ کا کام کرنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں۔ قاسمی صاحب کو تو ابھی بے شمار بڑے بڑے کام کرنے ہیں۔ اگر وہ ''واصل بہ تحقیق'' ہو گئے تو یہ بڑے بڑے کام کون انجام دے گا؟

قاسمی صاحب محقق کس طرح بنتے ہیں؟ اس کی تفصیل ان ہی کی زبانی ملاحظہ ہو:

''معروف محقق مشفق خواجہ سے ارادت مندی کا ایک فائدہ یہ ہوا ہے کہ جب کوئی کتاب ہاتھ لگتی ہے تو اس کے متن پر توجہ دینے کی بجائے اس کتاب کے صفحات گنتے ہیں۔ اس کے بعد یہ دیکھتے ہیں کہ اس کا کوئی ورق پھٹا تو نہیں ہوا اور اگر پھٹا ہوا ہے تو وہاں ممکنہ عبارت کیا ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ ممکن ہے، وہاں کسی کی تاریخ ولادت یا تاریخ وفات درج ہو۔ اس کے بعد ہم ناشر کا نام دیکھتے ہیں۔ کاتب کا نام تلاش کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ کتاب کون سے پریس میں چھپی ہے۔ اور ہاں، سب سے پہلے تو ہم سن اشاعت ڈھونڈتے ہیں۔ اگر کتاب پرانی ہو، بلکہ کچھ دیمک بھی لگی ہو تو اس کتاب کی قدر و قیمت ہماری نظر میں بڑھ جاتی ہے اور اگر یہ کتاب مارکیٹ میں تازہ تازہ آئی ہو تو ہماری نظروں میں یہ کتاب دو کوڑی کی رہ جاتی ہے۔''

قاسمی صاحب نے خاصے انکسار سے کام لیا ہے، ورنہ شنید یہ ہے کہ انھوں نے کسی ''معروف محقق'' سے ارادت مندی سے پہلے بھی کسی کتاب کے متن کو توجہ کا مستحق نہیں سمجھا تھا۔ صفحے گننے والی بات بھی محل نظر معلوم ہوتی ہے۔ شاید قاسمی صاحب کی نظر سے کبھی کوئی چھپی ہوئی کتاب نہیں گزری، ورنہ انھیں علم ہوتا کہ مطبوعہ کتابوں کے صفحات پر نمبر شمار درج ہوتے ہیں اور اہل تحقیق آخری صفحے کو دیکھ کر معلوم کر لیتے ہیں کہ کتاب کے صفحات کتنے ہیں۔ اگر کسی کو ہماری بات کا یقین نہ ہو تو جناب عبدالعزیز خالد سے اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ خالد صاحب نے اپنی بعض کتابوں کی کتابت خود کی ہے اور صفحات نمبر بھی درج کیے ہیں، حالاں کہ انھیں اس تکلف کی ضرورت نہیں تھی۔ علمی ادبی معیار کی حامل کتابیں صفحات نمبر کی پابند نہیں ہوتیں۔ ان کا ہر صفحہ جداگانہ معنویت رکھتا ہے۔

قاسمی صاحب نے یہ تو بتا دیا ہے کہ وہ بسلسلۂ تحقیق کس کس چیز پر نظر رکھتے ہیں، لیکن حیرت ہے کہ انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ محقق اس کا پورا پورا اطمینان کرتا ہے کہ کتاب کا مصنف کون ہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کا امکان رہتا ہے کہ وہ اپنی کسی تصنیف کو کسی اور کی تصنیف سمجھ کر تحقیق کر ڈالے اور اسے کتاب میں کوئی خوبی ہی نظر نہ آئے۔

قاسمی صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر کسی کتاب کو دیمک لگ جائے تو اس کا قدیم ہونا ثابت ہو جاتا ہے، بات بالکل درست ہے۔ اس پر ہم یہ اضافہ کریں گے کہ جہاں تک کسی کتاب کو دیمک لگنے کا تعلق ہے تو یہ ضروری نہیں کہ وہ پرانی کتاب ہی ہو۔ آج کل بعض نئی کتابیں بھی موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے ''دیمک زدہ'' اور کرم خوردہ ہوتی ہیں اور تحقیق کا موضوع بن سکتی ہیں۔

قاسمی صاحب نے محقق بننے کے لیے جو شرائط پیش کی ہیں، وہ اتنی مشکل ہیں کہ ایسی مشکل شرائط تو ٹیلی ویژن کا مصنف بننے کے لیے بھی عاید نہیں کی جاتیں۔ کسی مصنف کی تاریخ ہائے ولادت و وفات اور کسی کتاب کے کاتب کا نام معلوم کرنا بڑا مشکل کام ہے۔ جیسے کسی مصنف کی تاریخ وفات کا علم تو آپ کو حضرت رئیس امروہوی کے لکھے ہوئے قطعہ تاریخ وفات سے ہو جائے گا۔ ولادت کا علم کیسے ہوگا، کیوں کہ حضرت رئیس امروہوی نے آج تک کسی ادیب کا قطعۂ تاریخ ولادت نہیں لکھا، حالاں کہ بے شمار ادیب ان کی قطعہ نگاری کے دوران پیدا ہوئے ہیں۔

کسی کتاب کے کاتب کا نام معلوم کرنا بھی بہت مشکل کام ہے۔ آج کل کے کاتب بہت محتاط ہیں۔ وہ کسی ادبی کتاب کی کتابت کرنے سے پہلے اس کا اطمینان کر لیتے ہیں کہ ان کا نام ظاہر نہیں کیا جائے گا۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہ کوئی بھی نہیں چاہتا کہ کسی غلط کام میں اس کی شرکت کا اعلان ہو۔

آخر میں ہم قاسمی صاحب کو مشورہ دیں گے کہ وہ تحقیق کے کھڑاگ میں نہ پڑیں۔ یہ کام ان لوگوں کے لیے چھوڑ دیں، جنھیں اپنے پیچھے کرم خوردہ کتابیں چھوڑ کر جانا ہے۔ قدرتی وسائل کی وزارت کے سیکریٹری اور اردو کے صاحب طرز ادیب مختار مسعود نے ایک تقریب رونمائی میں عطاء الحق قاسمی کو پاکستان کے قدرتی وسائل میں شمار کیا تھا، ہم بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ یہ کالم ہم نے اس لیے لکھا ہے کہ پاکستان کے قدرتی وسائل کو ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

(۳۱/اگست ۱۹۸۴ء)

☆............☆............☆

ترقی پسندی اور سرمایہ داری کے درمیان سمجھوتہ

ہندوستان کے مشہور نقاد و ڈاکٹر محمد حسن کی بزرگی کا اعتراف ہم ان کی عمر عزیز کی وجہ سے نہیں، علم و فضل کی وجہ سے بھی کرتے ہیں۔ اگر معاملہ صرف سن و سال کی بزرگی کا ہوتا تو ہم ان کے رسالے ''عصری ادب'' کے پاکستانی ادب نمبر کے بارے میں لب کشائی نہ کرتے، لیکن موصوف نے یہ نمبر شائع کر کے اپنے علم و فضل کو بھی داؤ پر لگا دیا ہے، لہٰذا خود ان ہی کے دفاع میں ہمارے لیے کچھ عرض کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب ''عصری ادب'' کے نام سے جو سہ ماہی رسالہ دہلی سے شائع کرتے ہیں، اس کا ایک پاکستانی ادب نمبر تو تین سال پہلے شائع ہوا تھا اور دوسرا حال ہی میں منظر عام پر آیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ان چند ہندوستانی ادیبوں میں سے ہیں، جو پاکستانی ادیبوں اور ادب سے براہِ راست واقفیت رکھتے ہیں۔ وہ گزشتہ سات برسوں میں تین مرتبہ یہاں آ چکے ہیں اور ہر مکتبۂ فکر کے ادیبوں سے مل چکے ہیں۔ پاکستانی مطبوعات سے بھی وہ باخبر رہتے ہیں۔ اس ''باخبری'' کے بعد انھیں حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنے رسالے کا پاکستانی ادب نمبر شائع کریں، مگر افسوس کہ انھوں نے اپنے اس حق کو جس طرح استعمال کیا ہے، اس کی ان سے توقع نہیں تھی۔

ڈاکٹر صاحب کے ذہن میں پاکستانی ادب کا جو تصور ہے، وہ بہت عجیب و غریب ہے۔ ان کے نزدیک ہر وہ ادیب، ادیب نہیں ہے، جو مذہب کی بات کرے، نظریۂ پاکستان کا نام لے اور حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو۔ ادیب صرف وہ ہے، جو اشتراکی ہو یا اشتراکیت کی طرف جھکاؤ رکھتا ہو، مذاہب سے بیزار ہو، سیاسی نعرہ باز ہو، ادب کے نام پر بے ادبی کا مرتکب ہو اور حکومت وقت کی مخالفت میں حکومت اور مملکت کے فرق کو نظر انداز کر دے اور پھر کسی غیر ملک میں سیاسی پناہ حاصل کر لے۔

''عصری ادب'' کے پاکستانی ادب نمبر ۲ میں جو تحریریں پاکستان کے نمایندہ ادب کی حیثیت سے پیش کی گئی ہیں، ان میں سے بیشتر کی نوعیت احتجاجی ہے اور...... ''ایک نغمہ پاکستان کے لیے''...... تو اس

قدر زہریلا ہے کہ اس پر ڈاکٹر محمد حسن نے مصنف کا نام بھی نہیں دیا، تاکہ یہ معلوم نہ ہو سکے کہ علاقائیت کے منفی جذبات کو ہوا دینے والا پاکستانی ادیب کون ہے۔ معلوم نہیں، یہ نغمہ کس پاکستانی شاعر نے لکھا ہے یا ''عصری ادب'' کی خانہ ساز تخلیق ہے۔ اسی طرح ایک مضمون ''پاکستانی ادب کے نئے رجحانات'' بھی اسی اعتبار سے منفرد ہے کہ اس میں ایسے رجحانات کی نشان دہی کی گئی ہے، جن کا عدم اور وجود برابر ہے۔ مضمون نگار نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ پاکستان کے آج کے ادب میں ایک مرحوم وزیر اعظم کی ذات کو علامتی حیثیت حاصل ہو چکی ہے۔ یہ ادب کہاں تخلیق ہوا ہے اور کب شائع ہوا ہے، اس سے خود اہل پاکستان بھی بے خبر ہیں۔

اس رسالے کا سب سے دلچسپ مضمون ''پاکستانی ادب کی دو آوازیں'' ہے، جو خود ڈاکٹر محمد حسن نے لکھا ہے (یہ آوازیں رجعت پسندوں اور ترقی پسندوں کی ہیں)۔ ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلے تو اس حقیقت کی تردید کی ہے کہ پاکستان دو قومی نظریے کی بنیاد پر قائم ہوا اور پھر یہ ''مژدہ'' سنایا ہے کہ پاکستان میں علاقائی خود مختاری کی جنگ جاری ہے۔ پاکستانی ادب کا ذکر کرتے ہوئے راولپنڈی سازش پر خوشی کا اظہار اور انجمن ترقی پسند مصنفین پر پابندی کا ماتم کیا ہے اور ساتھ ہی یہ بتایا ہے کہ ''۱۹۵۳ء تک پاکستانی اور ہندوستان کے ترقی پسند ادیب مشترکہ طور پر مشترکہ جدوجہد میں شریک رہے۔'' ہندوستان کا حال تو ہمیں معلوم نہیں، لیکن پاکستان کے ۱۹۵۳ء والے ترقی پسند خدا کے فضل سے ہمارے درمیان موجود ہیں۔ کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ انھوں ۱۹۵۳ء تک ہندوستانی ادیبوں کے ساتھ کس مشترکہ جدوجہد میں حصہ لیا تھا؟

ترقی پسند تحریک سے اختلاف رکھنے والوں کو ڈاکٹر صاحب نے ''حملہ آور'' قرار دیا ہے۔ ان حملہ آوروں میں انھوں نے ممتاز شیریں، ڈاکٹر تاثیر اور محمد حسن عسکری کے ساتھ ساتھ سلیم احمد، انتظار حسین اور ناصر کاظمی کو بھی شامل کر دیا ہے۔ انتظار حسین کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے یہاں تک لکھ دیا ہے:

''انھوں نے اردو ادب سے عقل اور معقولیت کو خارج کر کے عقل دشمنی اور ظلمت پسندی کو پرکشش اور باوقار بنانے کی مہم چلائی۔''

یہ اطلاع ہمارے لیے خاصی سنسنی خیز تھی، اس لیے ہم نے انتظار حسین سے کہا:

''حضرت! آپ تو بڑے چھپے رستم نکلے۔ زندگی بھر ادب سے عقل اور معقولیت کو خارج کرتے رہے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ یہ خارج شدہ عقل اور معقولیت آخر گئی کہاں؟''

انتظار حسین نے جواب دیا:

''صفدر میر اٹھا کر لے گئے تھے، اسی کو تو وہ اپنے مضامین میں استعمال کرتے رہتے ہیں۔''

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون میں ہر اس ادیب کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا ہے، جو اصطلاحی معنوں میں ترقی پسند نہیں ہے اور اس شخص کو عظیم ادیب قرار دیا ہے جو ترقی پسند ہو تو ہو، ادیب ہرگز نہیں۔

مثلاً ڈاکٹر صاحب کے نزدیک پاکستانی ادب کی نمایندگی کا حق صرف سید سبطِ حسن کی تحریروں کو حاصل ہے اور وہی پاکستان کے سب سے بڑے ادیب ہیں۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ گزشتہ ۳۷ برسوں میں سید صاحب نے ایران توران پر تو بہت کچھ لکھا ہے، لیکن ان کے قلم سے کوئی ایسی تحریر "سرزد" نہیں ہوئی، جسے ادب کہا جا سکے۔ ڈاکٹر صاحب نے سید صاحب کو ترقی پسندی کی علامت قرار دیا ہے۔ انھیں بھی اس سے اتفاق ہے، لیکن اس جملۂ معترضہ کے ساتھ کہ پاکستان میں ترقی پسندی نے سرمایہ داری سے سمجھوتہ کر رکھا ہے۔ اب ہمارے ترقی پسند "ادیب" سرمایہ داروں کے اداروں کے پبلک ریلیشنز آفیسر بن کر ان کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ یہی نہیں، مکتبۂ فرینکلن جیسے امریکی اداروں کے لیے معاوضے پر ترجمے کا کام بھی کر سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ تراجم دوسروں کے نام سے شائع ہوں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضمون میں پاکستان کے کچھ ایسے نمایندہ شاعروں کے نام بھی گنوائے ہیں، "جن کے لہجے کا انقلابی آہنگ نمایاں ہے اور جن کے ہاں احتجاج کی چنگاریاں موجود ہیں۔" ان نمایندہ شاعروں میں فیض احمد فیض کے ساتھ صہبا لکھنوی کا نام بھی شامل ہے، حالاں کہ صرف صہبا کا نام کافی تھا۔ ڈاکٹر محمد حسن نے صہبا لکھنوی کے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ فیض صاحب اچھے شاعر ضرور ہیں، مگر ہمارا دعویٰ ہے کہ انھوں نے صہبا لکھنوی کے معیار کا ایک شعر بھی نہیں کہا۔

ڈاکٹر محمد حسن نے ازراہِ لطف و کرم بعض پاکستانی مطبوعات پر تبصرے بھی کیے ہیں۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی آپ بیتی "گردِ راہ" کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"اختر حسین رائے پوری کی شخصیت اور کردار کی جو تصویر ابھری ہے، وہ کسی واضح نظریاتی وابستگی والے دانشور کی نہیں، بلکہ ایک ایسے ذہین اور باخبر انسان کی ہے، جسے بھانت بھانت کے بڑے آدمیوں کو شیشے میں اتار لینے کا فن آتا ہے اور جس کی زندگی کٹی ہے تو کسی اعلیٰ اقدار کی کھوج یا ان کی خدمت کی بجائے خود اپنی ہی عظمت اور ذہانت ناپنے میں۔ اس اعتبار سے یہ سوانح عمری خاصی مایوس کن ہے۔"

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے ہیں، لیکن ترقی پسند ان سے اس لیے ناراض ہیں کہ انھوں نے سرکاری ملازمت قبول کر لی تھی۔ اگر ڈاکٹر صاحب کسی سرمایہ دار کی ملازمت کر لیتے تو شاید ان کی سوانح عمری اتنی مایوس کن نہ ہوتی۔

لاہور کے رسالے "معاصر" پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد حسن نے معروف ادیب اور دانشور سراج منیر کے ایک مقالے کا اقتباس پیش کرنے سے پہلے لکھا ہے: ......"کوئی صاحب ہیں سراج منیر"...... اور اقتباس کے بعد فرمایا ہے:

"سراج منیر کو اپنے ذوقِ شعری کا ثبوت دینا ہے اور ان کے اس مقالے سے بھی اس کا کوئی

ثبوت نہیں ملتا۔ دوسرے متعلقہ علوم سے واقفیت اور آگہی کے سلسلے میں ممتاز حسین اور ان کے شاگردوں کی سطح تک ابھی انھیں رسائی حاصل کرنا باقی ہے۔ محض اتفاق نہیں کہ تمام رجعت پسند دھند دریچوں کے باوجود آج بھی پاکستان کی اُردو تنقید میں جو نام معتبر ہیں، وہ ممتاز حسین، عتیق احمد، احمد ہمدانی اور شہزاد منظر کے ہیں۔"

شاعروں میں صہبا لکھنوی کا نام لینے کے بعد نقادوں میں عتیق احمد اور شہزاد منظر ہی کے نام لیے جا سکتے تھے، ورنہ ڈاکٹر صاحب پر یہ الزام آتا کہ وہ پاکستانی ادب سے پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ رہی یہ بات کہ سراج منیر کو ممتاز حسین کے شاگردوں کی سطح تک رسائی حاصل کرنی ہے، تو یہ کچھ ایسا مشکل کام نہیں ہے۔ ہم کالج کے زمانے میں ممتاز حسین صاحب کے شاگرد رہ چکے ہیں۔ سراج منیر صاحب جب چاہیں ہم سے ملاقات کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد حسن نے فہیم اعظمی کی "جنم کنڈلی" پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

"نہایت خوب صورت اور دیدہ زیب یہ کتاب مصنف نے نہایت محبت اور خلوص سے بھیجی۔ کئی وزنی اور باوقار رائیں بھی شریکِ اشاعت ہیں، مگر درحقیقت یہ محض فضول کاوش ہے۔ یہ نہ ناول بن سکا ہے، نہ فکری دستاویز۔ اس ادھ کچری تحریر کے لائق مصنف کو ابھی کچھ دیر اور انتظار کرنا تھا کہ افکار و احساسات کوئی واضح شکل اختیار کر پاتے۔"

محبت اور خلوص سے بھیجی گئی کسی کتاب پر ایسا روکھا سوکھا تبصرہ ڈاکٹر محمد حسن ہی کر سکتے تھے۔ فہیم اعظمی کو ہم مشورہ دیں گے کہ وہ اپنی اگلی کتاب ڈاکٹر صاحب کو محبت اور خلوص سے نہیں، وی پی پی سے بھیجیں، تاکہ محبت اور خلوص کی مٹی خراب نہ ہو۔

(۷/ ستمبر ۱۹۸۴ء)

☆......☆......☆

نثری نظم میں روز مرہ گفتگو

اگر ہم سے پوچھا جائے کہ ہماری پسندیدہ ادبی شخصیت کون ہے تو ہم اپنے آپ کو نظر انداز کرتے ہوئے جناب قمر جمیل کا نام لیں گے۔ اپنے آپ کو نظر انداز کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہم خاصے منکسر المزاج واقع ہوئے ہیں اور یہ اچھا نہیں لگتا، جو بات دوسروں کو کہنی چاہیے، وہ ہم اپنی زبان سے کہیں۔ جناب قمر جمیل کو پسند کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان معدودے چند ادیبوں اور دانشوروں میں سے ہیں، جنھوں نے نئی نسل کی ذہنی تربیت میں بڑا حصہ لیا ہے۔ ان کے تربیت یافتہ ادیبوں کے بارے میں ہمیں علم ہے کہ وہ جناب قمر جمیل سے ملاقات کے آٹھویں روز سے اپنے آپ کو میر و غالب کے مرتبے پر فائز سمجھنے لگتے ہیں۔ اگر میر و غالب کو جناب قمر جمیل کی سرپرستی حاصل ہوتی تو خدا جانے وہ کس مرتبے پر فائز ہوتے۔

جناب قمر جمیل نے بلا شبہ نہایت زرخیز ذہن پایا ہے۔ ایک زمانے میں وہ خوبصورت غزلیں لکھتے تھے اور ان کا شمار ہمارے بہترین غزل گو شعرا میں ہوتا تھا۔ پھر وہ نثری نظم کی طرف آ گئے۔ اس صنف میں انھوں نے اتنا کمال حاصل کیا کہ ان کی روز مرہ گفتگو بھی نثری نظم میں ہوتی تھی۔ پھر موصوف نے نثر کو اپنی جولانیٔ طبع کے اظہار کے لیے منتخب کیا اور اپنے کالموں کے ذریعے حق گوئی و بے باکی کی نادر مثال قائم کی۔ وہ اتنی روانی اور آسانی سے سچ بولتے ہیں کہ اوروں کے لیے اتنی روانی اور آسانی سے جھوٹ بولنا بھی ممکن نہیں ہوتا۔ کچھ دن ہوئے انھوں نے ایک کالم اپنے بارے میں لکھا تھا۔ اس میں وہ فرماتے ہیں:.....

"کسی زمانے میں ہم اپنے آپ کو شاعر سمجھتے تھے، غزلیں لکھتے تھے، تھک گئے تو نثری نظمیں شروع کر دیں اور اب نثر پر آ گئے تو ہمارے سامنے یہ سوال آیا کہ ہم شاعر ہیں یا نقاد"..... یہ سوال ان سب لوگوں کے لیے دلچسپی کا حامل ہے، جو قمر جمیل ہی سے نہیں، شاعری اور تنقید سے بھی ہمدردی رکھتے ہیں۔

قمر جمیل صاحب نے اس سوال کا جواب دینے کے لیے ایک طویل سوال نامہ مرتب کیا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اس سوال نامے کے جوابات بھی عنایت فرماتے، لیکن انھوں نے یہ کام دوسروں کے لیے چھوڑ

دیا ہے اور لکھا ہے کہ اس سوال نامے کے جوابات ہر اس شخص کو دینے چاہئیں، جو اپنا نام شاعروں کی فہرست میں لکھوانا چاہتا ہے۔ قمر جمیل صاحب نے از راہِ کرم ہمارا نام لے کر ہمیں دعوت دی ہے کہ ہم یہ سوال نامہ اپنے ہم عصروں کی خدمت میں پیش کریں اور اس کے جوابات حاصل کریں، ہمارے ہم عصروں یا ہم عمروں میں اب صرف حضرت لاغر مراد آبادی ہی رہ گئے ہیں، لہٰذا یہ سوال نامہ ہم نے ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ذیل میں قمر جمیل صاحب کے سوالات اور لاغر صاحب کے جوابات درج کیے جا رہے ہیں:

سوال: کیا آپ کو نوکری سے گھبراہٹ ہوتی ہے؟

جواب: مجھے نہیں، ان لوگوں کو گھبراہٹ ہوتی ہے، جن کے ادارے میں مَیں ملازم ہوں۔

سوال: کیا آپ اپنی زندگی تباہ کر رہے ہیں؟

جواب: جی ہاں اب روزانہ آپ کا کالم باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔

سوال: کیا آپ ہر مشاعرے میں شرکت کرنا اپنا فرضِ منصبی سمجھتے ہیں؟

جواب: یہ منصبی فرض نہیں، پیدائشی فرض ہے۔ مجھے کسی منصب کی وجہ سے شاعر نہیں سمجھا جاتا، جیسے بعض لوگوں کی غزلیں ٹی وی سے محض اس لیے گائی جاتی ہیں کہ وہ کسی بڑے منصب پر فائز ہوتے ہیں۔ مَیں پیدائشی شاعر ہوں۔

سوال: آپ ہر وقت قافیوں میں کھوئے رہتے ہیں؟

جواب: مَیں عام شاعروں کی طرح صرف قافیوں کی تلاش میں نہیں رہتا، وقت کا کچھ حصہ ردیفوں کی تلاش میں بھی صرف کرتا ہوں، کیوں کہ غیر مردّف غزلیں لکھنا میرا شیوہ نہیں ہے۔

سوال: کیا آپ ہمیشہ غمگین رہتے ہیں؟

جواب: خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔ صرف اس روز غمگین رہتا ہوں، جس روز ٹی وی کے مشاعرے میں ان لوگوں کو دیکھتا ہوں، جو مجھ سے غزلیں لکھواتے ہیں۔ اس پر افسوس ہوتا ہے کہ ٹی وی والے مجھ سے غزلیں لکھوانے والوں کو تو بلاتے ہیں، لیکن مجھے بھول کر بھی یاد نہیں کرتے۔

سوال: کیا آپ بارش میں درخت کے نیچے کھڑے رہنا پسند کرتے ہیں؟

جواب: بشرطیکہ کوئی نثری نظم لکھنے والا ساتھ نہ ہو، اس موقع کو غنیمت جان کر وہ نثری نظم سنانے لگے گا۔ اس کی بجائے مَیں بارش میں بھیگنے کو ترجیح دوں گا۔

سوال: کیا آپ بچوں کی طرح، بلکہ معصوم بچوں کی طرح اپنے گھر کا دروازہ کھول کر سونا پسند کرتے ہیں؟

جواب: ہرگز نہیں، ایک مرتبہ یہ تلخ تجربہ ہو چکا ہے کہ مَیں دروازہ کھول کر سویا تھا اور کوئی شخص میری بیاض اٹھا کر لے گیا تھا۔ اس بیاض کی بیشتر چیزیں بعد میں فیض احمد فیض کے نام سے شائع

ہوئیں۔

سوال: کیا آپ جھگڑے میں آنکھیں نکال نکال کر لوگوں کو ڈراتے ہیں؟

جواب: جھگڑے میں نہیں، مشاعرے میں۔

سوال: کیا آپ بچپن میں کسی عورت سے ڈر گئے تھے؟

جواب: اس کے برعکس واقعہ پیش آیا تھا۔

سوال: کیا آپ خواتین میں بہت غیر مقبول ہیں؟

جواب: ہرگز نہیں، میں خواتین میں اس حد تک مقبول ہوں کہ سلطانہ مہر نے شاعرات کا جو تذکرہ لکھا ہے، اس میں میرے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام شامل ہے۔

سوال: کیا آپ گھوڑوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں، کبوتروں کو پسند کرتے ہیں اور چیل اور کوے میں کوئی فرق نہیں کر سکتے؟

جواب: اس سوال کا جواب اس وقت تک نہیں دیا جا سکتا، جب تک مجھے ساداتِ امروہہ کے سالانہ مشاعرے میں شرکت کا موقع نہ مل جائے۔

سوال: کیا آپ اپنے آپ کو ماہرِ نفسیات سمجھتے ہیں؟

جواب: جی نہیں، نفسیات سے میرا اتنا ہی تعلق ہے، جتنا مولانا کوثر نیازی کا شاعری سے۔

سوال: کیا آپ ہر بار ٹیلی ویژن پر آنا چاہتے ہیں؟

جواب: مجھے اب تک ایک ہی بار ٹی وی پر آنے کا موقع ملا ہے اور وہ بھی اس وقت، جب میں قوالی کے ایک پروگرام میں سامعین کے ساتھ جھوم رہا تھا۔

سوال: کیا آپ کی یہ دلی خواہش ہے کہ ہر گویا آپ کی غزل گائے۔ خاص طور سے مہدی حسن اور فریدہ خانم؟

جواب: مجھے مہدی حسن اور فریدہ خانم کی کیا ضرورت ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے میرا ترنم اچھا خاصا ہے۔ گویوں کے محتاج وہی محتاج ہوتے ہیں، جو خود نہیں گا سکتے یا پھر گویوں کی ضرورت ان شاعروں کو ہوتی ہے، جن کی شاعری میں جان نہیں ہوتی۔

سوال: کیا آپ ٹی وی پر پروڈیوسر کو عید کارڈ بھیجتے ہیں؟

جواب: پہلے بھیجتا تھا، لیکن اب نقد رقم کی صورت میں عیدی بھیجتا ہوں۔

سوال: کیا آپ نثری نظم سے دلچسپی رکھتے ہیں؟

جواب: خدا نہ کرے ایسا ہو۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اہلِ دوزخ کو ایک سزا یہ بھی دی جائے گی کہ انھیں نثری نظمیں سنائی جائیں گی۔ راولپنڈی کے مشہور شاعر صادق نسیم نے اس خیال کو منظوم بھی

کر دیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

روزِ محشر جو نسیم اٹھایا گیا … داورِ حشر مسکرا اٹھا
مجھے شعر و سخن کا چسکا تھا … اس خطا پر مجھے ملی یہ سزا
"بامِ اعراف پر کھڑا ہو جا … حور و غلماں سنیں نہ تیری صدا
اہلِ دوزخ کو نثری نظم سنا
اور لگاتار ہی سناتا جا"

(۳۱ر دسمبر ۱۹۸۳ء)

☆……☆……☆

لفظوں سے مرقع کشی

یہ ۱۹۲۷ء کی بات ہے کہ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے اپنے سہ ماہی رسالے ''اردو'' میں مرزا فرحت اللہ بیگ کا ایک مضمون شایع کیا، جس کا عنوان تھا: نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی۔ اردو زبان میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا مضمون تھا۔ لکھنے والوں نے مولوی نذیر احمد کی ایسی چلتی پھرتی تصویر کھینچی تھی کہ آج ہم مولوی صاحب کو ان کی تحریروں سے زیادہ مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون کے حوالے سے پہچانتے ہیں۔ اس مضمون کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس کی اشاعت سے اردو میں شخصی خاکہ نگاری کا آغاز ہوتا ہے۔ ۱۹۲۷ء سے لے کر اب تک شخصی خاکوں کے پچاس سے زیادہ مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔ ''نقوش'' کے دو ضخیم نمبر چھپے ہیں اور پھر ہر سال مختلف رسالوں میں بے شمار شخصی خاکے شایع ہوتے رہتے ہیں۔ شخصی خاکہ نگاری کو اب باقاعدہ ایک ادبی صنف کی حیثیت سے تسلیم کیا جا چکا ہے۔

شخصی خاکہ نگاری کا بھی وہی حال ہے، جو دیگر اصناب ادب کا ہے۔ ہر طرح کے لکھنے والوں نے اسے اپنایا ہے۔ کچھ لوگوں نے تو واقعی لکھنے کا حق ادا کیا ہے، بعضوں نے شخصی خاکے سے وہی سلوک کیا، جو استاد اختر انصاری اکبر آبادی غزل سے اور سلطان جمیل نسیم افسانے سے کرتے ہیں۔ ہم نے ایسے شخصی خاکے بھی پڑھے ہیں، جن میں موضوع کا ذکر صرف عنوان کی حد تک ہوتا ہے اور باقی سارا خاکہ لکھنے والے کی اپنی شخصیت کے بارے میں ہوتا ہے۔ بہت دن ہوئے، ایک مشہور مصنف نے مولوی عبدالحق کا خاکہ لکھا تھا، جس میں انھوں نے خود اپنی شخصیت کو بڑی عمدگی سے بے نقاب کیا تھا اور پھر اپنی شخصیت سے جو نقاب اتارا تھا، اُسے مولوی عبدالحق کی شخصیت پر بڑی خوبصورتی سے ڈال دیا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے موصوف نے مولوی صاحب کا خاکہ نہیں لکھا، بلکہ مولوی صاحب نے ان کی شخصیت پر طبع آزمائی کی ہے۔ یہ خاکہ پڑھ کر ہم نے جناب مصنف سے عرض کیا۔ ''اس خاکے میں مولوی عبدالحق تو کہیں نظر نہیں آتے، ہر طرف آپ ہی جلوہ گر ہیں۔'' انھوں نے فرمایا۔ ''مولوی صاحب نے جو شخصی خاکے لکھے ہیں، ان میں

بھی تو وہ خود کہیں نظر نہیں آتے، میں نے بھی ان کی تقلید کی ہے۔''

شخصی خاکے مرحومین کے بھی لکھے جاتے ہیں اور زندہ لوگوں کے بھی۔ مرحومین کے بارے میں جھوٹ بولنا جتنا آسان ہوتا ہے، زندوں کے بارے میں سچ بولنا اتنا مشکل ہوتا ہے۔ اس صورت حال سے بعض خاکہ نگاروں نے یہ فائدہ اٹھایا ہے کہ شخصی خامیاں تو مرحومین کے کھاتے میں ڈال دی جاتی ہیں اور خوبیوں سے زندہ شخصیات کو سرفراز کیا جاتا ہے۔ اس طریق کار کو خاصی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ مرحومین حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے اور زندہ افراد مجوزہ خوبیوں کے مطابق اپنے کردار کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ ساری تمہید ہم نے اس لیے لکھی ہے کہ حال ہی میں شخصی خاکوں کا ایک ایسا مجموعہ پڑھنے کا اتفاق ہوا ہے، جس میں فن خاکہ نگاری کی مروجہ خوبیوں میں سے ایک بھی خوبی نہیں پائی جاتی، یعنی مصنف نے اپنی ذات کو پس منظر میں رکھا ہے اور اپنا ذکر صرف اس حد تک کیا ہے، جس حد تک ناگزیر تھا۔ کسی ایک خاکے پر بھی گمان نہیں گزرتا کہ مصنف نے کسی اور کے پردے میں اپنی شخصیت کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ مصنف نے آرائش بیان سے بھی کام نہیں لیا، حالاں کہ تمام خاکے مرحومین کے ہیں۔ اگر وہ چاہتے تو بلا خوف تردید بے شمار ایسے واقعات لکھ سکتے تھے، جو کبھی ظہور میں نہ آئے ہوں۔

شخصی خاکوں کے اس غیر روایتی مجموعے کا نام ہے: کیا قافلہ جاتا ہے۔ اور اس کے مصنف ہیں نصر اللہ خان۔ سیاست اور حقے والے نصر اللہ خان نہیں، جن کا سیاسی حقہ پانی آج کل بند ہے، بلکہ وہ نصر اللہ خان، جو اپنے کالموں کے ذریعے دوسروں کا حقہ پانی بند کرتے ہیں۔ اردو صحافت خان صاحب کے قلم کی جولانیوں سے گزشتہ ربع صدی سے مستفیض ہو رہی ہے۔ انھوں نے ظفر علی خان، عبدالمجید سالک اور چراغ حسن حسرت کی روایات کو قائم ہی نہیں رکھا، ان کی توسیع بھی کی ہے۔ اخباری کالم نویسی میں آج سب سے اہم اور محترم نام انھیں کا ہے۔ اور جو ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے، سب اسی نام کے اسیر ہوئے۔ خان صاحب کا نام ہی نہیں، کام بھی ایسا ہے کہ اردو صحافت اس پر فخر کر سکتی ہے۔

کالم نگاری جان جوکھوں کا کام ہے، لکھنے والے کے لیے بھی اور پڑھنے والے کے لیے بھی، کیوں کہ اکثر لکھنے والے پڑھنے والوں کے صبر کا امتحان لیتے ہیں، لیکن خان صاحب کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ ان کی طرح شاید ہی کسی نے اتنے طویل عرصے تک روزانہ کالم لکھا ہو اور طنز و مزاح کے اعلیٰ معیار کو برقرار رکھا ہو۔ یہ صرف کمال فن نہیں، معجزہ بھی ہے۔

خان صاحب نے کالم نگاری کے ساتھ ساتھ کئی اور قابل قدر کام بھی کیے ہیں۔ ریڈیو پاکستان کے پاس اسٹیج کے لیے بیسیوں ڈرامے لکھے، جو بے حد مقبول ہوئے۔ کئی برسوں تک ریڈیو کا مشہور پروگرام ''چلتا چلا گیا'' لکھا۔ اپنی یادداشتیں لکھیں، جو کئی برسوں تک ایک اخبار میں قسط وار شایع ہوئیں۔ ایک سو

سے زیادہ افراد کے شخصی خاکے لکھے۔ انھیں خاکوں کا انتخاب "کیا قافلہ جاتا ہے" کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا ہے، جس میں باون شخصیات کی قلمی تصویریں ہیں۔ ان میں علما بھی ہیں اور سیاست دان بھی، ادیب بھی ہیں اور موسیقار بھی۔ ان سب کو خان صاحب نے اپنی یادوں کے حوالے سے دیکھا ہے اور ایک ایسی محفل آراستہ کی ہے، جس میں سبھی آشنا چہرے ہیں۔ پہلے ہم انھیں دور سے دیکھتے تھے اور اب قریب سے دیکھ رہے ہیں۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ٹھیک لکھا ہے: "اگرچہ یہ قافلہ رفتگاں ہے، لیکن اس قافلے میں شامل سب لوگ اس کتاب کے صفحات میں جیتے جاگتے نظر آتے ہیں۔ خان صاحب نے لفظوں سے مرقع کشی ہی نہیں کی، ان مرقعوں میں جان بھی ڈالی ہے۔ اس کتاب کی ایک اہمیت یہ بھی ہے کہ اس میں گزشتہ نصف صدی کی علمی، ادبی اور سیاسی تحریکوں کے بارے میں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان خاکوں کے حوالے سے خود نصراللہ خان کی زندگی کے بہت سے گوشے سامنے آتے ہیں۔ گویا یہ کتاب جگ بیتی بھی ہے اور آپ بیتی بھی۔"

یوں تو اس کتاب میں شامل سبھی خاکے کسی نہ کسی اعتبار سے اہم ہیں، لیکن بعض خاکے اس اعتبار سے اہمیت رکھتے ہیں کہ ان سے متعلقہ شخصیات کے بارے میں بہت سی نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ سعادت حسن منٹو، ڈاکٹر رشید جہاں، ڈاکٹر تاثیر، شاہد احمد دہلوی اور طفیل احمد جمالی کی شخصیتوں کے بہت سے پہلو ایسے ہیں، جن سے ہم پہلی بار متعارف ہوئے ہیں۔ مثلاً مشہور اشتراکی کارکن اور افسانہ نگار ڈاکٹر رشید جہاں کے بارے میں خان صاحب نے بتایا ہے کہ جب صاحبزادہ محمود الظفر سے شادی کے بعد امرتسر آ گئیں تو انھوں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنے شوہر کے دادا نواب نجیب الدولہ کی تصویر پر اس زور سے گلدان تاک کر مارا کہ شیشہ بھی ٹوٹ گیا اور تصویر بھی پھٹ گئی۔ اشتراکیوں کے گھر میں کسی "نواب" کی تصویر اسی سلوک کی مستحق تھی۔

خان صاحب نے ڈاکٹر رشید جہاں اور فیض احمد فیض کے باہمی تعلقات کی نوعیت ان الفاظ میں بیان کی ہے:

"تاثیر اور فیض سے رشید جہاں کے گہرے مراسم تھے۔ فیض کی مسیں بھیگ رہی تھیں۔ وہ بڑے شرمیلے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ مکھی مکڑی کے جال میں پھنس گئی۔ ایک فیض ہی کیا، ایسے کئی فیض رشید جہاں کے حسن بیان اور ان کی تعلیمات کا اثر قبول کر کے کمیونسٹ ہو گئے۔ یوں سمجھیے کہ فیض بچے تھے اور رشید ان کی انا تھیں۔ ان کو لوریاں دیتیں، تھپک تھپک کر مارکسی نغمے سناتیں اور مارکسی خواب دکھایا کرتی تھیں۔ اس خواب ناک ماحول میں فیض بھلا پہلے سے فیض کہاں رہتے۔ بھرپور جوانی تھی، بہک جانے کے مواقع اور اسباب بہت سے تھے۔ غرض کہ فیض کو رشید جہاں نے بالکل بدل ڈالا۔ ایک فیض ہی کیا، امرتسر اور لاہور کا جو بھی

جوان ان کے قریب آیا وہ ان کا ہو گیا اور ان کے راستے پر لگ گیا۔"

اسی طرح منٹو کے بارے میں بھی انھوں نے یہ دلچسپ انکشاف کیا ہے:

"منٹو قلم اور کتاب چور تھا، اگر اس کی جیب میں کتاب خریدنے کے لیے پیسے نہ ہوتے وہ پڑھنے کے لیے ناول مانگتا اور اگر پھر اسے ناول نہ ملتا تو وہ چوری کرتا۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ اچھا قلم اور اچھی کتاب، جہاں بھی دیکھتا اڑا لیتا۔"

مختصر یہ کہ خان صاحب کی کتاب پڑھنے کے لائق ہے اور اگر اسے خرید کر پڑھا جائے تو زیادہ بہتر ہوگا، کیوں کہ یہ کتاب خان صاحب نے خود چھاپی ہے۔

(۲۸ر ستمبر ۱۹۸۲ء)

☆......☆......☆

کچھ سنسنی خیز انکشافات

جوش ملیح آبادی بلاشبہ اُردو کے بڑے شاعروں میں سے ہیں اور اپنے کلام کے بڑے حصے کی بنا پر "شاعر انقلاب" کہلانے کے بجا طور پر مستحق ہیں، لیکن ان کے مداحوں اور خود جوش صاحب کے اس خیال سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ جوش صاحب کی عمل زندگی بھی ان کی شاعری کے انقلابی مزاج سے ہم آہنگ تھی۔ جوش صاحب نے زندگی بھر، آزادی سے پہلے بھی اور آزادی کے بعد بھی، اہلِ ثروت و اقتدار سے فائدہ اٹھانے کی مقدور بھر کوشش کی اور اس میں کامیاب بھی ہوئے۔ مرحوم صرف شاعری کی حد تک انقلابی تھے، ورنہ مزاج انھوں نے جاگیردارانہ پایا تھا۔ وہ جہاں ذاتی اغراض کے لیے چھوٹے چھوٹے سرکاری افسروں سے بھی نیاز مندانہ روابط پیدا کرنے میں تاخیر نہ کرتے تھے، وہیں ضرورتِ شعری کے تحت دنیا کے بڑے سے بڑے آمر کو للکارنے سے دریغ نہیں فرماتے تھے۔ مزاج کے اسی تضاد کی وجہ سے ان کی شخصیت بڑی پہلو دار نظر آتی ہے، یعنی جس پہلو سے بھی دیکھیے، ایک نئے جوش صاحب سے ملاقات ہوتی ہے۔

جوں جوں وقت گزرتا جا رہا ہے، جوش صاحب کے بارے میں نئی نئی باتیں منظرِ عام پر آ رہی ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے جلیل قدوائی صاحب نے راس مسعود کے نام جوش صاحب کے خطوط شایع کیے تھے، جن میں پہلے تو مقصد براری کے لیے راس مسعود کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے گئے تھے اور جب مقصد پورا نہ ہوا تو راس مسعود کی ذات میں ہر طرح کے عیب تلاش کر لیے گئے۔ اب کچھ اور ایسی دستاویزات شایع ہوئی ہیں، جن سے جوش صاحب کی شخصیت کا ایک دلچسپ پہلو سامنے آتا ہے۔ اتر پردیش اردو اکیڈمی، لکھنؤ کے رسالے "اکادمی" کا جوش نمبر حال ہی میں ہماری نظر سے گزرا ہے، جس میں "جوش کی شخصیت کا مجروح پہلو" کے عنوان سے مائل ملیح آبادی کا ایک مقالہ شامل ہے، جس میں جوش صاحب کے حیدرآباد دکن جانے کے سلسلے میں سنسنی خیز انکشافات کیے گئے ہیں۔ مائل ملیح آبادی کو جوش

صاحب کی ایک بیاض ملی ہے۔ جس میں بعض ایسے نوادر موجود ہیں، جن سے جوش شناسی کا ایک نیا دروازہ کھلتا ہے۔

جوش صاحب نے "یادوں کی برات" میں نظام دکن سے اپنی پہلی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ انھوں نے نظام کو اپنی وہ غزل سنائی تھی، جس کے دو شعر یہ ہیں:

ملا جو موقع تو روک دوں گا ، جلالِ روزِ حساب تیرا
پڑھوں گا رحمت کا وہ قصیدہ، کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا
جڑیں پہاڑوں کی ٹوٹ جائیں، فلک تو کیا عرش کانپ اٹھتا
اگر میں دل پر نہ روک لیتا ، تمام زورِ شباب تیرا

کسی بادشاہ کے سامنے ایسی غزل پڑھنا، جس سے خود شاعر کی تعریف کا پہلو نکلتا ہو، بڑی جرأت کی بات ہے۔ جوش صاحب کے مداحوں نے ان کی اس جرأت کا تذکرہ بجا کیا، لیکن اصل حقیقت کچھ اور ہے۔ اس ملاقات میں جوش صاحب نے ۳۷ شعروں کا ایک قصیدہ پڑھا تھا، جس کے کچھ شعر یہ ہیں:

قریب ہے کہ ڈبو دے مجھے ہوائے فساد
سنبھال جلد سفینہ ، دکن کی بادِ مراد

اگرچہ قوتِ تخئیل و زورِ فکر سے آج
میرے دماغ پہ قائم ہے شعر کی بنیاد

مجھے فلک نے دیا ٹھیکرا گدائی کا
کبھی تھے صاحبِ جاہ و حشم میرے اجداد

مگر یہ بات نرالی نہیں ہے دنیا میں
ہمیشہ فقر پہ رہتی ہے فضل کی بنیاد

پسند ہوتی ہے جس مرغ کی خوش الحانی
اسی پہ دام بچھاتا ہے ڈھونڈ کر صیاد

نگاہِ غور سے تاریخ پہ جو کی تو کھلا
کمالِ فن ہے حسین اور زمانہ ابن زیاد

نہ تنگ کرتی جو دنیا تو اس گدائی کو
قبول کرتی نہ شاعر کی فطرتِ آزاد

مگر یہ میں نے کہا کیا؟ میری حقیقت کیا
ترے حضور تو خم ہے سرِ غرورِ قباد

نہیں ہے تیرے برابر جہاں میں کوئی ادیب
نہیں ہے تجھ سا کوئی فنِ شعر میں استاد

ترے جلال سے محکم ہے سلطنت کا نظام
ترے جمال سے رنگیں ہے گلشنِ ایجاد

تری نگاہ سے تابندہ محفلِ رنداں
تری جبیں سے درخشندہ مجلسِ زہّاد

ترے دکن کی دل آویزیوں پہ قرباں ہے
نسیمِ خاکِ مصلّے و آبِ رکنا باد

ستم ہے تیرے زمانِ عطا و بخشش میں
ہو ایک شاعرِ خوش گو کی زندگی برباد

بہا وہ فیض کا دریا، جو اپنی رو میں بہے
اچھالتا ہوا موتی سوئے نجف آباد

دعا پہ ختم کر اے جوشؔ! اب یہ نظم طویل
کہ شہر یارِ دکن کامران و زندہ باد

جوش صاحب نے حیدرآباد دکن پہنچ کر فردوسی کے شاہنامے کی طرح ایک "شاہ نامۂ دکن" لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ اسی سلسلے میں انھوں نے نظامِ دکن، میر عثمان علی خان کو جو درخواست پیش کی، اس کا آغاز ان الفاظ سے ہوتا ہے:

"اعلیٰ حضرت، ظلِ سبحانی، حامیِ دین و ملت، خسرو دارا صولت، عارفِ نکتہ شناس، حامیِ ارباب و کمال تاجدارِ سکندر جلال، حضرت سرکارِ عالی، خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ بہ بارگاہِ انجم سپاہ میر ساند۔"

جوش صاحب نے اس درخواست کے ساتھ اپنا مقصد ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"مجھے امید ہے کہ اگر یہ کام مجھ ایسے کم بضاعت سے بن پڑا تو یہ خدمت ہندوستان کے واسطے بالعموم اور ریاست حیدرآباد کے واسطے بالخصوص ایک نہایت دلچسپ، مفید اور سبق آموز خدمت ہوگی۔ غزل کہہ لینا اور چیز ہے اور تاریخ کے پیچیدہ واقعات کو ربط کے ساتھ نظم کرنا چیزے دیگر۔ یہ وہ میدان ہے کہ محمود نے فردوسی کے سپرد جب یہ خدمت کی تو حکم دیا کہ فردوسی کو ایوانِ شاہی کے قریب ایک مکان دیا جائے، جو تمام ضروری ساز و سامان

سے آراستہ ہو اور آلاتِ جنگ، شاہانِ عجم کے مرقعوں اور پہلوانوں کی تصاویر سے دیواریں سجا دی جائیں۔ ایک ایک شعر پہ ایک ایک اشرفی صلہ مقرر ہوا۔"

جوش صاحب نے "شاہنامۂ دکن" کا کچھ حصہ لکھ کر درخواست کے ساتھ نظامِ دکن کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس کے کچھ ابتدائی شعر ملاحظہ فرمایے۔ جوش صاحب قلم کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں:

وہ قصرِ سخن کے سجا بام و در
کہ یاد آئے فردوسیِ نامور

شبستانِ دلدار و میدانِ جنگ
دکھا بزم اور رزم دونوں کے رنگ

نکال ان کو قلبِ زمیں کر کے چاک
جو گنجِ گراں مایہ ہیں زیرِ خاک

لگا پھر سے ترتیب دے کر چمن
پراگندہ ہیں واقعاتِ دکن

بٹھا بزم میں پھر وہ اہلِ سخن
معطر ہو جس سے مشامِ دکن

زمانے سے مشتاق ہیں اہلِ بزم
دکھا سورماؤں کے میدانِ رزم

دلیروں کو کنجِ لحد سے جگا
لگا نعرۂ "قُمْ بِاِذْنِیْ" لگا

دکھا ان کو ہستی کی پوشاک میں
کفن اوڑھے سوتے ہیں جو خاک میں

قلم! لکھ وہ اشعار گرم و جلی
کہ زندہ رہے نامِ عثمان علی

افسوس کہ جوش صاحب کا شاہنامۂ دکن مکمل نہ ہوا، ورنہ اردو زبان کا دامن شاہنامۂ فردوسی کے پائے کے ایک شاہکار سے خالی نہ رہتا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس شاہکار کے ذریعے جوش صاحب کی انقلابی شاعری کے پس منظر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

(۱۵/اکتوبر ۱۹۸۴ء)

☆……☆……☆

جدید اُردو غزل کا اشاریہ

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہم اس انتظار میں رہتے ہیں کہ اُدھر نظیر صدیقی کی کوئی کتاب آئی اور اُدھر ہم نے کالم لکھ یا کھینچ مارا۔ یہ خیال بالکل غلط ہے، بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ ہمارے ایک کالم کی سیاہی خشک نہیں ہوتی کہ صدیقی صاحب کی نئی کتاب شائع ہو جاتی ہے۔ یہ صورت حال دیکھ کر ہم نے کئی مرتبہ کالم نگاری ترک کرنے کا ارادہ کیا، مگر جب اُدھر سے اسی قسم کی کوئی یقین دہانی نہ کی گئی تو مجبوراً ہمیں اپنے ارادے سے باز رہنا پڑا۔ بہر حال ہم مقابلے میں ڈٹے ہوئے ہیں، لیکن ہماری شکست کے آثار واضح ہیں۔ ہم اتنی تیزی سے کالم نہیں لکھ سکتے، جتنی تیزی سے نظیر صدیقی کتابیں لکھ لیتے ہیں۔ ۱۹۸۴ء ابھی ختم نہیں ہوا اور ان کی چار کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ سنا ہے، چار مزید کتابیں سال کے اختتام سے پہلے شائع ہونے والی ہیں۔

نظیر صاحب کی تازہ ترین کتاب "جدید اُردو غزل: ایک مطالعہ" ہے، جو گزشتہ ہفتے شائع ہوئی ہے۔ صنف غزل کے ساتھ شاعروں اور نقادوں نے یکساں سلوک کیا ہے۔ شاعر زندگی بھر غزلیں کہتے رہتے ہیں اور نقاد صنف غزل کی خوبیاں بیان کرنے میں عمریں صرف کر دیتے ہیں۔ غزل کے بارے میں اب تک بلا مبالغہ سیکڑوں مضامین شائع ہو چکے ہیں اور مستقل کتابوں کی تعداد بھی دو ڈھائی درجن سے کم نہیں ہے۔ غزل پر پہلی کتاب ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے لکھی تھی، پھر جو سلسلہ چلا تو بس چل ہی نکلا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی، ڈاکٹر رفیق حسین، خواجہ منظور حسین، پروفیسر اختر انصاری دہلوی، ڈاکٹر حنیف فوق، بشیر بدر، شمیم حنفی اور بہت سے دوسروں نے موٹی موٹی کتابیں لکھ کر یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ صنف غزل بڑی سخت جان ہے اور بڑے سے بڑے صدمے کو آسانی جھیل سکتی ہے۔

نظیر صدیقی کی کتاب اس اعتبار سے منفرد ہے کہ اس کا مصنف غزل گو شاعر بھی ہے اور غزل کا نقاد بھی۔ نظیر صاحب نے پہلے تو غزل لکھ کر اس صنف سے بے تکلفی کا اظہار کیا اور پھر جو کسر رہ گئی تھی، اسے

تنقیدی کتاب لکھ کر پورا کر دیا۔ یہ کتاب مصنف کے چار مختلف مضامین کا مجموعہ ہے، جو مختلف اوقات ہی میں نہیں، مختلف ذہنی کیفیات کے تحت بھی لکھے گئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ مصنف نے اپنے بعض بیانات کی تردید بھی خود ہی کر دی ہے اور اس طرح دوسرے نقادوں کو زحمتِ تردید سے بچا لیا ہے، مثلاً کتاب کے پہلے مضمون میں وہ ناصر کاظمی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"برگ نے کے بعد ناصر کاظمی کی شاعری ارتقا کی بجائے انحطاط کا راستہ طے کرتی رہی ہے۔ ان کی شاعری جو گہرے تجربات سے پہلے بھی بہرہ ور نہ تھی، اب گہرے تجربات سے اور زیادہ تہی داماں ہو چکی ہے۔" (صفحہ ۴۰)

اسی طرح ناصر کاظمی کے بارے میں وہ اپنے دوسرے مضمون میں لکھتے ہیں:

"انھوں نے اپنی شاعرانہ حیثیت اور اہمیت اپنے پہلے مجموعۂ کلام "برگ نے" ہی سے منوالی تھی۔ ان کی غزلوں کا دوسرا مجموعہ "دیوان" ...... ان کی شاعری کے بعض ارتقائی مرحلوں کا ترجمان ہے...... "دیوان" میں ان کی انفرادیت اور نکھر گئی ہے۔ روایت سے بغاوت کو اپنا نشانِ امتیاز نہ بنانے کے باوجود ناصر کاظمی نے "دیوان" کی بعض غزلوں اور کئی شعروں میں زبان اور نفس مضمون دونوں کے اعتبار سے خوبصورت تجربے کا ثبوت دیا ہے۔ "دیوان" میں ان کی تخلیقی توانائی نہ صرف برقرار رہتی ہے، بلکہ جگہ جگہ پھوٹی پڑتی ہے۔" (صفحہ ۱۰۵)

دیکھا آپ نے، جو شاعر کتاب کے صفحہ ۴۰ پر انحطاط کا راستہ طے کر رہا تھا، وہ صفحہ ۱۰۵ پر ارتقائی مراحل طے کرتا نظر آ رہا ہے۔ اس قسم کی "ارتقائی" مثالیں اور بھی پیش کی جا سکتی ہیں، البتہ ایک شاعر کے معاملے میں نظیر صدیقی ارتقا کے قائل نظر نہیں آتے۔ ایک مرتبہ اس شاعر کے بارے میں انھوں نے جو رائے قائم کر لی، پھر اس میں انھوں نے ترمیم کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ یہ شاعر ہے محبوب خزاں، جس کا ذکر زیر نظر کتاب کے پہلے مضمون میں (جو ۱۹۶۸ء میں لکھا گیا تھا) ان لفظوں میں آیا ہے:

"خزاں اردو کے ان چند شاعروں میں سے ہیں، جو غزل کے رسمی موضوعات و مضامین سے بہت دور ہٹ کر شعر کہتے ہیں۔ وہ اپنی شاعری میں ذاتی زبان اور ذاتی اسلوب ایجاد کرنے میں بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔" (صفحہ ۹۲)

بارہ برس بعد نظیر صدیقی اپنے دوسرے مضمون میں لکھتے ہیں:

"خزاں نہ صرف ایک اعلیٰ درجے کے سخن شناس ہیں، بلکہ اپنے موضوعات اور اسلوب کے اعتبار سے ایک حد درجہ منفرد شاعر بھی ہیں۔"

اس قسم کے بیانات سے محبوب خزاں کو سخن شناسی کا نہ سہی، نظیر صدیقی کی سخن شناسی کا ثبوت ضرور مل جاتا ہے۔ محبوب خزاں کا ذاتی زبان اور ذاتی اسلوب "ایجاد" کرنا اتنا اہم واقعہ نہیں، جتنا اہم واقعہ ان

ایجادات کی دوسروں کو اطلاع دینا ہے۔ نظیر صدیقی اگر اطلاع نہ دیتے تو اہلِ ادب ان ایجادات سے بے خبر رہتے۔

یہاں یہ بتاو ینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ نظیر صدیقی نے زیرِ نظر کتاب میں محبوب خزاں کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے:

"وہ غالباً واحد شاعر ہیں جن کی طرف اردو تنقید نے مناسب توجہ نہیں دی۔" (صفحہ ۱۶)

معلوم نہیں، "مناسب توجہ" سے نظیر صاحب کی مراد کیا ہے۔ خود نظیر صاحب کے ہر مضمون میں کسی نہ کسی بہانے محبوب خزاںؔ کا ذکر ہوتا ہے اور پھر انھوں نے تقریباً چالیس صفحات کا ایک مضمون خزاں کی شاعری پر لکھا ہے، جو اُن کے مجموعۂ مضامین "میرے خیال میں" شامل ہے۔ کیا اس کے بعد بھی یہ شکوہ کیا جاسکتا ہے کہ اُردو تنقید نے خزاںؔ کی طرف مناسب توجہ نہیں دی۔ "مناسب توجہ" سے شاید نظیر صاحب کی مراد یہ ہے کہ ان کی طرح اُردو کے تمام نقاد صرف محبوب خزاںؔ اور پروین شاکر پر ہی مضامین لکھتے رہیں۔

زیرِ نظر کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں جناب مصنف نے اپنے عہد کے اچھے برے ہر طرح کے شاعروں کو بڑی خوبصورتی سے ٹانک دیا ہے۔ اس سے غرض نہیں کہ کوئی اس کتاب میں بار پانے کا مستحق ہے یا نہیں، بس اس سے سروکار ہے کہ کسی کو یہ شکایت نہ رہے کہ اس کا نام کتاب میں نہیں آیا۔ اس بنا پر کتاب کا نام "جدید اردو غزل: ایک مطالعہ" کی بجائے "جدید اردو غزل۔ ایک اشاریہ" ہوتا تو اچھا تھا۔ کتاب کو پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے، جیسے ہم قدیم زمانے کا کوئی تذکرۂ شعرا پڑھ رہے ہیں۔ پرانے تذکرہ نگاروں کا طریق کار یہ تھا کہ جب وہ کسی شاعر کا نام اور اس کا ایک آدھ شعر سن لیتے تھے تو فوراً اسے شاملِ تذکرہ کر لیتے تھے۔ نظیر صدیقی کا انداز بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ انھیں کسی رسالے میں نجمہ تصدق اور امتہ الروف نسرین کا کلام نظر آیا۔ انھوں نے فوراً ان ناموں کو نوٹ کر لیا۔ نسرین کے اس قسم کے شعر انھوں نے انتخاب میں شامل کیے ہیں:

دیکھیے اب نہ یاد آئیے آپ
آج کل آپ سے خفا ہوں مَیں

اور پھر اس قسم کے شعروں پر یہ فیصلہ صادر کیا ہے:

"غالباً یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ نسرین اُردو کی دو تین بہترین شاعرات میں سے ہیں۔"

نظیر صدیقی کی جگہ اگر ہم ہوتے تو "غالباً" کی بجائے "یقیناً" لکھتے اور دو تین شاعرات والی بات بھی حذف کر دیتے کہ اردو کو اگر ایک ہی بہترین شاعرہ مل جائے تو بہت ہے۔

شعرا کے تعارف میں نظیر صدیقی نے ایک نیا تنقیدی اسلوب "ایجاد" کیا ہے، جس سے ہر شاعر کی غزل کی خصوصیات پوری طرح واضح ہو جاتی ہیں۔ اس کی چند مثالیں ملاحظہ فرمایئے:

(۱) انور مسعود:..... فارسی زبان و ادب کے پروفیسر کی حیثیت سے غزل کی روایات سے پوری طرح واقف ہیں۔

(۲) فارغ بخاری نے صوبہ سرحد میں اردو زبان و ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں، وہ فراموش نہیں کی جاسکتیں۔

(۳) شفیع منصور:..... نے طبیعت درویشانہ پائی ہے، اس لیے نہ ستائش کی تمنا، نہ صلے کی پروا۔

(۴) توصیف تبسم کا کلام "فنون" اور دوسرے رسالوں میں شائع ہوتا رہتا ہے۔

(۵) رحمت اللہ خاں اسلام آباد کے اتنے خاموش طبع اور عظمت پسند شاعر ہیں کہ اسلام آباد میں برسوں رہنے کے باوجود مجھے ان کے شاعرانہ وجود کا پتہ نہ چل سکا۔

(۶) امین راحت چغتائی کی غزلیں بھی "فنون" اور دوسرے رسالوں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

(۷) مہتاب ظفر کی غزلوں کا کوئی مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا۔

(۸) عیش برنی پہلے ڈھاکے میں رہتے تھے، اب پنڈی میں ہیں۔

(۹) ایوب فہمی تقریباً پندرہ سال سے اسلام آباد میں ہیں۔

(۱۰) اجاگت ندیم:..... چند سال ہوئے راولپنڈی کے کسی کالج سے ایک دلکش آواز ابھری تھی۔ نہ جانے وہ آواز کہاں گم ہوگئی۔

ان جملوں میں جو تنقیدی بصیرت ملتی ہے، اس سے جدید اردو غزل کی خصوصیات کا بھرپور اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے بعض لوگوں کو ان "تنقیدی" جملوں میں کام کی کوئی بات نظر نہ آئے، لیکن ہمیں تو بہت ہی کام کی باتیں نظر آرہی ہیں۔ مثلاً اگر نظیر صدیقی نہ بتاتے تو ہمیں کبھی یہ معلوم ہی نہیں ہوسکتا تھا کہ شفیع منصور نے درویشانہ طبیعت پائی ہے اور توصیف تبسم کا کلام "فنون" میں چھپتا ہے، رحمت اللہ خاں خاموش طبع ہیں، مہتاب ظفر کی غزلوں کا کوئی مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا، عیش برنی پہلے ڈھاکے میں رہتے تھے، ایوب فہمی پندرہ سال سے اسلام آباد میں ہیں (اب بیس سال ہوگئے، کیوں کہ نظیر صدیقی نے یہ اطلاع پانچ سال پہلے دی تھی)۔ ان معلومات کی بنا پر زیرِ نظر کتاب کو اگر جدید اردو غزل کا انسائیکلوپیڈیا کہا جائے تو یہ بے جا نہ ہوگا۔

اس کتاب کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں مصنف نے اپنے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے، یعنی اپنی غزل گوئی کو نظر انداز نہیں کیا۔ انھوں نے اپنے بارے میں تعریفی و توصیفی کلمات نہیں لکھے۔ یعنی یہ نہیں بتایا کہ وہ اسلام آباد میں کب سے مقیم ہیں اور آیندہ کے کیا ارادے ہیں۔........ بس اپنا ایک غزل انتخاب درج کر کے قارئین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"یہ سوچنا آپ کا کام ہے کہ غزل کے موجودہ سرمائے میں کوئی قابلِ قدر اضافہ میری طرف

سے بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔"

ایک حیثیت سے ہمارا جواب یہ ہے...... "غزل کے سرمائے میں نہ سہی، آپ کے اشعار کی وجہ آپ کی کتاب کی ضخامت میں تین صفحوں کا اضافہ ضرور ہوا ہے۔ اور یہ کوئی ایسی بات نہیں، جسے اس مہنگائی کے زمانے میں نظر انداز کیا جا سکے۔"

نظیر صدیقی نے اپنے کلام کے حوالے سے بھی سوچنے کی جو دعوت دی ہے، اس پر ہم کوئی تبصرہ نہیں کریں گے۔ ایک واقعہ یاد آ گیا ہے، وہ سن لیجیے کہ ایک صاحب مشاعرے میں کلام سنا رہے تھے۔ ایک شعر کے بعد فرمایا۔ "ذرا سوچیے تو میں نے کیا بات کہی ہے۔"

دوسری طرف سے جواب آیا۔ "جب شعر کہنے سے پہلے آپ نہیں سوچتے تو سننے کے بعد ہم کیوں سوچیں؟"

(۱۴ اکتوبر ۱۹۸۴ء)

☆............☆............☆

تخلیق و تنقید کی آبرو بچانے کی ایک مستحسن کوشش

اگر حصولِ علم کی سچی لگن ہو تو کسی مخصوص طریق کار پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ انسان ہزار طریقوں سے علم حاصل کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اخباروں میں چھپنے والے ٹینڈر نوٹس اور جناب انجم اعظمی کے کالموں کو یکساں دل چسپی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ٹینڈر نوٹسوں سے جو علم حاصل ہوتا ہے، وہ ہمارے کسی کام نہیں آتا۔ لیکن انجم اعظمی صاحب کے کالموں سے حاصل کردہ علم خاصا کارآمد ہوتا ہے۔ اور کچھ نہیں تو اسے بنیاد بنا کر ہم خود ایک کالم لکھ سکتے ہیں۔ سو آج کا کالم نہایت مضبوط بنیادوں پر لکھا جا رہا ہے۔

جناب انجم اعظمی نے گزشتہ ہفتے اپنے کالم میں بعض سنسنی خیز انکشافات کیے ہیں۔ ان کی تفصیل انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے:

(۱) لٹریچر کی روح سے ناآشنائی ہمارا سب سے بڑا تعلیمی معیار بن گیا ہے۔

(۲) یونیورسٹیوں میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے بغیر ملازمت کا راستہ بند ہے۔

(۳) پی ایچ۔ ڈی کا مطلب تیسرے درجے کی معلومات اکٹھا کرنے کے علاوہ کچھ اور نہیں۔

یہ ساری باتیں اس حوالے سے کہی گئی ہیں کہ ہماری یونیورسٹیوں میں ادب کی جو تعلیم دی جاتی ہے، وہ طالب علموں میں ادب کا صحیح مذاق پیدا نہیں کرتی............ ہمیں اعظمی صاحب کے اس خیال سے پورا پورا اتفاق ہے کہ لٹریچر کی روح سے ناآشنائی ہمارا سب سے بڑا تعلیمی معیار بن گیا ہے۔ ہم اس پر صرف اس قدر اضافہ کریں گے کہ آج کل ہمارا سب سے بڑا ادبی معیار بھی لٹریچر کی روح سے ناآشنائی ہے۔ ادب کتابوں اور رسالوں سے نکل کر اخباروں اور رونمائی کی تقریبوں میں آ گیا ہے۔ دور کیوں جائیں، خود انجم اعظمی صاحب کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ کراچی کی کوئی تقریبِ رونمائی اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتی، جب تک انجم صاحب اس میں تقریر نہ کریں۔ انجم صاحب تو خیر پڑھے لکھے آدمی ہیں

اور وہ ہمیشہ فکر انگیز تقریریں کرتے ہیں، لیکن رونمائی کی تقریبوں میں بیشتر تقریریں اس حد تک رسمی و فرمائشی ہوتی ہیں کہ لٹریچر کی روح سے آشنائی کے خواہاں لٹریچر کی روح قبض ہونے کا منظر دیکھ لیتے ہیں۔

انجم اعظمی صاحب کو اس پر اعتراض ہے کہ یونیورسٹیوں میں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے بغیر ملازمت کا راستہ بند ہے۔ ہماری رائے میں یہ اعتراض بالکل بجا ہے۔ یونیورسٹیوں کے ارباب حل وعقد کو ڈگریاں نہیں دیکھنی چاہییں، امیدوار کی استعداد و صلاحیت پر نظر رکھنی چاہیے۔ ایک زمانہ تھا کہ علامہ محمود شیرانی اور مولانا محمد حسین آزاد پنجاب یونیورسٹیوں میں پروفیسر تھے، جب کہ اول الذکر صرف میٹرک پاس تھے اور ثانی الذکر نے میٹرک پاس کرنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ اب بھی ویسا ہی ہونا چاہیے۔ اس صورت میں بہت سے ڈگری نہ رکھنے والے اہل علم یونیورسٹیوں میں کھپ سکتے ہیں، یہاں تک کہ حضرت لاغر مراد آبادی کے لیے بھی، اور کہیں نہیں تو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں تو جگہ نکل ہی سکتی ہے۔ اس یونیورسٹی نے اپنے نام میں ''اوپن'' کا لفظ شامل کیا ہے تو اس کی لاج بھی رکھنی چاہیے۔ اس کے دروازے ان سب لوگوں کے لیے کھلے رہنے چاہییں، جو حضرت لاغر مراد آبادی کی طرح ادب کی خدمت کا جذبہ رکھتے ہیں۔

انجم صاحب پی ایچ۔ ڈی کے بہت خلاف ہیں۔ اس مخالفت کا پس منظر بھی انھوں نے خود ہی بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''بہت پرانی بات ہے۔ کراچی یونیورسٹی کے ایک انٹرویو میں مجھ سے سوال کیا گیا کہ آپ نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کیوں نہیں لی۔ میں نے اس سوال کا سہارا لیتے ہوئے ایک بحث چھیڑ دی کہ لٹریچر میں ریسرچ ہوتی ہی نہیں۔ یا تو تخلیق ہوتی ہے یا تنقید۔ ہم جسے ادبی ریسرچ کہتے ہیں، وہ ادیبوں، شاعروں اور دانش وروں سے متعلق تیسرے درجے کی تاریخی معلومات کی شیرازہ بندی ہوتی ہے، جب کہ بقول ارسطو لٹریچر کا مرتبہ تاریخ سے بلند ہے۔''

اعظمی صاحب اگر ارسطو کی گواہی پیش نہ کرتے، تب بھی ہم ان کی بات مان لیتے۔ ویسے بھی یہاں ارسطو کی گواہی کی ضرورت نہیں تھی، کیوں کہ ارسطو کو کراچی یونیورسٹی کے کسی انٹرویو میں پیش ہونے کا تجربہ نہیں ہے۔ اعظمی صاحب کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ادب دو ہی چیزوں کا نام ہے اور وہ ہیں، تخلیق اور تنقید۔ ادبی ریسرچ سے ادب کا اتنا تعلق نہیں، جتنا طباعت اور جلد سازی سے ہے۔ طباعت اور جلد سازی سے ادب کے فروغ و اشاعت میں مدد ملتی ہے، جب کہ ادبی ریسرچ قدم قدم پر رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔ اگر اس سلسلے میں ایک دو مثالیں پیش کر دی جائیں تو بے جا نہ ہوگا۔ ایک مشہور نقاد نے غالب کی غزل

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

کے بارے میں لکھا تھا کہ اس میں غالب نے ۱۸۵۷ء کے بعد کی دہلی کی عکاسی کی ہے۔ دہلی کی تباہی کا غالب کے دل پر بہت اثر تھا، جس کا اظہار اس غزل میں ہوا ہے اور انھوں نے غدر سے پہلے کی دہلی کی رونق کو یاد کیا ہے...... بات معقول تھی، لیکن ریسرچ کرنے والے دور کی کوڑی لائے کہ یہ غزل غالب نے ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے لکھی تھی۔ اس کا دہلی کی تباہی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یوں ریسرچ والوں کی مداخلت سے بے چارے اک نقاد کی محنت اور تنقیدی بصیرت پر پانی پھیر دیا۔

دوسری مثال ہمارے بزرگ نقاد مجنوں گورکھ پوری کی ہے۔ میر تقی میر پر ان کا تنقیدی مقالہ بڑی شہرت رکھتا ہے۔ اس مقالے میں انھوں نے میر کی شخصیت کو اس شعر کے حوالے سے پیش کیا ہے:

شکست و فتح نصیبوں سے ہے، ولے اے میرؔ!
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

مجنوں صاحب فرماتے ہیں کہ اس شعر کے بغیر میر کی شخصیت کو سمجھا ہی نہیں جا سکتا۔ ریسرچ والوں کی تنگ نظری ملاحظہ کیجیے کہ انھوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ مذکورہ شعر میر تقی میر کا نہیں، کسی اور شاعر کا ہے۔ ریسرچ والوں نے مجنوں صاحب اور میر صاحب کے باہمی معاملے میں دخل دے کر ایک اچھے خاصے تنقیدی مضمون کو ساقط الاعتبار ٹھہرا دیا۔ ادب کے ان نادان دوستوں سے خدا ادب کو بچائے۔

اعظمی صاحب نے اہل تحقیق کے بارے میں یہ بھی فرمایا ہے:

''ہم آپ اکثر ایسے لوگوں سے ملتے رہتے ہیں، جو غالب یا میر یا اقبال پر تحقیق کر چکے ہیں۔ وہ لوگ ان کے بارے میں اس قسم کی باتوں میں الجھے رہتے ہیں کہ میر کا سن پیدائش کیا ہے، غالب کا انتقال کب ہوا، اقبال جرمنی میں کس کے ہاں ٹھہرے، کس سن میں انگلینڈ تشریف لے گئے، وغیرہ وغیرہ، لیکن ان میں سے بیشتر یہ نہیں جانتے کہ غالب، میر اور اقبال کی شاعری کی قدر و قیمت کیا ہے۔''

معلوم ہوتا ہے کہ اہل تحقیق کے بارے میں انجم اعظمی صاحب کی معلومات خاصی پرانی ہو چکی ہیں۔ اب تحقیق والے ان باتوں میں نہیں الجھتے کہ کسی شاعر کا سال پیدائش کیا ہے اور سالِ وفات کیا ہے۔ یہ مسائل تو کب کے طے ہو چکے ہیں۔ آج کل زور ان باتوں پر ہوتا ہے کہ غالب و میر وغیرہ کا جو کلام ملتا ہے، وہ انھیں شاعروں کا ہے یا دوسروں کی تخلیق ہے۔ جب سے غالب کے نسخۂ امروہہ والا کلام جعلی ثابت ہوا ہے، تب سے غالب کے باقی کلام ہی کو نہیں، ہر بڑے شاعر کے کلام کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جا رہا ہے۔ اسی طرح آج کل بعض محقق نقادوں کے بارے میں بھی چھان بین کر رہے ہیں کہ انھوں نے کس کس کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا ہے۔ حالاں کہ ذہین نقاد، چراغ سے چراغ نہیں جلاتے، دوسروں کا چراغ ہی اٹھا لاتے ہیں۔ گویا اب ادبی تحقیق پولیس والی تفتیش بن گئی ہے۔ ظاہر ہے یہ صورت حال تخلیق اور تنقید

دونوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ انجم اعظمی صاحب بلند مرتبہ تحقیق کار بھی ہیں اور ایک بڑے نقاد بھی۔ انھوں نے تحقیق کے خلاف بیان دے کر تخلیق و تنقید کی عزت و آبرو بچانے کی مستحسن کوشش کی ہے، جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

انجم اعظمی صاحب نے یہ معقول تجویز پیش کی ہے کہ:

"ہماری یونیورسٹیوں کو چاہیے کہ ادب کا شعبہ بھی کھولیں، جس میں تخلیق کرنے والوں کو استاد بنائیں۔ اعلیٰ ادب کی تعلیم ان کے سپرد کی جائے، جو تخلیق کر رہے ہیں یا تنقید کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، کیوں کہ ادیبوں اور شاعروں اور نقادوں میں ادب کی سمجھ کام کرتی ہے۔ اس سمجھ کو وہ اپنے طالب علموں میں منتقل کر سکتے ہیں۔ ادب کے شعبے میں زندوں کو استاد مقرر کرنا چاہیے، مردہ پرستوں کو نہیں۔ اور وہ محقق کیسے مردہ پرست، جو مردوں کا کفن بیچ کر کھا جاتے ہیں۔"

ہم اس تجویز کی پرزور تائید کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی عرض کریں گے کہ امیدواروں کا انٹرویو نہ لیا جائے، کیوں کہ انٹرویو میں عموماً غیر متعلقہ سوال کیے جاتے ہیں۔ یہ بھی نہ دیکھا جائے کہ امیدوار کے پاس کوئی ڈگری ہے یا نہیں۔ صرف یہ دیکھ لینا کافی ہوگا کہ اس کے کتنے دیوان یا تنقیدی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ اگر کسی امیدوار کی کوئی کتاب شائع نہ ہوئی ہو تو پھر یہ دیکھ لیا جائے کہ اگر وہ شاعر ہے تو اس نے کتنے مشاعروں میں کلام سنایا ہے اور اگر نقاد ہے تو کتنی تقریبات رونمائی میں تقریریں کی ہیں۔

(۱۹؍ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

☆……☆……☆

یہ نقطۂ نظر کا نہیں، نظر کا اختلاف ہے

اک زمانہ تھا کہ ہم فیض صاحب کو ان کی شاعری کے حوالے سے جانتے تھے، لیکن اب ایک عرصہ ہوا ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان شاعری رابطے کا ذریعہ نہیں رہی۔ اس سے فیض صاحب کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچا کہ ماضی بعید میں شاعری کے ذریعے کمائی ہوئی شہرت اب تک کام ہی نہیں آ رہی، بلکہ قومیائے ہوئے بنکوں کی شرح سود کے حساب سے اس میں اضافہ بھی ہو رہا ہے، لیکن ہمیں یہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے کہ فیض صاحب سے رابطہ رکھنے کے لیے ان کے لمبے لمبے انٹرویو پڑھنے پڑتے ہیں، جن میں ایک ہی جیسے سوال اور ایک ہی جیسے جواب ہوتے ہیں۔ اتنی یکسانیت تو کبھی فیض صاحب کی شاعری میں بھی نہیں تھی، جو ان کے انٹرویوز میں نظر آتی ہے۔ فیض صاحب کہیں سے آ رہے ہوں یا کہیں جا رہے ہوں، انٹرویو لینے والے موقع کی تلاش میں رہتے ہیں اور جب موقع مل جاتا ہے تو پھر فیض صاحب سے ایسا سلوک کیا جاتا ہے کہ ان کا ہر انٹرویو کسی فلمی ستارے کا انٹرویو معلوم ہوتا ہے۔

فیض صاحب اسی ہفتے کئی ملکوں کی سیر اور روس کا دو مرتبہ دورہ کرنے کے بعد کراچی تشریف لائے تو دوسرے ہی روز اخبار "حریت" میں ان کا ایک طویل انٹرویو شائع ہوا۔ اس "عجلت نویسی" کی بنا پر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ انٹرویو فیض صاحب کے سامان سفر میں شامل تھا، لیکن ہمیں اس سے اتفاق نہیں، کیوں کہ انٹرویو لینے والی خاتون شمع زیدی اپنے کام میں خاصی مستعد ہیں۔ انھوں نے تو فیض صاحب کو سامان سفر کھولنے کی بھی مہلت نہیں دی اور ان کے سامنے ایک فکر انگیز سوال نامہ رکھ دیا۔ اس طرح ہمیں فیض صاحب کا ایک ایسا انٹرویو پڑھنے کو ملا، جس میں بہت سی ایسی باتیں آ گئی ہیں، جو فیض صاحب کے سوانح نگاروں ہی کی نہیں، ہم جیسے کالم نگاروں کی بھی دلچسپی کی ہیں۔

شمع زیدی نے یوں تو بہت سے اچھے اچھے سوال کیے ہیں، لیکن کہیں کہیں انھوں نے اپنے نام کی مناسبت سے رسالہ "شمع" دہلی میں چھپنے والے انٹرویوز کی بھی یاد تازہ کر دی ہے۔ مثلاً انھوں نے پوچھا۔

"فیض صاحب! کیا آپ پر کوئی ایسا وقت آیا، جب کسی نے آپ کو پسند کیا ہو؟" فیض صاحب نے برجستہ جواب دیا۔ "ارے بھئی، ایسا وقت گیا تھوڑی ہے، آتا ہی رہتا ہے۔" اس جواب میں اپنے درخشاں مستقبل کے بارے میں جو خود اعتمادی پائی جاتی ہے، اس کی توقع فیض صاحب ہی سے کی جا سکتی تھی، ورنہ ہمارے شعرا تو اچھے وقت کے لیے ماضی کی طرف دیکھنے کے عادی ہیں۔

ایک سوال یہ تھا کہ آپ کو کون سا پھل پسند ہے۔ فیض صاحب نے فرمایا۔ "وہی، جو غالب کو پسند تھا، یعنی آم۔" اس جواب سے کم از کم یہ طے ہو جاتا ہے کہ غالب اور فیض میں کھانے پینے کے معاملے میں بڑی مماثلت پائی جاتی ہے۔ ممکن ہے یہ مماثلت آگے چل کر شاعرانہ عظمت کی مماثلت کے لیے راہ ہموار کر دے۔

اس کے بعد ضروری تھا کہ علامہ اقبال سے بھی قربت کا کوئی پہلو تلاش کر لیا جاتا، لہٰذا فیض صاحب نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا۔ "جاوید اقبال کی والدہ ہماری بھتیجی کی رشتے کی کزن ہیں۔" حیرت ہے کہ اتنی قریبی رشتے داری کے باوجود فیض صاحب نے علامہ اقبال کی شاعری کا اتنا اثر بھی قبول نہیں [illegible]، جتنا احمد ندیم قاسمی کی شاعری میں ملتا ہے، حالاں کہ قاسمی صاحب نے کبھی علامہ اقبال سے رشتے داری کا دعویٰ نہیں کیا۔

ایک سوال یہ تھا کہ کیا آپ ٹی وی دیکھتے ہیں؟ فیض صاحب نے جواب دیا۔ "یہ بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے۔" اس جواب سے یقیناً ٹی وی والوں کی دل شکنی ہوگی۔ فیض صاحب نے کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی، اس لیے ہمیں ان سے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ فیض صاحب چاہتے تو ٹی وی والوں کا دل رکھنے والوں کے لیے بآسانی کہہ سکتے تھے۔ "ہاں ٹی وی دیکھتا ہوں، جب کبھی کسی فنی خرابی کی وجہ سے پروگرام روک دیا جاتا ہے۔" بہرحال ٹی وی والے آزردہ خاطر نہ ہوں، فیض صاحب چوں کہ زیادہ تر ملک سے باہر رہتے ہیں، اس لیے انھیں حالات کا صحیح علم نہیں، ورنہ اہل ملک اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہمارے ہاں دیکھنے کی اب یہی ایک چیز تو رہ گئی ہے۔

اب آیئے خالص ادبی سوالوں کی طرف۔ ان سے پوچھا گیا کہ ہمارے نقادوں نے غالب، میر اور اقبال کے بعد سب سے زیادہ آپ کے بارے میں لکھا ہے۔ آپ کی شاعری پر جو تنقید ملتی ہے، اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ فیض صاحب نے یا تو اس سوال کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی، یا پھر خوب اچھی طرح سمجھ کر جواب دیا۔ "ہمارے ناقد بڑے ذہین ہیں، لیکن یہ شبہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے کلاسیکی ادب کا اس قدر وسعتِ نظر اور انہماک سے مطالعہ نہیں کیا کہ وہ مغربی اصول تنقید کو اپنی فضا میں ٹھیک طریقے سے جوڑ سکیں۔"

سوال فیض صاحب کی شاعری کے حوالے سے ہو اور جواب کلاسیکی ادب کے حوالے سے دیا جا [illegible]

تو اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ نقادوں کو فیض صاحب کے کلام کا مزید توجہ سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ کم از کم اتنی توجہ ضرور دینی چاہیے، جتنی فیض صاحب آج کل خود اپنے کلام پر دیتے ہیں۔ یعنی ۵، ۶ مصرعوں میں اگر ایک آدھ مصرعہ بحر سے خارج ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، مگر افسوس کہ ہمارے بیشتر ترقی پسند نقاد شعر کو موزوں حالت میں پڑھنے کے قائل ہی نہیں۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں اردو نقادوں کے بارے میں فیض صاحب کی رائے اچھی نہیں ہو سکتی۔

فیض صاحب سے پوچھا گیا کہ کیا آپ معاصر ادب کا مطالعہ کرتے ہیں؟ انھوں نے سال میں ۱۱ مہینے ملک سے باہر رہنے کے باوجود بڑے اعتماد سے فرمایا۔ "کرتے ہیں۔" پھر معاصر ادب کے بارے میں رائے پوچھی گئی تو انھوں نے فرمایا۔ "دوسرے درجے کا ادب جیسا تھا، ویسا ہی ہے، مگر اول درجے کے ادب میں آج کل قحط کا موسم ہے اور زیادہ بار آور فصل نہیں ہے، لیکن اس میں تشویش یا خفا ہونے کی بات نہیں ہے۔ اچھا لکھنے والے موجود تو ہیں، بس ان کی تعداد میں شاید تھوڑی سی کمی ہے اور اس کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ کوئی نئی تحریک پیدا نہیں ہوئی۔ بہت سے اچھے لوگ تو تحریک کا سہارا لے کر ابھرتے ہیں، تو اس وقت ترقی پسند تحریک کی طرح کوئی جاندار تحریک پیدا نہیں ہوئی۔"

حیرت ہے کہ فیض صاحب نے تیسرے درجے کے ادب کا ذکر نہیں کیا، حالاں کہ سب سے زیادہ بار آور فصل اسی کی ہے، جب ترقی پسند تحریک کا ذکر کیا تھا تو ادب کی درجہ بندی میں بھی وضاحت سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ بہرحال یہ خوشی کی بات ہے کہ فیض صاحب کو ترقی پسند تحریک کا سہارا لینے والے ابھرتے ہوئے نظر آئے، جب کہ عام مشاہدہ یہ ہے کہ اس تحریک کی بدولت ڈوبنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ممکن ہے، بعض لوگ اسے نقطۂ نظر کے اختلاف سے تعبیر کریں، لیکن یہ نقطۂ نظر کا نہیں، نظر کا اختلاف ہے، ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ ڈوبنے اور ابھرنے میں فرق نہ کیا جائے۔

فیض صاحب نے اپنے بارے میں بتایا ہے کہ:

"انگریزوں کے زمانے میں جس بچے میں تھوڑی سی لیاقت نظر آتی تھی تو والدین اسے آئی سی ایس بنانا چاہتے تھے۔ ہمیں آئی سی ایس بنانے کی بہت کوشش کی گئی، مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوئے۔"

فیض صاحب نے بجا فرمایا، لیکن انھیں یہ بھی بتانا چاہیے تھا کہ تھوڑی سی لیاقت رکھنے والے بچے تو آئی سی ایس بنتے تھے، لیکن بہت زیادہ لیاقت رکھنے والے بچے سلطنت برطانیہ کی فوج میں بھرتی ہو کر سامراجی حکومت کی بنیادیں مضبوط کرتے تھے۔ فیض صاحب میں چوں کہ عام بچوں سے زیادہ لیاقت تھی، لہٰذا وہ کرنل بن گئے۔ وہ کئی سال تک فوج میں خدمات انجام دیتے رہے اور شعر بھی کہتے رہے۔ یہی ان کی شاعری کے شباب کا زمانہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اچھا ماحول ہو تو فنکار کا فن زیادہ نکھرتا ہے۔

فیض صاحب سے پوچھا گیا:

"آپ نے روس سے متعلق یادداشتیں تو "مہ و سالِ آشنائی" کے نام سے کتابی صورت میں قلم بند کر دی ہیں، اب آپ خود نوشت سوانح عمری کب لکھیں گے؟"

فیض صاحب نے فرمایا:

"اپنے بارے میں لکھنے سے وحشت ہوتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خود سے اتنا لگاؤ نہیں ہے۔ ممکن ہے، بعض لوگ یہ کہیں کہ "فیض صاحب! یہ کیا بات ہے کہ آپ کو روس سے اتنا لگاؤ ہے کہ پوری ایک کتاب لکھ ڈالی اور اپنی ذات کے بارے میں لکھنے سے وحشت ہوتی ہے۔"

ایسے لوگوں کی خدمت میں عرض ہے کہ فیض صاحب من و تو کے قائل نہیں ہیں کہ روس کے بارے میں الگ کتاب لکھیں اور اپنے بارے میں الگ۔ "مہ و سالِ آشنائی" بھی دراصل خود نوشت سوانح عمری ہی ہے۔ مختصر ہے تو کیا، عقل مندوں کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔

(۲۶ اکتوبر ۱۹۸۳ء)

☆..........☆..........☆

عروض کے بوجھ تلے معانی

یہ عجیب بات ہے کہ فراق گورکھپوری کو ان کی زندگی میں ایک بت کی طرح پوجا گیا، لیکن جیسے ہی ان کی آنکھیں بند ہوئیں، ان کے خلاف ایک اچھی خاصی مہم شروع کر دی گئی، جس کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ ایک چھوٹے آدمی ہی نہیں، شاعر بھی معمولی درجے کے تھے۔ فراق صاحب کے انتقال کو ابھی دو برس بھی پورے نہیں ہوئے اور اس دوران میں کئی مخالفانہ تحریریں شائع ہو چکی ہیں۔

فراق پر سب سے پہلے جارحانہ حملہ شمس الرحمٰن فاروقی نے کیا تھا۔ فاروقی نئی نسل کے ذہین نقاد ہیں۔ قدیم ادب بھی پڑھا ہے اور جدید ادب بھی، عروض سے بھی گہری دلچسپی ہے، اس وجہ سے وہ ساقط المعنی مصرعوں کو تو برداشت کر لیتے ہیں، لیکن ساقط الوزن مصرعے ان کی برداشت سے باہر ہوتے ہیں۔ اس کی بہترین مثال ان کی اپنی شاعری ہے، جس میں عروض کی اتنی سختی سے پابندی کی جاتی ہے کہ کہیں کوئی حروف دبتا ہوا نظر نہیں آتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ عروض کے بوجھ تلے معانی دب جاتے ہیں۔

فراق صاحب جب تک زندہ تھے تو فاروقی کا خیال تھا کہ وہ بہت اچھے شاعر ہے۔ ان کے ہاں معنی آفرینی اور پیکر تراشی ملتی ہے، لیکن اب فاروقی کو فراق کی شاعری میں یہ صفات نظر نہیں آتیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اب معنی آفرینی اور پیکر تراشی کا کام خود فاروقی نے سنبھال لیا ہے۔ اور وہ بھی شاعری میں نہیں، تنقید میں، جس کا بہترین نمونہ ان کا وہ مضمون ہے، جو انھوں نے فراق کے بارے میں لکھا ہے اور جو گزشتہ سال "نیا دور" کراچی میں شائع ہوا تھا۔

اگر یہ مضمون صرف فراق کے خلاف ہوتا، تب بھی غنیمت تھا، لیکن فاروقی صاحب نے ستم یہ کیا کہ لاہور کے شاعر احمد مشتاق کو بھی ٹھکانے لگا دیا۔ انھوں نے فرمایا کہ احمد مشتاق فراق سے بہتر شاعر ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ احمد مشتاق جو بری بھلی شاعری کرتے تھے، اس سے بھی گئے، کیوں کہ فراق سے بہتر قرار پانے کے بعد شعر کہنے کی ضرورت تو اسی کو ہوگی، جو میر و غالب اور اقبال سے بہتر شاعر بننے کا خواب

دیکھیے۔ احمد مشتاق قناعت پسند ہیں، اس لیے انھوں نے فراق سے بہتر ہونے ہی کو غنیمت سمجھا اور شاعری سے تائب ہو گئے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر فراق کی زندگی میں انھیں احمد مشتاق سے کم درجے کا شاعر کہا جاتا تو وہ فاروقی صاحب پر ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیتے۔ ہمیں اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ فاروقی کا مضمون اگر فراق کی زندگی میں شائع ہوتا تو وہی سب سے زیادہ محظوظ ہوتے اور کہتے:

"میاں فاروقی! تنقید نگاری تو تم نے بہت کر لی، اب ذرا تحقیق سے بھی دلچسپی لو اور معلوم کرو کہ میر و غالب کے نام سے جو کلام ملتا ہے، وہ کہیں احمد مشتاق کا تو نہیں۔"

فاروقی کے بعد جگن ناتھ آزاد نے فراق صاحب کو نثر میں اپنی شعلہ نوائی کا ہدف بنایا، حالاں کہ وہ چاہتے تو فراق کے بارے میں ایک آدھ نظم لکھ کر دل کا غبار نکال سکتے تھے کیوں کہ خدا نے انھیں یہ کمال عطا کیا ہے کہ وہ جس موضوع پر نظم لکھ دیں، پھر وہ موضوع کسی کام کا نہیں رہتا۔ لیکن آزاد نے فراق کے خلاف نظم لکھنے کی بجائے پورے تیس صفحوں کا مضمون لکھا، جس میں صرف دل کا غبار ہی نہیں ملتا، اچھی خاصی گرد بھی اڑائی گئی ہے۔ فاروقی نے تو صرف فراق کی شاعری سے سروکار رکھا تھا، مگر حضرت آزاد نے فراق کی شخصیت میں بھی بہت سی برائیاں ڈھونڈ نکالیں اور وہ بھی اس اعلان کے ساتھ کہ فراق سے ان کے ۳۵ برس تک نہایت گہرے تعلقات رہے ہیں۔ انھیں سوچنا چاہیے تھا کہ اگر وہ فراق کے ۳۵ برس تک طویل تعلقات رہے ہیں تو دونوں نے ایک دوسرے کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور قبول کیا ہوگا۔ اب یہ اہل تحقیق کا فرض ہے کہ وہ یہ معلوم کریں کہ آزاد کی خوبیوں اور فراق کی برائیوں میں کس کا کتنا حصہ ہے۔ بہر حال آزاد صاحب کا یہ کرم ہے کہ انھوں نے یہ اعتراف کیا ہے کہ "ہندو تہذیب کے ایک پہلو، یعنی ادب کی جمالیات نے رباعی کے پردے میں فراق کے ہاں بھرپور جھلک دکھائی ہے۔" لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس سلسلے میں فراق کے سر سے اوّلیت کا سہرا چھین کر اپنے والد محترم تلوک چند محروم کے سر پر رکھ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ رباعیاتِ محروم میں پہلی بار ہندو تہذیب کی جھلک پیش کی گئی۔

فراق صاحب کی شخصی خامیوں کا ذکر کرتے ہوئے جناب آزاد صاحب فرماتے ہیں:

"غالباً ہر شاعر اپنے کلام کی تعریف پسند کرتا ہے اور یہ بھی چاہتا ہے کہ اس کے کلام کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھا جائے، لیکن فراق کا معاملہ دوسرا تھا۔ وہ اپنی پبلسٹی کے اتنے زیادہ مشتاق تھے کہ خود اپنے قلم سے اپنے بارے میں لکھ لکھ کر دوسروں کے نام سے چھپوانے میں کوئی عیب نہیں سمجھتے تھے۔"

گویا آزاد کو مضمون لکھنے پر نہیں، اس پر اعتراض ہے کہ فراق نے اپنے بارے میں مضامین لکھ کر خود اپنے نام سے کیوں نہیں چھپوائے۔ ہمیں آزاد صاحب کے بیان میں کچھ جھول نظر آتا ہے، ورنہ وہ اپنے

بیان کی تائید میں کوئی ثبوت ضرور پیش کرتے۔ کم از کم وہ یہ تو کہہ سکتے تھے کہ:

"فراق کے بارے میں میرے نام سے جو مضمون شائع ہو رہا ہے، وہ خود فراق کا لکھا ہوا ہے، جو انھوں نے اپنے انتقال سے چند روز پہلے مجھے دیا تھا اور کہا تھا میرے بعد اپنے نام سے چھپوا لینا۔"

آخر ۳۵ سالہ تعلقات کی گہرائی کا کوئی مثبت نتیجہ برآمد ہونا چاہیے تھا۔

فراق صاحب کے خلاف تازہ ترین سنسنی خیز تحریر ڈاکٹر ظل حسنین کا مضمون ہے، جو الٰہ آباد یونیورسٹی اردو میگزین کے فراق نمبر میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ "فراق نمبر" کا تعارف کرا دیا جائے۔ جہاں تک ہماری معلومات کا تعلق ہے، فراق صاحب کے انتقال کے بعد یہ کسی رسالے کا دوسرا فراق نمبر ہے۔ اس سے پہلے رسالہ "نیا دور" لکھنؤ کے فراق نمبر کا پہلا حصہ شائع ہوا تھا۔ (سنا ہے، حصہ دوم جلد شائع ہونے والا ہے) الٰہ آباد یونیورسٹی اردو میگزین گو مختصر ہے، لیکن اس میں کئی کام کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ فراق صاحب کا ایک غیر مطبوعہ مضمون "یادِ رفتگان" ہے۔ سید محمد عقیل، زرینہ عقیل احمد، علی احمد فاطمی اور بعض دوسرے اہل قلم کے تنقیدی مطالعے ہیں۔ سید محمد عقیل کی ڈائری کے چند اوراق بھی شائع کیے گئے ہیں۔ اس ڈائری میں فراق صاحب کی جو گفتگو درج کی گئی ہے، اس کا ایک دلچسپ اقتباس یہ ہے:

"ایک صاحب میرے پاس آئے اور بولے کہ صاحب غضب ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "بھئی ہوا کیا ہوا؟" کہنے لگے۔ "میں ادب میں ایسا غضب میں نے کبھی نہیں دیکھا۔" میں نے کہا۔ "بھئی جلدی بتاؤ کہ ادب میں غضب وغیرہ نہیں ہوا کرتے۔" اس پر وہ صاحب تقریباً آب دیدہ ہو کر کہنے لگے کہ صاحب! آل احمد سرور تنقیدی مضامین تو لکھتے ہی تھے، اب شاعری بھی کرنے لگے ہیں اور غضب یہ ہے کہ چھپواتے بھی ہیں۔"

ڈاکٹر ظل حسنین کے علمی و ادبی کاموں کے بارے میں ہمیں کچھ زیادہ علم نہیں ہے۔ وہ الٰہ آباد یونیورسٹی میں اردو کے استاد ہیں تو ظاہر ہے، ویسے ہی عالم و فاضل ہوں گے، جیسے اردو کے استاد عموماً ہوتے ہیں۔ مذکورہ میگزین کے ایڈیٹر نے بتایا ہے کہ ظل حسنین صاحب، فراق صاحب کے بہت قریب رہے ہیں۔ اس قربت کا نتیجہ جس مضمون کی صورت میں ظاہر ہوا ہے، وہ خاصا دلچسپ ہے۔ جی تو چاہتا ہے کہ پورا مضمون نقل کر دیا جائے، لیکن اس مختصر کالم میں دو چار اقتباسات ہی کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے!

"فراق شاعرِ جمال ہی نہیں، شاعرِ جلال بھی تھے۔ ان پر جب جلال طاری ہوتا تو وہ تمام بے شرمی و بے حجابی کے ساتھ جو جی میں آتا، کہتے چلے جاتے اور مغلظات کا ایک انبار لگا دیتے۔ طرح طرح کی گالیاں اختراع کرتے۔ انھیں اپنی اس خصوصیت پر ناز تھا کہ

''گالی دینے کا فن تو مجھے آتا ہے''۔ نیز یہ کہ جو شخص گالی بکنا نہیں جانتا، وہ ہرگز شریف انسان نہیں ہو سکتا۔ موصوف کی گالیوں کا ہدف بد نہیں، نیک انسان ہوا کرتے تھے۔ مثلاً اعجاز حسین، احتشام حسین، سردار جعفری، جعفر علی خان اثر، مجنوں گورکھپوری فراق کے سب سے دیرینہ دوستوں میں سے تھے، لیکن ان سے ایسے جھگڑے کرتے اور اتنی ذلیل باتیں کرتے کہ مجنوں صاحب کی حالت بہت بری ہو جاتی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آخر مجنوں صاحب ایسی باتیں کیوں کر گوارا کر لیتے، شاید یارانہ رشتے اس کا سبب رہے ہوں۔''

''روپے پیسے اور انعام و کرام کی بارشیں تو فراق صاحب پر گاہے گاہے ہوتی ہی رہتیں۔ جید اور عزت مآب ہستیوں کو بھی شاید ہدایت تھی کہ وہ بھی کبھی فراق کے آستانے پر حاضری دیتے رہیں۔ کبھی ہم نے یہ بھی دیکھا کہ شدید وقسم کے آدمی فراق کے ساتھ ہوتے۔ فراق خود تو نہ بتاتے کہ یہ ان کے محافظ یا باڈی گارڈ ہیں، لیکن انھی میں سے اکثر کوئی بے وجہ کہ بلا سبب ہم لوگوں کو بھی پریشان کیے رہتے ہیں اور میں سوچ میں پڑ جاتا کہ جمہوری ہندوستان میں بہت سارے دانشور کتوں اور بلیوں کی طرح مارے جاتے ہیں تو فراق صاحب میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے کہ ہر وقت ان کی دیکھ بھال کی جاتی ہے۔''

''ہائی کورٹ کے ایک ممتاز وکیل، جنھیں شعر و سخن سے بھی خاصا لگاؤ ہے، ایک دن جب فراق کے یہاں جانے لگے تو مجھے بھی اپنے ساتھ کھینچ لے گئے۔ جیسے ہی ہم لوگ ان کے سامنے پہنچے، ہمیں دیکھتے ہی فوراً بلند آواز میں بولے۔ آج ایک انقلاب برپا کر کے آ رہا ہوں۔ ہم لوگوں نے تجسس انداز میں جاننا چاہا کہ یہ انقلاب کیا ہے؟ کھودا پہاڑ نکلی چوہیا کے مصداق معلوم ہوا کہ انھوں نے اپنے ایک عزیز کا تبادلہ پاس کے ایک ملحقہ چھوٹے سے ضلع میں کرا دیا تھا۔ آفتاب علم و دانش فراق کا تصور انقلاب دور آخر میں اس حد تک آ گیا تھا۔''

''ایک مرتبہ فراق صاحب کو ایک مشاعرے میں شرکت کرنے کے سلسلے میں چند قدم پیدل چلنا پڑا۔ کچھ ہی قدم چلے تھے کہ بس مغلوب الغضب ہو گئے۔ ''فراق جو کہ شاہراہوں پر چلنے والا آدمی ہے، اسے گلی میں سے لے جایا جا رہا ہے'' کہتے ہوئے اور اسی برہم مزاجی کے ساتھ واپس ہو گئے اور مشاعرے میں شرکت نہیں کی۔''

(۳ نومبر ۱۹۸۳ء)

☆..........☆..........☆

جملے بازی کی صنعت

اخباروں کے ادبی صفحات پر جملے بازی کی صنعت کو خاصا فروغ حاصل ہوا ہے۔ بعض لوگوں نے اس سلسلے میں اتنی ترقی کی ہے کہ ان کی تخلیقی صلاحیتیں جملے بازی تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ کوئی غزل بھی لکھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے جملے بازی کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کرا رہے ہیں۔ اس رجحان کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اب شاعروں ادیبوں کے انٹرویو بھی ''جملہ پروری'' کی مثال بن گئے ہیں اور ہر انٹرویو دینے والا اپنے آپ کو ''میر جملہ'' سمجھنے لگا ہے۔ سوال کرنے والا کسی ہم عصر ادیب کا نام لیتا ہے اور جواب دینے والا ایک مختصر جملے میں اس ادیب کو بھگتا دیتا ہے۔ گزشتہ چند ہفتوں میں اس قسم کے جو انٹرویو ہماری نظر سے گزرے ہیں، وہ انتظار حسین، ابوالفضل صدیقی، سحر انصاری اور شاہدہ حسن کے بیانات و فرمودات کا عمدہ نمونہ ہیں۔

انتظار حسین سے شوکت صدیقی کے بارے میں ان کے تاثرات معلوم کیے گئے تو انھوں نے فرمایا:

''شوکت صاحب کو تو میں بھول چکا ہوں۔ کسی زمانے میں لکھا کرتے تھے۔ اب ڈائجسٹ لکھتے ہیں۔ نہ معلوم وہاں کیا کر رہے ہیں۔''

ہم نے شوکت صدیقی صاحب کو یہ فقرے سنائے تو وہ مسکرا دیے۔ اس مسکراہٹ کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا جائے تو وہ کچھ یوں ہوگا:

''انتظار حسین نے مجھے تو بھلا دیا، لیکن میری کتابوں کو نہیں بھلایا۔ جب میری کوئی کتاب چھپتی ہے، وہ اس کے نام سے متاثر ہو کر اپنی کتاب مارکیٹ میں لے آتے ہیں۔ میں نے اپنے ناول کا نام ''خدا کی بستی'' رکھا، انھوں نے ''بستی'' رکھ لیا۔ میرے افسانوں کا مجموعہ ''تیسرا آدمی'' چھپا تو وہ ''آخری آدمی'' کے نام سے اپنا مجموعہ لے آئے۔ میں نے اپنے ایک اور مجموعے کا نام ''راتوں کا شہر'' رکھا، انھوں نے اسے ''شہر افسوس'' بنایا۔ ان سے تو

بہتر تھا کہ "مقامِ افسوس" رکھ لیتے۔"

شوکت صاحب کے ایک طرف دار نے یہ لطیفہ بھی سنایا۔ ایک کتاب فروش کے پاس کوئی شخص "خدا کی بستی" خریدنے آیا۔ کتب فروش نے کہا "یہ ناول تو نہیں ہے، البتہ اس کا خلاصہ موجود ہے، وہ لے لیجیے۔" یہ کہہ کر اس نے خریدار کو "بستی" پیش کی۔ خریدار نے کہا "اس پر تو انتظار حسین کا نام لکھا ہے۔" دکاندار نے کہا "خلاصے پر خلاصہ کرنے والے ہی کا نام دیا جاتا ہے۔"

اب ذرا بزرگ افسانہ نگار ابوالفضل صدیقی کے تاثرات بھی ملاحظہ کیجیے:

اشفاق احمد	سحر لکھنے والا۔
بانو قدسیہ	کیا وہ رائٹر ہیں؟
جون ایلیا	یہ کون ہیں؟
زاہدہ حنا	زاہدہ نے ایک اچھا افسانہ لکھا ہے۔

صدیقی صاحب نے اس قسم کی رائیں دے کر "ادبی جوڑوں" کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے۔ اشفاق احمد کو تو وہ اچھا ادیب مانتے ہیں، لیکن ان کی بیگم بانو قدسیہ کا ادیب ہونا ان کے لیے قابلِ قبول نہیں۔ زاہدہ حنا کو ایک افسانے "   " تک تو انھوں نے پہچان لیا، لیکن ان کے شوہر جون ایلیا کے وجود ہی سے وہ ناواقف نکلے۔ ہمیں جناب ابوالفضل صدیقی سے اس ناانصافی کی توقع نہیں تھی۔ بزرگی کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ میاں بیوی دونوں کے بارے میں ایک جیسی رائے کا اظہار کرتے۔ جہاں بانو قدسیہ کے رائٹر ہونے میں انھیں شک تھا، وہیں اس شک کا اظہار اشفاق احمد کے سلسلے میں بھی کیا جا سکتا تھا۔ اور جہاں زاہدہ حنا کا ایک افسانہ انھیں پسند آیا تھا، وہیں جون ایلیا کی ایک آدھ غزل پر بھی پسندیدگی کا اظہار کیا جا سکتا تھا۔ یہ سچ ہے کہ جون ایلیا عام شاعروں سے بہت مختلف ہیں، لیکن ایسا بھی نہیں کہ ان کی بیاض میں ایسی ایک آدھ غزل بھی نہ ہو، جو دوسروں کو پسند آئے۔

جون ایلیا کے ساتھ سحر انصاری نے بھی بڑی زیادتی کی ہے اور ان کے بارے میں یہ رائے دی ہے:

"ایک ہی شخص ہے جہاں میں کیا؟"

معلوم نہیں، سحر انصاری نے یہ مصرع کس ذہنی سیاق و سباق میں پڑھا۔ ہمیں تو اس مصرعے میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی، جس سے جون ایلیا کی خصوصیت پر روشنی پڑتی ہو۔ سحر انصاری سے جب زاہدہ حنا کے بارے میں ان کی رائے پوچھی گئی تو انھوں نے کہا۔ "قیدی سانس لیتا ہے۔" واضح رہے کہ "قیدی سانس لیتا ہے۔" زاہدہ حنا کے افسانوں کے مجموعے کا نام ہے۔ سحر انصاری خدا جانے کیا کہنا چاہتے تھے، ہمیں تو ان کے جواب میں کوئی معنویت نظر نہیں آئی۔ ہاں اگر جون ایلیا کے بارے میں وہ یہی بات کہتے تو ہم سختی سے اس کی تردید کرتے۔

سحر انصاری کے کچھ اور تاثراتی جملے یہ ہیں:

مجنون گورکھپوری	مجنوں مجنوں لوگ کہیں ہیں مجنوں کیا ان سا ہوگا۔
شوکت صدیقی	ابھی تک خدا کی بستی میں الجھے ہوئے ہیں۔
ابوالخیر کشفی	میں ان کے کشف کا قائل ہوں۔
ہاجرہ مسرور	گم شدہ قاری کی تلاش۔
منیر نیازی	آج کل کلیاتِ منیر کو کلیاتِ میر کے دھوکے میں خریدا جا رہا ہے۔
محمد علی صدیقی	وہ میرے بہت پرانے دوست ہیں۔
حمایت علی شاعر	انھیں کسی کی ضرورت نہیں۔
پروین شاکر	نئے مجموعے کا انتظار۔
ابوالفضل صدیقی	طویل القامت افسانہ نگار۔
خاطر غزنوی	ان کے پاس میری ایک رنگین تصویر ہے، جو کسی طریقے سے حاصل کرنی چاہیے۔

سحر انصاری بہت اچھے شاعر اور نقاد ہیں۔ وہ اپنے ہم عصروں اور ہم عمروں میں اس اعتبار سے امتیازی حیثیت رکھتے ہیں کہ ان کا مطالعہ وسیع ہے، لیکن مذکورہ جملوں میں مطالعے ہی کی نہیں، مشاہدے کی بھی کمی محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً ان کا یہ کہنا کہ لوگ کلیاتِ میر کے دھوکے میں کلیاتِ منیر خرید رہے ہیں، درست نہیں۔ ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ کلیاتِ منیر کے دھوکے میں آج کل کلیاتِ میر کو بھی کوئی نہیں پوچھ رہا۔ ہاجرہ مسرور کے بارے میں یہ کہنا غلط ہے کہ وہ آج کل گم شدہ قاری کی تلاش میں ہیں۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ قاری ان کی تلاش میں ہے کیونکہ انھوں نے بہت دن سے کچھ نہیں لکھا۔

خاطر غزنوی کے پاس سحر انصاری کی جو رنگین تصویر ہے، اسے واپس لینے کا سبب سمجھ میں نہیں آیا۔ سحر صاحب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ خاطر غزنوی جب سے اکیڈمی آف لیٹرز سے وابستہ ہوئے ہیں، اس منصوبے پر کام کر رہے ہیں کہ مولانا محمد حسین آزاد کی طرح ادیبوں کے لیے شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار آراستہ کیا جائے۔ اس دربار میں خاص خاص ادیبوں کی تصویریں آویزاں کی جائیں گی۔ سحر صاحب اپنی تصویر واپس نہ لیں، ورنہ ہو سکتا ہے ان کی جگہ محمد علی صدیقی کی تصویر لگا دی جائے۔ محمد علی صدیقی ایک اہم نقاد کی حیثیت سے نہ سہی، سحر انصاری کے پرانے دوست کی حیثیت سے تو شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ پانے کے بہرحال مستحق ہیں۔

شاہدہ حسن نے دوسروں کے بارے میں جو کچھ کہا ہے، وہ بھی سن لیجیے:

پروین شاکر	مشاعرے کا رخِ زیبا۔

انجم اعظمی — اردو کے نقاد اور پروفیسر، جن کی تقریر سے کالج کی طالبات خاصی متاثر رہتی ہیں۔

محمد علی صدیقی — ان کی تنقید انگریزی میں اچھی لگتی ہے۔

ان آرا پر ہم کوئی تبصرہ نہیں کریں گے، کیوں کہ شاہدہ حسن نے پہلی مرتبہ نثر میں اظہار خیال کیا ہے۔ البتہ یہ ضرور عرض کریں گے کہ سحر انصاری اور شاہدہ حسن نے پروین شاکر کے بارے میں جو طنزیہ جملے کہے ہیں، ان سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ پروین شاکر ضرور اچھی شاعرہ ہوں گی، ورنہ بلا سبب تو کوئی کسی کے خلاف نہیں ہوتا۔

(۹ر نومبر ۱۹۸۳ء)

☆............☆............☆

غزل کی تکنیک میں نثر

پچھلے ڈیڑھ دو مہینوں میں دو درجن سے زیادہ نئی کتابیں ہماری نظر سے گزری ہیں۔ ان میں سے ہر کتاب کسی نہ کسی اعتبار سے بڑی اہمیت رکھتی ہے اور اس لائق ہے کہ ہم اس کے بارے میں اپنے تاثرات اپنے پڑھنے والوں تک پہنچائیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ تاثرات پیش کرنے کے لیے کسی کتاب کا نظر سے گزرنا ہی کافی نہیں، اس کا پڑھنا بھی ضروری ہے۔ یہ کام تو آج کل کتابیں لکھنے والے بھی نہیں کرتے تو ہم کیسے کر سکتے ہیں؟ بہرحال ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم کسی کتاب کے دو چار صفحے بھی نہ پڑھتے ہوں۔ اردو کے نقادوں کی طرح سرورق، فہرست اور دیباچے کی حد تک تو ہم بھی زحمتِ مطالعہ اٹھا لیتے ہیں۔ چند روز ہوئے کہ اسی قسم کی زحمت اٹھانے کے لیے ایک کتاب ہاتھ میں لی۔ سب سے پہلے تو کتاب کے نام نے متاثر کیا۔ نام کیا ہے، شاعرانہ پیکر تراشی کا خوب صورت نمونہ ہے۔ "شمع اور دریچہ"۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اتنا اچھا نام رکھنے کے بعد کتاب لکھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بالکل اسی طرح جس طرح منظور حسین یاد کو خوب صورت تخلص رکھنے کے بعد اچھا شعر کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

نام کے بعد کام پر نظر ڈالی تو اندازہ ہوا کہ طباعت و کتابت اتنی عمدہ ہے کہ محض اسی بنا پر یہ کتاب اکادمی ادبیات کا وہ انعام حاصل کر سکتی ہے جس کے لیے اکادمی مصنفین سے ان کی تصانیف کے پانچ پانچ نسخے بذریعہ وی پی منگواتی ہے، تاکہ مصنفین کو انعام نہ ملنے کی صورت میں یہ اطمینان رہے کہ ہزار میں سے پانچ نسخے تو فروخت ہو گئے۔

ہم نے حسبِ عادت "شمع اور دریچہ" کے دیباچے پر نظر ڈالی۔ یہ دیباچہ اتنا طویل تھا کہ اسے ختم کیا تو معلوم ہوا ایک چوتھائی کتاب ہم پڑھ چکے ہیں۔ اس کے بعد سوچا کہ باقی کتاب پڑھ لی جائے تو بہتر ہے، تاکہ یہ کہنے کو تو ہو کہ ۱۹۸۳ء میں ہم نے کم از کم ایک کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھا ہے۔ یہ مرحلہ بھی جب بخیر و خوبی طے ہو گیا تو احساس ہوا کہ ہماری اور مصنف دونوں کی محنت رائیگاں نہیں گئی، ورنہ عام

حالات میں دونوں میں سے کسی ایک کی محنت ضرور رائیگاں جاتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اگرچہ ہمارے علم میں خاصا اضافہ ہوا ہے، لیکن اصل فائدہ یہ ہوا کہ ہمیں معلوم ہوگیا، آج کے دور میں بھی اُردو میں اچھی نثر لکھی جاسکتی ہے۔ اس جملے کا مطلب خدانخواستہ یہ نہیں ہے کہ آج کل لوگوں کو اچھی نثر لکھنے سے جبراً روکا جارہا ہے، بلکہ مراد یہ ہے کہ اب اچھی نثر لکھنا ہماری ضروریاتِ زندگی میں شامل نہیں رہا۔ جس طرح ہم جمہوریت کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں، اسی طرح اچھی نثر کے بغیر بھی زندہ رہا جاسکتا ہے۔

''شمع اور دریچہ'' کے مصنف ہیں محمد ابن الحسن سیّد، جن کے بارے میں ہمیں یہ تو معلوم تھا کہ بہت اچھے شاعر ہیں۔ ایک مجموعۂ کلام شائع ہو چکا ہے اور اس قسم کے خوب صورت شعر کہتے ہیں:

جتنی آنکھیں ہیں اُتنے نظارے
جتنے نظارے اُتنی حیرانی

....

دو گھڑی پاس رہو حال نہ پوچھو میرا
درد احساس ہی احساس ہے آواز نہیں

لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ انھیں نثر سے بھی لگاؤ ہے۔ کتاب کا نام دیکھ کر ہم یہی سمجھے کہ شعری مجموعہ ہوگا۔ آج کل یہی ہوتا ہے کہ ایک مجموعۂ کلام کی سیاہی خشک نہیں ہوتی اور دوسرا شائع ہو جاتا ہے، لیکن مقامِ شکر ہے کہ سیّد صاحب نے اپنے پڑھنے والوں کو آزمائش میں نہیں ڈالا۔ آزمائش میں تو خیر انھوں نے اپنا پہلا مجموعہ چھاپ کر بھی نہیں ڈالا تھا، لیکن جب شاعروں کی گفتگو ہو تو ہم ذرا محتاط پیرایۂ بیان اختیار کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

اگر یہ پوچھا جائے کہ زیرِ بحث کتاب کا موضوع کیا ہے تو اس کا جواب ہم تو کیا، شاید جناب مصنف بھی نہ دے سکیں۔ کہنے کو تو یہ مختلف مضامین کا مجموعہ ہے، لیکن ہر مضمون میں اس کثرت سے مختلف موضوعات پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے کہ مرکزی موضوع ہاتھ نہیں آتا۔ مثلاً دیباچے ہی کو لیجیے۔ اس کے آخر میں کاتب وغیرہ کا شکریہ ادا ضرور کیا گیا ہے، لیکن اس میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی کہ اس طویل تحریر کو دیباچے کا نام دیا جائے۔ اس میں پاکستان کے سابق گورنر جنرل غلام محمد کا تذکرہ ہے، ان لوگوں کا ذکر ہے جو لمبے لمبے نام رکھتے ہیں (اور محمد ابن الحسن سیّد جیسے مختصر چہار لفظی نام نہیں رکھتے)۔ ڈھاکے اور اسلام آباد کی یادیں ہیں۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ دیباچہ ان سب میں سے کس کی خاطر لکھا گیا ہے۔ اسی طرح ''آشوبِ آگہی'' کے نام سے امریکہ کا سفرنامہ ہے، جس میں قارئین کی یاددہانی کے لیے گاہے گاہے امریکہ کا ذکر بھی آجاتا ہے۔ یہی حال دوسرے مضامین کا ہے۔ بس یہ سمجھیے کہ مصنف نے غزل کی تکنیک استعمال کی ہے۔ بات سے بات اس طرح پیدا ہوتی ہے، جس طرح غزل میں ایک ہی ردیف سے مختلف

مضامین کے شعر۔ غزل میں ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے، اسی طرح سیّد صاحب کے مضامین کا ہر حصہ اپنی الگ معنویت رکھتا ہے۔ ہم نے اس کتاب کو ایک غزل سمجھ کر ہی پڑھا ہے۔

یوں تو مصنف نے اپنی اس کتاب کو ''عصرِ حاضر پر رواں تبصرہ'' کہا ہے، لیکن اس میں جتنا عصرِ حاضر کا ذکر ہے، اتنا ہی ماضی کا تذکرہ بھی ہے۔ ہمیں تو عصرِ حاضر سے زیادہ ماضی کے واقعات میں مزہ آیا۔ خصوصاً اس قسم کے واقعات میں:

''اپنے عہدِ حکومت میں موصوف (غلام محمد) ایک دفعہ بذریعہ ریل گاڑی کراچی سے لاہور آئے تو میلوں پٹریوں پر استقبالیہ پٹاخے بجائے گئے تھے۔ ان دنوں، یقین کیجیے، وی آئی پیز کے پاس بھی اتنا وافر وقت ہوتا تھا کہ سفر بذریعہ ریل گاڑی اختیار کیا کرتے تھے، بلکہ دارالحکومت کے کراچی سے پنڈی کو منتقلی کے دوران کچھ وقت کے لیے تیزگام کو بھی عبوری دارالحکومت بننے کا شرف حاصل رہا ہے۔ بہرکیف اس دن جب گورنر جنرل کی اسپیشل ٹرین لاہور کے حدود میں داخل ہوئی تو پٹاخے چھوٹنے لگے۔ ان کی آواز آج بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اس وقت ان پٹاخوں کے شور میں ہم نے قومی اسمبلی کے ٹوٹنے کی آواز بھی نہیں سنی۔''

آخری جملے میں جو گہرا طنز پایا جاتا ہے، اس قسم کے طنز کی مثالیں کتاب کے تقریباً ہر صفحے پر ملتی ہیں۔ یہی سیّد صاحب کی نثر کی بنیادی خوبی ہے۔ ان کے ہاں مزاح زیریں لہر کی طرح ہوتا ہے، لیکن طنز عروج پا جاتا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس طنز میں تلخی بالکل نہیں ہوتی۔

عالمی حالات و واقعات پر مصنف کی گہری نظر ہے۔ گزشتہ دو دہائیوں میں عالمی سطح پر جو حیرت انگیز تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں، انھیں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''جنوبی ویت نام کی لڑکیاں امریکہ کے ریستورانوں میں کھانا چن رہی ہیں اور امریکہ کے صنعت کار تائیوان کی خاک چھان رہے ہیں۔ ترکی کے مزدور یورپ میں اور یورپ کے یہودی جولان کی پہاڑیوں پر چڑھے دوڑے ہیں۔ روسی فوجیں افغانستان میں اور افغان پناہ گزین پاکستان میں گھس آئے ہیں۔ پاکستان کے مزدور دوبئی میں اور دوبئی کے آجر بمبئی پہنچ کر علی الترتیب داد محنت اور داد عشرت دے رہے ہیں۔ پاکستان کے دانشور شاعر ماسکو میں صاحبِ فراش ہیں اور روس کے ماہرین پپری میں لوہے کے کارخانے لگا رہے ہیں۔ مسلم ملکوں میں بادشاہی اور لادین ملکوں میں جمہوریت۔''

سیّد صاحب نے نیویارک کے بارے میں اپنے تاثرات یوں پیش کیے ہیں:

''مجھے نیویارک اچھا نہیں لگا۔ اچھا لگنے کی تو بات الگ رہی، اسے آپ مجموعی طور پر سمجھ ہی

نہیں سکتے۔ ہوائی جہاز سے دیکھیں تو شہد کی مکھی کا چھتہ ہے۔ اندرون شہر کسی ایوینیو، کسی اسٹریٹ کا اک چھوٹا سا حصہ ہی دیکھ سکتے ہیں۔ بالائی منزلوں سے دیکھیں تو سامنے کی عمارتوں کے مدمقابل آنکھیں پتھرا جاتی ہیں۔ سڑک سے اوپر دیکھنے کی کوشش کریں تو کمر کے بل الٹے رکوع میں جانا ہوگا۔ ہاں سڑک کے بیچوں بیچ لیٹ کر آپ نیویارک کے آسمانی خلوط کا ایک چھوٹا سا حصہ دیکھ سکتے ہیں۔ سو شوق سے دیکھ لیجیے، اگر ٹریفک اجازت دے۔ نیویارک کے متعلق بلندش بنہایت بلند اور پستش بنہایت پست کہنا درست ہوگا۔ بلندش میں عمارتیں ہیں اور پستش میں انسان۔ عمارتوں کے مقابلے میں انسان کا بونا پن کہتا ہے کہ قد کے جھکنے کی مزید گنجائش اس کے تن میں نہیں۔"

قیام امریکہ کا ایک مشاہدہ یہ بھی ہے:

"یہاں میرے قیام کے دوران زمین دوز ٹرین کی صد سالہ سالگرہ منائی گئی۔ اس سلسلے میں ٹی وی پروگرام نے بتایا کہ پہلے دن ٹرین پر زدوکوب اور چوری کے کتنے واقعات ہوئے۔ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ مدت سے یہی پیشہ آ رہا ہے، جرائم روزمرہ کے معمولات میں سے ہیں اور ان معمولات کو تاریخ کی سند حاصل ہے۔"

امریکہ کے سفر کی یادگار یہ ایک واقعہ بھی ہے:

"ٹیلی ویژن پر ایک شخص مشین گن کی رفتار سے کوئی بیان داغ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "اس کی چیخ وپکار بند نہ کر دیں؟ بڑا مظلوم جان پڑتا ہے۔" کہنے لگے۔ "اسے آپ چیخنا کہتے ہیں۔ جناب عالی! اس کی آمدنی دس لاکھ ڈالر سالانہ ہے۔ کھیلوں، خاص کر آئس ہاکی کا بہترین مبصر ہے۔" میں نے عرض کیا۔ "شیخ صاحب اماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ، شاید اسی کو کہتے ہیں۔ میں نے اس کی آمدنی کی بات نہیں کی، صرف یہ کہا ہے کہ رواں تبصرے سے آپ کی بیٹھک پر نقار خانے کا گمان ہوتا ہے۔" شیخ صاحب مسکرائے اور جواباً بولے۔ "میں نے سوچا، اس کی مالی حیثیت آپ کے علم میں آ جائے گی تو آواز کے متعلق رائے میں بھی خوشگوار تبدیلی آ جائے گی۔" میں اپنا سا منہ لے کر رہ گیا اور ٹیلی ویژن پر ڈالر بولتا رہا۔"

ہم نے جان بوجھ کر کتاب کے کئی اقتباسات پیش کیے ہیں، تاکہ اس کے موضوع اور مصنف کے انداز تحریر کا اندازہ کیا جا سکے۔ نیز کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم محمد ابن الحسن کی کتاب پر فلیپ لکھ رہے ہیں نہ کہ اپنا کالم۔

(۱۶ر نومبر ۱۹۸۳ء)

☆.........☆.........☆

ثلاثی تبصرے

سلطانہ مہر کے بارے میں حمایت علی شاعر نے لکھا ہے کہ ان کی شخصیت سہ گوشہ بلور کی سی ہے۔ اگر یہی پیرایہ بیان خود جناب شاعر کے بارے میں اختیار کیا جائے تو ان کی شخصیت کو ہفت گوشہ بلور کہا جا سکتا ہے۔ وہ شاعر ہیں، ریڈیو کے صداکار ہیں، ٹی وی کے فنکار ہیں، فلم ساز ہیں، ڈراما نویس ہیں، یونیورسٹی کے استاد ہیں، اور اب ان کے نقاد ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں رہا کہ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ شائع ہو گیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہفت ہزاری امرا ہوا کرتے تھے، اب وہ نہیں ہیں تو ہمیں خوش ہونا چاہیے کہ ان کا نعم البدل موجود ہے، یعنی ایک ایسی شخصیت جسے ہفت گوشہ بلور سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔

جناب شاعر کا کمال ہے کہ وہ ادب وفن کے جس گوشے کی طرف بھی جا نکلتے ہیں، کامیابی ان کے قدم چومتی ہے۔ وہ شعر وسخن کی طرف گئے تو مشاعروں ہی میں نہیں، صفحۂ قرطاس پر بھی ان کی شاعری ساحری کے درجے پر فائز نظر آئی۔ وہ بلاشبہ ہمارے بہترین شاعروں میں سے ہیں، بشرطیکہ جناب محسن بھوپالی کو اس پر اعتراض نہ ہو۔ محسن بھوپالی نے چوں کہ بہت سے معاملات میں جناب شاعر پر اعتراضات کیے ہیں، اس لیے ان کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

ٹی وی میں جناب شاعر نے یوں تو کئی سلسلہ وار پروگراموں میں حصہ لیا اور کئی ڈراموں میں اہم کردار ادا کیے، لیکن ان کے پروگرام "کسوٹی" کو لوگ اب تک یاد کرتے ہیں، جس میں شاعر صاحب ایک خاص ادا سے اپنے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے تھے تو عبید اللہ بیگ اور افتخار عارف ہر سوال کا صحیح جواب دینے پر قادر ہو جاتے تھے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا تھا کہ "کسوٹی" کے دونوں ثقہ لوگوں کی ساری ذہانت حمایت علی شاعر کی انگلیوں میں ہے۔ اب انھیں انگلیوں پر جناب شاعر نے تنقید کی فندقیں لگائی ہیں۔ (استاد ذوق نے فرمایا ہے:

آ گئیں تم کو لگانی انگلیوں پر فندقیں
نوکِ مژگاں پہ مری اشکِ جگر گوں دیکھ کر

پہلے مصرعے میں انگلیوں کے سرے پر مہندی لگانے کا ذکر ہے۔)

جنابِ شاعر کے تنقیدی مجموعے کا نام ہے: ''شخص و عکس''، جس کے دیباچے میں انھوں نے اعلان کیا ہے کہ یہ مجموعہ ''میری تنقیدی فکر اور میری تخلیقات کے ردِ عمل کی روشنی میں میرا بھی آئینہ ہے اور ان مخصوص چہروں کا بھی، جنھوں نے شاید آج تک آئینہ نہیں دیکھا۔'' شاعر صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ایک ایسا آئینہ تیار کیا ہے، جس میں خود ان کا اپنا عکس تو مطابق اصل ہے، لیکن بعض چہروں کے عکس ایسے ہیں کہ انھیں دیکھ کر خوف آنے لگتا ہے۔ آئینہ گری ہو تو ایسی ہو۔

''شخص و عکس'' کے تین حصے ہیں۔ پہلے حصے کا عنوان ہے ''تجزیہ''۔ اس میں ابراہیم جلیس، سلطانہ مہر، سرور بارہ بنکوی، قمر ہاشمی، سرشار صدیقی، کشور ناہید، جیلانی بانو، نگار صہبائی اور متعدد اہلِ قلم کے بارے میں تنقیدی مضامین ہیں۔ ان مضامین سے مصنف کی گہری تنقیدی بصیرت ظاہر ہوتی ہے۔ وہ جس موضوع پر لکھتے ہیں، اس میں ڈوب کر لکھتے ہیں۔ وہ عام نقادوں کی طرح اپنے ساتھ موضوع کو بھی ڈبو نہیں دیتے، بلکہ بڑے خلوص اور فراخ دلی کے ساتھ موضوع کی قدر و قیمت متعین کرتے ہیں۔ فراخ دلی کا عالم یہ ہے کہ وہ سستے مال کو بھی مہنگے داموں خریدنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ جنابِ شاعر نے جن اہلِ قلم پر تنقیدی مضامین لکھے ہیں، ان میں سے بعض ایسے ہیں، جن پر جنابِ شاعر سے پہلے کسی نے کچھ لکھا اور شاید ان کے بعد بھی کوئی لکھنے کی جرأت نہ کر سکے۔

سلطانہ مہر کے بارے میں جو مضمون ہے، اس کا ایک جملہ ہم اس کالم کے شروع میں درج کر چکے ہیں، دوسرا جملہ اب درج کیا جاتا ہے: ''یہ مضمون دو قسطوں میں لکھا اور پڑھا گیا ہے۔'' اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ سلطانہ مہر کی ایک کتاب کی تقریبِ رونمائی ۱۹۷۶ء میں ہوئی تھی، دوسری کتاب کی ۱۹۷۹ء میں۔ دونوں تقریبوں میں جنابِ شاعر نے الگ الگ مضمون پڑھے تھے، لیکن کتاب میں دونوں کو اس خوبصورتی سے یکجا کیا گیا ہے کہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ پہلی قسط کہاں ختم ہوتی ہے اور دوسری کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ یہ مضمون خوبصورت علامتی انداز میں لکھا گیا ہے، جس سے اردو میں علامتی افسانے کی طرح علامتی تنقید بھی مروج ہو سکتی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''وہ زبان جو صدیوں کے جبر میں پتھرا کر رہ گئی ہے، جب ''لب گویا'' ہوئی تو ''صد برگ'' کا استعارہ بن کر ''شہرِ ممنوع'' کی سیکڑوں درپردہ حقیقتوں کو نمایاں کر گئی۔ اب وہ ''کلیاں'' ''خوشبو'' کو اپنے باطن میں چھپائے رکھنے پر آمادہ نہیں۔ زندگی کو ''چھپے چوری'' دیکھنے اور ''ہائے اللہ'' کہہ کر ''توبہ توبہ'' کر لینے کا عمل اپنے شعور میں تپ کر ''آگ کا دریا'' بن چکا ہے۔ گھر کے ''آنگن'' سے زندگی کی ''تیسری منزل'' دیکھنے کا حوصلہ اب عورت کو دو پاٹن کے بیچ پسنے والے احساس سے نکال کر اس مقام تک لے جا چکا ہے، جہاں ''آخرِ شب کے

ہم سفر'' اس کے منتظر ہیں اور وہ دن کے اجالے میں ''شہرِ ممنوع'' کی ''دھوپ'' گلیاں اور دروازے'' دیکھنے کی آرزو مند ہیں''

اس اقتباس میں واوین میں دیے گئے الفاظ پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ سب خواتین کی تصانیف کے نام ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصے کا عنوان ہے: ''تبصرہ''۔ اس میں فاضل مصنف نے اپنے ان تبصروں کو یکجا کر دیا ہے، جو انھوں نے وقتاً فوقتاً مختلف رسائل میں لکھے تھے۔ تبصرہ نگاری کو مولوی عبدالحق اور نیاز فتح پوری نے ایک باقاعدہ فن بنا دیا تھا، جنابِ شاعر نے بھی بڑی حد تک ان بزرگوں کی پیروی کی ہے۔ ان تبصروں میں تعارف بھی ہے اور تنقید بھی۔ ہر تبصرے کا آخری جملہ عموماً اس قسم کا ہے ''کتابت اور طباعت دیدہ زیب ہے اور قیمت معقول''۔ حیرت ہے کہ آج سے ۲۰ر۲۵ برس پہلے کتابوں کی قیمت معقول ہوتی تھیں اور اب قیمت تو کیا قامت میں بھی معقولیت ذرا کم ہی نظر آتی ہے۔ جنابِ شاعر کے بعض تبصرے ان کی ایجاد کردہ صنفِ سخن ''ثلاثی'' کی طرح چند سطری ہیں۔ انھوں نے اچھا کیا کہ ان تبصروں کو کتاب میں محفوظ کر دیا، ورنہ سو پچاس برس بعد اہلِ تحقیق کو ان کی تلاش میں خاصی زحمت اٹھانی پڑتی۔

تیسرا حصہ ''تزکیہ'' ہے، جو ضخامت کے اعتبار سے کتاب کا تقریباً نصف ہے اور دلچسپی کے اعتبار سے باقی دونوں حصوں پر بھاری ہے اور شاید ان لوگوں پر بھی خاصا بھاری ہوگا، جن کا ذکر اس میں آیا ہے۔ مصنف نے اپنے تمام مضامین اس حصے میں جمع کر دیے ہیں، جو انھوں نے گزشتہ ۲۰ر۲۵ برسوں میں اپنے دفاع میں لکھے تھے۔ ممکن ہے، بعض نو واردانِ ادب یہ پوچھیں کہ آخر حمایت علی شاعر جیسے شاعرِ نغز گو کو اپنے دفاع کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ لہٰذا مختصراً عرض ہے کہ گزشتہ ربع صدی میں متعدد اہلِ قلم نے جنابِ شاعر پر الزامات لگائے اور ان کے بعض امتیازات کی نفی کی، مثلاً جب شاعر صاحب نے ایک صنف ''ثلاثی'' کے نام سے ایجاد کی تو محسن بھوپالی نے فوراً یہ اعلان کیا کہ وہ اور قمر جمیل تین مصرعوں والی نظمیں بہت پہلے لکھ چکے ہیں۔ (قمر جمیل نے صرف اپنی حد تک اس بیان کی تصدیق کی)۔ شاعر صاحب کی مشہورِ زمانہ نظم ''بنگال سے کوریا تک'' کے بارے میں بعض یار لوگوں نے افواہ اڑائی کہ یہ ساحر لدھیانوی کی نظم ''پرچھائیاں'' سے ماخوذ ہے۔ فلمی گانا ''کسی چمن میں رہو تم بہار بن کر رہو'' زبان زدِ خاص و عام ہوا تو اسے اختر شیرانی کی ایک نظم کا چربہ بتایا گیا۔ شاعر صاحب نے ''سمندر'' کے عنوان سے نظم لکھی تو قمر جمیل نے کہا کہ یہ عزیز حامد مدنی کی اسی عنوان کی نظم سے ماخوذ ہے اور ساتھ ہی یہ الزام لگایا کہ جنابِ شاعر نے ٹیگور کی شاعری پر بھی ہاتھ صاف کیا ہے۔ قمر جمیل ہی کا بیان ہے کہ ان کی ایک نظم ''نیل کا سیلاب'' جنابِ شاعر نے اپنے مجموعے میں شامل کر لی ہے۔ ایک الزام یہ بھی ہے کہ فلم ''اور بھی غم ہیں'' کے ایک گیت میں جنابِ شاعر نے محسن بھوپالی کے دو مصرعے ہتھیا لیے ہیں۔ (یہ اگر درست ہے تو نہایت افسوس ناک ہے۔ دو مصرعے چوری ہو گئے تو باقی کیا رہا!) اور پھر شمیم احمد صاحب نے اپنی کتاب ''برشِ قلم'' میں ادبی ہی

نہیں، اخلاقی الزامات بھی عاید کیے، حالاں کہ موجودہ زمانے میں ادب سے اخلاق کا اتنا بھی تعلق نہیں رہا، جتنا آج کل احمد ایش سے صلاح الدین پرویز کا ہے۔ غرضیکہ ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے پچھلے ۲۵ ر برسوں میں باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے جناب شاعر کے خلاف "انسدادی" مہم چلائی گئی ہو۔ جناب شاعر کا حوصلہ ہے کہ وہ ان پریشان کن حالات میں بھی آسودہ خاطر رہے اور بڑی جرأت کے ساتھ مخالفوں کے ایک ایک الزام کو مدلل انداز سے رد کرتے رہے۔ جناب شاعر کی جگہ اگر ہم ہوتے تو حوصلہ ہار جاتے اور اعلان کر دیتے کہ ہمارے نام سے جو کچھ چھپا ہے، وہ قمر جمیل اور محسن بھوپالی کا نتیجۂ فکر ہے۔ یہاں تک کہ ان دونوں نے اپنے نام سے جو کچھ چھپوایا ہے، وہ بھی انھیں کا لکھا ہوا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری دوسری بات کو فوراً تسلیم کر لیا جاتا، کیوں کہ قمر جمیل اور محسن بھوپالی کے نام سے جو کلام شایع ہوا ہے، وہ ایسا نہیں ہے کہ کوئی دوسرا لکھنے کی جرأت کر سکے۔

اردو ادب میں ادبی معرکہ آرائیوں کی روایت بہت پرانی ہے۔ ہمیشہ سے یہ ہوتا آیا ہے کہ دو ادیب لڑتے ہیں اور باقی تماشا دیکھتے ہیں، لیکن جناب شاعر کے ساتھ جو معاملہ ہوا وہ منفرد نوعیت کا ہے۔ یعنی یہ ادھر اکیلے اور ادھر حریفوں کا جم غفیر۔ بہر حال جناب شاعر اپنی شاعری کے ساتھ ساتھ اس بات پر بھی داد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے چومکھی لڑی اور خوب لڑی۔ شمیم احمد کے ہاں تو قلم کی روش تھی، لیکن حمایت علی شاعر کے ہاں کرپان کی برش ہے (یہاں ہم "تلوار" بھی کہہ سکتے ہیں، لیکن آج کل تلوار کا رواج نہیں رہا، کرپان ہی استعمال ہوتی ہے)۔ جناب شاعر کی یہ جرأت بھی قابلِ داد ہے کہ انھوں نے لڑائی کے دوران ایسے لوگوں پر بھی وار کیے، جن کا اس لڑائی سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مثلاً انھوں نے فیض صاحب کے بہت سے شعروں کو مالِ مسروقہ قرار دیا ہے اور عزیز حامد مدنی کے متعدد اشعار کو خارج از وزن بتایا ہے۔ گویا گھن کے ساتھ گیہوں کو بھی پیس کے رکھ دیا ہے۔

جی تو چاہتا ہے کہ "شخص و عکس" کے کچھ مزید اقتباس پیش کر کے بتایا جائے کہ جناب شاعر نے کہیں تاریخی شواہد سے، کہیں طنز و مزاح سے کام لے کر اور کہیں عدالتی کارروائی کی دھمکی دے کر حریفوں کو اپنی حرکتوں سے باز آنے کا مشورہ دیا ہے، لیکن افسوس کہ ہمارے کالم میں اقتباسات کی گنجایش نہیں نکل سکتی۔ بہر حال جن حضرات کو ادبی معرکہ آرائیوں سے دلچسپی ہو، انھیں اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ خصوصاً جناب محسن بھوپالی کو، کیوں کہ ان کا دعویٰ ہے کہ حمایت علی شاعر کے "ادبی سرقوں" کا سب سے پہلے سراغ انھوں نے ہی لگایا تھا۔ ہمیں یقین ہے کہ محسن اس کتاب کو دیکھتے ہی کہیں گے:

"اس کا نام ہی مالِ مسروقہ ہے۔ عنوان چشتی کی کتاب "شخص و عکس" کے نام سے کئی سال پہلے شایع ہو چکی ہے۔"

جناب شاعر اب ایک اور کتاب "چراغ بکف" کے نام سے مرتب فرما رہے ہیں۔ انھوں نے کہا

ہے کہ وہ اپنے ادبی معرکوں سے متعلق تمام تحریروں کی فوٹو کاپیاں بنوا کر ملک کی مختلف لائبریریوں میں محفوظ کرا دیں گے۔ ایک کاپی انڈیا آفس لائبریری کو بھی بھیجی جائے گی" تا کہ آیندہ سو پچاس برسوں میں اس مسئلے سے متعلق کسی شخص کو تحقیقی کام کی ضرورت پیش آئے تو سارا مواد یکجا مل جائے۔" ہماری دعا ہے کہ جناب شاعر سو برس تک زندہ رہیں اور وہ خود ہی اس مواد پر تحقیق مزید کا فریضہ انجام دیں، کیوں کہ سو برس بعد اتنی گاڑھی تحقیق کی فرصت کسے ہوگی۔

"چراغ بکف" کی اشاعت ادب کی ایک مفید خدمت ہوگی۔ کیا ہی اچھا ہو، اگر جناب شاعر اس کتاب میں اپنے معترضین اور مخالفین کی تصویریں بھی شامل کر دیں، تا کہ سو برس بعد اہلِ ادب کو یہ معلوم ہو کہ آخر وہ کون لوگ تھے، جنھوں نے جناب شاعر کو تخلیقی کاموں سے ہٹا کر آئینہ سازی کی صنعت کے سپرد کر دیا۔

(۱۳ر نومبر ۱۹۸۴ء)

☆--------☆--------☆

''فنون'' کا جمال پانی پتی نمبر

پاکستان میں باقاعدگی سے شائع ہونے والے اردو کے ادبی رسالوں کو ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے، اور مجموعی تعداد اشاعت اتنی ہے کہ انھیں بآسانی دوسرے ہاتھ میں اٹھایا جاسکتا ہے۔ اہم رسالوں میں سے اس وقت افکار، تخلیق، اوراق اور فنون کے نام ذہن میں آرہے ہیں۔ ان میں سے ہر رسالہ اپنی کسی نہ کسی خصوصیت کی بنا پر اہمیت رکھتا ہے، مثلاً ''افکار'' کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اہل قلم کے ساتھ مشتہرین کو بھی برابر کی اہمیت دی جاتی ہے، تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ یہ رسالہ کسی ایک طبقۂ فکر کی نمایندگی کرتا ہے۔ ''تخلیق'' کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں ستار طاہر کے ''فٹ نوٹس'' شائع ہوتے ہیں۔ ستار طاہر دوسروں کی غلطیاں اتنی ہی آسانی سے پکڑتے ہیں، جس آسانی سے عبدالعزیز خالد تین تین سو شعروں کی غزلوں کے لیے قافیے قابو میں کرتے ہیں۔ ''اوراق'' کی شہرت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس کے ہر شمارے میں انشائیے کی فصل لہلہاتی نظر آتی ہے، اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ وہ دن دور نہیں، جب اردو کا ہر ادیب انشائیہ نگار کہلانے میں فخر محسوس کرے گا اور فخر کرنے کی دوسری تمام وجوہ ناپید ہو جائیں گی۔

''فنون'' کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس کے ہر شمارے میں محمد حسن عسکری کے بارے میں کوئی نہ کوئی فکر انگیز یعنی سنسنی خیز تحریر ضرور ہوتی ہے اور کچھ نہیں تو ''اختلافات'' کے مستقل عنوان کے تحت دو چار ایسے خط ہی شائع کر دیے جاتے ہیں، جن میں اختلافات کو ہوا دی جاتی ہے۔ ''فنون'' کا تازہ شمارہ اسی ہفتے شائع ہوا ہے، اس میں توقع کے مطابق ''ردِ عسکریت'' کے سلسلے میں خاصا مواد موجود ہے۔ بحث وہی پرانی ہے، جو محمد ارشاد نامی ''مفکر'' نے شروع کی تھی اور جو فکر و تشویش سے خالی نہیں تھی۔ کچھ عرصہ ہوا سراج منیر اور جمال پانی پتی نے محمد ارشاد کے مضمون کے جواب لکھے تھے، حالاں کہ ان دونوں کو الگ الگ مضمون لکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بحث کو آگے بڑھانے کے لیے ایک ہی مضمون کافی تھا۔ سراج منیر پر تو نہیں، جمال صاحب پر ہمیں حیرت تھی کہ امیر و داغ کے رنگ میں غزلیں کہنے والا فلسفے کی پیچ در پیچ وادی

میں کہاں آنکلا، لیکن سچی بات یہ ہے کہ مضمون لکھ کر انھوں نے اپنے پڑھنے والوں کو مایوس نہیں کیا۔ مایوس تو خیر انھوں نے غزلیں لکھ کر بھی نہیں کیا تھا، مگر گوہر جان گلگتے والی اور زہرہ بائی آگرے والی کے بے وقت انتقال کی وجہ سے اُن کی غزلیں گائی نہ جاسکیں اور اس طرح وہ امیر و داغ جیسی شہرت حاصل کرنے سے محروم رہے۔

''فنون'' کے تازہ شمارے میں محمد ارشاد نے ایک جوابی مقالہ لکھا ہے اور سراج منیر اور جمال پانی پتی دونوں کو بزعم خود ٹھکانے لگانے کی کوشش کی ہے۔ رشید ملک نے ایک خط لکھ کر اس کارِ ثواب میں حصہ لیا ہے۔ انھوں نے جمال پانی پتی کو تو (شاید اُن کی خرابیٔ صحت کی بنا پر) معاف کر دیا ہے، لیکن سراج منیر کو ہوا دکرانے کے ایسے ایسے کمالات دکھائے ہیں کہ ان کی جگہ ہم ہوتے تو لکھنے لکھانے کے کام سے توبہ کر لیتے۔ ذرا دیکھیے، رشید ملک نے جمال پانی پتی کو ان کا نام لیے بغیر کس عالمانہ انداز سے معاف کیا ہے:

> ......(ان کا) ''علمی دنیا میں شاید ایک طفلِ مکتب کا بھی مقام نہیں......چوں کہ یہ ایک بے خبر کے قلم سے نکلی ہوئی بھونڈی تحریر تھی، اس لیے اسے نظر انداز کرنا ہی مناسب تھا۔''

سراج منیر کو محمد حسن عسکری سے جو عقیدت ہے، اُس کے حوالے سے ملک صاحب فرماتے ہیں:

> ....''عقیدت اعتقادات کے معاملے میں تو درست ہے، لیکن علم کے حصول میں تعصب کا روپ دھار لیتی ہے اور تحصیلِ علم کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ......اس سے انسانی ذہن کی نشو و نما رک جاتی ہے اور جس انسان کی ذہنی نشو و نما رک جائے، اس کے نمونے گجرات کے ایک بزرگ شاہ دولہ کے مزار پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ عقیدت اندھی ہوتی ہے اور اندھے پن کو فارسی میں کور چشمی کہتے ہیں۔''

ممکن ہے بعض لوگ مضمون نگار کے انداز گفتگو سے متاثر ہو کر اس پر تعجب کریں کہ احمد ندیم قاسمی جیسے بزرگ کے رسالے میں اس اسلوبِ اظہار کی گنجائش کیسے نکلی۔ ان متاثرین کی خدمت میں عرض ہے کہ بزرگی کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آدمی زندہ دلی سے تائب ہو جائے۔ قاسمی صاحب خود بلند پایہ طنز و مزاح نگار ہیں اور ایک عرصے سے اخبارات میں کالم نگاری کر رہے ہیں، اس لیے ''فنون'' میں بھی وہ طنزیہ و مزاحیہ تحریریں شائع کرنے میں فراخ دلی سے کام لیتے ہیں۔ قاسمی صاحب کو یہ نکتہ بھی معلوم ہے کہ بعض تحریریں تلوار کی طرح دو دھاری ہوتی ہیں۔ لکھنے والا انھیں سنجیدہ سمجھ کر لکھتا ہے اور پڑھنے والا انھیں مزاحیہ سمجھ کر پڑھتا ہے۔ ایڈیٹر کا کیا ہے، اس کے لیے تو مراسلہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہوتا۔

ممکن ہے، بعض لوگ یہ سوال کریں کہ کسی کی ذہنی نشو و نما کے رک جانے اور کور چشم ہونے کا سرٹیفکیٹ عنایت کرنا اخلاقی طور پر کہاں تک درست ہے؟ سوال کرنے والوں سے ہم عرض کریں گے کہ یہاں معاملہ ادب کا ہے، اخلاق کا نہیں، لہٰذا یہ سوال نہ لکھنے والے سے کیا جاسکتا ہے، نہ چھاپنے والے

سے۔ اور پھر یہ سب کچھ جس رسالے میں چھپا ہے، اس کا نام "فنون" ہے، "تہذیب الاخلاق" نہیں۔

محمد ارشاد کا مضمون، ان کے سابقہ مضامین کے برعکس خاصا شگفتہ ہے، اس شگفتگی کی وجہ خدانخواستہ ان کی نثر نہیں، بلکہ دوسروں کے وہ اشعار ہیں، جو انھوں نے موقع بے موقع درج کیے ہیں۔ ان شعروں کی خوبی یہ ہے کہ اگر انھیں ارشاد صاحب کی عبارت سے الگ کر کے پڑھا جائے تو زیادہ مزہ دیتے ہیں۔

ارشاد صاحب کا مضمون فکر انگیز ہو نہ ہو، عبرت انگیز ضرور ہے۔ ایک جگہ وہ اعلان کرتے ہیں۔

"لغت فلسفہ ہو یا قاموسِ فلسفہ، ان کے (جمال پانی پتی کے) لیے چنداں سود مند نہیں ہو سکتے کہ ان کی بنیاد پر بڑے بڑے دعوے کیے جائیں۔ وہ محمد ارشاد کو اپنے آپ سے بہرحال بہتر پائیں گے۔" محمد ارشاد کو اپنے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہونے کا حق حاصل ہے، لیکن جمال پانی پتی کو وہ اتنا بھی گیا گزرا نہ سمجھیں۔ جمال صاحب بڑے قادر الکلام شاعر ہیں۔ اگر انھوں نے غصے میں آ کر سودا کے رنگ میں ہجو لکھ ڈالی تو آنے والی نسلیں فریق مخالف کو اسی ہجو کے حوالے سے پہچانیں گی۔ فلسفہ ولسفہ سب طاق پر دھرا رہ جائے گا۔

سراج منیر اور جمال پانی پتی کے بارے میں اپنے مضمون کے آخر میں محمد ارشاد لکھتے ہیں:

"محمد حسن عسکری کو شاگردوں کے اس جوڑے کے پیش کردہ حوالوں کو دیکھ کر مجھے اس اعرابی کا واقعہ یاد آتا ہے، جو دریائے دجلہ کے کنارے دن بھر پتھر جمع کرتا رہتا اور شام کو سارے پتھر جہاں جہاں سے اٹھا کر لایا کرتا تھا، وہیں لے جا کر چھوڑ آتا۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ مجذوب اعرابی یہ کام خوشی خوشی کرتا تھا، جب کہ ان اعرابیوں کے جمع کردہ حوالوں کو انھی سے اٹھوا کے لے جانے اور ہر حوالے کو اس کی پہلی جگہ پہنچانے کی نگرانی مجھے کرنی پڑ گئی ہے، شاید اس لیے کہ وہ اپنے کام میں کامل تھا اور یہ ناقص۔"

ہم نے یہ اقتباس جمال پانی پتی کو سنایا تو انھوں نے ہنستے ہوئے کہا:

"کامل اور ناقص پر تو بعد میں غور ہوگا، فی الحال مسئلہ یہ ہے کہ اگر "فنون" کا اعرابی فلسفے پر مضمون لکھنے کی بجائے پتھر ڈھونے کا کام کرتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ وہ صرف اپنا ہی وقت ضائع کرتا ہے، دوسروں کا نہیں۔"

(۷ر ستمبر ۱۹۸۴ء)

☆..........☆..........☆

غیر مشروط معافی نامہ

کچھ عرصہ ہوا، ہم شاعر نغز گو جناب ناصر زیدی کی فرمائش پر ان کے بارے میں ایک کالم لکھا تھا، اس کالم کو انھوں نے پسند نہیں فرمایا اور ہمارے نام ایک عتاب نامہ لکھا ہے۔ ناصر زیدی صاحب ہم سے بہتر طور پر جانتے ہیں کہ فرمائشی یا طرحی غزلوں کی طرح فرمائشی کالم بھی "بے ضرر" قسم کی چیز ہوتے ہیں، ان پر غصہ نہیں کرنا چاہیے، بلکہ لکھنے والے کے لیے دعا کرنی چاہیے کہ خدا اسے اچھا لکھنے کی توفیق دے۔ کاش زیدی صاحب عتاب نامہ لکھنے کے لیے قلم اٹھانے کی بجائے ہمارے حق میں دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے۔

اس سے پہلے کہ زیدی صاحب کا مراسلہ پیش کیا جائے، ہم اپنے سابقہ کالم کا کچھ حصہ یہاں نقل کرتے ہیں، تاکہ قارئین خود اندازہ فرمالیں کہ زیدی صاحب کا غصہ کہاں تک حق بجانب ہے۔ ہم نے لکھا تھا:

"یہ خط راولپنڈی کے ناصر زیدی صاحب کا ہے، جو شاعر بھی ہیں اور لاہور کے ایک اخبار میں کالم بھی لکھتے ہیں۔ ہمیں زیدی صاحب کی غزلیں اور کالم اس حد تک پسند ہیں کہ ہم ان کے کالموں کو غزل سمجھ کر اور غزلوں کو کالم سمجھ کر پڑھتے ہیں، اسی لیے ہمیں آج تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ غزل اور کالم میں کیا فرق ہوتا ہے۔ ناصر زیدی اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"جسارت میں اکثر آپ کی نظر کرم مجھ پر رہی ہے۔ "اکثر" اس لیے لکھا ہے کہ ایک بار تو خود "ذکر خیر" پڑھا تھا اور دو تین بار محب مکرم نظر صدیقی صاحب سے معلوم ہوا کہ آپ نے "ذکر خیر" کیا ہے۔ اب آپ "تکبیر" میں ہیں تو اکثر آپ کا کالم پڑھنے کے لیے بک اسٹال پر کھڑے کھڑے "تکبیر" کی ورق گردانی کر لیتا ہوں۔ مجھے آپ کے لیے پھر حاضر ہوں۔ تو مشق ناز کر..........."

اپنے گرامی نامے کے ساتھ زیدی صاحب نے مندرجہ ذیل دستاویزات منسلک کی ہیں۔ (۱) ایک کلی مراسلہ، (۲) اپنی ایک غزل کی فوٹو اسٹیٹ کاپی، (۳) اپنے مطبوعہ کالم کی فوٹو اسٹیٹ کاپی،

کوئی ہنگامہ چاہیے ناصر
کیسے گزرے گی زندگی خاموش

میرے پہلے مجموعۂ کلام ''ڈوبتے چاند کا منظر'' میں یہ غزل شامل ہے۔ سلیم احمد مرحوم، حسن اکبر کمال، توصیف تبسم، یونس احمر اور بہت سوں کو میرے کلام میں ناصر کاظمی کا رنگ ملتا ہے، (مطبوعہ تبصرے موجود ہیں) جب کہ ابوالاثر حفیظ جالندھری، جوش ملیح آبادی، احسان دانش، احمد ندیم قاسمی، ظہیر کاشمیری، ڈاکٹر سلیم واحد سلیم، ضمیر جعفری، مرزا ادیب، محشر بدایونی، عارف عبدالمتین، شہرت بخاری، حمایت علی شاعر، اعجاز فاروقی، نور بجنوری، ڈاکٹر احسان رشید، قمر جمیل، ڈاکٹر سید مرتضیٰ، اختر جعفری اور سب سے بڑے آپ کے انتظار حسین مجھے تحریری طور پر صف اول کے نمائندہ غزل گوؤں میں شمار کرتے ہیں، آپ کے نزدیک میں گھٹیا شاعر ٹھہرا۔ مگر سوال تو گھٹیا بڑھیا کا نہ تھا۔ اگر کوئی آپ کا کالم، بہترین کالم تو نہیں (انعام یافتہ) عطاء الحق قاسمی سے منسوب کر دے تو بے شک کالم گھٹیا سہی، مگر آپ کو شکایت نہ ہوگی کیا؟ مسئلہ صرف حق بحقدار رسید کا تھا، جو طے ہوا .... آپ ایسے اپنی برادری کے افراد نہ چاہنے کے باوجود .... آپ کی کوششوں کا پھر شکریہ''

ہم نے جو کچھ لکھا تھا اور اس کے جواب میں ناصر زیدی صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ اہل انصاف کے سامنے ہے۔ ہماری تحریر میں کوئی ایسی بات نہیں، جس سے ثابت کیا جا سکے کہ ہم نے ٹی وی کی بیورو کریسی کو سپورٹ کیا ہے۔ ٹی وی کی بیورو کریسی کو کیا، ہم ٹی وی کے ادارے ہی کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے اور اپنے کالموں میں کئی بار لکھ چکے ہیں کہ قوم کا سب سے زیادہ وقت ٹی وی نے ضائع کیا ہے۔ ہر وقت راگ درباری سنا کر پوری قوم کو موسیقی کا رسیا بنا دیا ہے اور مختلف کھیلوں کے میچ دکھا دکھا کر پورے ملک کو بازیچۂ اطفال بنا دیا ہے۔

ناصر زیدی کے معاملے میں بھی ہم نے ٹی وی والوں کی واضح طور پر مذمت کی تھی اور انھیں معافی مانگنے کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیمی و ادبی استعداد میں اضافہ کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ٹی وی والوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انھوں نے ناصر زیدی صاحب کو ان کی اس غزل کے معاوضے میں دو سو روپے کا چیک بھیجا، جو ناصر کاظمی کے نام سے ٹیلی کاسٹ کی گئی تھی۔ (یہ دوسری بات ہے کہ ناصر کاظمی کی ساکھ کو جو نقصان پہنچا، اس کی تلافی اب تک نہیں کی گئی۔)

ناصر زیدی صاحب کے خط میں ''مصرع چور شاعر'' اور ''شاعر چور جعلی شخص'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس ابہام کی توضیح یہ ہے کہ ناصر زیدی نے اپنے ایک اخباری کالم میں الزام لگایا تھا کہ سرشار صدیقی نے ان کا ایک مصرع چوری کر لیا ہے اور کراچی کے ایک شاعر نے اپنا نام ناصر زیدی رکھ کر ہمارے ممدوح کے

(۴) اپنی ایک تصویر۔ یہ سب چیزیں اس لائق ہیں کہ انھیں ہم اپنے کالم میں شامل کرتے، مگر افسوس کہ جگہ اور حوصلے کی کمی کی وجہ سے ہم ایسا نہیں کر سکتے۔ زیدی صاحب کی تصویر البتہ ہم اس کالم کے ساتھ شائع کر رہے ہیں، تاکہ انھیں یہ شکایت نہ ہو کہ ہم نے ان کی ارسال کردہ چیزوں میں سے کسی ایک سے بھی مکمل استفادہ نہیں کیا۔

زیدی صاحب کے مراسلے میں یہ سنسنی خیز انکشاف کیا گیا ہے کہ ۱۸ جولائی ۱۹۸۳ء کو کراچی ٹیلی ویژن سے ایک ''انتہائی خوبصورت غزل'' منی بیگم نے ''نہایت عمدگی'' سے گائی تھی۔ یہ غزل ناصر زیدی کی تھی، لیکن ٹی وی والوں نے اسے ناصر کاظمی سے منسوب کر دیا۔

پہلے تو ہمیں یقین نہ آیا کہ ٹی وی والے اتنی بڑی غلطی بھی کر سکتے ہیں، لیکن جب غزل دیکھی تو معلوم ہوا کہ ناصر زیدی صاحب کا بیان درست ہے .... یہ غزل ناصر زیدی یا منی بیگم ہی کی تصنیف ہو سکتی ہے، ناصر کاظمی مرحوم اس الزام کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ یہ الزام اتنا وزنی ہے کہ اگر ناصر کاظمی زندہ ہوتے تو یہی الزام ان کی موت کا سبب بن جاتا۔ اس غزل کے غلط انتساب پر ٹی وی والوں کو ناصر زیدی ہی سے نہیں، ان تمام لوگوں سے بھی معذرت کرنی چاہیے، جو ناصر کاظمی کے عقیدت مند ہیں۔ ٹی وی والوں کو یہ بھی چاہیے کہ اپنی تعلیمی و ادبی استعداد میں اتنا اضافہ ضرور کر لیں کہ ناصر زیدی اور ناصر کاظمی میں فرق کیا جا سکے۔ ناصر زیدی کا کلام کسی دوسرے شاعر سے منسوب نہیں ہونا چاہیے، تاکہ ایک کی عزت اور دوسرے کی ادبی شہرت ضائع نہ ہو۔

مذکورہ تحریر کے مطالعے کے بعد ناصر زیدی صاحب نے ہمیں جو خط لکھا ہے، اب اسے بھی ملاحظہ فرما لیا جائے:

''آپ نے ٹی وی کی بیورو کریسی کو سپورٹ کیا، اس کا شکریہ۔ پہلے بھی آپ ''مصرع چور شاعر'' کو اور ''شاعر چور'' جعلی شخص کو سپورٹ کر چکے ہیں۔ گویا حقدار کی حق رسی کی بجائے ''خائن'' کی حمایت آپ کا شعار ہے۔ بہر حال اس کے باوجود میں نے تنہا لڑائی لڑ کر اپنا حق تسلیم کرایا۔ میری غزل بیس سالہ پرانی ہے۔ ''بہت ہی گھٹیا ہے، محض تک بندی ہے، اس میں کچھ ہے نہیں۔'' بہر حال ہے تو میری۔ اگر وہی ناصر کاظمی کے نام سے نشر ہوتی رہتی تو بہت اچھی کہلاتی۔ حق دار نے حق مانگا تو کیڑے پڑ گئے۔ ناصر کاظمی کی زندگی میں میری ایک غزل اُن کے نام سے چھپ گئی تھی تو اسلم انصاری (ملتان) گواہ ہیں کہ انھوں (ناصر کاظمی) نے کہا۔ ''تمھارا رنگ مجھ سے قریب ہے، اس لیے یہ مغالطہ ہو جاتا ہے۔'' غزل تھی:

رات سنسان ہے گلی خاموش
پھر رہا ہے اک اجنبی خاموش

پورے شاعرانہ وجود کو ہتھیا لیا ہے۔ ہم نے اس پر احتجاج کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ایک ممتاز اور بلند مرتبہ شاعر کے کلام اور شاعرانہ وجود کو مالِ مسروقہ بنا دینا نہایت نامناسب حرکت ہے۔ ہماری اس تنبیہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ سرشار صدیقی نے رائٹرز گلڈ سے اور کراچی کے ناصر زیدی نے ادب ہی سے استعفیٰ دے دیا۔

ہم نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ناصر زیدی کی غزل بہت ہی گھٹیا ہے اور محض تک بندی ہے۔ ہم نے صرف اتنا عرض کیا تھا کہ ناصر کاظمی ایسی غزل نہیں کہہ سکتے۔ مقصود ناصر کاظمی کا عجزِ بیان تھا، نہ کہ غزل کی تحقیر۔

جناب زیدی نے بہت سے ادیبوں کی گواہی پیش کی ہے کہ ان کا رنگ ناصر کاظمی کے رنگ سے ملتا ہے۔ افسوس کہ ہم نے ناصر زیدی اور ناصر کاظمی دونوں کو نہیں دیکھا، صرف تصویریں دیکھی ہیں۔ ظاہر ہے، تصویروں کی بنا پر رنگ کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے ہم کشادہ دلی سے معزز گواہوں کے بیانات کو تسلیم کیے لیتے ہیں۔

ناصر زیدی صاحب نے بتایا ہے کہ جوش اور حفیظ جیسے شاعروں نے انھیں صفِ اوّل کے نمایندہ غزل گو شاعروں میں شمار کیا ہے، لیکن ہم زیدی صاحب کو گھٹیا شاعر سمجھتے ہیں۔ بخدا یہ غلط الزام ہے۔ (ہمارا اشارہ جوش و حفیظ کی طرف نہیں، خود اپنی طرف ہے) ہم ناصر زیدی کے کمالِ فن کے نہ صرف معترف ہیں، بلکہ انھیں صنفِ غزل کی آبرو سمجھتے ہیں۔ زیدی صاحب کو اجازت ہے کہ آیندہ جب کبھی وہ ان لوگوں کی فہرست مرتب کریں، جو انھیں صفِ اول کا نمایندہ غزل گو سمجھتے ہیں تو اس فہرست میں بلاتکلف ہمارا نام بھی شامل کر لیں۔

ناصر زیدی صاحب نے اپنے خط کے آخر میں ہم سے پوچھا ہے کہ اگر ہمارا کوئی گھٹیا کالم، بہترین کالم نویس عطاء الحق قاسمی کے نام سے چھپ جائے تو کیا ہمیں شکایت نہ ہوگی۔ عرض ہے شکایت تو نہیں، ندامت ضرور ہوگی کہ ایک گھٹیا کالم قاسمی صاحب کے نام سے منسوب ہو گیا۔ ویسے اگر قاسمی صاحب خود ہی ہمارا کوئی کالم اپنے نام سے چھپوانا چاہیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ خصوصاً پچھلے ہفتے کا کالم جو ''فون'' کے بارے میں تھا۔

(۱۴ر ستمبر ۱۹۸۴ء)

☆......☆......☆

۱۹۸۴ء کی یاد میں

ہر گزرے ہوئے سال کی طرح ۱۹۸۴ء بھی اپنے پیچھے خوش گوار اور ناخوش گوار یادوں کا ایک سلسلہ چھوڑ گیا ہے۔ ادبی اعتبار سے یہ سال کچھ اچھا نہیں تھا۔ بعض ایسے ادیب، ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے، جو ہمارے عہد کا حاصل تھے۔ فیض احمد فیض کی صورت میں ہم سے جدید اردو شاعری کی شناخت چھن گئی اور راجندر سنگھ بیدی کی وفات سے جدید اردو افسانہ اپنے معمارِ اعظم سے محروم ہو گیا۔ ان دونوں بڑے ادیبوں کی دائمی جدائی کو جس شدت سے محسوس کیا گیا، اس کا اندازہ ہمارے اخباروں سے کیا جا سکتا ہے، جنھوں نے ان ادیبوں سے متعلق خبروں کو بڑی اہمیت دی، لیکن کچھ جدا ہونے والے ایسے بھی تھے، جن کی وفات کی خبریں اخباروں میں اس طرح شائع ہوئیں، جیسے غیر اہم مضافاتی خبریں شائع ہوتی ہیں۔ اس کی مثال میں دو نام پیش کیے جا سکتے ہیں۔ ایک ڈاکٹر عبداللہ چغتائی کا اور دوسرا تابش صدیقی کا۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی نے تاریخ، آثارِ قدیمہ اور فنِ تعمیر پر گراں قدر علمی کام کیا ہے۔ تابش صدیقی بڑے اچھے شاعر تھے اور حلقۂ اربابِ ذوق کے بانیوں میں سے تھے۔ ان دونوں کے بارے میں کراچی کے اخباروں میں ایک آدھ خبر محض اس لیے شائع ہوگئی کہ اہلِ اقتدار میں سے بعض نے تعزیتی بیانات جاری کر دیے تھے۔ گویا مرنے والوں کی اپنی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اہمیت تھی تو اس بات کی کہ ''بڑے آدمیوں'' نے رسمی تعزیت کی تھی۔

اور کچھ ادیب تو ایسے بھی تھے کہ انھیں رسمی تعزیت کا بھی مستحق نہ سمجھا گیا۔ ڈاکٹر صدرالحق اور ڈاکٹر غلام حسین جعفری ذاتی تشہیر سے بے نیاز ہو کر جس خاموشی سے زندگی بھر ادبی و تحقیقی کام کرتے رہے، اسی خاموشی سے رخصت ہو گئے۔ یہ دونوں محقق تھے، بے شمار قدیم شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں انھوں نے دادِ تحقیق دی، لیکن خود ان کے بارے میں کسی نے اتنی تحقیق بھی نہ کی کہ ان کا انتقال کب ہوا۔

۱۹۸۴ء میں مرنے والوں کی تعداد اچھی خاصی ہے...... کس کس کا نام لیجیے کس کس کو رو دیجے...... لیکن

ایک مرنے والا ایسا بھی ہے، جس کی جدائی سے کراچی شہر ادبی و تہذیبی اعتبار سے سنسان ہو گیا۔ مرزا ظفر الحسن، جنھوں نے ادارۂ یادگارِ غالب اور غالب لائبریری قائم کر کے کراچی کو ایک ادبی و تہذیبی شہر بنا دیا تھا۔ اس شخص کے دم سے کتنی رونق تھی، کتنی چہل پہل تھی۔ اب یہ رونق اور چہل پہل ماضی کا حصہ بن چکی ہے۔

۱۹۸۴ کا سب سے اہم بلکہ سنگین واقعہ یہ ہے کہ مسیح الدین صدیقی اور اکیڈمی آف لیٹرز میں جدائی کی دیوار حائل ہو گئی اور یوں اکیڈمی صحیح معنوں میں ڈیڈ لیٹرز آفس بن گئی۔ کوئی کچھ بھی کہے، ہم تو یہ کہیں گے کہ صدیقی صاحب کی وجہ سے اکیڈمی کا کام چلا ہو یا نہ چلا ہو، نام ضرور چل نکلا۔ اور خود صدیقی صاحب بھی کچھ کم نہیں چلتے تھے۔ آج اسلام آباد میں ہیں تو کل لاہور میں، صبح ملتان میں گزرتی تھی تو شام بہاول پور میں، ناشتہ حیدرآباد میں کرتے تھے تو دوپہر کا کھانا کراچی میں کھاتے تھے۔ ہر جگہ ان کی دعوتیں ہوتی تھیں۔ تمام ادیبوں سے ان کا ذاتی رابطہ تھا۔ کسی کو آئندہ سال اہلِ قلم کانفرنس میں بلانے کا مژدہ سناتے اور کسی کو ادبی انعام کی امید دلاتے۔ کسی پر مہربان ہوئے تو ٹکٹ بھیج کر اسلام آباد بلوا لیا اور زیادہ مہربان ہوئے تو کسی غیر ملک کے دورے پر بھجوا دیا۔ ادیبوں نے بھی صدیقی صاحب کو سر آنکھوں پر جگہ دی۔ انھیں ادبی تقریبات ہی میں نہیں، تعزیتی جلسوں میں بھی مہمان خصوصی بنایا جاتا تھا۔ ہم نے تو انھیں ایک افسانہ نگار کی شادی میں بھی مہمان خصوصی بنتے دیکھا ہے۔ وہاں ایک شاعر نے سہرا پڑھا جس میں صنعت توشیح سے کام لیا گیا تھا۔ تمام مصرعوں کے ابتدائی حروف ملائے جائیں تو صدیقی صاحب کا نام برآمد ہوتا تھا۔ ہم نے سہرا نگار سے اس کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا، یہ شادی صدیقی صاحب کی کوششوں ہی سے ہو رہی ہے۔ اگر وہ معذور ادیبوں کے فنڈ سے رقم فراہم نہ کرتے تو افسانہ نگار صاحب کے افسانوی مجموعے کی طرح ان کی شادی بھی "غیر مطبوعہ" رہتی..... افسوس کہ اب صدیقی صاحب کا اکیڈمی سے تعلق نہیں رہا تو انھیں اس طرح فراموش کر دیا گیا ہے، جیسے اس نام کا کوئی شخص ادبی منظر پر موجود ہی نہ تھا۔ اتنی آسانی سے تو کوئی اپنے عیبوں کو بھی نہیں بھولتا، جتنی آسانی سے ہم نے صدیقی صاحب کو بھلا دیا۔ بھولنے والے تو بہت ہیں، لیکن ہمیں رہ رہ کر کراچی کا وہ شاعر یاد آتا ہے، جس نے ایک مرتبہ فرطِ عقیدت سے صدیقی صاحب سے کہا تھا۔ "میری خواہش ہے کہ جب میرا تعزیتی جلسہ ہو تو اس کی صدارت آپ کریں۔" اور صدیقی صاحب نے بڑی معصومیت سے کہا تھا۔ "یہ کام آپ کی زندگی ہی میں ہو جائے تو اچھا ہے، کیوں کہ جب تک یہ واقعہ پیش آئے گا، میں سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو چکا ہوں گا۔"

صدیقی صاحب اکیڈمی سے گئے تو ان کی جگہ دو آدمیوں نے لی، حالاں کہ صدیقی صاحب جیسا کام دو آدمی تو کیا، دس آدمی مل کر بھی نہیں کر سکتے۔ خاطر غزنوی چند روز اکیڈمی میں رہے اور پھر اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دیا۔ اب غلام ربانی اگرچہ اکیلے رہ گئے ہیں۔ معلوم نہیں وہ اس پتھر میں جونک لگانے میں کامیاب ہوتے ہیں یا نہیں۔ بہر حال صدیقی صاحب کے جانے کا یہ نتیجہ نکلا کہ ۱۹۸۴ء میں اہلِ

قلم کانفرنس نہیں ہوئی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صدیقی صاحب کے بعد اکیڈمی نے یہی ایک مثبت کام کیا ہے۔

اس سال رائٹرز گلڈ کا حال بھی دگرگوں رہا، بلکہ یوں کہیے کہ کالعدم سیاسی جماعتوں کی طرح "ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے" والا معاملہ رہا۔ گلڈ نے اپنی زندگی کا ثبوت دینے کے لیے کئی برسوں کے جمع شدہ ادبی انعامات بھی تقسیم کیے، لیکن اس سے گلڈ کی ساکھ کیا بچتی، انعام لینے والوں کی ساکھ بھی خراب ہو گئی۔ اب تو یہ حال ہے کہ کسی کتاب کے فروخت نہ ہونے کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس پر گلڈ کا انعام مل چکا ہے۔

ادبی رسالوں میں "افکار" سرفہرست رہا۔ یہ سال بھر باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا۔ ہم جناب صہبا لکھنوی کی دل سے قدر کرتے ہیں کہ وہ نامساعد حالات کے باوجود رسالہ نکال رہے ہیں۔ نامساعد ان معنوں میں کہ انھیں اداریہ تک دوسروں سے لکھوانا پڑتا ہے۔ کبھی پروفیسر مجتبیٰ حسین سے لکھواتے ہیں اور کبھی ڈاکٹر حنیف فوق سے۔ حد تو یہ ہے کہ اس سال انھوں نے ایک اداریہ افسانہ نگار فہیم اعظمی سے بھی لکھوایا، حالاں کہ عام رسالے ان سے افسانے بھی نہیں لکھواتے۔ اگر صہبا صاحب اپنے اداریے فہیم اعظمی کی بجائے شبانہ اعظمی سے لکھوائیں تو رسالے کی اشاعت بڑھ سکتی ہے۔

"فنون" اور "اوراق" بھی اس سال مرضی وار چھپتے رہے۔ یہ رسالے نہیں ادبی دبستان ہیں۔ ہماری ادبی دنیا کی ساری رونق انھیں دبستانوں کی وجہ سے ہے۔ دونوں میں روزِ اول ہی سے جنگ جاری ہے۔ مظفر علی سید نے اس جنگ کو نوراکشتی کا نام دیا ہے۔ شاید یہ نوری نستعلیق قسم کی کوئی چیز ہے، کیوں کہ دونوں دبستانوں کے سربراہ خاصے نستعلیق واقع ہوئے ہیں۔ خود ایک دوسرے کے خلاف کچھ نہیں لکھتے۔ دوسروں ہی کے لکھے کو بہت سمجھتے ہیں۔ دبستانِ فنون میں ایسے ادیبوں کی تعداد اچھی خاصی ہے، جو قلم سے آلۂ حرب و ضرب کا کام لینے کا ہنر جانتے ہیں۔ دوسری طرف بے چارے انور سدید اکیلے ہیں، جو چومکھی لڑتے ہیں۔ انور سدید نے بڑا زرخیز ذہن پایا ہے۔ جب وہ دبستانِ فنون کے خلاف معرکہ آرا ہوتے ہیں تو ایک رنگ کے مضمون کو سو ڈھنگ سے باندھتے ہیں۔ اگر ان کے کسی مضمون میں دبستانِ فنون کے خلاف کوئی جملہ نہ ہو تو وہ مضمون سہوِ قلم کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ (ایسے سہوِ قلم کا بہترین نمونہ مشکور حسین یاد کی وہ کتاب ہے، جو انھوں نے انشائیے پر لکھی ہے۔ یہ کتاب دبستانِ اوراق کے ساتھ ساتھ خود اپنے موضوع پر بھی کاری ضرب لگاتی ہے۔)

گزشتہ سال ڈاکٹر سلیم اختر نے بھی دبستانِ اوراق کی اینٹ سے اینٹ بجانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تنقید لکھنے اور اینٹ سے اینٹ بجانے میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ (واضح رہے کہ اینٹ سے اینٹ بجانا اور بھینس کے آگے بین بجانا دو مختلف کام ہیں، لیکن کبھی کبھی ایک ہی

آدمی کو یہ دونوں کام بیک وقت انجام دینے پڑتے ہیں۔)

انفرادی طور پر یہ سال نظیر صدیقی کی کامیابیوں کا سال تھا، جسے محاورے میں ان کا چھٹا برس بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس سال ایک نہ دو، کُل چار کتابیں شائع ہوئیں۔ اب ان کی تصانیف کی مجموعی تعداد دو ڈیڑھ درجن ہو گئی ہے۔ یہ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے کسی ادیب کی تصانیف کی تعداد اس کے قارئین کی تعداد سے بڑھ جائے۔

صہبا اختر، پروین شاکر اور امجد (اسلام امجد) نے یہ سال لکھنے کی بجائے پڑھنے میں گزارا...... کتابیں پڑھنے میں نہیں، مشاعرے پڑھنے میں...... اس سلسلے میں یہ شعرا بیرونِ ملک بھی گئے اور اپنی کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ آئے۔ یہ لوگ اپنے دیوان اپنے ساتھ واپس لے کر آئے، حالاں کہ غیر ممالک میں انھیں بھی گاڑنے کے لیے جگہ مل سکتی تھی۔

احمد فراز، فارغ بخاری اور شہرت بخاری نے یہ پورا سال لندن میں گزارا۔ اردو مرکز لندن کی تقریبات کی تصویریں پاکستانی اخبارات میں شائع ہوتی ہیں، ان میں یہ تینوں افتخار عارف کے ساتھ اکثر نظر آتے ہیں۔ گویا اس سال ان شاعروں نے شعر کہنے کی بجائے صرف تصویریں اتروانے پر اکتفا کی۔ ساقی فاروقی ان تصویروں میں کبھی نظر نہیں آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابھی تک افتخار عارف سے ناراض ہیں۔ ایسی بھی کیا ناراضگی! شوقین لوگ تو ابوالہول کے پاس کھڑے ہو کر بھی تصویریں اتروا لیتے ہیں۔ سنا ہے کئی لوگوں نے ساقی فاروقی اور افتخار عارف میں صلح کرانے کی بھی کوشش کی، لیکن بعد میں وہ اس نتیجے پر پہنچے، یہ کام خطرے سے خالی نہیں، کیوں کہ ساقی فاروقی مکتوب نگاری چھوڑ کر دوبارہ شاعری شروع کر دیں گے۔

اس سال بے شمار کتابیں شائع ہوئیں۔ زیادہ تر شعرائے کرام نے اپنے دیوان خود ہی اور اپنی ذمہ داری پر شائع کیے، جس سے شاعری کی ارزانی اور کاغذ کی گرانی میں کچھ اور اضافہ ہوا، تاہم بعض ایسی کتابیں بھی شائع ہوئیں، جنھیں ادب ہی میں نہیں، کتاب سازی کے فن میں بھی سنگِ میل قرار دیا گیا۔ منیر نیازی نے اپنے سارے مجموعوں کو یکجا کر کے "کلیاتِ منیر" شائع کی، جس کی قیمت صرف دو سو روپے ہے۔ یہ ۱۹۸۴ء ہی کی نہیں، بیسویں صدی کی سب سے مہنگی کتاب ہے۔ اس پر ایک نقاد نے یہ تبصرہ کیا کہ اچھے وقتوں میں اتنی رقم میں تو کتاب مع مصنف مل جایا کرتی تھی۔

اس سال ایک اور مہنگی کتاب "نسخہ ہائے وفا" یعنی کلیاتِ فیض احمد فیض بھی شائع ہوئی۔ اس کی قیمت ۱۲۵ روپے تھے، لیکن جونہی فیض صاحب کی آنکھیں بند ہوئیں، قیمت میں پندرہ روپے کا اضافہ کر دیا گیا۔ یہ پہلی کتاب ہے، جس کی قیمت میں اضافہ مصنف کی آنکھیں بند ہونے کی وجہ سے ہوا، ورنہ عام طور پر پبلشر خود ہی آنکھیں بند کر کے کتابوں کی قیمتیں مقرر کرتے ہیں۔

کالم نگاری کے میدان میں گزشتہ برسوں کی طرح اس برس بھی نصر اللہ خاں سب سے آگے رہے۔ اس سال ان کے شخصی خاکوں کا مجموعہ "کیا قافلہ جاتا ہے" بھی شائع ہوا، جسے اہلِ نظر نے (جن میں ہم بھی شامل ہیں) ۱۹۸۴ء کی بہترین کتاب قرار دیا ہے۔ سنا ہے ان کا دوسرا مجموعہ "قافلہ گمراہ ہوتا ہے" کے نام سے شائع ہوگا، جس میں عطاء الحق قاسمی کا شخصی خاکہ بھی شامل ہے، حالاں کہ عطاء الحق قاسمی کبھی گمراہ نہیں ہوئے یہ اور بات ہے کہ وہ دوسروں کو گمراہ کر دیتے ہیں، اسی لیے اس سال بہترین کالم نگار کا ایوارڈ انھیں کو ملا ہے۔ وہ بہر حال اس اعزاز کے مستحق تھے۔ حق بحق دار رسید، اگر خدا نخواستہ یہ ایوارڈ انتظار حسین کو مل جاتا تو لوگ کہتے، انتظار حسین کالم نگاری نہیں کرتے، ایوارڈ نگاری کرتے ہیں۔

۱۹۸۴ء میں کئی ہندوستانی ادیب پاکستان تشریف لائے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر تنویر علوی، رشید حسن خاں اور ڈاکٹر خلیق انجم کی وجہ سے کراچی اور لاہور میں بڑی رونق رہی۔ ڈاکٹر نارنگ سال کے آخر میں دوبارہ آتے آتے رہ گئے۔ انجمن ساداتِ امروہہ نے انھیں اپنے ایک جلسے میں تقریر کرنے کے لیے بلایا تھا، مگر اچانک یہ جلسہ منسوخ کر دیا گیا۔ معلوم نہیں، ساداتِ امروہہ والے ڈاکٹر صاحب پر اتنے مہربان کیوں ہیں کہ انھیں بار بار بلاتے ہیں۔ ممکن ہے، انھوں نے کسی عربی زبان کے اخبار میں ڈاکٹر صاحب کے نام کے ساتھ "السید" کا لفظ دیکھ لیا ہو یا پھر ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب میں وہ "امروہہ پن" پایا جاتا ہو، جس کا ذکر جوش ملیح آبادی نے "یادوں کی برات" میں کیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ڈاکٹر تنویر علوی اپنے رشتہ داروں سے ملنے کے لیے آئے تھے۔ وہ انجمن ترقی اردو کے تحت ایک لیکچر دے کر چلے گئے۔ اس سے زیادہ پبلک ریلیشنگ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ خلیق انجم اور رشید حسن خاں ساتھ ساتھ آئے اور ساتھ ساتھ گئے۔ خلیق انجم نے روانگی کے وقت کہا:

"رشید حسن خاں میرے ساتھ ہیں، کہیں کسٹم والے اس پر اعتراض نہ کریں۔"

رشید خاں نے اس کا یہ جواب دیا:

"آپ فکر نہ کریں۔ میری وجہ سے کسٹم والے آپ کو کچھ نہیں کہیں گے، ورنہ انجمن ترقی اردو ہند کا سیکریٹری جنرل ہو کر غلط اردو بولنا ایسا جرم نہیں ہے، جسے کسٹم والے نظر انداز کر دیں۔"

(۱۱ر جنوری ۱۹۸۵ء)

☆............☆............☆

ادیبوں کا پسندیدہ راگ...... راگ کھڑ اگ

آخر وہی ہوا، جس کا ہمیں بہت دنوں سے اندیشہ تھا، یعنی طاہر مسعود بھی صاحب تصنیف بن گئے۔ کم عمری میں والد بن جانے سے یہ فایدہ ہوتا ہے کہ بڑھاپا آنے سے پہلے ہی اولاد قوت بازو بن جاتی ہے، لیکن کم عمری میں مصنف بن جانا خطرے سے خالی نہیں۔ اگر مصنف خود نہیں تو اس کا قاری ضرور وقت سے پہلے بوڑھا ہو جاتا ہے۔ کتاب خوانی کے زمانے کو کتاب سازی میں گنوا دینا کوئی اچھی بات نہیں۔ اسی لیے پہلی نظر میں ہمیں طاہر مسعود کا صاحب کتاب بن جانا پسند نہ آیا، لیکن جب کتاب کا مطالعہ کیا تو ہمیں احساس ہوا کہ حسب معمول پہلی نظر میں ہم دھوکا کھا گئے تھے۔ یہ کتاب عام کتابوں سے بالکل مختلف ہے۔ اسے لکھنے کے لیے طاہر مسعود نے بے شمار کتابیں ہی نہیں پڑھیں، ان کتابوں کے مصنفوں کے چہرے اور ذہن بھی پڑھے ہیں۔ طاہر مسعود کی کتاب کا نام ہے "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے" اور یہ مجموعہ ہے عہد حاضر کے دو درجن ادیبوں کے انٹرویوز کا۔

ایک زمانے میں روزنامہ "جسارت" کے ادبی صفحے کی بڑی دھوم تھی اور اس کا واحد سبب طاہر مسعود کے انٹرویو تھے۔ یہ انٹرویو بڑے ہنگامہ خیز تھے، یعنی ادھر کوئی انٹرویو شایع ہوا اور ادھر کوئی ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ سلیم احمد مرحوم کا انٹرویو چھپا تو ایسا محسوس ہوا، جیسے ادبی دنیا میں کوئی زلزلہ آ گیا ہو۔ سلیم احمد مرحوم "جسارت" کے مستقل کالم نگار تھے۔ اس اخبار سے قطع تعلق کا سبب ان کا یہی انٹرویو تھا۔ کرنل محمد خان کا انٹرویو شایع ہوا تو نسیمہ بنت سراج نے کالم نگاری چھوڑ کر مکتوب نگاری شروع کر دی۔ انھوں نے کرنل صاحب کے انٹرویو کے ایک حصے کی تردید میں ایک سنسنی خیز قسم کا خط لکھا، اور اب وہ دنیائے ادب میں اسی خط کے حوالے سے پہچانی جاتی ہیں۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا انٹرویو چھپا تو یہ بحث شروع ہو گئی کہ ترقی پسند تحریک کا بانی کون تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے بعض بیانات کی تردید پروفیسر احمد علی نے اپنے انٹرویو میں کی۔ جمیل الدین عالی کے انٹرویو نے اس بحث کو جنم دیا کہ ان (عالی) کے بعد گلڈ نے کچھ نہیں کیا۔ عالی

صاحب کے جانشین محمد طفیل نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ بعض دوسرے لوگوں نے بھی اس بحث میں حصہ لیا اور اس کے باوجود یہ بحث بے نتیجہ رہی۔ غرض کہ طاہر مسعود نے جس ادیب کا بھی انٹرویو لیا، اس سے ادبی دنیا میں ایک ہلچل پیدا ہوئی اور اب یہ انٹرویو کتابی صورت میں شایع ہوئے ہیں تو ان سے مزید ہلچل پیدا ہوگی، کیوں کہ طاہر مسعود نے بعض انٹرویو کے ساتھ ان کی تردید میں موصول ہونے والے خط بھی کتاب میں شامل کر دیے ہیں۔ ۳۳۶ صفحات کی اس کتاب کی قیمت یوں تو صرف ۴۰ روپے ہے، لیکن بعض انٹرویو دینے والوں کو یہ خاصی مہنگی پڑے گی۔

جب سے اخبارات کے فلمی صفحات پر پابندی لگی ہے، تب سے اخباروں نے ادب کی سرپرستی شروع کر رکھی ہے۔ ادبی شخصیتوں سے بھی وہی سلوک کیا جاتا ہے، جو فلمی ستاروں سے کیا جاتا ہے۔ اخبار میں ادیبوں کے انٹرویو شایع ہوتے ہیں، جن میں اس قسم کے سوال و جواب ہوتے ہیں:

سوال: آپ ادبی دنیا میں آنے سے پہلے کیا کاروبار کرتے تھے؟

جواب: پرانے کپڑوں کا۔

سوال: اور اب؟

جواب: پرانے خیالات کا۔

سوال: آپ کا پسندیدہ رنگ کیا ہے؟

جواب: رنگ تغزل۔

سوال: آپ کا پسندیدہ راگ کون سا ہے؟

جواب: کھڑاگ۔

سوال: آپ کا پسندیدہ شاعر کون سا ہے؟

جواب: من آنم کہ من دانم۔

سوال: منٹو پر انیس ناگی کی کتاب آپ نے دیکھی ہے؟

جواب: میں نے منٹو اور ناگی دونوں کو نہیں دیکھا تو کتاب کیا دیکھوں گا۔

سوال: ویسے اس کتاب کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: بہت اچھی کتاب ہے۔ ان لوگوں کو ضرور پڑھنی چاہیے، جو منٹو کے بارے میں کچھ نہیں جاننا چاہتے۔

سوال: قمر جمیل کی نثری نظمیں کیسی ہوتی ہیں؟

جواب: جیسے وہ خود ہیں۔

لیکن طاہر مسعود کے انٹرویو اس طرح کے نہیں ہوتے۔ وہ جس ادیب سے گفتگو کرتے ہیں، اس کے

ادبی کاموں پر پوری طرح حاوی ہوتے ہیں۔ وہ سوال نہیں کرتے، گفتگو کے لیے میدان ہموار کرتے ہیں۔ وہ ہر بات پر گردن نہیں ہلاتے، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتے ہیں اور بڑی جرأت مندی کے ساتھ ایسے سوال بھی کر جاتے ہیں، جو عام انٹرویو لینے والوں کے بس کی بات نہیں۔ طاہر مسعود کے صرف چند سوال ملاحظہ کیجیے اور دیکھیے کہ وہ کیسے بے ڈھب آدمی ہیں:

فیض احمد فیض: ”آپ کے ناقدین خیال میں آپ کو بعض سیاسی وجہ کی بنا پر اہمیت دی جاتی ہے۔ ابتدائی زمانے میں تو آپ کو پنڈی سازش کیس کے حوالے سے شہرت ملی اور اب بائیں بازو کے عناصر نظریاتی ہم آہنگی کی بنا پر آپ کو اور آپ کے نام کو بطور علامت استعمال کرتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“

قدرت اللہ شہاب: ”آپ کے علم میں ہوگا کہ عوام بیوروکریسی سے کتنے بیزار ہیں۔ بیوروکریٹ طبقہ بھی عوام کو تحقیر آمیز نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ آپ ایک حساس ادیب ہونے کے علاوہ ایک کامیاب بیوروکریٹ بھی ثابت ہوئے۔ لوگ یہ پوچھنے میں حق بجانب ہیں کہ آپ نے اس ظالمانہ نظام کا حصہ بننا کیسے گوارا کرلیا؟ ممتاز مفتی اور اشفاق احمد نے اپنی بعض تحریروں میں یہ تاثر دیا ہے کہ جیسے آپ پہنچے ہوئے بزرگ اور صوفی ہیں۔ ممتاز مفتی تو آپ کو اپنا پیر بھی کہتے ہیں، اس کی حقیقت کیا ہے؟“

ممتاز مفتی: ”کہا جاتا ہے کہ قدرت اللہ شہاب کی دوستی کی وجہ سے آپ کو ترقیاں ملیں؟“

قیوم نظر: ”آپ کی شاعری پر بعض نقادوں کا اعتراض ہے کہ اس کا علامتی افق محدود، اس میں خارجی زندگی کے مسائل کا احساس بھی کم ہے؟“

”آپ کے شعری ڈکشن کو بھی محدود قرار دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ آپ کی شاعری میں دورِ اول سے آج تک خصوصی لفظوں کا استعمال ملتا ہے، جس کے باعث علامتوں میں تنوع نہیں ہے؟“

شوکت صدیقی: ”نظریاتی اعتبار سے آپ بائیں بازو کے گروپ سے وابستہ ادیب تصور کیے جاتے ہیں۔ آپ کے بارے میں اب کہا جاتا ہے کہ آپ نے بحیثیت ادیب نظریاتی کردار ادا کرنا ترک کر دیا ہے؟“

منیر نیازی: ”آپ پر ایک الزام یہ ہے کہ آپ اپنے بارے میں بہت تعلّی سے کام لیتے ہیں اور خود پسند بھی ہیں، آپ کا اپنا کیا خیال ہے؟“

کرنل محمد خان: ”آپ پر ایک الزام ہے کہ خواتین لکھاریوں کے لیے آپ کے دل میں بے حد نرم گوشے پائے جاتے ہیں اور آپ نے بعض خواتین لکھاریوں کی تحریروں کی تعریف

میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے ہیں، حالاں کہ ان کی تحریریں اس پائے کی نہیں تھیں، جتنی آپ نے تعریف کی؟“

طاہر مسعود نے اسی قسم کے سوالوں کے ذریعے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے ہر ادیب کی شخصیت کو اس کے اصل رنگ میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس طرح یہ انٹرویوز کا مجموعہ ادیبوں کے بارے میں نادر و نایاب معلومات کا خزینہ ہی نہیں، ادبی مسائل پر ایک اچھی خاصی تنقیدی کتاب بھی ہے۔ اس میں بعض اداروں، رائٹرز گلڈ، اکادمی ادبیات اور انجمن ترقی پسند مصنفین وغیرہ کے بارے میں بھی بعض حقائق سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ فیض صاحب نے راولپنڈی سازش کیس کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، اس سے عام قاری ہی کی نہیں، خواص کی معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

ادیبوں کی ایک دوسرے کے بارے میں رائیں بھی خاصی فکر انگیز ہیں۔ شاید ہی کسی نے دوسرے کے بارے میں کلمۂ خیر کہا ہو۔ بعض ادیبوں نے سنسنی خیز قسم کے انکشافات بھی کیے ہیں۔ مثلاً:

”میں نے منیر نیازی کو سکھایا ہے کہ نظمیں کیسے کہتے ہیں۔ میں نے ۱۹۴۲ء میں اسے پہلی بار ”ادبی دنیا“ میں شائع کیا۔ منیر نیازی کو مصرع نہیں سوجھتا تھا تو مجھ سے پوچھتے تھے۔ مختار صدیقی کا خط میرے نام موجود ہے کہ اس نے لکھا کہ قیوم نظر! مجھے گیت لکھنے کا ڈھنگ سکھا دو۔ ایک زمانے میں ضیا جالندھری مجھ سے بری طرح متاثر تھا۔ اس کے مجموعے ”سرِ شام“ میں آپ کو میرے اثرات بآسانی مل جائیں گے۔“ (قیوم نظر)

”میری شاعری کا پہلا مجموعہ ”جنگل میں دھنک“ شائع ہوا، جس کی آج بھی تعریفیں کی جاتی ہیں کہ میں نے اس کتاب کو مقابلے (آدم جی انعام) کے لیے بھیجا تھا، کیوں کہ ہمیں بھی شوق ہے چاہے جانے کا، تسلیم کیے جانے کا، لیکن اس برس کہا گیا کہ شاعری کی کوئی اچھی کتاب مقابلے کے لیے آئی ہی نہیں اور اس کے مقابلے میں ”تلاشِ بہاراں“ کو ایوارڈ دیا گیا، جو قرۃ العین کے ناولوں کا بھدا عکس تھا۔ اس کے بعد میں نے بیان دیا کہ میں کبھی اپنی کتاب انعام کے لیے نہیں بھیجوں گا اور میں گلڈ سے مستعفی ہوتا ہوں۔“ (منیر نیازی)

”منیر نیازی ایک نفسیاتی کیس ہے۔ وہ اچھا شاعر ضرور ہے، لیکن سب سے بڑا شاعر نہیں ہے۔“ (جمیل الدین عالی)

”سچ پوچھیے تو اشفاق احمد ایک ایسا ادیب ہے، جس کی برصغیر میں کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ وہ ایک چھوٹے سے پودے سے برگد کا پیڑ بنا ہے۔ اس کے افسانوں ناولٹ اور ڈراموں میں جتنا تنوع اور گہرائی ہے، وہ اس کے ایک عظیم رائٹر ہونے کی دلیل ہے۔“ (بانو قدسیہ)

بانو قدسیہ نے اپنے شوہر اشفاق احمد کے ”عظیم رائٹر“ ہونے کی جو بات کہی ہے، اس سے ہم تو

کیا، خود اشفاق احمد بھی اختلاف کی جرأت نہیں کر سکتے، البتہ یہ بات ہمیں پسند نہیں آئی کہ اشفاق احمد نے اپنے انٹرویو میں بانو قدسیہ کے فن پر کوئی رائے نہیں دی، حالاں کہ وہ انھیں اپنی عظمت میں آسانی شریک کر سکتے تھے۔

اس کتاب کا دیباچہ ماضی کے افسانہ نگار اور "روزن در" کے مصنف، حال کے صحافی اور کالم نگار ابن الحسن صاحب نے لکھا ہے۔ انھوں نے ظاہر مسعود کی تعریف ایسی فراخ دلی سے کی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ ہم بھی اپنے کالموں کے مجموعے کا دیباچہ ان ہی سے لکھوائیں۔

(۱۸؍جنوری ۱۹۸۵ء)

☆............☆............☆

ادب پر بھی عائلی قوانین کا نفاذ ہونا چاہیے

ہمارے نام خط اس کثرت سے آتے ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو محترم نظیر صدیقی کی طرح ہر مہینے خطوں کا ایک مجموعہ چھاپ سکتے ہیں۔ نظیر صدیقی صاحب نے اپنے نام موصول ہونے والے خطوں کا جو مجموعہ شائع کیا ہے، اس میں مکتوب الیہ کے ذاتی معاملات کے سوا کچھ اور نہیں ہے، لیکن ہمارے نام کے خطوں کا جو مجموعہ چھپے گا، وہ اُردو مکتوب نگاری کی تاریخ میں سنگ میل ثابت ہوگا۔ ان خطوں میں ادبی، غیر ادبی، ذاتی اور غیر ذاتی ہر طرح کے مسائل ملتے ہیں۔ کوئی ہمیں دوسروں کی غلطیوں کی طرف متوجہ کرتا ہے اور کوئی ہماری غلطیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔ کوئی یہ لکھتا ہے کہ آپ اکثر نظیر صدیقی، استاد اختر انصاری اکبر آبادی، لاغر مراد آبادی اور سلطان جمیل نسیم وغیرہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں۔ کیا آپ ان سب کے پروپیگنڈا [illegible] ہیں، کیوں کہ انھیں اپنے ادبی کاموں سے اتنی شہرت نہیں ملی، جتنی آپ کے کالموں سے۔ بعض خطوں میں ہماری ایسی تعریف ہوتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ اسی قسم کے خطوں کے مطالعے میں زندگی بسر ہو جائے اور بعض خطوں میں لعنت ملامت کا ایسا پیرایہ اختیار کیا جاتا ہے کہ دل کالم نگاری سے ہی نہیں، ادب سے بھی اچاٹ ہو جاتا ہے۔

زیادہ دلچسپ وہ خط ہوتے ہیں جو بعض کرم فرما فرضی ناموں سے لکھتے ہیں۔ جب بھی ہم نے کسی کتاب پر اظہارِ خیال کیا تو صاحبِ کتاب کی طرف سے "چہرۂ غیر" میں ناراضگی کا اظہار ضرور ہوا۔ مثلاً ایک مرتبہ ہم نے ایک کتاب کے سرورق پر مصنف یا مصنفہ کی تصویر دیکھ کر یہ لکھا تھا کہ کتاب کی فروخت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن ہمیں یقین ہے کہ اس کا سرورق ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جائے گا۔ کتاب کا ایک ایڈیشن ختم ہونے کی شاید ہی نوبت آئے، لیکن سرورق کے کئی ایڈیشن چھپیں گے۔ اس پر مصنف یا مصنفہ نے فرضی نام سے ہمیں ایک دلچسپ خط لکھا، جس کا ایک جملہ ہمیں اب تک یاد ہے۔ "آپ اس لیے جل گئے کہ آپ کی تصویر اس لائق نہیں ہے کہ آپ اسے اپنی کتاب کے سرورق پر چھاپ

سکیں۔" بات درست تھی، اس لیے ہمیں بری نہیں لگی۔ کاش ان مکتوب نویس کو یہ معلوم ہوتا کہ ہم اتنے عاقبت نااندیش نہیں ہیں کہ اپنی کتاب پر اپنی تصویر چھاپیں۔ موقع ملا تو ہم انھی کی تصویر سے استفادہ کریں گے۔ سرورق ان کی وجہ سے بکے گا اور کتاب ہماری وجہ سے۔

ہمارے ایک مستقل مکتوب نگار بھی ہیں، جو ہر کالم کے مطالعے کے بعد ایک عدد خط ضرور لکھتے ہیں۔ ان میں سرفہرست جناب منظر علی خاں منظر ہیں۔ موصوف کبھی کسی معاملے میں ہم سے اتفاق رائے کرتے ہیں اور کبھی اختلاف فرماتے ہیں اور کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ نادانستہ طور پر ہماری معلومات میں اضافہ بھی کر جاتے ہیں۔ ایک مرتبہ ان سے ہمارا ٹیلی فون پر رابطہ قائم ہوا تو ہم نے پوچھا:

"آپ ہر ہفتے ہمیں خط لکھتے ہیں۔ آپ کو اتنی فرصت کیسے مل جاتی ہے؟"

انھوں نے فرمایا:

"آپ کو تو ہفتے میں ایک ہی خط لکھتا ہوں۔ بعض لوگوں کو ہر روز لکھتا ہوں۔"

ہم نے پوچھا:

"تو کیا آپ خط لکھنے کے سوا کوئی اور کام نہیں کرتے؟"

فرمایا:

"کیوں نہیں۔ انشائیے بھی لکھتا ہوں اور شاعری بھی کرتا ہوں۔"

اس پر ہم نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا:

"خط تو آپ ہمارے فائدے کے لیے لکھتے ہیں۔ انشائیوں اور شاعری سے کس کا فائدہ مقصود ہوتا ہے؟"

انھوں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا:

"جناب! میں ہر کام دوسروں کے فائدے کے لیے نہیں کرتا۔ بعض کام نقصان پہنچانے کے لیے بھی کرتا ہوں۔"

انھیں منظر علی خاں صاحب کا تازہ ترین گرامی نامہ اس لائق ہے کہ ہمارے قارئین بھی اس سے فائدہ اٹھائیں۔ وہ لکھتے ہیں:

محترم خامہ بگوش صاحب...... سلام مسنون

آپ نے صرف دو کالم حضرت مولانا کوثر نیازی کی نذر کیے، حالاں کہ مولانا کی ذات گرامی اور ان کا مجموعۂ کلام اس سے بہت زیادہ کا متقاضی تھا۔ "لمحے" کی تقریب رونمائی میں جو کچھ مخدومی رئیس امروہوی نے حضرت مولانا کے کلام کے متعلق فرمایا، وہ تو آپ نے دہرا دیا، لیکن اس تقریب میں محترمہ خوش بخت شجاعت نے مولانا کی ذات گرامی کے متعلق جو کچھ کہا، آپ اسے نظر انداز کر گئے! مولانا کی دو

کتابوں کی رونمائی ہو چکی ہے۔ اس کے حوالے سے محترمہ نے کہا تھا کہ دو رونمائیوں کے وقوع پذیر ہو جانے کے بعد بھی مسلمان ہونے کے ناطے مولانا کے لیے مزید دو رونمائیوں کی گنجائش موجود ہے، جسے وہ ان شاء اللہ ضرور انجام دیں گے...... آپ اسے اتفاق کہیں یا محترمہ خوش بخت کی خوش فہمی کہ انھوں نے تقریباً ڈھائی سال قبل یہی بات میری کتاب کی تقریب رونمائی میں کہی تھی۔ میں یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ یہ مماثلت میرے لیے باعث فخر ہے یا وجہ شکایت۔ اور اگر شکایت کی جائے تو کس سے۔ کیا آپ مدد فرمائیں گے۔

نیاز آگیں
منظر علی خاں منظر

منظر صاحب کی خواہش ہے کہ ہم مولانا صاحب کی کتاب پر چند کالم اور گھسیٹتے، حالاں کہ دو کالم بھی کتاب و مصنف کے استحقاق اور ہماری بساط سے زیادہ تھے۔ اس موقع پر معلوم نہیں، کسی استاد کا یہ شعر کیوں یاد آ گیا ہے:

طوفان نوح لانے سے اے چشم فائدہ
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

منظر صاحب نے اس طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ "چار رونمائیوں" والا جملہ محترمہ خوش بخت شجاعت نے ڈھائی سال پہلے منظر صاحب کی کتاب کے جلسے میں کہا تھا اور اب اسی جملے سے انھوں نے مولانا کوثر نیازی کی کتاب کی تقریب کو زعفران زار بنا دیا۔ ہمارے خیال میں یہ کوئی نامناسب بات نہیں۔ محترمہ خوش بخت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے کسی جملے کو ایک سے زائد مرتبہ استعمال کریں۔ انھیں منظر صاحب میں اور مولانا صاحب میں اگر کوئی تو مماثلت نظر آئی ہوگی، جو دونوں کو ایک ہی جملے میں بھگتا دیا اور کچھ نہیں تو مماثلت کیا کم ہے کہ دونوں کو کتابیں لکھنے ہی کا نہیں، ان کو چھپوانے کا اور پھر رونمائیوں کا بھی شوق ہے۔ اگر غور کیا جائے تو محترمہ کا جملہ محض جملہ بازی کا نتیجہ نظر نہیں آتا، بلکہ اس میں ایک اہم نکتہ بیان کیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ ادب میں بھی عائلی قانون کی طرح کا کوئی قانون رائج ہونا چاہیے، تاکہ ادیب بغیر کسی معقول عذر کے ایک کے بعد دوسری کتاب نہ لکھیں۔

منظر صاحب نے ہم سے پوچھا ہے کہ انھیں مذکورہ مماثلت پر فخر کرنا چاہیے یا شکایت۔ ہماری رائے میں یہ شکایت کا نہیں، فخر کا موقع ہے اور اس فخر میں منظر صاحب اور مولانا صاحب برابر کے شریک ہیں۔ منظر صاحب کو اس پر فخر کرنا چاہیے کہ خوش بخت شجاعت نے انھیں مولانا صاحب کے برابر درجہ دیا اور مولانا صاحب کو اس پر فخر کرنا چاہیے کہ ادبی تاریخ میں ان کا نام منظر صاحب کے ساتھ نظر آئے گا۔ بشرطیکہ یہ ادبی تاریخ خود منظر صاحب کے زور قلم کا نتیجہ ہو۔

مولانا صاحب ہی کے سلسلے میں ایک خط احمد رشید صاحب (میر، کراچی) نے بھی لکھا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"......"لمحے"...... پر تبصرہ کرتے ہوئے یوں تو آپ نے بہت سی باتیں لکھی ہیں، لیکن بنیادی بات آپ لکھنا بھول گئے کہ کتاب کا نام نیا نہیں ہے۔ اس نام سے محمد خلیل الرحمٰن مرحوم کا مجموعہ برسوں پہلے شائع ہو چکا ہے۔ مشہور شاعر ناصر زیدی نے اپنے کالم "بادشمال" ("امروز" لاہور۔ مورخہ ۱۱ر جنوری ۱۹۸۵ء) میں اس مسئلے پر تفصیل سے لکھا ہے۔ یہ کالم آپ کے ملاحظے کے لیے بھیج رہا ہوں۔ آپ بھی اس سلسلے میں کچھ لکھیے۔"

احمد رشید صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ ہمیں محمد خلیل الرحمٰن مرحوم کے مجموعے کا نام یاد نہیں تھا، ورنہ ہم ضرور بتا دیتے کہ مولانا کے کلام کے حسن کی طرح ان کی کتاب کا نام بھی مستعار ہے۔ احمد رشید صاحب نے ناصر زیدی صاحب کے کالم کا جو تراشہ بھیجا ہے، اس کا ابتدائی حصہ ہم یہاں نقل کیے دیتے ہیں، تاکہ ہمارے پڑھنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ مولانا کی شاعری کس نازک مرحلے میں داخل ہو چکی ہے:

"مختلف اخبارات میں شائع ہونے والی ایک خبر ان دنوں اسلام آباد کے ادیبوں اور شاعروں کے حلقے میں موضوع گفتگو ہے۔ وہ خبر یہ ہے کہ شاعر، ادیب، خطیب، صحافی اور سابق وفاقی وزیر مولانا کوثر نیازی کو محترمہ زیبا نے اپنے وکیل کے ذریعے دس لاکھ روپے ہرجانے کا نوٹس دیا ہے۔ نوٹس میں کہا گیا ہے کہ مولانا نے اپنے تازہ مجموعۂ کلام کا نام "لمحے" رکھا ہے، جو محترمہ زیبا کے مرحوم شوہر محمد خلیل الرحمٰن کے مجموعے کا نام ہے اور یہ مجموعۂ کلام آج سے ۲۷ برس قبل چھپا تھا۔ مولانا کوثر نیازی کو اس نوٹس کی وصول یابی کے ایک ماہ کے اندر دس لاکھ روپے ادا کرنے ہوں گے اور دس دن کے اندر اپنے مجموعۂ کلام کا نام اور ٹائٹل کا اسٹائل تبدیل کرنا ہوگا، ورنہ ان کے خلاف دعویٰ کر دیا جائے گا۔"

(۲۵ر جنوری ۱۹۸۵ء)

☆..........☆..........☆

تنقید نگار......دلاّل یا درمیان کا آدمی

"جب قرۃ العین حیدر کے ناول "آگ کا دریا" پر سب طرف سے اعتراض اور تنقید ہو رہی تھی تو غالباً اس کے بارے میں پہلا مضمون میں نے ہی لکھا تھا، جسے پڑھ کر قرۃ العین بہت ہی خوش ہوئی تھیں اور اس موقع پر انھوں نے مجھے اپنے ہاتھ سے پکوڑے تل کر کھلائے تھے۔"

یہ اقتباس شفیق الرحمٰن کے کسی مزاحیہ مضمون کا نہیں ہے، بلکہ اُردو کے مشہور نقاد مجتبیٰ حسین کے ایک انٹرویو سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس سے یہ بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ اردو میں اچھے سے اچھا تنقیدی مضمون لکھنے کا زیادہ سے زیادہ معاوضہ یہ ہو سکتا ہے کہ نقاد کو پکوڑے تل کر کھلا دیے جائیں اور پھر پکوڑے کھانے کے بعد تنقید میں خاصی گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس گہرائی کی مثال بھی مذکورہ انٹرویو سے مل جاتی ہے۔ مجتبیٰ حسین فرماتے ہیں:

"پروین شاکر اچھا لکھتی ہیں اور ذہین ہیں، مگر جب ان کی پہلی کتاب "خوشبو" شائع ہوئی تو اس کی تقریب میں کیا کالی داس اور کیا شیکسپیئر، سب کچھ آ گیا، لہٰذا جب اس سطح سے تعریف کی جائے گی تو اس کا نتیجہ ظاہر ہے اچھا نہیں ہوگا۔ بعض کپڑے چھینٹ کے ایسے ہوتے ہیں، جنھیں لانڈری پر بھیج دیا جائے تو ان کے رنگ اڑ جاتے ہیں، چنانچہ پروین شاکر کے ساتھ یہی ہوا کہ ان کا دوسرا مجموعہ لانڈری پر بھیج دیا گیا۔"

پکوڑوں سے لے کر لانڈری تک اردو تنقید نے جو مراحل طے کیے ہیں، ان کو جاننے کے لیے مجتبیٰ حسین صاحب کے انٹرویو کا مطالعہ بے حد ضروری ہے۔ یہ انٹرویو روزنامہ "حریت" میں شائع ہوا ہے۔ شیخ اوبی نے مجتبیٰ صاحب سے ملاقات کر کے اپنے سوالوں کے فکر انگیز جواب حاصل کیے ہیں۔ واضح رہے کہ ہم نے "فکر" کا لفظ "فکر و تشویش" کے معنوں میں استعمال نہیں کیا، تاہم ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کو یہ تشویش ضرور ہو سکتی ہے کہ مجتبیٰ صاحب نے نقاد ہونے کے باوجود تنقید اور نقاد دونوں کے بارے میں

اشتعال انگیز گفتگو کیوں کی ہے، مثلاً ایک موقع پر انھوں نے فرمایا:

"تنقید نگار کا کام خطرناک ہے۔ یہ دلال یا درمیان کا آدمی ہوتا ہے، جس کا کام پڑھنے والوں کی طرف سے لکھنے والوں کو اور کچھ لکھنے والوں کی جانب سے پڑھنے والوں کے لیے پیغام لے جانا ہوتا ہے، مگر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تنقید نگار دونوں کا بہی خواہ ہوتے ہوئے دونوں کا بدخواہ ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں ہی جانب پسند نہیں کیا جاتا۔"

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ لکھنے والوں کا بدخواہ ہونا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن پڑھنے والوں سے ایسی کون سی غلطی ہوئی ہے کہ نقاد ان کا بھی بدخواہ ہو جائے۔ یہ سوال ہم نے استاد لاغر مراد آبادی کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے فرمایا:

"نقاد کسی وجہ سے کسی کا بدخواہ نہیں ہوتا۔ "مقتضائے حیثیت انسانیت" والا معاملہ ہے۔ نقاد کو لکھنے والوں سے یہ شکایت ہے کہ وہ لکھنے سے پہلے اس سے مشورہ کیوں نہیں کرتے اور پڑھنے والوں سے یہ شکایت ہے کہ وہ براہ راست ادب کا مطالعہ کیوں کرتے ہیں، نقاد کے تیار کیے ہوئے خلاصے کیوں نہیں پڑھتے۔"

استاد لاغر مراد آبادی نے یہ بھی فرمایا:

"نقاد کا کام اگر صرف پیغام رسانی ہے تو پھر یہ خدمت بہتر طریقے سے بھی انجام دی جاتی ہے، یعنی نقاد ہونے سے کہیں بہتر ہے کہ آدمی ڈاک خانے میں ملازمت کرلے اور گھر گھر گھوم کر چٹھیاں تقسیم کرے۔ گھومنے پھرنے کی وجہ سے ڈاک تقسیم کرنے والے کی صحت بھی اچھی رہتی ہے، جب کہ نقاد ہمیشہ ادب کے غم میں گھل گھل کر اپنی صحت خراب کر لیتا ہے اور پھر جو کچھ لکھتا ہے، اسے پڑھ کر دوسروں کی صحت بھی خراب ہوتی ہے۔"

مجتبیٰ صاحب نے نقاد کے بارے میں ایک اور تشویش ناک بات یہ کہی ہے کہ:

"کبھی کبھی تنقید نگار پبلسٹی انچارج بھی ہو جاتا ہے، بلکہ بعض اوقات یہ مجھے گدھ اور مردار خور بھی معلوم ہوتا ہے۔"

پبلسٹی انچارج کی حد تک تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ آج کل تنقید تقریباتی اور فرمائشی نوعیت کی ہوتی ہے، مگر نقادوں کو گدھ اور مردار خور کہنا بڑی زیادتی ہے۔ اس پر ہمیں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک شاعر نے ایک ادبی محفل میں کہا:

"ہمارے نقاد کنویں کے مینڈک ہیں۔"

اس پر ایک افسانہ نگار نے اسے سمجھایا:

"آہستہ بولو! اگر یہ بات کسی مینڈک نے سن لی تو وہ تم پر ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر

کر دے گا۔"

گدھوں سے مجتبیٰ صاحب کو خاصی دلچسپی معلوم ہوتی ہے، فرماتے ہیں:

"آج کل افسانے خود کلامی کا شکار ہو گئے ہیں اور کردار مردہ ہیں، بلکہ آج کل تو ناولوں میں مردہ کردار پیش کیے جاتے ہیں، جیسے گدھ وغیرہ۔ اور ظاہر ہے کہ جب افسانوں میں کردار نہیں رہیں گے تو گدھ ہی اڑیں گے۔"

ظاہر ہے کہ مجتبیٰ صاحب کا اشارہ بانو قدسیہ کے ناول "راجہ گدھ" کی طرف ہے۔ موصوف کو شاید معلوم نہیں کہ راجہ گدھ کو تو کیا، کسی عام گدھ کو بھی مردہ نہیں کہا جا سکتا اور راجہ گدھ تو صرف زندہ نہیں، بلکہ اتنا طاقت ور بھی ہے کہ اس کے حوالے سے فحاشی کی ایسے زمانے میں حوصلہ افزائی ہوئی، جب کہ چاروں طرف نفاذ اسلام کا چرچا ہے۔

موجودہ ادبی صورت حال پر مجتبیٰ صاحب کا تبصرہ بڑا دلچسپ ہے۔ فرماتے ہیں:

"اب ہر ادیب کے پیچھے ایک کرسی ہے اور اگر اس کا سرکاری افسروں سے رابطہ نہ ہو تو وہ بڑا نہیں کہلاتا۔ اب ادیب اقتدار میں شامل ہونا چاہتا ہے اور یہ بڑی خطرناک بات ہے، کیوں کہ ادیب ہر دور میں ہمیشہ اقتدار سے برسرپیکار رہا ہے۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے، مجتبیٰ صاحب کو ادیب کا امن پسند شہری ہونا پسند نہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ادیب ہر وقت تلوار ہاتھ میں لیے اہل اقتدار سے جنگ کرتا رہے۔ ممکن ہے، جنگ سے کچھ فوائد حاصل ہوتے ہوں، مگر ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ پرامن طریقے سے اقتدار میں شامل ہونا زیادہ مفید ہے۔ ادیب اگر سرکاری افسروں سے رابطہ پیدا کرتے ہیں اور ان کی کتابوں پر تعریفی مضامین لکھ کر عزت و آبرو حاصل کرتے ہیں تو اس سے مفاہمت کی خوشگوار فضا پیدا ہوتی ہے۔ سرکاری افسر اپنی جگہ خوش کہ ان کی افسری ادبی دنیا میں بھی سرخرو ہے اور ادیب اپنی جگہ خوش کہ انھیں ادب سے کچھ حاصل نہیں ہوا تو کیا، سرکاری افسروں کی قربت تو حاصل ہوئی۔ وہ بے روزگار تو نہیں رہیں گے۔ اور کچھ نہیں تو "توتا کہانی" کے مصنف کی طرح سائنسی کتابیں چھاپنے والے کسی سرکاری ادارے کے سربراہ تو بن ہی جائیں گے۔

مجتبیٰ حسین صاحب صرف نقاد نہیں، ایک یونیورسٹی میں اردو کے استاد بھی ہیں اور اپنے طالب علموں کو ادب پڑھاتے ہیں۔ ایک استاد کی حیثیت سے انھیں جو مشکلات درپیش ہیں، ان کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں:

"طلبہ اصولوں اور پوائنٹس کی مدد سے اکنامکس، کیمسٹری اور فزکس کے مضامین تو سمجھ سکتے ہیں، مگر جب بات ادب کے طالب علم کو محبت کے معنی اور مفہوم بتانے کی آتی ہے تو بڑی دشواری ہوتی ہے کہ انھیں محبت کے بارے میں یہ کس طرح بتایا جائے کہ اس کے کیا اصول

اور پوائنٹس ہیں۔"

انٹرویو لینے والی خاتون نے جب مجتبیٰ صاحب کو کسی نہ کسی طرح قائل کر لیا کہ محبت کے بھی کچھ نہ کچھ اصول ضرور ہوتے ہوں گے تو موصوف نے مندرجہ ذیل اصول بتائے:

(۱) پہلے ایک دوسرے کو فرض کر دیکھو۔
(۲) پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراؤ۔
(۳) ڈائیلاگ بولو۔
(۴) ایک دوسرے سے کہو کہ آج سینما دیکھنے چلیں گے۔
(۵) پھر اپنے بینک کے کریڈٹ اور اکاؤنٹ دکھاؤ۔
(۶) اور پھر جدا ہو جاؤ۔

ان اصولوں پر ہم کوئی تبصرہ نہیں کریں گے۔ یہ ایک استاد اور عمل کے طالب علموں کا باہمی معاملہ ہے، ہم دخل دینے والے کون! ہاں ایک غیر متعلق بات کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں اور وہ یہ کہ پکوڑے کھانے کے بعد نقاد محبت کے موضوع پر بھی اچھی گفتگو کر سکتا ہے۔

(یکم فروری ۱۹۸۵ء)

☆.........☆.........☆

ریلوے ٹائم ٹیبل کا منظوم ایڈیشن

طاہر مسعود کی کتاب "یہ صورت گر کچھ خوابوں کے" پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا کہ اس کتاب کی قیمت تو کم ہے، لیکن ان لوگوں کو خاصی مہنگی پڑے گی، جن کے اس میں انٹرویو شامل ہیں۔ اب تک جو اطلاعات ملی ہیں، ان کے مطابق یہ کتاب خود طاہر مسعود کو خاصی مہنگی پڑ رہی ہے۔ جو ادیب بھی ان سے ملتا ہے۔ یہی کہتا ہے:

"کتاب تو اچھی ہے، مگر کچھ اور ادیبوں کے انٹرویو شامل ہوتے تو اچھا تھا۔"

جب اس کی وضاحت طلب کی جاتی ہے تو مشورہ دینے والا دو چار ادیبوں کے ناموں کے ساتھ خود اپنا نام نامی بھی پیش کر دیتا ہے۔ طاہر مسعود شرمندہ ہو کر جواب دیتے ہیں:

"ہاں یہ بڑی غلطی ہوئی کہ کتاب میں آپ کا انٹرویو شامل نہیں ہو سکا۔ ان شاء اللہ اگلے ایڈیشن میں اس غلطی کا ازالہ کیا جائے گا۔"

طاہر مسعود کے اس جواب سے کوئی مطمئن ہو یا نہ ہو، یہ ضرور ثابت ہو جاتا ہے کہ ان کی کتاب انٹرویوز کا نہیں، غلطیوں کا مجموعہ ہے۔ اب وہ زندگی بھر ان غلطیوں کا ازالہ ہی کرتے رہیں گے۔

ایک شکایت طاہر مسعود سے ہمیں بھی ہے۔ انھوں نے بعض ایسے ادیبوں کو تو اپنی کتاب میں شامل کیا ہے، جو زمانہ ساز ہیں، لیکن بعض کہنہ ساز ادیبوں کو نظر انداز کر دیا ہے۔ مثلاً حضرت لاغر مراد آبادی ایک ایسی قابل قدر ہستی ہیں کہ جنھوں نے ہر طرح کی گروہ بندی سے بلند ہو کر اور کوئی رسالہ نکالے بغیر ادب کی بے مثال خدمت کی ہے۔ ان کا انٹرویو مذکورہ کتاب میں ضرور شامل ہونا چاہیے تھا۔ طاہر مسعود اپنی تمام غلطیوں کا ازالہ تو خود کریں گے، لیکن حضرت لاغر سے متعلق غلطی کا ازالہ ہم کیے دیتے ہیں۔ ذیل میں موصوف کا انٹرویو شائع کیا جا رہا ہے۔ طاہر مسعود کو چاہیے کہ اسے اپنی کتاب کے اگلے ایڈیشن میں شامل کر لیں، بشرطیکہ اگلے ایڈیشن کی کوئی امید ہو۔ امید کی شرط ہم نے اس لیے لگائی ہے کہ ہمارے ملک میں مصنف تو ختم ہو جاتا ہے، لیکن اس کی کتاب کا پہلا ایڈیشن کبھی ختم نہیں ہوتا۔

ہم: سب سے پہلے آپ اپنے مختصر حالاتِ زندگی ارشاد فرمائیے؟

وہ: میں نے کبھی غزل بھی مختصر نہیں کہی تو حالات کس طرح مختصر بیان کر سکتا ہوں۔ بہر حال کوشش کروں گا کہ اختصار سے کام لوں۔ میں ایسے خاندان کا فرد ہوں، جو پشت ہا پشت سے شاعری کی خدمت کر رہا ہے۔ جس طرح آج کل کوئی شخص قمر جمیل سے ایک مرتبہ مل لے تو نثری نظمیں لکھنے لگتا ہے، اسی طرح ایک زمانے میں یہ مشہور تھا کہ جو شخص ہمارے آبائی مکان کے قریب سے گزر جائے تو موزوں طبع ہو جاتا ہے۔ میں نے تو ہوش سنبھالتے ہی شاعری شروع کر دی۔

ہم: گویا تعلیم حاصل کرنے سے بھی پہلے؟

وہ: سچے شعرا رسمی تعلیم نہیں حاصل کرتے۔ وہ تلمیذ الرحمٰن ہوتے ہیں۔ اس لیے تو جب میں نے شاعری شروع کی تو اس زمانے میں حضرت عبث امروہوی کی بڑی شہرت تھی۔ بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ روز مرہ گفتگو بھی بحر ہزج مثمن سالم میں کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جوش آیا تو انھوں نے ریلوے کے ٹائم ٹیبل کو منظوم کر ڈالا۔ مجھے فخر حاصل ہے کہ میری شاعرانہ تربیت انھی کے زیرِ سایہ ہوئی۔

ہم: گویا زبان و بیان پر آپ کو جو قدرت حاصل ہے، وہ حضرت عبث امروہوی کا فیضان ہے؟

وہ: جی ہاں! خدا بخشے، وہ صورت دیکھ کر بتا سکتے تھے کہ کسی شخص نے اپنی زندگی میں زبان و بیان اور تلفظ کی کتنی غلطیاں کی ہیں۔ اور میں تو صورت دیکھے بغیر ہی صحیح نتیجے پر پہنچ جاتا ہوں۔

ہم: وہ کس طرح؟

وہ: نام سن کر اندازہ کر لیتا ہوں۔

ہم: آپ کے حالات تو بہت دلچسپ ہیں۔ اب آپ موجودہ ادبی صورتِ حال کے بارے میں کچھ ارشاد فرمائیے؟

وہ: نہایت تشویش ناک صورتِ حال ہے۔

ہم: وہ کس طرح؟

وہ: ہر شخص گروہ بندی اور ذاتی تشہیر کے مرض میں مبتلا ہے۔ ادیب ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہیں، کوئی اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا، حالاں کہ ان ادیبوں کے نزدیک ادب کو مکھی پر مکھی مارنے کے عمل ہی کا نام ہے، انھیں سوچنا چاہیے کہ جب ناک پر مکھی نہیں بیٹھے گی تو اسے مارا کیسے جائے گا؟ بھلا یہ بھی کوئی افسانے کا موضوع ہے۔

ہم: آپ کا اشارہ شاید احمد ہمیش کی طرف ہے، جنھوں نے ''مکھی'' کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا ہے؟

وہ: ایک احمد ہمیش ہی کیا، سبھی ادیب مکھی پر مکھی مار رہے ہیں۔

ہم: ذاتی تشہیر کو آپ معیوب کیوں سمجھتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں تو تشہیر کے بغیر کوئی کاروبار نہیں چل

سکتا۔ ادب کو بھی تشہیر کی ضرورت ہے، تا کہ اسے زیادہ سے زیادہ پڑھا جائے؟

وہ: ادب ہے ہی کہاں، جو اسے پڑھا جائے۔ اب تو جلسے ہوتے ہیں اور اُن کی رپورٹیں اخباروں میں چھپتی ہیں۔ اب ادیب کی ساری تگ و دو کا حاصل یہ ہے کہ اخبار میں اس کا نام چھپ جائے۔ گویا صرف نام چھپوا لینا ہی ادب ہے۔ اس پر طرفہ تماشا یہ کہ ہر ادیب کالم نگار بن گیا ہے۔ اخباروں میں اتنے کاتب نہیں ہوتے، جتنے کالم نگار ہوتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اب اخبار خبروں کے لیے نہیں، لوگوں کو بے خبر بنانے کے لیے چھپتے ہیں۔

ہم: آپ نے کبھی کالم نگاری کی ہے؟

وہ: خدا نہ کرے کہ مجھ پر بھی ایسا برا وقت آئے۔

ہم: بات ذاتی تشہیر کی ہو رہی تھی۔

وہ: کالم نگاری بھی اسی شوق کا نتیجہ ہے۔ یہ شوق تو اب اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ بعض ادیب اپنے فرضی انٹرویو خود ہی لکھ کر اخباروں میں چھپوا دیتے ہیں۔

ہم: اس کی کوئی مثال؟

وہ: اب نام کیا لیا جائے۔ آپ خود ہی اپنے ایک کالم میں ایک ایسے صاحب کا ذکر کر چکے ہیں۔

ہم: یاد نہیں آ رہا کہ آپ کا اشارہ کن صاحب کی طرف ہے؟

وہ: انھیں صاحب کی طرف، جو ایک اخبار کے ادبی صفحے کے انچارج ہیں اور جن کے بارے میں آپ نے بتایا تھا کہ وہ اپنے اخبار میں چھپنے والی ہر خبر میں اپنا نام شامل کر دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے ۱۹۸۴ء میں مرنے والوں کی فہرست مرتب کر کے کاتب کے حوالے کی۔ جب اخبار چھپا تو اس فہرست میں انچارج صاحب کا نام بھی شامل تھا۔ کاتب سے جواب طلبی کی گئی تو اس نے کہا:......

......''چوں کہ انچارج صاحب ہر خبر میں اپنا نام شامل کر دیتے ہیں۔ میں سمجھا کہ وہ اس فہرست میں اپنا نام شامل کرنا بھول گئے ہیں، لہٰذا یہ نام میں نے اضافہ کر دیا۔''

ہم: اچھا یہ بتائیے، رائٹرز گلڈ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

وہ: یہ تو کالعدم سیاسی جماعتوں کے برابر بھی فعال نہیں ہے۔

ہم: یہ نہ کہیے۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی تو اس کی سالگرہ منائی گئی ہے؟

وہ: یہ سالگرہ نہیں، برسی تھی۔

ہم: اکیڈمی آف لیٹرز کے بارے میں کیا رائے ہے؟

وہ: ابھی کوئی رائے قائم نہیں کی۔

ہم: کیوں؟

وہ: اہل قلم کانفرنس کے دعوت نامے کا انتظار ہے۔

ہم: آپ تو عام ادیبوں والی بات کر رہے ہیں کہ دعوت نامہ آ گیا تو اکیڈیمی بہت اچھی ہے، ورنہ بہت بری؟

وہ: یہ بات نہیں۔

ہم: تو پھر کیا بات ہے؟

وہ: قصہ یہ ہے کہ میرے بیٹے کی شادی اسلام آباد میں طے پائی ہے۔ اہل قلم کانفرنس کے دعوت نامے جاری ہو جائیں تو شادی کی تاریخ مقرر ہوگی۔

ہم: آپ کے بیٹے کی شادی کا اہل قلم کانفرنس سے کیا تعلق؟

وہ: میرا بیٹا ایک اخبار کے ادبی صفحے کی خبریں مرتب کرتا ہے اور ادبی ڈائری لکھتا ہے۔ اس وجہ سے اُسے اور اس کے بہت سے دوستوں کو اہل قلم کانفرنس میں مدعو کیا جاتا ہے۔ ارادہ ہے کہ اہل قلم کانفرنس کے دنوں میں شادی کی جائے، تاکہ دولہا اور اس کے دوستوں کا کرایہ بچ جائے۔ یہ اکیڈیمی کے خرچ پر جائیں گے اور واپس آئیں گے۔

ہم: دلہن کے اخراجاتِ سفر کون برداشت کرے گا؟

وہ: معذور ادیبوں کے فنڈ سے اس کی گنجائش نکل آئے گی۔

ہم: اچھا اب یہ بتایئے کہ ادبی انعامات کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

وہ: جن کو انعام نہیں ملتا، وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ یہ الزام بڑی حد تک درست ہے، کیوں کہ بعض ایسی کتابوں پر انعامات مل چکے ہیں، جو جرمانے کی مستحق تھیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایک سال جو شخص جج ہوتا ہے، دوسرے سال وہی امیدوار بن جاتا ہے۔ اس وجہ سے انعامات میں "لین دین" کا لامتناہی سلسلہ قائم ہو چکا ہے۔

ہم: اس ناانصافی کے ازالے کے لیے آپ کیا تجویز پیش کرتے ہیں؟

وہ: میری رائے میں انعامات قرعہ اندازی کے ذریعے تقسیم ہونے چاہئیں۔ اس طرح کسی کو شکایت نہیں ہوگی کہ اس کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔

ہم: اچھا اب آخر میں نئی نسل کے نام کوئی پیغام؟

وہ: نئی نسل میرا کلام تو سنتی نہیں، پیغام کیا سنے گی۔

ہم: کلام کی بات اور ہے۔ پیغام سے نئی نسل کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

وہ: تو پھر یہ کہہ دیجیے نئی نسل سے کہ نثری نظم سے پرہیز کرے۔ اس سے زبان ہی نہیں، صحت پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔

(۱۸ر فروری ۱۹۸۵ء)

ڈاکٹر انور شدید

ڈاکٹر انور سدید پر ہمیں رشک آتا ہے کہ ان کے قلم کی روشنائی سے ہر رسالہ اور اخبار...... اور روانی سے ہر صنفِ ادب فیض یاب ہو رہی ہے۔ "فنون" کی بات اور ہے کہ یہ جس کاغذ پر چھپتا ہے: اس پر ڈاکٹر صاحب کے قلم کی روشنائی پھیل کر داغ دھبوں میں تبدیل ہو سکتی ہے، ورنہ پاکستان کا کوئی رسالہ یا اخبار ایسا نہیں، جس پر ڈاکٹر صاحب کا قلم ابرِ نیساں کی طرح گرجتا اور برستا نہ ہو۔ حد تو یہ ہے کہ مضافاتِ ملتان و بہاول پور سے جو رسالے نکلتے ہیں، ان میں بھی ڈاکٹر صاحب کے مضامین تسلسل و تواتر سے شائع ہوتے ہیں، جیسے ان رسالوں کو ڈیکلریشن اسی شرط پر ملے ہوں کہ یہ ڈاکٹر صاحب کے افکار کی تشہیر کریں گے۔

یہی حال اصنافِ ادب کا ہے۔ تنقید، تحقیق، غزل، نظم، انشائیہ، طنز و مزاح، افسانہ، حد تو یہ ہے کہ بائیکنگ کو ڈاکٹر صاحب نے اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ بسیار خوری اور بسیار نویسی دونوں کا نتیجہ یکساں ہوتا ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب کی بسیار نویسی ان کے پڑھنے والوں کی صحت پر اچھا اثر ڈالتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب جو کچھ لکھتے ہیں، اس کی بنیاد گہرے غور و فکر اور ٹھوس علم پر ہوتی ہے۔ آج تک ہماری نظر سے ڈاکٹر صاحب کی کوئی ایسی تحریر نہیں گزری، جس کے مطالعے سے ہماری معلومات میں اضافہ نہ ہوا ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ کبھی کبھی پریشانی میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے، کیوں کہ ڈاکٹر صاحب "دبستانِ فنون" کے خلاف اپنے اشہبِ قلم کو کچھ زیادہ ہی دوڑاتے ہیں۔ ہم دبستانِ فنون اور ڈاکٹر انور سدید دونوں ہی کے خیر خواہ ہیں، اس لیے ہماری یہ خواہش ہے کہ دونوں کے تعلقات خوشگوار ہو جائیں۔ ایک مرتبہ ہم نے صلح کرانے کی کوشش کی تھی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دونوں ہی ہم سے بدگمان ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب کی تحریروں میں "دبستانِ فنون" کی مخالفت میں جو شدت پائی جاتی ہے، اس کی بنا پر عطاء الحق قاسمی نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ انور سدید دراصل انور شدید ہے، کثرتِ استعمال سے "ش" کے نقطے اڑ گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب سے ہماری اتنی بے تکلفی نہیں ہے کہ ہم اس قسم کی بات کہہ سکیں۔ ہمارے

بس میں ہوتا تو ہم "مش" کے نقطوں کو بھی اُڑنے نہ دیتے۔

ڈاکٹر صاحب کی مستقل تصانیف بھی ایک درجن سے زیادہ ہیں۔ کثیر التصانیف مصنفین کا حال بھی کثیر الاولاد لوگوں جیسا ہوتا ہے کہ وہ تعداد میں اضافے ہی سے خوش ہوتے رہتے ہیں۔ کسی دوسری چیز سے مطلب نہیں رکھتے، لیکن ڈاکٹر انور سدید کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی۔ ان کی ہر کتاب اپنے موضوع پر نادر معلومات کا خزینہ اور وسیع مطالعے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ہمیں کتابیں لکھنے پر اتنی حیرت نہیں، جتنی اس بات پر کہ انھیں مطالعے سے اتنی دلچسپی کیوں ہے۔ آج کل کتاب لکھنے کے لیے مطالعے کی نہیں، صرف کاغذ اور قلم کی ضرورت ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی تازہ ترین کتاب "انشائیہ اردو ادب میں" اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ ہم نے اس کتاب کو شروع سے آخر تک تو نہیں، ادھر ادھر سے پڑھا ہے کیوں کہ تحقیقی کتابوں کو لفظاً لفظاً وہی لوگ پڑھتے ہیں، جو زندگی سے بیزار ہوں۔ خدا کے فضل سے ہمارے حالات ابھی اتنے خراب نہیں ہوئے کہ ہم انشائیے پر کوئی تحقیقی و تنقیدی کتاب پوری کی پوری پڑھ ڈالیں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہم سے انشائیے ہی نہیں ہضم ہوتے تو انشائیوں پر کتاب کیا ہضم ہوگی۔

بہر حال ہم نے اس کتاب کو جس قدر بھی دیکھا، مفید پایا۔ خصوصاً ان لوگوں کے لیے، جنھوں نے ساری زندگی میں ایک آدھ انشائیہ لکھا ہے اور اس کتاب میں ان کا بھی ذکر موجود ہے۔ اگر اس کتاب کی اشاعت کا پہلے سے علم ہوتا تو ہم بھی ایک آدھ انشائیہ لکھ کر شہیدوں میں شامل ہو جاتے۔

انشائیے پر یوں تو کئی کتابیں لکھی جا چکی ہیں، لیکن زیر نظر کتاب میں جس تفصیل اور جامعیت کے ساتھ موضوع کا حق ادا کیا گیا ہے، اس کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ ہم کتاب خرید کر نہیں پڑھتے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ داد کے معاملے میں بھی بخل سے کام لیں۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت عمدگی سے پہلے تو یہ بتایا کہ انشائیہ کسے کہتے ہیں۔ پھر یورپ میں انشائیے کی روایت کا سراغ لگایا ہے۔ اس کے بعد سرسید کے دور سے لے کر اب تک کے انشائیہ نگاروں کے فن سے بحث کی ہے۔

ہمیں اس کی بے حد خوشی ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے نظیر صدیقی اور مشکور حسین یاد کو نہ صرف انشائیہ نگار تسلیم کیا ہے، بلکہ ان کا ذکر اس باب میں کیا ہے، جس کا عنوان ہے "انشائیے کا دورِ زریں"۔ نظیر صدیقی کے بارے میں انھوں نے یہ رائے دی ہے:

"انشائیہ جس فکری توازن و اعتدال کا تقاضا کرتا ہے، وہ نظیر صدیقی کے ہاں ان کی قنوطیت اور کلبیت پسندی کی بنا پر پیدا نہیں ہوا۔ انھوں نے نوعِ انسان کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھا اور دنیا کو بالکل بے ثمر تسلیم کیا۔ اپنے اس مزاج کو جب وہ اپنی تحریروں میں پیش کرتے ہیں تو بالعموم سنجیدہ باتیں غیر سنجیدہ انداز میں کرنے لگ جاتے ہیں، جس سے ایک

مخصوص قسم کا منفی تاثر پیدا ہوتا ہے اور نظیر صدیقی موضوع پر محبت و التفات نچھاور کرنے اور اس سے مسرت کشید کرنے کی بجائے موضوع سے نالاں نظر آتے ہیں۔ وہ طنز کی ایسی زہرناکی پیدا کرتے ہیں، جو انشائیہ کے فطری مزاج کو مجروح کر ڈالتی ہے۔"

ڈاکٹر انور سدید نے ایک ہی سانس میں کئی الزامات عاید کیے ہیں۔ نظیر صدیقی نے انشائیے کو اتنا مجروح و مضروب نہیں کیا تھا، جتنا ڈاکٹر انور سدید نے نظیر صدیقی کی ادبی شہرت کو مجروح و مضروب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے کہ نظیر صدیقی سنجیدہ باتیں غیر سنجیدہ انداز میں کرتے ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کو معلوم ہونا چاہیے کہ نظیر صدیقی کی اصل حیثیت نقاد کی ہے اور نقاد تو اتنے محتاط ہوتے ہیں کہ غیر سنجیدہ باتیں بھی سنجیدہ انداز میں کرتے ہیں۔

مشکور حسین یاد کے بارے میں ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

"کلبیت اور قنوطیت کے جو زاویے نظیر صدیقی کی شخصیت اور فن میں موجود ہیں، وہ مشکور حسین یاد کے مزاج میں بھی نمایاں نظر آتے ہیں، چنانچہ وہ معاشرے سے نہ صرف خوف زدہ دکھائی دیتے ہیں، بلکہ اشیا اور مظاہر پر بھی محبت کی نظر نہیں ڈالتے۔ وہ موضوع کو اپنی ذات کا حصہ بنانے یا موضوع کے وسیلے سے اپنی ذات کے انوکھے گوشوں کو منظر عام پر لانے کی سعی بھی نہیں کرتے۔"

ہم نہایت ادب کے ساتھ عرض کریں گے کہ ڈاکٹر انور سدید کا یہ خیال نظر ثانی کا محتاج ہے کہ مشکور حسین یاد معاشرے سے خوف زدہ ہیں۔ صحیح صورت حال یہ ہے کہ جب سے انھوں نے انشائیہ نگاری شروع کی ہے، معاشرہ ان سے خوف زدہ ہے اور ان کی کتاب "ممکنات انشائیہ" کی اشاعت کے بعد تو خود انور سدید بھی اتنے خوف زدہ ہوئے کہ انھوں نے انشائیے پر ایک الگ کتاب لکھ ڈالی۔ مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ انور سدید کی کتاب پڑھتے ہوئے قاری کو مسکرانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہوتی، جب کہ یاد صاحب کی کتاب پڑھتے ہوئے قاری کے قہقہوں سے کتاب کی سنجیدگی متاثر ہوتی ہے۔

سطور بالا میں ہم نے ڈاکٹر انور سدید کی خاصی تعریف کی ہے اور وہ اس کے مستحق بھی ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی کتاب کے کسی حصے سے ہمیں اختلاف نہیں ہے۔ اختلافی مسائل اتنے ہیں کہ ہم ایک کالم ایسا بھی لکھ سکتے ہیں، جس کا مزاج زیر نظر کالم سے بالکل مختلف ہو سکتا ہے۔ فی الحال صرف ایک مسئلے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے انشائیے اور کالم کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"کالم کی زندگی ایک چھوٹے سے روزن میں مقید ہو کر رہ گئی ہے اور اسے وہ کھلی فضا میسر نہیں آ سکی، جس میں انشائیہ پنپتا ہے، چناں چہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کالم نگار حقیقت کو اُبھار رہا ہے، لیکن اس کے داخل سے انشائیہ نگار برآمد نہیں ہو رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ان اصحاب

میں سے بیشتر کی تحریریں دن غروب ہونے سے قبل ہی مرجھا جاتی ہیں اور کبھی کتابی صورت میں چھپ جائیں تو باسی پھولوں کی طرح ان سے خوشبو نہیں اٹھتی۔''

ہمارے خیال میں انشائیے کی صورتِ حال اس کے برعکس ہے۔ کالم کی نہیں، انشائیے کی زندگی ایک چھوٹے سے روزن میں مقید ہے، جب کہ کالم پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے۔ انشائیہ صرف کرسی، میز، پلنگ، ایش ٹرے، سگریٹ اور کولھو کے بیل وغیرہ پر لکھا جا سکتا ہے، جب کہ کالم اس سے کہیں زیادہ اہم مسائل پر لکھا جاتا ہے۔ ہمارا موجودہ کالم ہی دیکھیے۔ یہ کرسی، میز یا ایش ٹرے پر نہیں ہے، ڈاکٹر انور سدید پر ہے، جو دبستانِ فنون کے نزدیک ایک بہت بڑا مسئلہ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے کہ کالم دن غروب ہونے سے پہلے ہی مرجھا جاتے ہیں۔ ہم ان کی بات مان لیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ہماری بھی ایک چھوٹی سی بات مان لیں کہ انشائیے دن کے طلوع ہونے کا بھی انتظار نہیں کرتے، اس سے پہلے ہی پڑھنے والے پر غنودگی طاری کر دیتے ہیں۔

ہم یہ بات بھی نہیں مان سکتے کہ کالم کتابی صورت میں چھپ جائیں تو باسی پھولوں کی طرح ان سے خوشبو نہیں اٹھتی۔ ہمیں معلوم ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا اشارہ کس کی طرف ہے، بہرحال ہماری طرف نہیں کیوں کہ ہمارے کالموں کا کوئی مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا۔ انشائیوں کے بعض ایسے مجموعے بھی ہماری نظر سے گزرے ہیں، جو باسی پھول تو واقعی نہیں ہوتے، لیکن انھیں پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے باسی کڑھی میں ابال آ رہا ہو۔

سچی بات تو یہ ہے کہ انشائیہ نگار ہمارے ہاں ایک ہی ہے، اور وہ ڈاکٹر وزیر آغا ہیں۔ انھوں نے جو اونچا معیار قائم کیا ہے، اس تک کوئی دوسرا انشائیہ نگار نہیں پہنچ سکا۔ ان کی دیکھا دیکھی انشائیہ نگاری فیشن کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ یہ فیشن جنگل کی آگ کی طرح پھیل رہا ہے اور اس آگ سے بیشتر انشائیہ نگاروں نے اپنا دامن ہی جلا لیا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ یہ آگ دامن سے آگے نہ بڑھے۔

(۱۵ر فروری ۱۹۸۵ء)

☆ ☆ ☆

یا تو اخبار بند کیا جائے یا کالم

علامہ نیاز فتح پوری کے پاس ''نگار'' میں تبصرے کے لیے بے شمار کتابیں آتی تھیں۔ بعض کتابوں پر وہ مفصل تبصرے کرتے تھے، یعنی مصنف اور تصنیف دونوں کے ساتھ وہی سلوک کرتے تھے، جو قاتل مقتول سے کرتا ہے۔ بعض کتابوں پر وہ صرف چند تعارفی سطور لکھ دیتے تھے، تاکہ کسی مضمون کے آخر میں کچھ سطریں خالی رہ جائیں تو وہ ضائع نہ ہوں، لیکن بیشتر کتابوں پر ان کا تبصرہ اشتہار کی صورت میں ہوتا تھا، جس کی سرخی اس قسم کی ہوتی تھی۔ ''مندرجہ ذیل کتابیں نگار بک ایجنسی سے آدھی قیمت پر مل سکتی ہیں۔'' اس اشتہار میں جن کتابوں کے نام شامل ہوتے تھے، ان کے مصنفین پھر کبھی نیاز صاحب کو اپنی کوئی کتاب تبصرے کے لیے نہیں بھیجتے تھے۔ ایک مشہور ناول نگار نے رسوائی سے بچنے کی یہ ترکیب نکالی کہ اپنے نصف درجن ناول نیاز صاحب کو تبصرے کے لیے بھیجے تو ساتھ ہی ان کی آدھی قیمت کا منی آرڈر بھی بھیج دیا اور اس مضمون کا خط بھی لکھا:

''میں تبصرے کے لیے اپنے چھ عدد ناول بھیج رہا ہوں۔ ان کی آدھی قیمت بھی پیشِ خدمت ہے، تاکہ آپ ان ناولوں کو آدھی قیمت پر فروخت کرنے کا اشتہار شائع نہ کریں۔''

اگلے مہینے نیاز صاحب نے نگار میں جو اشتہار چھاپا، اس کی سرخی یہ تھی:

''مندرجہ ذیل کتابیں نگار بک ایجنسی سے بلا قیمت طلب کی جا سکتی ہیں۔''

اس سرخی کے نیچے مشہور ناول نگار کے نصف درجن ناولوں کے نام تھے۔

ہمارے پاس بھی کتابیں اس کثرت سے آنے لگی ہیں کہ ''کالم بک ایجنسی'' قائم کرنے کی شدید ضرورت محسوس ہو رہی ہے، مگر ہم نیاز صاحب کی طرح اتنے فیاض نہیں ہیں کہ کتابیں آدھی قیمت پر یا بلا قیمت پیش کر دیں۔ ہم تو اصل قیمت کے ساتھ کتابوں کو اپنے پاس رکھنے کا کرایہ بھی وصول کریں گے۔ کرائے والی بات ذرا وضاحت طلب ہے، اس لیے ایک واقعہ سن لیجیے:

"ایک مشہور نقاد نے اپنے تنقیدی مقالات کا مجموعہ خود ہی شایع کیا کہ اس مجموعے کو مصنف کے علاوہ کوئی اور چھاپنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ کتاب کی فروخت کا مسئلہ سامنے آیا تو انھوں نے پورا اسٹاک ایک کتب فروش کے حوالے کر دیا۔ سال بھر بعد انھوں نے کتب فروش سے کہا کہ جو کتابیں فروخت ہو گئی ہوں، ان کی قیمت ادا کر دی جائے۔ کتب فروش نے جواب دیا: افسوس کہ کتاب کا ایک نسخہ بھی فروخت نہیں ہوا، لہٰذا فی الحال گودام کا سال بھر کا کرایہ عنایت کر دیجیے۔"

۱۹۸۵ء کے صرف ۵۰ دن گزرے ہیں اور اتنی ہی کتابیں ہمیں تبصرے کے لیے مل چکی ہیں۔ اگر یہ کتابیں تحفتاً ملتیں تو ہمیں بے حد خوشی ہوتی۔ معلوم نہیں لوگ تبصرے کے لیے صرف کتابیں ہی کیوں بھیجتے ہیں۔ ایک زمانے میں حکیم محمد سعید صاحب کی پے در پے کئی کتابیں موصول ہوئیں تو ہم نے لکھا تھا کہ حکیم صاحب کو شاید معلوم نہیں کہ ہم صرف کتابوں پر نہیں، روح افزا وغیرہ پر بھی تبصرہ کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد سے ہمیں دو تین مرتبہ روح افزا کی بوتلیں مل چکی ہیں، مگر ہر مرتبہ بوتلوں کی تعداد دو سے زیادہ نہیں ہوتی۔ انتظار حسین اور عطاالحق قاسمی کو تو حکیم صاحب اپنے خرچ پر لاہور سے کراچی بلاتے ہیں اور بڑے ہوٹلوں میں ٹھیرا کر ان کی عادتیں خراب کرتے ہیں، لیکن ہمیں روح افزا کی دو بوتلوں سے بہلا دیتے ہیں۔ یہ اپنی اپنی قسمت ہے۔ بہر حال ہم اس پر شاکر ہیں۔ رہی تبصرے کی بات تو ہم نے روح افزا پر اب تک تبصرہ اس لیے نہیں کیا کہ کہیں یہ دو بوتلوں کے کرم کا سلسلہ بھی ختم نہ ہو جائے۔

ہمیں تبصرے کے لیے جو کتابیں ملتی ہیں، ان کے ساتھ یہ حکم بھی ہوتا ہے کہ ہر کتاب کو پڑھا جائے اور کالم میں اس پر تبصرہ بھی کیا جائے۔ مطالعے کے لیے ہمارے ذہن میں اور تبصرے کے لیے ہمارے کالم میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ اس حکم کی تعمیل کی جا سکے۔ اب تک ہم نے جو تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہے۔ وہی ہمارے کسی کام نہ آ سکا تو مزید مطالعے کا کیا جواز ہو سکتا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اب مطالعہ فائدے کی بجائے نقصان پہنچاتا ہے۔ اس کا اثر نظر پر ہی نہیں، عمومی صحت پر بھی پڑتا ہے۔ ابھی پچھلے دنوں ہم نے منٹو پر انیس ناگی کی کتاب پڑھی تو کئی روز تک زکام کی شکایت رہی۔ شہزاد منظر یہ کتاب ہم سے پڑھنے کے لیے لے گئے تو انھیں بخار آنے لگا۔ بخار کا یہ سلسلہ اس وقت تک ختم نہ ہوا، جب تک انھوں نے خود بھی منٹو پر ایک کتاب نہ لکھ ڈالی۔ اب شہزاد صاحب کی بخار کی حالت میں لکھی ہوئی کتاب چھپے گی تو اس کا مطالعہ کرنے والوں کو خدا جانے کس کس امتحان سے گزرنا پڑے گا۔

ہمارے کالم میں تبصروں کی گنجائش اس لیے نہیں ہے کہ یہ کالم اہم مسائل کے لیے وقف ہے۔ مثلاً اس ہفتے ہمارا ارادہ تھا کہ اس مسئلے پر کچھ لکھیں کہ قمر جمیل نے کالم نگاری سے توبہ کیوں کر لی ہے۔ ہر ہفتے ایک اخبار میں ان کا کالم باقاعدگی سے چھپتا تھا، جس کا علم قمر جمیل اور اخبار کی انتظامیہ ہی کو نہیں، ہمیں بھی

تھا۔ ہم یہ کالم بڑے شوق سے پڑھتے تھے، مگر افسوس کہ تین چار ہفتوں سے یہ سلسلہ بند ہے۔ ہم نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ اخبار کی انتظامیہ کے سامنے دو ہی راستے تھے یا تو اخبار بند کیا جائے یا کالم۔ انتظامیہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اخبار کے بند ہونے سے سو ڈیڑھ سو آدمی بیروزگار ہو جائیں گے جب کہ کالم کے بند ہونے سے اتنے ہی آدمیوں کو روزگار ملے گا۔ کیوں کہ کالم کے نہ ہونے سے اخبار کی اشاعت بڑھے گی۔ اشاعت بڑھے گی تو لازماً عملے کی تعداد بھی بڑھے گی۔ مگر افسوس کہ اس اہم مسئلے پر ہمیں اظہار خیال کا موقع نہیں مل رہا، کیوں کہ دو ایسے بزرگوں کی کتابیں ہمارے سامنے رکھی ہیں، جن کے لیے ہمارے دل میں بہت احترام ہے۔ اس احترام کی وجہ سے ان کتابوں کو چھونے کی ہمت نہیں ہوتی کہ کہیں میلی نہ ہو جائیں۔

پہلی کتاب حضرت اقبال عظیم کے کلام کا انتخاب ہے، جو سید شیدا عظیم کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ یہ کتاب ہمیں مسٹر دہلوی صاحب کے توسط سے ملی ہے۔ دہلوی صاحب کا اصرار ہے کہ ہم اس کے بارے میں ضرور کچھ لکھیں۔ ہم نے عرض کیا یہ ایک محترم بزرگ کی سنجیدہ کتاب ہے، ہمارے غیر سنجیدہ کالم میں اس کا ذکر کچھ مناسب نہ ہوگا۔ دہلوی صاحب نے فرمایا:

"آخر آپ نے ہماری کتابوں پر بھی تو کالم لکھے ہیں۔ ہم بھی تو آپ کے بزرگ ہیں اور قابل احترام ہیں۔"

ہم نے نہایت ادب کے ساتھ جواب دیا:

"ان باتوں کا علم ہمیں اس وقت ہوا، جب ہمارا کالم چھپ چکا تھا۔"

دہلوی صاحب نے ہماری سعادت مندی کو سراہتے ہوئے فرمایا:

"آپ کو اقبال عظیم صاحب کی کتاب پر ہر حالت میں لکھنا ہے، یہ میرا فیصلہ ہے۔"

دہلوی صاحب نے اپنی زندگی میں دو فیصلے بڑے عجیب کیے۔ پہلا فیصلہ وہ تھا، جس کے تحت انھوں نے شاعری شروع کی اور دوسرا فیصلہ یہ ہے کہ جس کے تحت ہم سید اقبال عظیم صاحب کی کتاب پر تبصرہ لکھ رہے ہیں۔

سید اقبال عظیم صاحب کا کلام ویسے ہی سراپا انتخاب ہے۔ معلوم نہیں شیدا عظیم صاحب کو اس انتخاب کے انتخاب کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس سے تو کہیں بہتر ہوتا کہ وہ حضرت راغب مراد آبادی کے کلام کا انتخاب شایع کرتے، تاکہ ہم جیسے طالب علموں کو معلوم ہو جاتا کہ راغب صاحب اچھے شعر بھی کہتے ہیں۔ راغب صاحب کے کلام کا انتخاب کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ لاکھوں شعروں میں سے دس بیس شعر ڈھونڈ نکالنا ویسا ہی ہے، جیسے سمندر میں غواصی کر کے اس کی تہہ سے گہر ہائے آبدار نکالے جائیں۔ شیدا صاحب نے آسان کام پر ہاتھ ڈالا اور سمندر میں غواصی کرنے کی بجائے ساحل سمندر پر بیٹھ کر اقبال عظیم صاحب کے مجموعے پڑھے اور انتخاب مرتب کر لیا۔ اس انتخاب کا ہر شعر اگرچہ بے مثال ہے، لیکن

ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ انتخاب اقبال عظیم صاحب کے مکمل کلام کے مطالعے سے قارئین کو بے نیاز کر دے، کیوں کہ ان کے بہت سے اچھے شعر اس انتخاب میں شامل نہیں ہیں۔

سید شہیدا عظیم شاعری کی حد تک تو خاصے محتاط ہیں، لیکن نثر کے معاملے میں وہ ہماری طرح خاصے بے تکلف معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے اس انتخاب کے آخر میں اقبال عظیم صاحب کی کتاب ''مشرقی بنگال میں اردو'' پر ایک تبصرہ بھی شامل کیا ہے، جو بقول ان کے بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے لکھا تھا اور رسالہ ''اردو'' کے اکتوبر ۱۹۵۴ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ یہ تبصرہ بابائے اُردو نے نہیں، ڈاکٹر عبدالقیوم (سابق صدر شعبۂ اردو، کراچی یونیورسٹی) نے لکھا تھا۔ ''اُردو'' کے مذکورہ شمارے کی فہرست میں اور تبصروں والے حصے کے آخر میں واضح طور پر ڈاکٹر عبدالقیوم کے نام کا مخفف (ع ق) درج ہے۔ یقین نہ آئے تو ڈاکٹر عبدالقیوم سے پوچھ لیجیے، جو اسی شہر کراچی میں رہتے ہیں۔

دوسری کتاب ''دستِ زر فشاں'' ہے، جس کے نام سے ہم یہ سمجھے کہ یہ ایڈمرل ایم آر آئی ارشد کی سوانح عمری ہوگی، کیوں کہ ارشد صاحب جس طرح اہلِ ادب اور ادبی اداروں کی سرپرستی کرتے ہیں، اس کی بنا پر ان کی سوانح عمری کے لیے اس سے بہتر نام نہیں سکتا، لیکن یہ کتاب سوانح عمری نہیں، عمر خیام کی ایک سو رباعیوں کے منظوم اردو تراجم کا مجموعہ ہے۔ ترجمے کی عمدگی کے لیے اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ حضرت صبا اکبر آبادی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ صبا صاحب نے رباعیوں کا ترجمہ نہیں کیا، انھیں از سرِ نو تخلیق کیا ہے۔

ہمارے ملک میں فارسی کا مذاق اس حد تک ختم ہو چکا ہے کہ نئی نسل عمر خیام کے نام سے بھی واقف نہیں ہے۔ جس روز صبا صاحب کی کتاب ہمیں ملی، نثری نظمیں لکھنے والے ایک نوجوان شاعر ہمارے پاس بیٹھے تھے۔ انھوں نے کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے ہم سے پوچھا:

''یہ عمر خیام کون ہیں، جس نے صبا صاحب کی رباعیوں کا فارسی میں ترجمہ کیا ہے؟''

ہم نے جواب دیا:

''یہ تو ہمیں بھی معلوم نہیں، البتہ ترجمے سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی زبان پر اسے خاصا عبور حاصل ہے۔''

انھوں نے تائید میں گردن ہلائی اور فرمایا:

''رباعی ایک روایتی صنفِ سخن ہے۔ اگر عمر خیام نثری نظموں کا ترجمہ کرتا تو اس کے کام کی زیادہ اہمیت ہوتی۔''

(۲۲ر فروری ۱۹۸۵ء)

☆......☆......☆

افسانہ نگاری سے شربت فروشی تک کا سفر

ایک اخباری اطلاع کے مطابق افسانہ نگار، ڈرامہ نویس اور شاعر اوپندر ناتھ اشک نے الہٰ آباد میں اپنے گھر کے ایک حصے میں لیموں کے شربت کی دکان کھول لی ہے۔ وہ اور ان کی اہلیہ کوشلیا اشک (جو خود بھی ادیبہ ہیں) دونوں دکانوں پر بیٹھتے ہیں۔ جناب اشک نے اپنی تخلیقی سرگرمیوں کا رخ بدلنے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ کاغذ کی قیمت بے تحاشا بڑھ چکی ہے اور کتابوں کی خریداری سے متعلق حکومت کی پالیسی اتنی خراب ہے کہ اب تصنیف و تالیف کا کام کرنا ممکن نہیں رہا۔

واضح رہے کہ جناب اشک اُردو اور ہندی دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں اور ایک سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف ہیں۔ ایک زمانے میں ان کے متعلق مشہور تھا کہ صبح اٹھتے ہی تین چار نظمیں لکھتے ہیں، اس کے بعد ناشتے سے فارغ ہو کر ایک افسانہ سپردِ قلم کرتے ہیں، پھر ریڈیو اسٹیشن جاتے ہیں اور وہاں دو تین ڈرامے لکھتے ہیں۔ شام کو واپس آ کر ناول کے تین چار باب سیاہ کرتے ہیں اور جب تھک جاتے ہیں تو آرام کرسی پر بیٹھ کر اگلے دن کے افسانوں اور ڈراموں کے پلاٹ سوچتے ہیں یا دوستوں سے خط و کتابت کرتے ہیں۔ اس زمانے میں راجندر سنگھ بیدی سے ۔۔۔۔ ان کی جو خط و کتابت تھی، اس کا کچھ حصہ شائع ہو چکا ہے۔ بیدی صاحب کے خطوں میں جناب اشک کی زود نویسی کا ذکر دلچسپ انداز میں ملتا ہے۔ مثلاً:

''پچھلے دنوں جب کہ تم مجھے ملے، اس وقت سے لے کر آج تک تم نے میرے اندازے کے مطابق تین نظمیں کہہ ڈالی ہوں گی، ایک افسانہ مکمل کر لیا ہوگا اور دوسرا تیسری بار لکھ رہے ہوں گے۔ ڈرامے کا پلاٹ تمھارے دماغ میں تو ہوگا۔ بس اسی بات کے منتظر ہوگے کہ کب بیٹھوں اور اسے لکھ ڈالوں۔''

....

''سنا ہے تمہارے قلم کی جولانیاں تیز ہو رہی ہیں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ، لیکن قلم کے

اس گھوڑے کو اتنا سرپٹ دوڑانا کیا معنی رکھتا ہے کہ بیچارہ منزل سے کوسوں دُور ہانپتا ہوا گرے اور دم توڑ دے۔"

راجندر سنگھ بیدی کے یہ خطوط دہلی کے رسالے "عصری آگہی" کے راجندر سنگھ بیدی نمبر میں شائع ہوئے ہیں اور ان سے اشک کی شخصیت کے دلچسپ پہلو سامنے آتے ہیں۔

جناب اشک نے ادب کو خیر باد کہہ کے، لیموں کا شربت بیچنے کا جو جواز پیش کیا ہے، اس پر بعض لوگوں نے یہ تبصرہ کیا ہے کہ اشک صاحب کی ساری کمائی تو ایک سو سے زیادہ کتابوں میں صرف ہو چکی ہے، اب وہ کیا لیموں نچوڑیں گے اور کیا شربت بنائیں گے۔ شربت کی دکان بھی ویسے ہی چلے گی، جیسے ادب کی دکان چلتی تھی...... ہمیں اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ لیموں کا شربت ادب کے مقابلے پر زیادہ مفید ہے۔ شربت پینے والوں کا ہاضمہ درست رہتا ہے، جس کے نتیجے میں صحت پر خوش گوار اثر پڑتا ہے۔ ادب کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ پڑھنے والوں ہی کا ہاضمہ خراب نہیں ہوتا، لکھنے والے بھی زندگی بھر پریشان رہتے ہیں اور بالآخر انھیں یہ کام چھوڑ کر کوئی شریفانہ پیشہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جناب اشک کی طرح لیموں کے شربت کی دکان کھولنی پڑتی ہے یا کراچی کے جناب عیش ٹونکی کی طرح گنے کے رس کی سبیل لگانی پڑتی ہے۔ عیش صاحب نے ایک زمانے میں گنے کے رس کی دکان کھولی تھی، جس کا نام انھوں نے "پیو اور جیو" رکھا تھا، ہم نے اس دکان پر لوگوں کو گنے کا رس پیتے ہوئے تو بار ہا دیکھا تھا، لیکن پینے کے بعد جینے والی بات کی تصدیق ہم نہیں کر سکتے، کیوں کہ ہم نے کسی رس پینے والوں کو دوبارہ دکان پر آتے نہیں دیکھا۔

جناب اشک نے کاغذ کی قیمت بڑھنے کا شکوہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں حضرت لاغر مراد آبادی کی رائے یہ ہے کہ جب ایک ایک آدمی سو سو کتابیں لکھے گا تو کاغذ کی قیمت ہی بڑھے گی، قدر تو بڑھنے سے رہی۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ قیمت سادہ کاغذ کی بڑھ رہی ہے، نہ کہ چھپے ہوئے کاغذ کی۔ سادہ کاغذ تو ایک بے ضرر سی چیز ہے۔ اس میں کسی کو نقصان پہنچانے کی صلاحیت اس وقت تک پیدا نہیں ہوتی، جب تک کہ اس پر کچھ لکھا یا چھاپا نہ جائے، لہٰذا ایسی بے ضرر چیز کی قیمت میں اضافہ ہونا تعجب خیز ہے۔ بہر حال یہ ہمارے عہد کا بہت بڑا المیہ ہے کہ سادہ کاغذ سونے کے مول بکتا ہے اور جب اس پر کچھ چھپ جائے تو اسے کوڑیوں کے دام بھی نہیں پوچھا جاتا۔

بعض لوگوں کو اس پر حیرت ہے کہ جناب اشک نے ادب سے منہ پھیر کر لیموں کے شربت کی دکان کیوں کھولی۔ ہمارے نزدیک اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ ہر ادیب کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ وقت کے مطابق اپنے نظریات ہی میں نہیں، پیشے میں بھی مناسب تبدیلی کرے۔ جناب اشک کے لیے جب تک ادب فائدہ مند کام تھا، انھوں نے کتابیں لکھیں۔ اب یہ ایک غیر مفید عمل ہے تو انھوں نے لیموں کے

شربت کی دکان کھول لی۔ اگر آگے چل کر کوئی زیادہ فائدہ مند کام نظر آیا تو وہ اسے اپنا لیں گے۔ مثلاً آرٹسٹ کا کام شروع کر سکتے ہیں، پرانے کوٹوں کی دکان لگا سکتے ہیں، باٹا کی ایجنسی لے سکتے ہیں، اس آخری کام کی تو مولانا حالی نے بھی تعریف کی تھی۔

ع

کمالِ کفش دوزی علم افلاطوں سے بہتر ہے

جناب اشک کے پیشہ بدلنے پر حیرت کا اظہار کرنے والوں سے گزارش ہے کہ وہ صورت حال پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ جب لیموں کا شربت بیچنے والے ادیب بن سکتے ہیں تو ادیب لیموں کا شربت کیوں نہیں بیچ سکتے۔ ممکن ہے بعض پڑھنے والے سوال کریں کہ ہمارا اشارہ کن ادیبوں کی طرف ہے اور وہ کون لوگ ہیں، جو پہلے لیموں کا شربت بیچتے تھے اور آج ادیب کی حیثیت سے معروف ہیں۔ افسوس کہ ہم اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔ اگر ہم نے نام گنوانے شروع کر دیے تو اکیڈمی آف لیٹرز کی ڈائریکٹری کا بڑا حصہ نقل کرنا پڑے گا۔ چوں کہ نقل کے لیے عقل اور فرصت دونوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے ہم کوئی ایسا کام نہیں کر سکتے جو ہماری بساط سے باہر ہو۔

اکیڈمی آف لیٹرز کا ذکر آیا ہے تو بعض لوگ اس انتظار میں ہوں گے کہ ہم حسب سابق اس ادارے کے بارے میں کوئی کلمۂ خیر کہیں۔ کلمۂ خیر کہنے میں تو ہمیں کوئی تکلف نہیں، لیکن ادھر اک عرصے سے اکیڈمی کی خیریت کی کوئی خبر نہیں آئی، یہاں تک کہ اکیڈمی جو خبر نامہ چھاپتی ہے، وہ بھی بہت دنوں سے دیکھنے میں نہیں آیا۔ پہلے تو یہ باقاعدگی سے ہمیں ملتا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اعزازی فہرست میں سے ہمارا نام کاٹ دیا گیا ہے۔ اگر اکیڈمی کے ارباب اقتدار کی نظر سے یہ سطریں گزریں تو وہ اتنا کرم ضرور کریں کہ خبر نامہ دوبارہ ہمارے نام جاری کر دیں۔ اس خبر نامے سے کم از کم یہ تو معلوم ہو جاتا ہے کہ اکیڈمی خیریت سے ہے۔ بصورت دیگر ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ ادارہ بھی لیموں کے شربت کے کارخانے میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ادیب جب انفرادی طور پر لیموں کا شربت بیچ سکتے ہیں تو پھر یہ کام اجتماعی طور پر کیوں نہیں کیا جا سکتا؟

(یکم مارچ ۱۹۸۵ء)

☆.........☆.........☆

ادبی تاریخ کا ایک اہم واقعہ

کچھ اس طرح غم عمر رواں نے خاک کیا
فراق و وصل کی سب داستان بھول گئے

....

میں سوچتا ہوں سفر کا حساب کیا دوں گا
کہ میرے پاس تو گردِرہ سفر بھی نہیں

....

کوئی آشوب جہاں ہے نہ کوئی سود و زیاں
تو نے آسان کیے سخت مراحل کیا کیا

....

کچھ دل بھی ہے میرا غم ایام سے بوجھل
کچھ شام کی دہلیز سے اٹھتا ہے دھواں بھی

اس قسم کے خوبصورت شعر کہنے والے سرگودھا کے شاعر جمیل یوسف کا مجموعۂ کلام "غزل" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے، جو ان کے سخنور ہونے کی دلیل ہے۔ انھوں نے سخن فہم ہونے کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے اور وہ اس طرح کہ اپنے دیوان کا ایک نسخہ ہمیں بھیجا ہے، ورنہ عام طور پر یہی دیکھا گیا ہے کہ شعرا حضرات اپنے دیوان نقادوں میں تو فراخ دلی سے بانٹتے ہیں، لیکن اہل ذوق کو فراموش کر دیتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ نقاد کلام کو پڑھے بغیر رائے دیتے ہیں اور اہل ذوق کلام کو پڑھ کر بھی کوئی رائے قائم نہیں کرتے۔

جمیل یوسف صاحب میں ایک اضافی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ نثر بھی اچھی لکھتے ہیں، ورنہ شعرائے کرام

نثر لکھنے میں تو کیا، بولنے میں بھی اس حد تک احتیاط سے کام لیتے ہیں کہ نثر، نثری نظم کی طرح بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ پچھلے سال سادات امروہہ کے مشاعرے میں ہندوستان سے ایک شاعر تشریف لائے تھے، جو کلام سناتے وقت دو شعروں کے درمیان نثر کے پانچ جملے بولتے تھے۔ ان شاعر صاحب سے ایک مرتبہ ہم نے عرض کیا تھا:

"یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ آپ کی شاعری نے نثر کو ڈبویا ہے یا نثر نے شاعری کو۔"

اس کے جواب میں شاعر صاحب نے برجستہ فرمایا تھا:

"یہ دونوں کام مَیں نے خود ہی انجام دیے ہیں۔"

جمیل یوسف صاحب کو اچھے شاعر ہونے کا ثبوت ان کا مجموعۂ کلام ہے اور اچھے نثر نگار ہونے کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے ہمارے نام ایک دلچسپ خط لکھا ہے۔ اگرچہ یہ خط انھوں نے اشاعت کے خیال سے نہیں لکھا، لیکن جی چاہتا ہے کہ ہمارے قارئین بھی اس سے محظوظ ہوں، ملاحظہ فرمایئے:

"...... "تکبیر" ..... کے تازہ شمارے میں آپ نے لکھا ہے کہ ہمارے ملک میں مصنف ختم ہو جاتا ہے، مگر اس کی کتاب کا پہلا ایڈیشن ختم نہیں ہوتا۔ یہاں سرگودھا میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا ہے، جو مَیں اس ضمن میں آپ کے علم میں لانا ضروری سمجھتا ہوں۔

مکرمی جناب پروفیسر غلام جیلانی اصغر کا شعری مجموعہ "مَیں اور مَیں" نومبر ۸۲ء میں شائع ہوا۔ ابھی بمشکل تین ماہ ہی گزرے ہیں کہ کتاب کا سارا ایڈیشن بک چکا ہے۔ مصنف کے پاس صرف ایک ہی کاپی بچی ہے۔ یہاں یہ ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ پروفیسر صاحب نے اپنی کتاب اعزازی طور پر کسی کو پیش نہیں کی۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور مَیں نے بھی ان سے یہ کتاب قیمتاً لی ہے۔ اب یہ حالت ہے کہ پروفیسر صاحب کے کئی شاگرد ان کے پاس آتے ہیں اور کتاب مانگتے ہیں۔ پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ کتاب کی قیمت ایک سو روپے ہے۔ شاگرد ایک سو روپے نکالتا ہے، پروفیسر صاحب یہ رقم لے کر جیب میں ڈال لیتے ہیں اور کتاب کا دیدار کراتے ہیں۔ شاگرد اس کی ورق گردانی کرتا ہے۔ ابھی وہ کتاب کو پوری طرح دیکھ بھی نہیں پاتا کہ پروفیسر صاحب اس کے ہاتھ سے کتاب لے لیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تم تو ایک جاہل شخص ہو، تمھیں شعر پڑھنا تو آتا نہیں، کتاب لے کر کیا کرو گے۔ چھوڑو اسے، یہیں رہنے دو۔ میرے پاس بھی یہی ایک کاپی رہ گئی ہے ...... یہ کہہ کر کتاب تو واپس لے لیتے ہیں، مگر سو روپے واپس نہیں کرتے۔

یہ ادبی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے کہ "مَیں اور مَیں" کی ایک ایک جلد ایک ایک ہزار روپے کی بھی بکی ہے۔ پروفیسر صاحب نے سرگودھا میں ۳۵ سال پڑھایا ہے۔ یہاں کی

سات نسلوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کیا ہے۔ ان کے متعدد شاگرد بڑے بڑے جاگیردار ہیں۔ ان کے رئیس شاگردوں نے کتاب کی قیمت ایک ہزار روپے سے کم دینا اپنی توہین سمجھا ہے۔ جو جاگیردار نہیں ہیں، ان کو یہ کتاب سو روپے کی پڑی ہے، حالاں کہ اس کی قیمت ۵۵ روپے ہے۔ پورے کی پوری ایک ہزار کتاب یہاں سرگودھا میں ختم ہو گئی ہے۔ ایک صاحب انھی ۸۰ کاپیاں لندن کے لیے لے گئے۔ اب پروفیسر صاحب کو احساس ہوا ہے کہ ان کے شاگرد دوسرے شہروں میں بھی موجود ہیں، چناں چہ اب ہر شہر کے لیے کتاب کا علیحدہ علیحدہ ایڈیشن چھپوایا جا رہا ہے۔ دوسرے شہروں کے رہنے والوں کو زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا، لیکن خیال رہے، جیسا کہ اوپر لکھا ہے، پروفیسر صاحب بے ذوق اور جاہل لوگوں کو اپنی کتاب نہیں دیتے۔"

جناب جمیل یوسف نے جس مدلل انداز سے ہمارے ایک بیان کی تردید کی ہے، اس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں، حالاں کہ کسی بھی بات کی تردید کے لیے دلیل پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہمیں یقین ہے کہ پروفیسر غلام جیلانی اصغر کے مجموعۂ کلام کے ختم ہونے کا جو واقعہ انھوں نے بیان کیا ہے، وہ بالکل درست ہے، لیکن پروفیسر صاحب کا معاملہ عام شاعروں سے مختلف ہے۔ وہ ہزاروں شاگردوں کے استاد ہیں، اور شاگرد بھی ایسے جو ۴۵ روپے کی جگہ ہزار روپے صرف کر سکتے ہیں، اس لیے اگر تین مہینوں میں پروفیسر صاحب کے دیوان کا پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، البتہ ہمیں اس بات کے ماننے میں تامل ہے کہ پروفیسر صاحب اپنے شاگردوں کو جاہل کہیں اور یہ الزام دیں کہ انھیں شعر پڑھنا نہیں آتا۔ پروفیسر صاحب کی شاگردی تو کیا، نیاز مندی اختیار کرنے کے بعد بھی آدمی جاہل نہیں رہ سکتا۔ بفرضِ محال راوی کے ثقہ ہونے کی وجہ سے یہ بات درست بھی مان لی جائے تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ پروفیسر صاحب کے دیوان کا پہلا ایڈیشن ان لوگوں میں تقسیم ہو گیا، جنھیں شعر پڑھنا نہیں آتا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ جمیل یوسف صاحب کی طرح پروفیسر صاحب ہم جیسے سخن فہموں میں اپنا دیوان تقسیم کر دیتے۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں تھا کہ قیمت وہ اپنے شاگردوں ہی سے وصول کرتے۔

ہمیں پروفیسر صاحب کی یہ ادا بھی پسند آئی ہے کہ وہ اپنے دیوان کے آخری نسخے کی "رونمائی" کے سو روپے وصول کرتے ہیں۔ اس میں شاعر اور خریدار دونوں کا فائدہ ہے۔ شاعر کا فائدہ یہ کہ کتاب اسے بغیر قیمت وصول ہو جاتی ہے اور خریدار کا فائدہ یہ کہ وہ قیمت ادا کر کے بھی شاعری سے محفوظ رہتا ہے۔

جمیل یوسف صاحب نے لکھا ہے کہ پروفیسر صاحب نے سرگودھا والوں کی سات نسلوں کو پڑھایا ہے، یقیناً یہ بات درست ہو گی۔ جمیل یوسف صاحب کا خط ملنے کے بعد سرگودھا کے راغب شکیب صاحب سے ملاقات ہوئی تو ہمارے دل میں یہ خیال آیا کہ پروفیسر صاحب اگر سرگودھا کی آٹھویں نسل کو بھی

پڑھا دیتے تو اچھا تھا۔

ہماری دعا ہے کہ پروفیسر صاحب کی کتاب کے بیسیوں ایڈیشن شائع ہوں اور ہر ایڈیشن اسی طرح فروخت ہوتا رہے، جس طرح پہلا ایڈیشن فروخت ہوا ہے۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ پروفیسر صاحب اپنے بعض نیاز مندوں کے دیوان بھی اپنے نام سے چھپوائیں، تاکہ اسی بہانے یہ دیوان فروخت ہو جائیں۔ اس سلسلے میں مشفق خواجہ صاحب کی سفارش ہم بطورِ خاص کریں گے کہ یہ پروفیسر صاحب کے نیاز مند ہیں اور ہمارے کرم فرما ہیں۔ خواجہ صاحب کا دیوان "ابیات" کے نام سے شائع ہوا تھا۔ ایک ہی مہینے میں پہلا ایڈیشن ختم ہو گیا اور ان کے پاس ہاتھی کے دانتوں کی طرح دکھانے کے لیے بھی ایک نسخہ نہ رہا۔ ہم نے خواجہ صاحب سے پوچھا کہ یہ معجزہ کیسے رونما ہوا؟ انھوں نے بتایا کہ سارا ایڈیشن جاننے والوں میں مفت تقسیم کر دیا گیا ہے۔ کچھ عرصے بعد ہمیں خواجہ صاحب کے ہاں جانے کا اتفاق ہوا تو ان کے کمرے میں "ابیات" کا انبار نظر آیا۔ ہم سمجھے دوسرا ایڈیشن شائع ہوا ہے، لیکن خواجہ صاحب نے بتایا:

"جن لوگوں کو یہ دیوان دیا گیا تھا، وہ ایک ایک کر کے واپس کر گئے ہیں۔"

(۱۵ر مارچ ۱۹۸۵ء)

☆..........☆..........☆

ہمارے کالموں کا سالانہ گوشوارہ

ہمیں "تکبیر" میں کالم لکھتے ہوئے پورا ایک سال ہو گیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ آج ہم اپنی کالم نگاری کی سالگرہ منائیں اور اس بہانے یہ عرض کریں کہ کالم نگاری کے ذریعے ہم نے کیا کھویا ہے اور کیا پایا ہے؟ نفع اور نقصان کا گوشوارہ پڑھنے والوں کی خدمت میں پیش ہے۔ نفع چوں کہ کم ہوا اور نقصان زیادہ، اس لیے پہلے نقصان کی تفصیل ملاحظہ ہو:

"تکبیر" سے پہلے ہمارا کالم "جسارت" میں ۸۱ء سے ۸۳ء تک شائع ہوتا رہا ہے، لہٰذا ہمارے نقصانات کا سلسلہ ۸۱ء سے شروع ہوتا ہے، جو اب تک جاری ہے۔ سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ہمارے بہت سے کرم فرما ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہم سے ناراض ہو گئے۔ اگرچہ بعض کرم فرماؤں کا ناراض ہو جانا ہی ان کے اور ہمارے حق میں بہتر تھا، لیکن جناب احمد ندیم قاسمی اور جناب محمد خالد اختر کی ناراضگی کا ہمیں بے حد افسوس ہے۔ قاسمی صاحب ہمارے بزرگ ہیں اور فیض صاحب کے انتقال کے بعد تو وہی ایک بزرگ رہ گئے ہیں۔ ہم نے دو چار مرتبہ "فنون" کے بعض اہل قلم کی محمد حسن عسکری دشمنی کی طرف اشارہ کیا تھا اور اس لب و لہجہ کی شکایت کی تھی، جس کی "فنون" جیسے شائستہ رسالے سے توقع نہیں کی جا سکتی، مثلاً ایک مرتبہ "فنون" میں عسکری صاحب کے بارے میں یہ لکھا گیا:

"اگر ان کی اس کتاب (جدیدیت یا مغربی گمراہیوں کا خاکہ) کا ترجمہ فرانسیسی یا کسی دوسری یورپی زبان میں کر کے مصنف کے نام کے بجے M.Asin Oscario لکھ دیے جائیں تو اہل مغرب یہ خیال کریں گے کہ یہ کتاب کسی ہسپانوی نژاد فرانسیسی اور کیتھولک مذہب کے کٹر پیرو نے اپنے مذہب کو مسلمانوں میں مقبول بنانے کی خاطر لکھی ہے۔"

ہم نے عرض کیا کہ اس قسم کی باتیں "افکار" اور "نئی قدریں" وغیرہ میں شائع ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن کسی ایسے رسالے میں نہیں چھپنی چاہییں، جو قاسمی صاحب جیسے محترم ادیب کی ادارت میں شائع

ہوتا ہو۔ ہمارا خیال تھا کہ اس نیاز مندانہ شکایت پر ہمدردانہ غور کیا جائے گا، مگر افسوس کہ قاسمی صاحب نے ہماری اس جسارت بے جا کو پسند نہیں فرمایا اور اپنے نیاز مندوں کی فہرست میں سے ہمارا نام کاٹ دیا۔ اس تحریر کے ذریعے ہم قاسمی صاحب سے درخواست کریں گے کہ وہ اپنے فیصلے پر نظرثانی کریں اور ہماری سابقہ حیثیت بحال فرما دیں۔ کالم نگاری تو ختم بھی ہو سکتی ہے، لیکن ہماری نیاز مندی کا سلسلہ ختم نہیں ہو سکتا۔

محمد خالد اختر ہمارے پسندیدہ مصنف ہیں۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ان کی ہر مطبوعہ تحریر ہماری نظر سے گزری ہے۔ شاید وہ اتنے ذوق و شوق سے لکھتے بھی نہ ہوں گے، جتنے ذوق و شوق سے ہم انھیں پڑھتے ہیں۔ جب "فنون" اور "افکار" شائع ہوتے ہیں تو ہم سب سے پہلے ان میں اختر صاحب کی نگارشات کو تلاش کرتے ہیں اور انھیں پڑھنے کے بعد ہی ان رسالوں کے دیگر مندرجات پر نظر ڈالتے ہیں۔ خالد صاحب کی ناراضگی کا سبب یہ ہے کہ طاہر مسعود نے ان کا جو انٹرویو لیا تھا، اس پر ہم نے ایک کالم لکھا تھا۔ اس میں کچھ سخن گسترانہ باتیں آ گئی تھیں، مثلاً خالد صاحب نے فرمایا تھا کہ انھیں انگریزی زبان و ادب سے زیادہ دلچسپی رہی ہے، اس لیے اُردو لکھنے میں انھیں خاصی دقت ہوتی ہے۔ اس پر ہم نے عرض کیا تھا کہ یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں، پڑھنے والوں کو بھی خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس لیے حساب برابر ہو جاتا ہے۔ یہ محض شگفتگیِ طبع کا اظہار تھا۔ اس سے خدانخواستہ یہ ثابت کرنا مقصود نہیں تھا کہ خالد صاحب کی تحریریں قابل مطالعہ نہیں ہوتیں۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم خالد صاحب کی ہر تحریر دلچسپی سے کیوں پڑھتے؟ ہماری ایک بے ضرر سی بات سے خالد صاحب ناراض ہو گئے، حالاں کہ خود انھوں نے فارغ بخاری، ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سجاد وغیرہ کے بارے میں وقتاً فوقتاً خاصی سخت باتیں لکھی ہیں اور ان ہی باتوں کو دیکھ کر ہمیں شگفتگیِ طبع کے اظہار کی جرأت ہوئی تھی، لیکن کیا خبر تھی کہ وہ ہم سے ناراض ہو جائیں گے۔ بہرحال ہم اپنے کیے پر نادم ہیں، بلکہ فارغ بخاری وغیرہ کے کیے پر بھی نادم ہیں اور غیر مشروط معافی پیش کرتے ہیں۔ امید ہے خالد صاحب ناراضگی ختم کر دیں گے اور جس طرح پہلے ہمارے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے، ویسی ہی، بلکہ اس سے بہتر رائے دوبارہ قائم کر لیں گے۔ ہم بھی وعدہ کرتے ہیں کہ آیندہ ان کے کسی انٹرویو کو موضوع بنا کر غلطی ہائے مضامین کے انبار نہیں لگائیں گے۔

ناراض ہونے والوں کی فہرست خاصی طویل ہے، مثلاً اُردو کے ایک پروفیسر ایمریطس نے شیخ محمد اکرم کی لکھی ہوئی غالب کی سوانح عمری "حکیم فرزانہ" کو طب کی کتاب بتایا۔ ہم نے اس پر احتجاج کیا تو وہ ناراض ہو گئے۔ کھاری پانی کو میٹھا بنانے کے لیے ہم نے ایک شاعر کے کلام کی شیرینی کی بنا پر ان کے دیوان کو سمندر کی نذر کرنے کا مشورہ دیا تو وہ بھی ناراض ہو گئے۔ ایک رسالے کے ایڈیٹر نے اپنے رسالے کو "لمیٹڈ ادارہ" بنانے کا اعلان کیا تو ہم نے اس فیصلے کی تعریف کرتے ہوئے لکھا کہ یہ اچھی بات ہے کہ جو رسالہ اشاعت کے اعتبار سے پہلے ہی لمیٹڈ تھا۔ اب کاروباری سطح پر بھی لمیٹڈ ہو جائے گا۔ یہ

ایڈیٹر صاحب بھی ناراض ہو گئے۔ ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری صاحب کے بارے میں ۸۳ء میں ہم نے لکھا تھا کہ وہ ہر سال ایک تصنیف کے مصنف اور ایک بچے کے والد بن جاتے ہیں۔ وہ اتنے ناراض ہوئے کہ ۱۹۸۳ء میں دو جڑواں تصانیف اور دو جڑواں بچوں کو منظر عام پر لے آئے۔ ایک شاعر نے اپنے دیوان کے اشتہار میں اپنے آپ کو "مسلّمہ طور پر دور حاضر کا سب سے بڑا نظم گو" لکھا، تو ہم نے کم علمی کی بنا پر پوچھ لیا کہ یہ دعویٰ صرف اردو کی حد تک ہے یا اس میں دنیا کی تمام زبانیں شامل ہیں۔ یہ شاعر صاحب بھی ناراض ہو گئے۔

مختصر یہ کہ ناراض ہونے والوں کا شمار ممکن نہیں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہمارے قلم سے بعض اہل قلم کی دل آزاری ہوئی، اس کے لیے ہم معذرت خواہ ہیں۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آیندہ ہم اپنے رویے میں اس حد تک تبدیلی کر لیں گے کہ اگر ہمدرد والوں نے اپنے طبیہ کالج کے نصاب میں "حکیم فرزانہ" کو شامل کر لیا تو ہم بھی طبیہ کالج میں داخلہ لے لیں گے، تاکہ غالب کی سوانح عمری کا طبی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا جا سکے۔ کسی شاعر کو مشورہ نہیں دیں گے کہ وہ اپنے کلام کی شیرینی سے سمندر کے پانی کو میٹھا کرے، بلکہ کوشش کریں گے کہ اس کا کلام دوسروں کے لیے...... کام و دہن کی آزمائش پر پورا اترے۔ کسی رسالے کی اشاعت کے لیٹ ہونے کی بات نہیں کریں گے، بلکہ اس رسالے کی اشاعت بڑھانے کی کوشش کریں گے۔ اس میں اپنی غزلیں چھپوائیں گے اور ہر وہ شمارہ، جس میں ہماری غزل شائع ہوگی، بذریعہ وی پی منگوائیں گے۔ مولانا ابو سلمان کے معاملات ان پر چھوڑ دیں گے اور ان کے حق میں صرف دعائے خیر کرنے پر اکتفا کریں گے۔ سب سے بڑے نظم گو کے دعوے کو دور حاضر تک ہی محدود نہیں رکھیں گے، بلکہ اس میں گزشتہ و آیندہ ادوار کو بھی شامل کر لیں گے۔

افراد کی طرح بعض اداروں کو بھی ہم سے شکایت ہے۔ رائٹرز گلڈ نے اپنی سالگرہ منائی تھی تو ہم نے لکھا تھا کہ یہ سالگرہ نہیں، برسی ہے۔ اس پر گلڈ والے ہم سے ناراض ہو گئے تھے۔ گلڈ والوں کی خدمت میں بھی ہم معذرت پیش کرتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ موقع ملتے ہی غلطی کی تلافی کر دی جائے گی۔ یعنی جب گلڈ کی برسی منائی جائے گی تو ہم یہ لکھیں گے کہ گلڈ نے اپنی سالگرہ منائی ہے۔

اکیڈمی آف لیٹرز کے سلسلہ میں بھی ہم سے سہو قلم کا مظاہرہ ہوتا رہا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہمیں اکیڈمی سے کوئی دشمنی ہے۔ معذور ادیبوں کے لیے اس ادارے نے جو خدمات انجام دی ہیں، اس کا اعتراف ہم ہی نہیں، جناب صہبا لکھنوی بھی کرتے ہیں، حالاں کہ ہمیں ان کی طرح اکیڈمی سے وظیفہ نہیں ملتا۔ اکیڈمی کے چیئرمین جناب شفیق الرحمن ہیں، جن کا احترام ہر وہ شخص کرتا ہے، جسے اردو ادب سے دلچسپی ہے۔ اکیڈمی کا چیئرمین ہونا ان کے لیے نہیں، خود اکیڈمی کے لیے باعثِ عزت ہے، اس لیے اگر ہم اکیڈمی کے بارے میں کبھی کچھ لکھتے ہیں تو اس میں کسی بدنیتی کو دخل نہیں ہوتا۔ ہماری دلی

خواہش ہے کہ یہ ادارہ اس حد تک ادیبوں میں مقبول ہو جائے کہ رائٹرز گلڈ کی ضرورت باقی نہ رہے۔ گلڈ اگر اکیڈمی میں ضم ہو جائے تو ہمیں اس سے خوشی ہوگی، کیوں کہ ان دونوں اداروں کے الگ الگ قائم رہنے میں ذم کا پہلو پایا جاتا ہے۔

یہ تو تھا نقصانات کا گوشوارہ، جو کالم نگاری کی وجہ سے ہمیں اٹھانے پڑے۔ اب آیئے فوائد کی طرف..... فوائد اگرچہ کم ہیں، لیکن اتنے بھی کم نہیں کہ نظر انداز کر دیے جائیں۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہماری بار بار کی گزارشات کے نتیجہ میں نظیر صدیقی نے ایک مقبول شاعرہ پر مستقل کتاب لکھنے کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنے ۵۰ صفحے والے مضمون پر ہی قناعت کر لی۔

دوسرا فائدہ محسن بھوپالی کو پہنچا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ہمارا کالم چوں کہ ہندوستان کے دو ایک جریدوں میں بھی نقل کیا جاتا ہے، لہٰذا وہاں بھی پڑھا جاتا ہے۔ ہندوستان والوں نے اس میں محسن بھوپالی کا ذکر پڑھ کر انھیں حیدرآباد دکن کی مزاح کانفرنس میں مدعو کیا تھا۔ محسن صاحب نے اس دعوت نامے کے جواب میں وضاحت کی کہ وہ سنجیدہ شاعر ہیں تو ان کے بیان پر اعتبار کرتے ہوئے انھیں دہلی کے ایک مشاعرے میں مدعو کر لیا گیا۔ محسن صاحب آج کل دہلی میں ہیں اور مشاعرے لوٹ رہے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ وہ خیریت سے واپس آئیں اور کسی اخبار میں اپنا سفرنامۂ ہندوستان بالاقساط چھپوائیں۔ بالاقساط اس لیے کہ اخباری کاغذ میں زیادہ بوجھ اٹھانے کی سکت نہیں ہوتی۔

یہ وہ فائدے تھے جو ہمارے کالم کی وجہ سے دوسروں کو حاصل ہوئے۔ رہے ہم، تو ہمارے لیے یہی فائدہ بہت ہے کہ یہ کالم وہ لوگ بھی پڑھتے ہیں، جو ہم سے خوش نہیں ہیں۔

(۲۲/مارچ ۱۹۸۵ء)

☆......☆......☆

کالم نہ لکھنا صحت مندی کی دلیل ہے

پچھلے ہفتے ہم کالم نہیں لکھ سکے تو ادارہ 'تکبیر' نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ہماری ناسازیٔ طبع کو غیر حاضری کا سبب بتایا اور قارئین کرام سے صحت یابی کی دعا کے لیے درخواست کی۔ درخواست کا انداز کچھ ایسا مخلصانہ، بلکہ والہانہ تھا کہ ہمارے بعض کرم فرماؤں نے تو مغفرت کی دعا کی تیاریاں بھی کرلیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہماری سخت جانی آڑے آئی۔ حضرت لاغر مرادآبادی کا ردعمل ذرا مختلف تھا۔ وہ عیادت کے لیے خوشی خوشی تشریف لائے تو ہمیں ٹھیک ٹھاک دیکھ کر افسردہ سے ہوگئے۔ فرمایا:

"ادارۂ تکبیر نے آپ کے کالم کے نہ چھپنے پر افسوس کا اظہار کیا ہے، حالاں کہ افسوس چھپنے پر کرنا چاہیے کہ آپ کا ہر کالم آپ کی ناسازیٔ طبع کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اگر کسی ہفتے آپ کالم نہ لکھیں تو اسے آپ کی صحت مندی کی دلیل سمجھنا چاہیے۔"

حضرت لاغر مرادآبادی ہمارے بزرگ ہیں، اس لیے ہم ان کی کسی بات کا، یہاں تک کہ ان کی شاعری کا بھی برا نہیں مانتے۔ ان سے جو چھیڑ چھاڑ رہتی ہے، اس کا انھوں نے اچھا اثر نہیں لیا۔ یہاں تک کہ ہماری بیماری کو بھی انھوں نے مذاق سمجھا۔ بہر حال یہ حقیقت ہے کہ پچھلے ہفتے ہم بیمار تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ بیماری بھی فائدے سے خالی نہیں تھی۔ سب سے بڑا فائدہ تو یہ ہوا کہ لکھنے کی بجائے پڑھنے کا موقع ملا۔ اپنے کالم کی جگہ ڈاکٹر انور سدید کا مضمون پڑھا، جس سے دل و دماغ معطر ہوئے، لیکن اتنے شگفتہ مضمون کے ساتھ ان کی جو تصویر چھاپی گئی، وہ بڑی سنجیدہ تھی۔ تصویر کے تیور ایسے ہیں، جیسے ڈاکٹر صاحب دبستان فنون پر حملہ کرنے جارہے ہوں، حالاں کہ مضمون میں 'دبستان فنون' کا تو کیا، ڈاکٹر سلیم اختر کا بھی ذکر نہیں ہے۔ بہر حال یہ خوشی کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے قلم سے کم از کم ایک مضمون تو ایسا نکلا، جو 'دبستان فنون' اور ڈاکٹر سلیم اختر کی ملاوٹ سے پاک ہے۔

بیماری کے دوران دوسری دلچسپ تحریر جو ہماری نظر سے گزری، وہ مشہور ادیب اوپندر ناتھ اشک

کے بارے میں ایک باتصویر فیچر ہے، جو ہندوستانی رسالے "دی ویک" میں چھپا ہے۔ پچھلے دنوں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ اشک صاحب نے لیموں کے شربت کی دکان کھولی ہے۔ مگر اس فیچر سے معلوم ہوا کہ دکان پرچون کی ہے، نہ کہ شربت کی۔ پرچون کی دکان کس طرح لیموں کے شربت کی دکان بن گئی، اس کی تفصیل مذکورہ فیچر میں اس طرح بیان کی گئی ہے کہ اشک صاحب کے بارے میں سب سے پہلے الہ آباد کے ایک ہندی اخبار میں یہ خبر چھپی کہ انھوں نے پرچون کی دکان کھولی ہے۔ ایک خبر رساں ایجنسی نے پرچون کو "چونا" سمجھ کر اس کا ترجمہ Lime کیا۔ ہندی اخباروں میں اس ترجمے کا ترجمہ "لیموں" کیا گیا۔ اس طرح پرچون سے چونا بنا، چونے سے لیموں اور لیموں سے شربت، گویا "نکس کو باغ میں جانے نہ دینا" والا معاملہ ہوا۔ "دی ویک" نے اپنے اس بیان کے ثبوت میں کچھ تصویریں بھی شائع کی ہیں۔ ایک تصویر میں اشک صاحب ترازو کے ساتھ اور دوسری میں توازن کے ساتھ کھڑے ہیں۔ ترازو والی تصویر میں وہ تنہا ہیں اور توازن والی تصویر میں ان کی بیگم کوشلیا اشک بھی موجود ہیں۔ دکان پر میاں بیوی دونوں بیٹھتے ہیں، تاکہ گاہک نہ آئیں تو آپس ہی میں بات چیت کرکے وقت گزارا جائے۔

"دی ویک" کے فیچر رائٹر نے لکھا ہے کہ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ اشک جیسے سینئر ادیب کو پرچون کی دکان نہیں کھولنی چاہیے تھی، یہ کام ان کے شایان شان نہیں ہے۔ ہمیں اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ اشک صاحب پہلے ادیب نہیں ہیں، جنھوں نے پرچون کی دکان کھولی ہو۔ کم از کم پاکستان کی حد تک تو ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ یہاں کئی ادیبوں نے پرچون کی دکانیں کھول رکھی ہیں۔ مثلاً جس دکان سے ہم اپنی ضرورت کا سامان خریدتے ہیں، اس کے مالک ایک مشہور ادیب ہیں۔ اس دکان میں ادبی ضرورت کی ہر چیز ملتی ہے۔ ناول، ناولٹ، افسانہ، نظم، غزل، رباعی، انشائیہ، تنقیدی مضمون، تحقیقی مقالے، ثلاثی، ہائیکو غرض سب کچھ مل جاتا ہے۔ اخباری قطعات اور کالم بھی ارزاں نرخوں پر دستیاب ہوتے ہیں، یہاں تک کہ محسن بھوپالی جیسے شاعر بھی یہیں سے خریدتے ہیں۔ ہم نے خود کئی مرتبہ اس دکان سے کالم خریدے ہیں اور اپنے نام سے چھپوائے ہیں۔ ایک مرتبہ صاحب دکان نے کالم کی جگہ ہمیں ایک تنقیدی مضمون دے دیا۔ یہ دراصل مولانا کوثر نیازی کے دیوان کا دیباچہ تھا، جو ایک نقاد کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔ یہ دیباچہ "تکبیر" میں شائع ہوا اور ادبی و سیاسی حلقوں میں بے حد پسند کیا گیا، جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس کی اشاعت کے کچھ ہی دنوں بعد مولانا صاحب کو بحیثیت کارکن منتخب کرلیا گیا۔

"دی ویک" کے فیچر کے مطابق اشک صاحب نے پرچون کی دکان حکومت کی اس پالیسی کے خلاف بطور احتجاج کھولی ہے، جس کے تحت ادیبوں پر عرصۂ حیات تنگ کردیا گیا ہے۔ ادیب اگر اپنی کتاب خود چھاپتے ہیں تو خریدار نہیں ملتا ہے، پبلشر سے چھپواتے ہیں تو معاوضہ نہیں ملتا۔

ہندی کے ایک بڑے ادیب نے اشک صاحب کے اقدام پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے:

"جو مسائل اشک صاحب کے ہیں، وہی دوسرے ادیبوں کو بھی درپیش ہیں، لیکن کسی ادیب نے پرچون کی دکان نہیں کھولی۔ اشک صاحب نے شہرت کمانے کے لیے اور عام لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے دکان کا شوشا چھوڑا ہے۔"

اشک صاحب کی طرح ہمارا بھی یہی خیال ہے کہ ادیبوں پر بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ یہ بیچارے خود ہی کتابیں لکھتے ہیں، خود ہی چھاپتے ہیں اور انتہا یہ ہے کہ خود ہی پڑھتے ہیں۔ وہ اپنی کتابیں کتب فروشوں کی دکانوں پر لے جاتے ہیں تو دکان دار کتابیں رکھنے کا معاوضہ طلب کرتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست ہر سال اپنے دیوان کی قیمت میں پانچ روپے کا اضافہ کر دیتے ہیں۔ ہم نے ان سے کہا:

"حضرت! آپ کا دیوان بکتا تو ہے نہیں، پھر آپ اس کی قیمت میں اضافہ کیوں کرتے رہتے ہیں؟"

انھوں نے فرمایا:

"گودام کا کرایا بھی تو دینا پڑتا ہے۔"

ہم نے عرض کیا:

"جب کوئی کتاب کی اصل قیمت نہیں دیتا تو گودام کا کرایہ کیا دے گا۔"

انھوں نے اطمینان سے جواب دیا:

"اصل قیمت تو کب کی سوخت ہو چکی، اب تو صرف گودام کا کرایہ ہی رہ گیا ہے۔"

ہمیں مذکورہ ہندی ادیب کی اس رائے سے سخت اختلاف ہے کہ اشک صاحب نے شہرت کمانے کے لیے دکان کھولی ہے۔ اشک صاحب پہلے ہی خاصے مشہور ہیں، یہی شہرت ان کے کسی کام نہیں آئی تو مزید شہرت کو وہ کیا کریں گے۔ اگر شہرت کمانا ہی اشک صاحب کا مسئلہ ہوتا تو اس کے بہت سے بہتر طریقے بھی تھے۔ مثلاً وہ بعض ہندوستانی ادیبوں کی طرح انجمن سادات امروہہ کی دعوت پر پاکستان آسکتے تھے اور واپس جا کر سفرنامہ لکھ سکتے تھے۔ قمر جمیل کی طرح نثری نظمیں لکھ سکتے تھے، بلکہ نثری نظم کی پوری تحریک چلا سکتے تھے۔ ڈاکٹر انور سجاد کی طرح ڈراموں میں کام کر سکتے تھے۔ پروین شاکر کی طرح مشاعرے پڑھنے کے لیے کینیڈا جا سکتے تھے۔ افتخار عارف کی طرح ساقی فاروقی سے یا ساقی فاروقی کی طرح افتخار عارف سے جھگڑا کر سکتے تھے۔ مگر اشک صاحب نے اس قسم کا کوئی کام نہیں کیا۔

اس قسم کے کاموں میں ہمارے حیدرآباد سندھ والے استادِ گرامی سب سے آگے ہیں۔ وہ ہر پانچ سال اخباروں میں اپنے انتقال کی خبریں خود ہی چھپواتے ہیں۔ مختلف ادبی انجمنوں سے تعزیتی قرار دادیں منظور کراتے ہیں اور پھر ایک دن اپنا تردیدی بیان چھپوا دیتے ہیں کہ میں خدا کے فضل سے زندہ ہوں، کسی غلط فہمی کی بنا پر میرے انتقال کی اطلاع اخباروں میں چھپی ہے، جس کی میں سختی سے تردید کرتا ہوں۔

چار پانچ سال ہوئے اس قسم کی خبر مشہور ہوئی تو استاد کے ایک عقیدت مند نے ان کے پس ماندگان کے لیے چندہ جمع کرنا شروع کر دیا۔ اس کی اطلاع استاد کو ملی تو وہ عقیدت مند کے پاس پہنچے اور جمع شدہ رقم طلب کی۔ عقیدت مند نے کہا:

"یہ رقم تو آپ کے پس ماندگان کے لیے ہے۔"

استاد نے فی البدیہہ فرمایا:

"رقم نکالو۔ مجھ سے زیادہ میرا پس ماندہ کون ہوگا؟"

(۵ را پریل ۱۹۸۵ء)

☆..........☆..........☆

بانکے بہاری

کسی نے یہ بات خوب کہی تھی کہ لاہور میں کوئی بڑا شاعر اور نثر نگار خود تو پیدا ہونے کی جسارت نہیں کرتا، لیکن لاہور والے بڑے ادیبوں کو ادھر اُدھر سے گھیر کر لے آتے ہیں اور انھیں دبستانِ لاہور میں شامل کر لیتے ہیں۔ علامہ اقبال اور فیض احمد فیض سیالکوٹ کے تھے، مولانا ظفر علی خاں وزیر آباد کے، مولانا عبدالمجید سالک بٹالے کے، حفیظ جالندھری اور مولانا غلام رسول مہر جالندھر کے، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور سعادت حسن منٹو امرتسر کے اور اختر شیرانی ٹونک کے تھے۔ خدا سلامت رکھے، انتظار حسین ڈبائی کے ہیں اور جناب احمد ندیم قاسمی انگہ (شاہ پور) کے، لیکن یہ سب لاہور کے حوالے سے پہچانے جاتے ہیں اور لاہور ان کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے۔ معلوم نہیں، ان ادیبوں کو لاہور میں کیا بات نظر آئی کہ وہیں کے ہو کے رہ گئے۔

اب لاہور والوں کی نظر کراچی پر ہے۔ وہ یہاں کے کئی اہم ادیبوں کو طرح طرح کے سبز باغ دکھا چکے ہیں۔ حضرت لاغر مراد آبادی کا بیان ہے، گزشتہ سال ایک صاحب، فرض کر لیجیے عطاء الحق قاسمی، کراچی آئے تو انھوں نے حضرت لاغر سے کہا: اگر ادب میں حیاتِ دوام حاصل کرنی ہے تو لاہور تشریف لائیے۔ یہاں آپ "کورنگی" کی مضافاتی بستی میں شاگردوں کے نرغے میں زندگی بسر کر رہے ہیں، صحیح قدردان آپ کو لاہور کی کھلی فضا میں ملیں گے۔ حضرت لاغر نے اس اجمال کی تفصیل پوچھی تو قاسمی صاحب نے فرمایا:

"سب سے پہلے تو آپ کو دبستانِ فنون کا رکن بنایا جائے گا اور یوں اخباروں اور رسالوں میں آپ کے کلام کی اشاعت کا دروازہ کھل جائے گا۔ آپ کی غزلیں اس طرح چھپیں گی، جس طرح اخباروں میں ٹینڈر نوٹس چھپتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی مختصر ترین تاریخِ ادب میں آپ کا نام نامی مع نمونۂ کلام شامل کیا جائے گا۔ اخباروں میں آپ کے پینل انٹرویو

چھپیں گے۔ ڈاکٹر سلیم اختر، سجاد باقر رضوی، تحسین فراقی، حسن رضوی، سعادت سعید، امجد اسلام امجد اور آپ کا یہ نیاز مند، انٹرویو لینے والوں میں شامل ہوں گے۔ آپ سے وعدہ ہے کہ انٹرویو میں کوئی ایسا سوال نہیں کیا جائے گا، جس سے آپ کی یا ادب کی پوزیشن خراب ہو۔ آپ کے ساتھ شامیں منائی جائیں گی۔ اگر آپ کے مالی حالات نے اجازت دی اور آپ نے مجموعۂ کلام چھپوا لیا تو اس کی تقریبِ رونمائی ہوگی، جس کی رپورٹ ٹی وی پر بھی دکھائی جائے گی، کیوں کہ ضیا جالندھری کی رخصتی کے بعد ٹی وی والے شاعروں سے ویسا ہی سلوک کرنے لگے ہیں، جیسا وہ گویوں سے کرتے ہیں۔"

حضرت لاغر نے ان سب ترغیبات و تحریصات پر نہایت توجہ سے غور کیا اور کہا:

"یہاں کراچی میں میرا ذریعۂ معاش یہ ہے کہ میں شاگردوں کے کلام پر اصلاح دیتا ہوں، وہ میری خدمت کرتے ہیں۔ لاہور میں میں کیا کیا کروں گا۔"

قاسمی صاحب نے جواب دیا:

"لاہور میں آپ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی، اپنے کلام پر آپ سے کوئی اصلاح نہیں لے گا، ضرورت ہوگی تو ہم نیاز مند مل جل کر آپ کے کلام پر اصلاح دے لیا کریں گے۔"

یہ سن کر حضرت لاغر خاموش ہو گئے، ورنہ وہ ذہنی طور پر لاہور کے لیے سامانِ سفر باندھ چکے تھے۔

حضرت لاغر تو ذرا سی بات پر محتاط ہو گئے، لیکن سبھی لوگ ان کی طرح عاقبت نااندیش نہیں ہوتے۔ اپنا برا بھلا اچھی طرح پہچانتے ہیں۔ نامور شاعرہ پروین شاکر ہی کو لیجیے۔ رہتی کراچی میں ہیں، لیکن لاہور کے حوالے سے پہچانی جاتی ہیں۔ لاہور کے رسالوں میں وہ چھپتی ہیں اور لاہور کے ناشر ہی ان کی کتابیں چھاپتے ہیں۔ لاہور کے اخباروں میں ان کے انٹرویو چھپتے ہیں اور وہیں ان کی کتابوں کی رونمائیاں ہوتی ہیں۔ پچھلے دنوں ان کے تیسرے مجموعۂ کلام کی رونمائی جس تزک و احتشام سے ہوئی، اس کی تفصیلات اخباروں میں پڑھ کر ہمیں یہ خیال آیا کہ کاش یہ تقریب کراچی میں ہوتی، تاکہ ہمارا شہر ایک قومی اعزاز سے محروم نہ رہتا۔ خدا بھلا کرے، منظر علی خاں منظر کا کہ انھوں نے اس نقصان کی تلافی بہت عمدگی سے کر دی۔ پچھلے ہفتے ان کی کتاب "مکرر کہے بغیر" کی رونمائی اتنے شاندار پیمانے پر ہوئی کہ ہم پروین شاکر کی تقریب کو بھول گئے۔ حاضرین کی تعداد، تصویروں کے معیار اور کھانے پینے کی اشیا کی فراوانی کے اعتبار سے یہ تقریب کم از کم اُن لوگوں کو ہمیشہ یاد رہے گی، جو ایسی تقریبوں میں ادبی مسرت کی بجائے لذتِ کام و دہن کے حصول کے لیے جاتے ہیں۔

ایک مرتبہ ہم نے لکھا تھا کہ منظر علی خان منظر نے پچھلے چار برسوں میں جس تیزی سے شہرت حاصل کی ہے، اتنی تیزی سے تو کوئی رسوائی بھی حاصل نہیں کرتا۔ ابھی کل کی بات ہے کہ منظر صاحب کی پہلی

کتاب ''کربِ آگہی'' شائع ہوئی تھی۔ یہ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا عکس تھی۔ اس کے بعد وہ شاعری سے (خود شاعری کے بقول ان کے دعویٰ ساز کار میں) تائب ہوگئے اور نثر کی طرف توجہ کی۔ ان کا پہلا نثری مجموعہ ''بدلتے چہرے'' تھا۔ ابھی ان چہروں کی بازکتاب کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ دوسرا مجموعہ ''مکرر کہے بغیر'' شائع ہوگیا۔ گویا چار برسوں میں تین مجموعے۔ اس معاملے میں وہ پروین شاکر اور میر تقی میر دونوں سے آگے نکل گئے۔ پروین شاکر نے تین کتابیں دس سال کے عرصے میں شائع کیں اور میر تقی میر نے اپنا تیسرا دیوان ساٹھ برس کی عمر میں مرتب کیا۔ منظر علی خان منظر جب ساٹھ برس کی عمر کے ہوں گے تو اس وقت تک ان کی تصانیف کی تعداد پروین شاکر اور میر تقی میر دونوں کی تصانیف کی مجموعی تعداد سے کئی گنا زیادہ ہوگی۔ وہ دن گئے، جب لوگ ایک آدھ کتاب لکھ کر بقائے دوام کے دربار میں کرسی حاصل کر لیتے تھے۔ اب درجنوں کتابیں لکھنے کے بعد بقائے دوام کے دربار میں تو کیا اہلِ قلم کی قطاروں میں کھڑے ہونے کی جگہ بمشکل ملتی ہے۔

جناب منظر کی تقریب کی صدارت ڈاکٹر جمیل جالبی نے کی۔ اظہارِ خیال کرنے والوں میں حضرت انیس امروہوی اور محترمہ زاہدہ حنا شامل تھیں۔ مہمانِ خصوصی پاکستان اسٹیل مل کے چیئرمین جناب حق نواز اختر تھے۔ گویا منظر صاحب نے علم، شاعری اور افسانے کے ساتھ ساتھ فولاد سے بھی محفل کی رونق بڑھائی تھی۔ پہلے تو ہم یہی سمجھے کہ ادب سے فولاد کا وہی تعلق ہوگا، جو خود منظر صاحب کا ہے، لیکن جب حق نواز اختر صاحب کی فی البدیہہ تقریر سنی تو جی خوش ہوگیا۔ انھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے ادبی مسائل پر اس طرح گفتگو کی، جیسے وہ اسٹیل مل کے نہیں، اکیڈمی آف لیٹرز کے چیئرمین ہوں۔ جب سے ممتاز حسن کا انتقال ہوا ہے، کراچی کی ادبی تقاریب کی صدارت کے لیے کوئی ڈھنگ کا آدمی نہیں ملتا تھا۔ ایک ہم ہیں، سو ہمیں کوئی بلاتا نہیں۔ ہمیں منظر صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ ان کے ذریعے جناب حق نواز اختر کسی ادبی محفل میں نظر آئے۔ گویا منظر صاحب کی کتاب کے ساتھ ساتھ یہ اختر صاحب کی بھی تقریب رونمائی تھی۔

تقریب کی مناسبت سے منظر صاحب نے ایک خوبصورت مجلّہ بھی شائع کیا ہے، جس میں اشتہارات اور پیغامات شامل ہیں۔ منظر صاحب کی وسیع القلبی قابلِ داد ہے کہ انھوں نے ہر طرح کے اشتہاروں اور پیغاموں کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض اشتہاروں پر پیغاموں کا اور بعض پیغاموں پر اشتہاروں کا گمان گزرتا ہے۔ اگر ہماری طرح منظر صاحب بھی غلط فہمی کا شکار ہوگئے تو اس کا امکان ہے کہ وہ بعض پیغام دینے والوں کو اشتہار کا بل بھیج دیں۔ اگر ایسا ہوا تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ کم از کم راغب مرادآبادی، محسن بھوپالی اور شہزاد منظر تو اسی سلوک کے لائق ہیں۔ اول الذکر دونوں نے یہ غضب کیا ہے کہ مشتاق احمد یوسفی اور منظر علی خان کا موازنہ کر ڈالا ہے، حالاں کہ یوسفی صاحب قطعاً اس

اعزاز کے مستحق نہیں تھے۔ اگر یوسفی صاحب کو یہ معلوم ہوتا کہ ایک دن ان کا موازنہ ہمارے ممدوح سے ہوگا تو وہ لکھنے لکھانے کا شغل اختیار نہ کرتے، کوئی مفید اور آبرومندانہ کام کرتے۔

شہزاد منظر صاحب نے کہا:

''منظر علی خان کو لکھنے لکھانے کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔ مجھے یقین ہے، وہ اس میدان میں آگے چل کر نام پیدا کریں گے۔''

شہزاد منظر کو شاید علم نہیں ہے کہ منظر علی خان کے لیے لکھنا لکھانا کمبل کا درجہ رکھتا ہے۔ وہ چاہیں بھی تو اس شغل سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے، اس لیے یہ مشورہ غیر ضروری ہے کہ وہ لکھنے لکھانے کا سلسلہ جاری رکھیں۔ رہی نام پیدا کرنے کی توقع تو یہ بعید از وقت ہے۔ منظر صاحب خدا کے فضل سے اتنا نام پیدا کر چکے ہیں کہ ان کے کام سے کوئی واقف ہو نہ ہو، نام سے ہر شخص واقف ہے۔ اگرچہ منظر صاحب کو معلوم ہے کہ نام میں کچھ نہیں رکھا، لیکن ان کے پاس اور رکھا ہی کیا ہے، بلکہ اب تو موصوف اس مقام پر ہیں، جہاں وہ دوسروں کے لیے بھی شہرت و ناموری کا سبب بنتے ہیں۔ ان کے مجلّے ہی کو دیکھ لیجیے۔ اس میں بہت سے ایسے لوگوں کے پیغام بھی شامل ہیں، جن کے نام پہلی اور آخری بار اس مجلّے میں نظر آئے ہیں۔ وہ دن گئے، جب منظر صاحب فرمائش کر کے دوسروں سے اپنے بارے میں لکھوایا کرتے تھے۔ اب لوگ خود ہی ستائشی تحریریں لکھ کر منظر صاحب کی خدمت میں پیش کر دیتے ہیں، تاکہ اسی بہانے ادبی تاریخ میں ان کا نام باقی رہ جائے۔

اس مجلّے میں چند خواتین نے بھی منظر صاحب کے لیے تعریفی و توصیفی کلمات لکھے ہیں۔ سلطانہ مہر نے انھیں ''ماہِ رُخ'' کا نام دیا ہے۔ مہر ''اگر کسی کو ''ماہ'' کہہ دے تو یہ اس کی ذرہ نوازی ہے، لیکن یہاں ذرہ نوازی کا نہیں، منظر نوازی کا کمال ہے۔ زاہدہ حنا نے انھیں ''بانکے بہاری'' کا خطاب دیا ہے۔ شاید منظر صاحب کا گھریلو نام بھی یہی ہو۔ وضاحت نسیم نے لکھا ہے:

''میں نے ان کی کتاب ''مکرر کہے بغیر'' تین مرتبہ دل لگا کر الف سے یے تک پڑھی ہے۔''

ماہِ رُخ عرف بانکے بہاری مبارک باد کے مستحق ہیں کہ ان کی تصنیفِ لطیف کو دل لگا کر تین مرتبہ الف سے یے پڑھا گیا اور اس سے زیادہ مبارک باد کی مستحق وضاحت نسیم ہیں کہ انھیں خدا نے صبر بھی دیا ہے، فرصت بھی اور ہمت بھی۔ ورنہ بعض لوگ تو اتنے کم ہمت ہوتے ہیں کہ کسی کتاب کو ایک مرتبہ بھی پڑھ لیں تو پھر زندگی بھر کوئی اور کام کرنے لائق نہیں رہتے۔

(۱۹ اپریل ۱۹۸۵ء)

☆..........☆..........☆

شعرائے کرام شعر کہنا ترک کر دیں

جب سے اخبارات کے ادبی صفحوں اور ڈائجسٹوں کا بول بالا ہوا ہے، ادبی رسالوں کا حال خراب ہے۔ خصوصاً ماہوار رسالے تو دم توڑ رہے ہیں۔ چشم بد دور ایک "افکار" ہے، جو باقاعدگی سے شایع ہوتا ہے۔ اسے بھی اب کے پیر مغان جناب صہبا لکھنوی کی جوان ہمتی کا معجزہ سمجھنا چاہیے، ورنہ صہبا صاحب کی جگہ کوئی اور ہوتا تو ادب کا غیر منافع بخش کاروبار بند کر کے کوئی مفید کام کرتا۔ مثلاً "افکار" کا دفتر جس علاقے میں ہے وہ نہاری کی دکان کے لیے مشہور ہے۔ صہبا صاحب اگر نہاری کی دکان ہی کھول لیتے تو انھیں خریداروں کا گھیراؤ کرنے کی ضرورت نہ ہوتی، خود خریدار ان کا گھیراؤ کرتے، لیکن ادب کی خدمت کا جذبہ صادق ہے۔ اس لیے صہبا صاحب ہر روز نہاری کھلانے کی بجائے ہر ماہ باقاعدگی سے "افکار" کی صورت میں اہل ذوق کو ادب کا خوانِ نعمت پیش کرتے ہیں۔ ان کی اس بے مثال خدمت کا اعتراف تو ہم کرتے ہی رہتے ہیں، حکومت کو بھی کچھ خیال کرنا چاہیے۔ صہبا صاحب کو حسن کارکردگی کا تمغہ ضرور ملنا چاہیے کہ وہ ہر اعتبار سے اس کے مستحق ہیں۔ اگر یہ نہیں ہو سکتا تو کم از کم اتنا تو ہو کہ معذور ادیبوں کے فنڈ سے انھیں جو وظیفہ ملتا ہے، وہ دگنا کر دیا جائے۔ اس مہنگائی کے زمانے میں چار پانچ سو کی بساط ہی کیا ہے۔ دفتر "افکار" میں آنے والے ادیب اس سے کہیں زیادہ کی تو چائے پی جاتے ہیں۔

"افکار" کے علاوہ جتنے رسالے ہیں، وہ سب مرضی وار شایع ہوتے ہیں۔ ادبِ لطیف، فنون، اوراق، تخلیق، سیپ، محراب اور معاصر ہمارے بہترین رسالے ہیں، لیکن ان میں سے کوئی باقاعدگی سے شایع نہیں ہوتا۔ سبب یہ ہے کہ پڑھنے والوں کے ذوق اور قوت خرید پر مقبول عام ڈائجسٹوں اور فیشن زدہ رسالوں کا قبضہ ہے۔ ادبی رسالوں کو کوئی نہیں پوچھتا۔ اگر ملک کی تمام لائبریریوں کو ادبی رسالوں کا خریدار بنا دیا جائے اور سرکاری و غیر سرکاری مشتہرین کو اس کا پابند کر دیا جائے کہ وہ اپنے صرف ایک فیصد اشتہارات ادبی رسالوں کو دیں تو ادبی رسالوں کی حالت سدھر سکتی ہے۔ تین سال ہوئے، اکیڈمی آف

لیٹرز نے ادبی رسالوں کی حالت بہتر بنانے کے لیے ایک کمیٹی بنائی تھی۔ اس کمیٹی کی کوششوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اب شاید اکیڈمی کو اس کمیٹی کی حالت بہتر بنانے کے لیے ایک اور کمیٹی بنانی پڑے۔

بہر حال اس تشویش ناک صورتِ حال میں جب کسی مرضی وار ادبی رسالے کا کوئی شمارہ شایع ہوتا ہے، ہمیں بے حد خوشی ہوتی ہے۔ یہ احساس ہوتا ہے کہ ادب سے دلچسپی رکھنے والے اپنے فرض سے غافل نہیں ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے "نیا دور" کراچی کا خاص نمبر ہے، جو اسی ہفتے شایع ہوا ہے۔ یوں تو اس نمبر میں افسانے، نظمیں، غزلیں، مقالے، یعنی وہ سب کچھ ہے، جس کے بغیر کسی رسالے کا تصور نہیں کیا جا سکتا، لیکن بعض تحریریں ایسی بھی ہیں، جو صرف "نیا دور" ہی میں شایع ہو سکتی تھیں۔ یعنی گرما گرم قسم کی تحریریں، جنھیں پڑھ کر خون کی روانی اس حد تک تیز ہو جائے کہ کرفیو کی پابندیوں کے باوجود شہر سے صحرا کی طرف بھاگ جانے کو جی چاہے۔ اس قسم کی تحریروں میں سرفہرست شمیم احمد کا مقالہ ہے، جس کا عنوان تو ہے "کچھ فراق صاحب کے حوالے سے"، لیکن متن میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ شمس الرحمٰن فاروقی کے حوالے سے ہے۔

اس سے پہلے کہ مقالہ نگار اور موضوع کے باہمی تعلق کے حوالے سے کچھ عرض کیا جائے، شمیم احمد کے بارے میں یہ بتا دینا ضروری ہے کہ وہ ہمارے ان ذہین ترین نقادوں میں سے ہیں، جو اپنی ذہانت سے آلۂ حرب و ضرب کا کام لیتے ہیں، یعنی جب وہ کسی شاعر یا ہم پیشہ نقاد کے بخیے ادھیڑنے پر آتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے محمود غزنوی کی فوج ہندوستان پر حملہ کر رہی ہو۔ محمود غزنوی نے تو وقفوں وقفوں سے ہندوستان پر سترہ حملے کیے تھے، لیکن شمیم احمد ایک ہی سانس میں سترہ سے کہیں زیادہ حملے کر ڈالتے ہیں۔ اسی لیے لوگ کہتے ہیں کہ شمیم احمد قلم سے تلوار کا کام لیتے ہیں اور نادر شاہ کی طرح ہمیشہ قتل عام پر کمر باندھے رہتے ہیں۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔ شمیم احمد قلم سے تلوار کا نہیں، تلوار سے قلم کا کام لیتے ہیں، اسی لیے جو ان کی زد میں آتا ہے، پانی بھی نہیں مانگتا۔

الاماں کیوں نہ دل اس تیغ سے جانی مانگے
جس کا مجروح کبھی لے کے نہ پانی مانگے

منیر شکوہ آبادی کا یہ شعر لکھنے کو تو ہم نے لکھ دیا ہے، لیکن ہم ڈر رہے ہیں کہ اس شعر کی بنا پر شمیم احمد کہیں ہمارے خلاف بھی اعلان جنگ نہ کر دیں، کیوں کہ شمس الرحمٰن فاروقی سے بھی ان کا جھگڑا کچھ شعروں کو پسند یا ناپسند کرنے کی بنا پر ہوا ہے۔ (اس کی تفصیل آگے آئے گی) یہ عجیب بات ہے کہ شعر تو دوسروں کے ہوتے ہیں، لیکن خود حضرات ان شعروں کی بنا پر آپس ہی میں لڑنے لگتے ہیں۔ اس صورتِ حال پر نہایت سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ فساد کی جڑ شعرائے کرام ہیں۔ اگر یہ شعر کہنا ترک کر دیں تو نقادوں کو آپس میں لڑنے کی ضرورت ہی نہ رہے۔

اپنے بارے میں کوئی ناخوش گوار بحث چھیڑنا نہیں چاہتے، اس لیے اس قضیے کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ جنھیں اس جھگڑے سے زیادہ دلچسپی ہو، وہ ''نیا دور'' خرید کر پڑھیں۔ اس میں شمیم احمد کے مضامین کے علاوہ اور بھی بہت سی دلچسپ تحریریں ہیں۔ مثلاً محمد حسن عسکری کے خطوط، جن میں ترقی پسندوں کے بارے میں بعض سنسنی خیز معلومات ملتی ہیں۔ تبسم کاشمیری نے جاپانی شاعری کے جو ترجمے کیے ہیں، وہ بھی پڑھنے کے لائق ہیں۔ مترجم نے جن جاپانی شاعروں پر طبع آزمائی کی ہے، ہمیں ان سے دلی ہمدردی ہے، کیوں کہ ان ترجموں میں وہ تمام خصوصیات نظر آتی ہیں، جو تبسم کاشمیری کی طبع زاد شاعری میں پائی جاتی ہیں۔

(۲۶راپریل ۱۹۸۵ء)

☆.........☆.........☆

گنجینۂ گوہر......۱۳۲۔ادیبوں کی مشترکہ کوشش

جناب صادق الخیری ہمارے بزرگ ادیبوں میں سے ہیں۔ گزشتہ نصف صدی میں انھوں نے اردو ادب کی بے مثال خدمت کی ہے۔ اردو فکشن کے سرمائے میں انھوں نے اپنی طبع زاد تحریروں اور تراجم کے ذریعے قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ ان کے تراجم کی خوبی یہ ہے کہ ان پر تخلیقی ادب کا گمان ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ترجمے میں یہ خوبی اسی وقت پیدا ہوتی ہے، جب مترجم خود بھی اعلیٰ درجے کا تخلیق کار ہو۔ اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ کسی شخص کو اس وقت تک ادب کے ترجمے کا کام نہیں کرنا چاہیے، جب تک وہ تخلیقی سطح پر کوئی وقیع کام نہ کر چکا ہو۔

قیام پاکستان کے بعد صادق الخیری عملی زندگی کے ہنگاموں میں کچھ اس طرح کھوئے کہ ادب سے ان کا تعلق تقریباً ختم ہو گیا۔ ایک عرصے تک تعطل کا یہ دور رہا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد وہ دوبارہ ادب کی طرف آئے اور اپنی پرانی کتابوں کو چھاپنے کے ساتھ ساتھ نئی کتابیں لکھنے اور شائع کرنے کا منصوبہ بنایا۔ گزشتہ بارہ برسوں سے وہ اس منصوبے پر نہایت خوش اسلوبی سے عمل کر رہے ہیں اور اب تک ایک درجن سے زیادہ کتابیں شائع کر چکے ہیں...... افسانوی کتابوں کی اہمیت اپنی جگہ ہے، لیکن صادق الخیری کو یادنگاری میں جو کمال حاصل ہے، وہ اپنی مثال آپ ہے۔ شخصی خاکے ہوں یا آپ بیتی، وہ ایسا جادو جگاتے ہیں کہ ...... وہ کہیں اور سنا کرے کوئی...... ان کی اس نوعیت کی کتابیں ''آسماں کیسے کیسے''، ''مرا زندگی افسانہ'' اور ''نایاب ہیں ہم'' بے حد مقبول ہوئیں۔

لیکن جناب صادق الخیری کی تازہ ترین کتاب ''گنجینۂ گوہر کھلا'' پڑھ کر کچھ زیادہ مزہ نہیں آیا۔ کیوں؟ پہلے آپ ایک مشہور لطیفہ سن لیجیے۔ ایک سردار جی نے اپنے باغ میں تین تالاب بنوائے۔ ایک گرمیوں میں نہانے کے لیے اور دوسرا سردیوں میں نہانے کے لیے۔ سردار جی سے پوچھا گیا کہ یہ تیسرا تالاب آپ نے کیوں بنوایا ہے تو انھوں نے فرمایا۔ ''کبھی کبھی نہانے کو جی نہیں چاہتا۔'' یہ اب اسی مقصد

کے لیے ہے۔"

زیرِ نظر کتاب بھی سردار جی کے تیسرے تالاب کی قسم کی چیز ہے، کیوں کہ کبھی بھی صادق الخیری صاحب کو اس بات کا خیال بھی نہ آیا ہوگا کہ کتاب نہ لکھی جائے۔ سو اس خواہش کے نتیجے میں یہ کتاب وجود میں آ گئی۔

اس کتاب کی شانِ نزول یہ ہے کہ خیری صاحب کے نام وقتاً فوقتاً جو خطوط موصول ہوئے، انھیں وہ ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کی بجائے جمع کرتے گئے اور جب یہ خط تعداد میں اتنے ہو گئے کہ کتابی صورت میں شائع کیے جا سکیں تو انھیں مطبع کے حوالے کر دیا۔ اس میں ۳۲ راد یبوں کے تقریباً ایک سو خط شامل ہیں۔ اس قسم کی کئی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ دو سال پہلے نظیر صدیقی نے بھی ایک مجموعہ چھپایا تھا۔ ایسے مجموعوں میں عموماً وہی خط شامل کیے جاتے ہیں، جن کی کوئی علمی یا ادبی اہمیت ہو...... لیکن "گنجینۂ گوہر کھلا" میں زیادہ تر ان رسیدوں کو جمع کر دیا گیا ہے، جو مختلف افراد نے خیری صاحب کی تصانیف کی وصولی پر انھیں بھیجی تھیں۔ بیشتر "رسیدوں" کا مضمون کچھ اس قسم کا ہے:

"آپ کی کتاب ملی۔ نہایت عمدہ چھپی ہے۔ اس تحفے کے لیے بے حد ممنون ہوں۔ کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ کئی بار پڑھ چکا ہوں۔ اگر عمر نے وفا کی تو کئی بار اور پڑھوں گا۔"

اس قسم کی باتیں بار بار پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ مکتوب نگاروں کی عمر تو ضرور وفا کرے گی کتاب کے قاری کی عمر شاید ہی وفا کرے۔

جب کوئی کتاب مفت میں ملتی ہے تو وصول کنندہ اخلاقاً کتاب اور مصنف کی تعریف ضرور کرتا ہے۔ سو اس مجموعے کے مکتوب نگاروں نے بھی خیری صاحب کی خوب دل کھول کر تعریف کی ہے۔ گنجینۂ گوہر کے کھلنے کا اشارہ اسی طرف ہے۔ خیری صاحب نے ان خطوں کو شاید اس لیے چھاپ دیا ہے کہ آیندہ چل کر کوئی مکتوب نگار اپنی رائے سے منحرف نہ ہو سکے۔ اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض اہل الرائے نجی خطوط میں تو کسی مصنف کی خوب تعریف کرتے ہیں، لیکن مضامین لکھتے وقت بالکل مختلف رائے دیتے ہیں یا کوئی رائے ہی ظاہر نہیں کرتے۔ خیری صاحب نے اپنے بارے میں اس دوعملی کے امکانات کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے۔

اس مجموعے میں کچھ خطوط "کاروباری" نوعیت کے بھی ہیں۔ خیری صاحب کسی زمانے میں ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی کے مالک تھے۔ اردو رسالوں کے جو ایڈیٹر انھیں اشتہاروں کے لیے خطوط لکھا کرتے تھے، ان میں "فنون"، "نقوش"، "ادبی دنیا" اور "الحمرا" جیسے اہم رسالوں کے ایڈیٹر بھی شامل ہیں۔ حیرت ہے کہ ان ایڈیٹروں نے خیری صاحب سے اشتہارات تو مانگے، لیکن کسی نے تکلفاً یہ نہ لکھا کہ رسالے کے لیے اپنا افسانہ عنایت کیجیے۔ اس پر ہمیں ایک واقعہ یاد آ گیا۔ بلاتشبیہ عرض ہے کہ اک اشتہاری ادارے کے سربراہ شاعر بھی تھے۔ ایک ادبی رسالے کا ایڈیٹر ان سے اشتہار مانگنے کے لیے گیا تو

شاعر نے اشتہار کے ساتھ اپنی ایک غزل بھی ایڈیٹر کو پیش کر دی۔ ایڈیٹر کبھی اشتہار کو دیکھتا اور کبھی غزل کو۔ شاعر نے اس پریشانی کا سبب پوچھا، تو ایڈیٹر نے کہا:

"آپ ایک اشتہار کی اجرت میں دو اشتہار چھپوانا چاہتے ہیں۔"

شاعر نے کہا:

"اشتہار تو ایک ہی ہے، دوسری تو میری غزل ہے۔"

ایڈیٹر نے جواب دیا:

"یہ صحیح ہے، مگر میرے رسالے میں تو غزلیں بھی اشتہاری نرخوں پر چھپتی ہیں۔"

اس مجموعے میں سارے خط "کاروباری" نہیں، کچھ ادبی نوعیت کے بھی ہیں۔ مثلاً اخلاق احمد دہلوی کے خطوط بہت دلچسپ ہیں۔ ان میں دوسروں کے بارے میں سنسنی خیز انکشافات بھی ملتے ہیں۔ مثلاً عیب اشعر کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔ "ترجمے سارے الف سے یے تک جوں کے توں سید ابوالخیر مودودی کے ہیں۔ وہ جو دو چار غزلیں تھیں، وہ بقلم خود خیام الہند استاد حیدر دہلوی کی کہی ہوئی ہیں۔" اسی قسم کا ایک انکشاف صفحہ ۹۳ پر ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے بارے میں بھی ہے، لیکن ہم اسے نقل نہیں کریں گے، اصل کتاب میں بھی تو کچھ پڑھنے کا مواد باقی رہنا چاہیے۔

زبان کے معاملے میں اخلاق احمد دہلوی کا خیال ہے کہ اہل زبان کو قواعد کی پروا نہیں کرنی چاہیے۔ وہ جس طرح بولتے ہیں، اسی طرح درست ہے۔ اس کے برعکس جو بھی ہے، وہ غلط ہے۔ یہ اصول بہت اچھا ہے، لیکن صرف قواعد تک محدود نہیں ہونا چاہیے، املا پر بھی اس کا اطلاق ہونا چاہیے۔ اخلاق احمد صاحب نے اپنے خطوں میں متعدد جگہ "تحت الثریٰ" کو "تحت الثرا" اور "لف ونشر" کو "لف و نشر" لکھا ہے اور صادق الخیری صاحب نے ان الفاظ کو اسی طرح چھاپ دیا ہے۔ قواعد والے اصول کا اطلاق یہاں بھی ہو جائے تو پھر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اہلِ زبان کسی لفظ کو جس طرح لکھتے ہیں، وہی درست ہے۔ اس کے برعکس جو بھی ہے، وہ غلط ہے۔

شاہد احمد دہلوی مرحوم واحد ایڈیٹر ہیں، جنھوں نے صادق الخیری صاحب سے اشتہار نہیں مانگا۔ ان کی فرمائش دوسرے ایڈیٹروں سے مختلف ہے۔ وہ اپنے بارے میں مضمون لکھوانے کی فرمائش کرتے ہیں۔ صادق الخیری صاحب یہ فرمائش پوری کر دیتے ہیں، لیکن مضمون ذرا مختصر ہو جاتا ہے۔ اس پر شاہد صاحب انھیں لکھتے ہیں:

"بڑی ہمت کی تم نے، کسی نہ کسی طرح مضمون لکھ ہی ڈالا۔ آخر کے ایک صفحے میں اسے سمیٹ دو، ورنہ اختتام Abrupt ہو رہا ہے۔ موجودہ حالات یہ ہیں، صبح سے رات گئے تک محنت مشقت کرتا ہوں اور خوش رہتا ہوں۔ شرافت اور وضع داری کو نبھائے جاتا ہوں۔ خدا

کے فضل سے عزت و تکریم قائم ہے۔ جوانی کے ولولے نہیں رہے، مگر سنجیدگی و پختگی روز افزوں ہے۔ اتنی مایوسیوں کے بعد مزاج میں تلخی آ جانی چاہیے تھی، مگر شگفتگی مزاج قائم ہے۔ خدا جانے یہ ساختہ ہے یا بے ساختہ۔ کسی کے آگے دست سوال پھیلانا نہیں پڑتا۔ مجھے میری روزی پہنچتی رہتی ہے۔ انھیں اشاروں پر ایک صفحہ اور لکھ دو۔ میں منتظر رہوں گا۔"

خیری صاحب نے اس خط کو ضائع نہ کر کے اور اب شائع کر کے شاہد احمد دہلوی مرحوم پر بڑا ظلم کیا۔ شاہد صاحب کا زندگی بھر یہ معمول رہا کہ ان کے نام جتنے خط آتے تھے، جواب دینے کے بعد انھیں وہ ضائع کر دیتے تھے۔ خیری صاحب کے بارے میں بھی وہ یہی حسن ظن رکھتے ہوں گے۔ اسی لیے انھوں نے اتنی بے تکلفی سے اپنا مدعا بیان کر دیا، لیکن صادق الخیری خطوں کو ضائع کر دیتے تو ان کی تیرہویں کتاب کس طرح وجود میں آتی۔ خیری صاحب نے شاہد احمد دہلوی مرحوم پر یہ ظلم بھی کیا ہے کہ ان کی کتاب کا نام ایک لفظ کے اضافے کے ساتھ اپنا لیا۔ "گنجینۂ گوہر" کی موجودگی میں کسی کتاب کا نام "گنجینۂ گوہر کھلا" رکھنا کھلی زیادتی ہے۔

اس مجموعے کا دلچسپ ترین خط ہمارے عہد کے سب سے بڑے کالم نگار جناب نصر اللہ خان صاحب کا ہے۔ یہ خط ۱۹۳۷ء کا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خان صاحب آج سے ۴۸ سال پہلے بھی اپنی نوعمری کے زمانے میں چاند ماری کا خاصا شوق رکھتے تھے۔ اس خط کے صرف دو جملے ملاحظہ کیجیے۔

(۱) "آپ افسانے کیوں لکھتے ہیں۔ اس کی جگہ کوئی دوسرا نیک کام کیوں نہیں کرتے۔"

(۲) "اگر حکیم نابینا نے آپ کو مشورہ دیا ہے کہ افسانے لکھنے سے تمہاری صحت اچھی رہے گی تو الگ بات ہے۔"

خیری صاحب خود دانا و بینا ہیں، اس لیے وہ بھلا حکیم نابینا کے مشورے پر افسانے کیوں لکھتے۔ ہاں آج کل کے علامتی افسانہ نگاروں کے بارے میں ضرور کہا جا سکتا ہے کہ وہ طبی ضروریات کے پیش نظر ہی افسانے لکھتے ہیں۔

خیری صاحب نے مکتوب نگاروں کے بارے میں جو تعارفی سطور لکھی ہیں، ان میں خاکہ نگاری کی جھلک پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اشاروں کنایوں میں ہر مکتوب نگار کے بارے میں تمام ضروری باتیں لکھ دی ہیں، البتہ احمد ندیم قاسمی اور محمد طفیل کے متعلق انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ "غیر ضروری" نظر آتا ہے۔ قاسمی صاحب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

"انھوں نے افسانہ نگاری چھوڑ کر شاعری، مزاح نویسی اور کالم نگاری تک میں قسمت آزمائی کرنا مناسب سمجھی۔ یہ سچ ہے کہ ان کوششوں کی وجہ سے ان کا نام زیادہ مشہور ہو گیا، مگر ان کے مزاج میں جو گداز اور طبیعت میں جو نرمی تھی، اس میں کمی آ گئی۔ پھر زمانہ بدلا تو وہ بھی بدل

گئے۔ ہر کام کرنے سے پہلے یہ سوچ لیتے ہیں کہ اس میں میرا کتنا فائدہ ہے۔ قاسمی صاحب کو اپنا پروپیگنڈا کرانے کا بہت شوق ہے۔ انھوں نے شہرت حاصل کرنے کے تمام ہی وسائل اور ذرائع آزمائے ہیں۔ یہاں تک کہ جب ساٹھ سال کے ہوئے تو اپنی سالگرہ کا سارے ملک میں چرچا کرا ڈالا، لیکن ایک تمنا دل میں باقی رہی، وہ یہ کہ کسی ادبی رسالے کا خاص نمبر ان سے منسوب ہو۔ لاہور میں یہ ممکن نہیں ہوا تو کراچی کے ایک ماہنامے سے احمد ندیم قاسمی نمبر نکلوا دیا...... میری ندیم صاحب سے ایک زمانے میں یاد اللہ تھی...... جب یہ احساس ہوا کہ انھیں مجھ سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا تو انھوں نے آنکھیں پھیر لیں۔"

یہ ساری باتیں درست نہیں ہیں۔ ان سے قاسمی صاحب کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا، لیکن جو خیری صاحب سے نیاز مندی کا رشتہ رکھتے ہیں، انھیں ضرور افسوس ہوگا کہ خیری صاحب نے یہ بے بنیاد باتیں لکھ کر خود اپنی شخصیت کو داغ دار کر لیا۔

محمد طفیل کے بارے میں خیری صاحب نے لکھا ہے:

"وہ پنجاب کے کسی قصبے سے کتابت کے لیے لاہور آئے۔ ایک دوست کے ذریعے کتب فروشی اور پھر کتابیں چھاپنے کا شوق پیدا ہوا اور اس کے ساتھ ہی اتفاقاً ادیبوں سے میل جول بڑھا۔ احباب کی تجویز اور تحریک پر نقوش کا اجرا کیا۔ مختلف ادیب اسے مرتب کرنے لگے اور چونکہ وہ سب اعلیٰ ادبی ذوق کے مالک تھے، پرچہ چل نکلا۔ مختلف ادوار سے نکل کر جب نقوش نے اپنے قدم جما لیے اور ادیب ایڈیٹر اپنی اپنی وجوہ کی بنا پر ایک ایک کر کے کنارہ کش ہو گئے تو محمد طفیل نے ڈرتے ڈرتے خود اس کی ادارت سنبھالی...... لکھنے لکھانے کی بھی مشق شروع کر دی اور اب ایک خاص نوعیت کے ادیب شمار کیے جاتے ہیں۔"

جس تحقیر آمیز انداز سے محمد طفیل کا ذکر کیا گیا ہے، اس کی خیری صاحب جیسے وضع دار شخص سے توقع نہیں تھی۔ کوئی کچھ بھی کہے، یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان کی تاریخ میں "نقوش" سے بہتر رسالہ شائع نہیں ہوا اور یہ صرف اور صرف محمد طفیل کی محنت کا نتیجہ ہے۔ یہ بہت بڑی بات ہے کہ کوئی "کاتب" ترقی کر کے "نقوش" بن جائے اور اس کا شمار مستند ادیبوں میں ہو، ورنہ ہم نے ایسے ادیب بھی دیکھے ہیں، جو بڑی شان و شوکت سے ادب میں داخل ہوتے ہیں، درجنوں کتابوں کے مصنف بنتے ہیں اور آخر میں صرف "کاتب" رہ جاتے ہیں۔ محمد طفیل ایسے مصنف نما کاتبوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔

(۳ جون ۱۹۸۵ء)

ہاتھی اور خرگوش کے ساتھ یکساں سلوک

ڈاکٹر وزیر آغا صف اول کے نقاد ہیں، نغز گو شاعر ہیں، بلند مرتبہ انشائیہ نگار ہیں.......... یہ سب خوبیاں اور کمالات اپنی جگہ، لیکن ہمیں جو چیز پسند ہے، وہ یہ ہے کہ انھیں ڈاکٹر انور سدید جیسا باکمال عقیدت مند میسر ہے۔ غالب تو فرشتوں کے لکھے پر پکڑے گئے تھے، لیکن ڈاکٹر انور سدید کے لکھے پر ڈاکٹر وزیر آغا ہر فقرے سے چھوٹ جاتے ہیں۔ ادھر کسی نے آغا صاحب کے خلاف کچھ لکھا اور ادھر ڈاکٹر انور سدید نے سارا حساب کتاب برابر کر دیا۔ ایک ایک بات اور ایک ایک نکتے کا وہ ایسا مدلل جواب دیتے ہیں کہ معترض کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا، بلکہ وہ آئینہ بھی دیکھتا ہے تو اسے اپنی صورت کی بجائے ڈاکٹر انور سدید نظر آتے ہیں۔ وارث علوی کے مضمون کا جواب لکھ کر انور سدید چھپوا چکے ہیں، فضیل جعفری کے مضمون کا جواب چھپنے ہی والا ہے۔ گویا وہ ہاتھی اور خرگوش کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہیں۔ وارث علوی کا غلط نامہ تیار کرنا تو ٹھیک ہے کہ وہ اہم نقاد ہیں اور غلطیاں کرنے کے عادی ہیں، لیکن بے چارے فضیل جعفری کو مصرع طرح بنا کر مشق سخن کرنا ایسا ہی ہے، جیسے غلطی کی اصلاح غلطی سے کی جائے۔

ڈاکٹر انور سدید کا کام صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ ڈاکٹر وزیر آغا کے مخالفین کو کیفر کردار تک پہنچا کر خود اپنے گھر صحیح سلامت واپس آ جاتے ہیں، بلکہ وہ مثبت کام بھی کرتے ہیں۔ ''مثبت کام'' سے ہماری مراد خدانخواستہ یہ نہیں ہے کہ وہ انشائیے لکھتے ہیں، سالانہ ادبی جائزے لکھتے ہیں اور غزلیں لکھتے ہیں۔ یہ سب ضمنی کام ہیں.......... مطلب یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر وزیر آغا کے بارے میں ایسی کتابیں بھی لکھتے ہیں، جو کسی کے جواب میں نہیں ہوتیں، بلکہ اپنا جواب خود ہوتی ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے انھوں نے ''وزیر آغا .... ایک مطالعہ'' لکھی تھی، جسے پڑھ کر کئی دن تک ہماری اور ڈاکٹر سلیم اختر کی طبیعت ناساز رہی۔ ہم اس لیے کام سے گئے کہ یہ کتاب علمی ہے اور علم کا بوجھ اٹھانا ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔ ڈاکٹر سلیم اختر کی ناسازیٔ طبع کا سبب ظاہر ہے۔ وہ نہیں چاہتے کہ ان کے پسندیدہ موضوع.......... ڈاکٹر وزیر آغا پر کوئی اور بھی خامہ فرسائی کرے۔ سنا ہے، ڈاکٹر سلیم اختر آج کل ڈاکٹر انور سدید کی کتاب کا رد لکھ رہے ہیں اور

یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ ڈاکٹر انور سدید کی کتاب کی طرح ڈاکٹر سلیم اختر کی کتاب کا فلیپ بھی مشفق خواجہ لکھیں گے، کیوں کہ ان کے تعلقات دونوں سے مخلصانہ ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ڈاکٹر انور سدید کی تازہ ترین کتاب ''ڈاکٹر وزیر آغا کے خطوط'' ہے۔ اس میں آغا صاحب کے ۸۹ خط ہیں، جو انور سدید کے نام ۱۹۶۶ء سے ۱۹۸۲ء کے دوران لکھے گئے۔ کتاب پڑھنے سے پہلے کاتب اور مکتوب الیہ کے گہرے مراسم کے پیش نظر ہمارا خیال تھا کہ یہ خطوط ویسے ہی ہوں گے، جیسے مولانا ابوالکلام نے نواب صدر یار جنگ شیروانی کے نام لکھے تھے اور مکتوب الیہ نے انھیں پہلی مرتبہ مطبوعہ صورت میں دیکھا تھا.......... لیکن کتاب کو بغور دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اصلی خط ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر انور سدید دونوں کا تعلق سرگودھا سے ہے۔ اگرچہ ایک ہی شہر کے لوگوں اور روزانہ ایک دوسرے سے ملنے والوں کا آپس میں خط و کتابت کرنا کوئی معیوب بات نہیں، لیکن ڈاکٹر انور سدید نے بڑی احتیاط سے کام لیا ہے۔ وہ ڈاکٹر وزیر آغا سے خطوط لکھوانے کے لیے مختلف مقامات پر اپنا تبادلہ کراتے رہے اور جب کبھی دونوں اتفاق سے سرگودھا میں زیادہ دن ساتھ رہ جاتے تو ڈاکٹر وزیر آغا خود احتیاط سے کام لیتے اور خط لکھنے کے لیے لاہور یا مری چلے جاتے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کے خطوط نہایت دلچسپ ہیں۔ ان میں علمی و ادبی مسائل پر گفتگو ہے، ذاتی معاملات ہیں، زندہ دلی اور شگفتگیٔ طبع کے نمونے ہیں۔ غالب نے تو مراسلے کو مکالمہ بنا دیا تھا، ڈاکٹر وزیر آغا نے اسے اچھا خاصا ''اوراق'' کا انشائیہ نمبر بنا دیا ہے۔ مختصر یہ کہ یہ خطوط ڈاکٹر وزیر آغا کے تنقیدی مضامین کی طرح ثقیل نہیں ہیں، بلکہ سہل و زود ہضم ہیں اور ان سے ہم جیسے آوارہ خواں بھی محظوظ ہو سکتے ہیں۔

پہلے ذرا ڈاکٹر صاحب کی شگفتہ بیانی کے کچھ نمونے دیکھیے۔ اپنے ''برساتی'' دوستوں کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''.......... ادھر 'اوراق' کا دوبارہ اجرا ہوا اور ادھر وہ کونوں کھدروں سے برآمد ہونے لگے۔ خطوں کے انبار لگ گئے السلام علیکم آغا صاحب! مزاج اچھے ہیں۔ معذرت کہ میں دو سال تک رابطہ نہ رکھ سکا۔ دراصل میری بیٹی کے شوہر کی والدہ کی اکلوتی بہو کے والد محترم کی طبیعت ناساز ہو گئی تھی۔ اس لیے میں یہ سارا عرصہ ان کی تیمارداری کرتا رہا۔ اب چند غزلیں 'اوراق' کے لیے ارسال کر رہا ہوں۔ یہ میں نے داغ کے رنگ میں کہی ہیں، مگر تھوڑا سا امیر مینائی بھی ڈال دیا ہے..........''

ڈاکٹر انور سدید کو وہ کچھ کتابیں تبصرے کے لیے بھیجتے ہیں اور ساتھ ہی لکھتے ہیں:

''کوشش کریں کہ روزے کی حالت میں تبصرے نہ کریں۔ سحری کے وقت کھانا کھانے کے فوراً بعد آپ جس کتاب کو ہاتھ لگائیں گے، ادب کا اعلیٰ نمونہ دکھائی دے گی۔ دوپہر تک شدت

گرما اور تشنہ لبی کے باعث آپ کی سابقہ رائے متزلزل ہونے لگے گی، لہٰذا یہ وقت تبصرے کے لیے موزوں نہیں۔ افطاری سے قبل سابقہ آرا بالکل تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اگر اس وقت آپ نے کسی کتاب کو چھوا تو ادب کی مختصر ترین تاریخ کے نمونے پر تبصرے وجود میں آئیں گے، لہٰذا وقت کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے کسی شبھ گھڑی کا انتظار کریں۔"

بات مزاحیہ پیرائے میں تھی، لیکن ڈاکٹر سلیم اختر کی "مختصر ترین تاریخ" کا حوالہ دے کر ڈاکٹر وزیر آغا نے مزاح میں بھی علمی متانت پیدا کر دی ہے۔

ان خطوں میں بعض اہم ادیبوں کے بارے میں اہم ترین معلومات ملتی ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا ۱۹۸۰ء میں ایک ادبی تقریب میں شرکت کے لیے دہلی گئے تھے۔ احمد ہمیش بھی وہاں موجود تھے۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر صاحب ایک خط میں لکھتے ہیں:..........

"احمد ہمیش کا کہنا تھا کہ لوگ ان کا سوانگ اس طرح کر رہے ہیں جیسے کسی ایکٹر کا کیا جاتا ہے۔ بات بھی ٹھیک تھی۔ احمد ہمیش کسی فلم کے ایکٹر ہی تو لگ رہے تھے — ان کا ایک لطیفہ بھی سن لیجیے۔ ہم دونوں کو ایک ہی ہوٹل میں ٹھہرایا گیا تھا۔ کمرے بھی ساتھ ساتھ تھے۔ صبح ہوئی تو میں نے انھیں فون کیا اور کہا کہ چائے میرے کمرے میں آ کر پئیں۔ جب وہ خاصی دیر کے بعد تشریف لائے اور دیر کا سبب پوچھا تو کہنے لگے کہ ہوٹل کے دھوبی کو کپڑے دینے میں دیر لگ گئی۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا "کے آمدی و کے، خلاف شدی۔" ابھی کل ہی تو آپ یہاں پہنچے ہیں، کپڑوں کا میلا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دھوبی کو آپ نے کیا عنایت کیا ہوگا؟ فرمایا۔ "اس ہوٹل میں ہم پر جو کچھ خرچ ہوگا، حکومت ہند ادا کرے گی، لہٰذا میں نے سوچا کہ کیا حرج ہے، اگر دھلے ہوئے کپڑوں کو دوبارہ دھلوا لیا جائے۔"

"فنون" اور "اوراق" کے دبستانوں کی باہمی چپقلش کے سلسلے میں بھی ان خطوط میں خاصا مواد ملتا ہے۔ یہ جھگڑا کس طرح شروع ہوا، اس کی تفصیل ڈاکٹر وزیر آغا نے یوں بیان کیا ہے:

"آپ تو جانتے ہیں کہ ندیم صاحب سے میرے دیرینہ مراسم ہیں۔ اس زمانے میں بھی، جب "ادبی دنیا" کا آخری دور تھا اور ندیم صاحب نسبت روڈ کے ایک مکان میں گوشہ نشین تھے۔ میں بڑے التزام کے ساتھ ان کے ہاں جاتا، بڑی محبت سے پیش آتے۔ سرگودھا آتے تو بلا تکلف میرے ہاں ٹھہرتے، مگر جب سے "اوراق" نکلا ہے، حالات تیزی سے بدلنے لگے ہیں۔ ممکن ہے یہ میرا وہم ہو، مگر میرا خیال ہے کہ وہ مجھ سے ناراض ہیں۔ اس کی کوئی اور وجہ تو نظر نہیں آتی، بجز ایک وجہ کے۔ جب "اوراق" کا پہلا شمارہ نکلا تو اس میں فتح محمد ملک کا ایک مضمون چھپا، جس میں انھوں نے فیض اور ندیم کا موازنہ بھی کیا تھا۔ مضمون فیض کی مخالفت

میں تھا۔ چوں کہ ادبی حلقوں میں یہ بات عام ہے کہ ان دنوں فیض اور ندیم کے درمیان معاصرانہ چشمک ہو رہی ہے، اس لیے میں نے مناسب نہ سمجھا کہ "اوراق" میں چھپنے والا مضمون اس چشمک کو ہوا دے اور ندیم صاحب کے مخالف ملک صاحب کے مضمون کو فرمائشی قرار دیں۔ سو میں نے مضمون میں سے بعض قابل اعتراض حصے حذف کر دیے۔ جب مضمون چھپا تو ملک صاحب کا ایک عتاب نامہ مجھے موصول ہوا، جس میں انھوں نے طعنہ زنی کی تھی اور لکھا تھا کہ میں نے مضمون کے بعض حصے حذف کر کے ندیم صاحب کے ساتھ زیادتی کی ہے۔"

جھگڑے کا آغاز تو اس معمولی واقعے سے ہوا تھا، لیکن بعد میں اس نے نہایت سنگین صورت اختیار کر لی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے خلاف دشنام طرازی کی گئی، جس کے نتیجے میں وہ بیمار ہو گئے۔ فرماتے ہیں:

"پچھلے دنوں میرے ایک دیرینہ کرم فرما کے "دوستوں" نے میرے خلاف مغلظات سے لبریز ایک نظم سائیکلو اسٹائل کر کے ادبا میں تقسیم کی تھی۔ میں نے یہ نظم نہیں پڑھی، لیکن احباب نے بتایا کہ میں اس کا ہدف ہوں اور وہ بھی بہت ہی پست سطح پر۔ چوں کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ دشنام کا جواب دشنام سے دے سکوں، اس لیے ممکن ہے کہ اس واقعے نے میرے اندر Suffocation پیدا کی، اس کا خارجی مظہر میری یہ خطرناک علالت ہے۔"

جب صورت حال خاصی تشویش ناک ہو گئی ہو تو ہم جیسے بعض صلح پسندوں نے فریقین میں صلح کرا دی۔ اس کی تفصیل خاصی دلچسپ ہے:

"لنچ کے دوران رشید قیصرانی ادھر ادھر کچھ کھسر پھسر کرتے رہے اور لنچ کے فوراً بعد مجھے ظفر چودھری صاحب کے دفتر میں لے گئے۔ وہاں ظفر چودھری صاحب، ضمیر جعفری، ندیم قاسمی اور جیلانی صاحب پہلے ہی پہنچ چکے تھے...... جب ہم وہاں بیٹھ گئے تو رشید قیصرانی صاحب نے اشارہ کیا اور جیلانی صاحب نے اٹھ کھڑے ہو کر اپنے کیریئر کی مختصر ترین تقریر کی، جس کا لب لباب یہ تھا کہ بعض غلط فہمیوں کے باعث ندیم صاحب اور وزیر آغا کے تعلقات خوشگوار نہیں رہے، جس کے باعث اردو زبان کے بہی خواہوں نیز ان دونوں کے دوستوں کے لیے کرب کا سامان مہیا ہو گیا ہے۔ ظفر چودھری صاحب نے بالخصوص اس بات پر زور دیا کہ یہ صورت حال ختم ہونی چاہیے۔ ندیم صاحب نے کہا کہ انھیں جیلانی صاحب اور چودھری صاحب کی رائے سے مکمل اتفاق ہے اور اس بات پر انھیں قطعاً کوئی اعتراض نہیں۔ سب کی نگاہیں میری طرف اٹھیں کہ میرا ردعمل کیا ہوگا۔ میں نے برملا کہا کہ گزشت آنچہ گزشت۔ ندیم صاحب کو میں اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔ بس اس کے بعد ایک شور بلند ہوا۔ لوگ گلے ملے اور یہ خوشخبری فوراً پھیل گئی۔"

لیکن یہ صلح اس قسم کی تھی:

صلح ہے اک مہلت سامانِ جنگ
کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ

جھگڑا دوبارہ شروع ہو گیا، کیوں کہ بعض لوگ (مثلاً احمد فراز) صلح کے حق میں نہیں تھے۔ ایک ہفتے کے بعد ساقی فاروقی لندن سے آ گئے تو انھوں نے ایک مرتبہ پھر صلح کے لیے زمین ہموار کی، حالاں کہ یہ بات خود ساقی کے مزاج کے خلاف تھی۔ دوبارہ صلح ہو گئی لیکن یہ بھی عارضی ثابت ہوئی۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس خط میں لکھتے ہیں:

"پچھلے دنوں .... خالد احمد سے ملاقات ہوئی تو میں نے اس سے کہا کہ ساقی فاروقی کی وجہ سے جو Understanding ہوئی تھی، اسے ندیم صاحب کے رفقا نے خود ہی توڑ دیا ہے۔ اگر ندیم صاحب کو کوئی شکایت پیدا ہو گئی تھی تو انھیں اس سلسلے میں مجھ سے بات کرنی چاہیے تھی اور ڈائریکٹ ایکشن نہیں لینا چاہیے تھا۔ رشید امجد کی بات چل نکلی تو میں نے کہا: ہم نے تو رشید امجد کے اس مضمون کو ہرگز پسند نہیں کیا تھا، جو "نئی قدریں" میں شائع ہوا تھا .... یہ باتیں سن کر خالد احمد نے عطاء الحق قاسمی کے اقدام کی بھرے سر میں مذمت کر دی اور بس۔"

معلوم نہیں، اس جھگڑے میں عطاء الحق قاسمی کہاں سے آ گئے اور یہ خالد احمد ان کے کس اقدام کی مذمت کرنے والے کون ہوتے ہیں اور وہ بھی اس صورت میں، جب کہ اقدام کی نوعیت واضح نہیں ہے۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے عطاء الحق قاسمی ہماری طرح اس جھگڑے میں غیر جانبدار رہے ہیں اور اگر اس سلسلے میں کچھ لکھا بھی ہے تو ان کا "جھکاؤ" ڈاکٹر وزیر آغا ہی کی طرف رہا ہے۔ شاید اسی وجہ سے خالد احمد نے ان کی مذمت کی ہوگی!

اور اب آخر میں ایک اقتباس ڈاکٹر سلیم اختر کے بارے میں:

"لاہور میں ابصار عبدالعلی نے رام لعل کو اپنے گھر بلایا تھا، وہاں سے مجھے ٹیلی فون کیا کہ میں بھی پہنچ جاؤں۔ جب میں پہنچا اور ابھی گلی میں تھا کہ اوپر سے انتظار حسین اور سلیم اختر اترے۔ انتظار صاحب نے ہاتھ ملایا، مگر سلیم اختر نے منہ پھلا لیا اور اپنے سائیکل پر جھک گئے۔ جب وہ چلنے لگے تو میں نے آواز دی۔ سلیم صاحب! آپ تو سلام دعا سے بھی گئے۔ ناراض تو مجھے ہونا چاہیے تھا، الٹا آپ نے کٹی کر رکھی ہے۔ بس آئیں بائیں شائیں کرنے لگے۔ انتظار نے کہا: سلیم اختر اتنی بھی کیا ناراضگی۔"

ہم اس واقعے پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے، کیوں کہ ڈاکٹر سلیم اختر نے ہم سے وعدہ کیا ہے کہ وہ اپنی "مختصر ترین تاریخ ادب" میں ہماری کالم نگاری کا ذکر اچھے لفظوں میں کریں گے۔

(۱۰ر مئی ۱۹۸۵ء)

☆......☆......☆

کتابوں کا ظاہر و باطن

آدمیوں کی طرح کتابوں کی بھی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ بعض کتابوں کا ظاہر کچھ ہوتا ہے اور باطن کچھ۔ سرورق ایسا کہ نظر نہیں جمتی، کتابت ایسی کہ جیسے پروین رقم نے موتی چن دیے ہوں، طباعت ایسی کہ سیاہی سے روشنی پھوٹی پڑتی ہے، کاغذ ایسا جو کرنسی نوٹوں کے کاغذ کو بھی شرمائے، لیکن مطالب پر نظر ڈالیے تو پہلوے حور میں لنگور والی بات یاد آتی ہے۔ بعض کتابیں اس کے برعکس ہوتی ہیں۔ سرورق ایسا جیسا اکیڈمی آف لیٹرز کے خبرنامے کا ہوتا ہے، کتابت ایسی جیسے چیونٹیاں رینگ رہی ہوں، طباعت ایسی جیسی ریلوے کے ٹکٹوں کی ہوتی ہے، کاغذ ویسا ہی کھردرا اور زردی مائل، جس پر ڈاک خانے کی رسیدیں چھپتی ہیں، لیکن کتاب کے مطالب پر نظر ڈالیے تو ذہن روشن ہو جاتا ہے۔

آدمیوں اور کتابوں میں کچھ اور مماثلتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ بعض کتابیں دور سے اچھی لگتی ہیں، ان کے قریب جاتے سے خوف آتا ہے کہ ان کے حسن کے زائل ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ بعض کتابوں کی رفاقت چند لمحوں کے لیے تو ٹھیک ہوتی ہے کہ ادھر ادھر سے ورق گردانی کر لی، انھیں شروع سے آخر تک لکھنا تو کارِ ثواب ہو سکتا ہے، لیکن پڑھنا کارِ عذاب ہوتا ہے۔ جس طرح بعض آدمی رونقِ محفل بڑھاتے ہیں، اسی طرح بعض کتابوں کی ضخامت یا سرورق کے رنگوں کی دھنک سے بک شیلف کے وقار یا حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ جس طرح بعض آدمیوں سے زندگی بھر کی ملاقات کے باوجود تعلقات سلام دعا کی حد سے آگے نہیں بڑھتے، اسی طرح بعض کتابوں سے بھی واقفیت صرف اتنی ہی رہتی ہے کہ ان کا اور ان کے مصنف کا نام یاد رہ جاتا ہے، اس سے آگے حافظہ کام نہیں کرتا۔ جس طرح اکثر آدمیوں کی صورت سے سیرت کا اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے، اسی طرح فلیپ پر درج عبارتوں سے کتابوں کی اصلیت کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا، بلکہ اکثر اوقات یہ عبارتیں قاری اور مصنف دونوں کو گمراہ کرتی ہیں۔ قاری کو اس طرح کہ وہ آئندہ کوئی کتاب نہیں پڑھتا، مصنف کو اس طرح کہ وہ آئندہ بھی کتاب لکھنے سے باز نہیں آتا۔

ایسی کتابیں بہت کم ہوتی ہیں، جن کا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ جیسی وہ باہر سے نظر آئیں، ویسی ہی اندر سے ہوں۔ انھیں دیکھنے کو بھی جی چاہے اور بار بار پڑھنے کو بھی۔ اس وقت ایک ایسی ہی کتاب ہمارے سامنے ہے۔ یہ اپنے موضوع پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ موضوع بے انتہا خشک ہے، جس سے خاص خاص لوگوں ہی کو دلچسپی ہو سکتی ہے، لیکن مصنف نے اس خشک موضوع کو ایسے دلچسپ پیرائے میں پیش کیا ہے کہ خاص خاص لوگ ہی نہیں، ہم جیسے عام لوگ بھی اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ کتاب کا نام ہے ''کتب خانہ'' اور مصنف ہیں رضا علی عابدی۔ یہ نام اُن اردو دانوں کے لیے اجنبی نہیں ہوگا، جو بی بی سی سنتے ہیں۔ پاکستان میں جب کوئی سیاسی تحریک چلتی ہے یا غیر معمولی صورت حال پیدا ہوتی ہے تو لوگ خبروں کے لیے بی بی سی سے رابطہ پیدا کرتے ہیں۔ ان خبروں سے افواہوں کو جو فروغ ہوتا ہے، اس کی بنا پر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بی بی سی خبریں نشر کرنے ہی کا نہیں، تصنیف کرنے کا بھی ادارہ ہے۔ گویا اس ادارے کو نشریات کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف سے بھی گہری دلچسپی ہے۔ چوں کہ ہم نے کبھی بی بی سی کی خبریں نہیں سنیں، اس لیے ہم اس خیال کی تصدیق یا تردید نہیں کر سکتے، لیکن رضا علی عابدی کے چند پروگراموں کو سننے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ بی بی سی کو خبروں کی تصنیف و تالیف سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو، کتابوں کی تصنیف و تالیف سے ضرور دلچسپی ہے۔ ۱۹۷۵ء میں بی بی سی نے ایک پروگرام شروع کیا تھا ''کتب خانہ''۔ اس پروگرام میں ان اردو کتابوں کو متعارف کرایا جاتا ہے، جو برطانیہ کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ یہ پروگرام صرف ۱۲ ہفتوں کے لیے تھا، لیکن اس کی مقبولیت کی بنا پر اسے ایک سو چالیس ہفتوں تک نشر کیا گیا۔ عابدی صاحب نے ایسی ایسی نادر و نایاب کتابوں کا تعارف پیش کیا، جن کے بارے میں خود اردو والوں کی معلومات بہت محدود تھیں۔

اس پروگرام کی مقبولیت کے بعد بی بی سی نے ایک اور دلچسپ پروگرام پیش کرنے کا منصوبہ بنایا، جس کا مقصد یہ تھا کہ یہ معلوم کیا جائے کہ برصغیر میں پرانی کتابیں کہاں کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔ یہ کام بھی رضا علی عابدی کے سپرد کیا گیا۔ انھوں نے زادِ راہ کے طور پر ایک ٹیپ ریکارڈ گلے میں ڈالا اور لندن سے روانہ ہوئے۔ کراچی اور سندھ کے کئی اندرونی علاقوں کی سیر کرتے ہوئے بھوپال پہنچے۔ پھر رام پور، پٹنہ، ٹونک، حیدر آباد دکن، لکھنؤ اور لاہور کی کوچہ گردی کی۔ ہر جگہ کتابوں، کتب خانوں اور کتابوں کے عشاق کا سراغ لگایا۔ معلومات جمع کیں اور بی بی سی کے لیے ایسا پروگرام تیار کیا، جو اپنی مثال آپ تھا۔ ۱۹۸۲ء میں یہ پروگرام قسطوں میں نشر ہوا اور بے حد مقبول ہوا۔ برصغیر کے علمی و ادبی حلقوں سے لے کر عام لوگوں تک میں اس کا چرچا ہوا۔

سادات امروہہ کے مشاعرے میں پڑھا جانے والا کلام ہو یا ریڈیو سے نشر ہونے والے پروگرام، ان کی اہمیت لمحاتی ہوتی ہے۔ لوگ ایک کان سے سنتے ہیں اور دوسرے سے اُڑا دیتے ہیں۔ چند روز بعد کسی کو یاد نہیں رہتا کہ ریڈیو سے منی بیگم نے ناصر زیدی کی غزل گائی تھی یا ناصر زیدی نے منی بیگم کا کلام لکھا

تھا۔ مشاعروں کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوتا ہے۔ لوگ بھول جاتے ہیں کہ مشاعرہ سادات کا تھا یا فسادات کا کیوں کہ مشاعروں میں شاعروں کی باہمی چپقلش خاصی فساد انگیز ہوتی ہے۔

رضا علی عابدی نے بہت اچھا کیا کہ اپنے پروگراموں کو کتابی صورت میں محفوظ کر دیا۔ جن لوگوں نے بی بی سی کا پروگرام نہیں سنا، انھیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔ اس سے انھیں معلوم ہوگا کہ برصغیر میں نادر و نایاب قلمی کتابیں جگہ جگہ بکھری ہوئی ہیں، لیکن ان کے ساتھ جو سلوک کیا جا رہا ہے، وہ نہایت افسوس ناک ہے۔ کہیں کتابوں کو دوسروں کی نظروں سے بچانے کے لیے دفن کر دیا گیا اور کہیں احتراماً دریا میں بہا دیا گیا۔ بعض قیمتی کتابیں سرکاری کتب خانوں سے غائب کر دی گئیں یا مناسب دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے ضائع ہو گئیں۔ بعض مکانوں میں پرانی کتابوں کو بزرگوں کی نشانی سمجھ کر صندوق میں بند کر دیا گیا۔ سالہا سال بعد جب صندوق کھولے گئے تو ان میں مٹی کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

کتابوں کی گمشدگی کے سلسلے میں رضا علی عابدی نے سب سے زیادہ افسوس ناک انکشاف یہ کیا ہے کہ پنجاب پبلک لائبریری لاہور کی ۴۷ ہزار کتابیں گم ہو چکی ہیں۔ یہاں تک کہ چند برس قبل ممتاز حسن مرحوم نے اپنی بیٹی رفعت سلطانہ کی یاد میں اس لائبریری کو جو آٹھ ہزار کتابیں دی تھیں، ان میں سے چھ ہزار اب لائبریری میں موجود نہیں ہیں۔

رضا علی عابدی نے پرانی کتابوں کے بارے میں جو تحقیق کی ہے، اس سے قاری کی معلومات ہی میں نہیں، مالی ابتری میں بھی اضافہ ہوگا، کیوں کہ ۱۶۹ صفحوں کی اس کتاب کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ اس کا خریدنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ مجلد کتاب کی قیمت نوے روپے ہے اور غیر مجلد کے ساٹھ روپے۔ مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص کتاب کی صرف جلد خریدنا چاہے تو وہ تیس روپے میں ملے گی۔ ایک مرتبہ ہم نے اس قسم کی مہنگی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ اچھے وقتوں میں اتنی قیمت کی کتاب مع مصنف مل جایا کرتی تھی۔ اب مہنگائی کا زمانہ ہے، کتاب کی لاگت اتنی زیادہ آ جاتی ہے کہ کتاب اور مصنف دونوں کی قیمتیں الگ الگ مقرر کرنی پڑتی ہیں۔

عابدی صاحب نے پرانی کتابوں پر بہت عمدہ کام کر ڈالا۔ کیا ہی اچھا ہو، وہ اگر ایک مرتبہ پھر برصغیر کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازیں اور نئی کتابوں کے بارے میں بھی تحقیق کر ڈالیں۔ ہم انھیں یقین دلاتے ہیں کہ ان کی محنت رایگاں نہیں جائے گی۔ انھیں بے شمار ایسی کتابیں مل جائیں گی، جو دفن کر دینے یا دریا میں بہا دینے کے لائق ہوں، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ آج کل ایسی کتابیں ہی زیادہ چھپتی ہیں، جو مطبع سے نکل کر سیدھی ساحل سمندر پر پہنچ جاتی ہیں، یعنی کراچی پورٹ ٹرسٹ کے چیئرمین ایڈمرل ایم آئی ارشد کی توجہ سے اپنا صحیح مقام حاصل کر لیتی ہیں۔

(۱۷ مئی ۱۹۸۵ء)

عزت سادات بھی گئی!

کوئی کچھ بھی کہے، مگر انجمن سادات امروہہ کا یہ احسان ماننا پڑتا ہے کہ اس کی وجہ سے کراچی جیسے صنعتی وتجارتی اور ادبی اعتبار سے بے آب وگیاہ شہر میں ہر سال دو چار روز بڑی ادبی چہل پہل رہتی ہے۔ ہندوستان سے اور پاکستان کے کئی شہروں سے نامور شعرا تشریف لاتے ہیں، پہلے سادات امروہہ کے مشاعرے میں شرکت کرتے ہیں اور اس کے بعد ان کے اعزاز میں تقاریب کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پریس کلب، بزم خانہ اور آرٹس کونسل سے لے کر لانڈھی اور کورنگی تک کی ادبی انجمنوں کے تن مردہ میں جان پڑ جاتی ہے۔ شہر میں ہر طرف ادب ہی ادب نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ منی بسوں میں بھی ہندوستانی فلمی گانوں کی بجائے ہندوستانی شاعروں کے کیسٹ چلنے لگتے ہیں۔ کراچی کا ہر شہری اپنے آپ کو اہل قلم کانفرنس میں شریک سمجھتا ہے اور ادب کے مختلف مسائل پر گفتگو کرتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس گفتگو میں ادب کم ہوتا ہے اور امروہہ پن زیادہ۔ مطلب یہ کہ ساری گفتگو انجمن سادات امروہہ کے حوالے سے ہوتی ہے۔

ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ "امروہہ پن" کی ترکیب ایجاد بندہ نہیں، مولانا محمد حسین آزاد کی وضع کردہ ہے اور اسے مروج کرنے میں جوش ملیح آبادی کا بھی خاصا حصہ ہے۔ اب تین برسوں سے ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اس ترکیب کے لسانی وثقافتی اثرات پر تحقیق فرما رہے ہیں یا ان کا تجربہ کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر نارنگ کی تحقیق پر تو ہم بعد میں تحقیق کریں گے، پہلے مولانا محمد حسین آزاد اور جوش ملیح آبادی کے حوالے ملاحظہ فرمالیجیے، تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم بلاحوالہ بات کر رہے ہیں۔ حوالوں کے سلسلے میں ہم ڈاکٹر نارنگ کی طرح بے حد محتاط ہیں، یہاں تک کہ ہم کوئی غلط بات بھی بلاحوالہ نہیں کہتے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں شیخ مصحفی امروہوی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ مطلب کو بہت خوبی اور خوش اسلوبی سے ادا کرتے ہیں، مگر کیا کریں کہ امروہہ پن نہیں جاتا۔ اسی طرح

جوش صاحب نے "یادوں کی بارات" میں ایک صاحب کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ آدمی تو اچھے خاصے تھے، مگر باتوں میں امروہہ پن پایا جاتا ہے۔

آمدم برسر مطلب۔ گزشتہ چند برسوں سے سادات امروہہ کا مشاعرہ بہت دھوم دھڑ کے سے ہو رہا ہے۔ اب کے بھی بہت شان وشوکت سے مشاعرے کا انعقاد ہوا۔ کئی دن تک اخباروں میں اشتہار چھپتے رہے کہ ہندوستان سے سردار جعفری اور معین احسن جذبی آئیں گے۔ لاہور سے احمد ندیم قاسمی، کراچی سے ادا جعفری اور جمیل الدین عالی شرکت کریں گے۔ ہم جیسے بے شمار شائقین ادب نے ان مقبول شاعروں کے نام پر اپنی روزمرہ کی ضروریات کو نظر انداز کر کے ٹکٹ خریدے، لیکن مشاعرے میں جا کر معلوم ہوا کہ علی سردار جعفری اور جذبی کے عوض ہندوستان سے بونس حیدرآبادی آئے ہیں۔ اس تخلص کے اثرات کئی مقامی شاعروں کی شاعری میں بدرجۂ اتم موجود ہیں، اس صورت میں ہندوستان سے اس تخلص کو درآمد کرنے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ جناب احمد ندیم قاسمی کے بدلے میں لاہور سے کشور ناہید کو بلا لیا گیا، حالاں کہ کشور ناہید کا شاعرانہ مرتبہ ایسا ہے کہ انھیں ان کی ذاتی حیثیت میں بلانا چاہیے تھا، بلکہ اب تو ان کا شاعرانہ مرتبہ میر تقی میر کے برابر ہے۔ وہ بھی صاحب کلیات تھے اور انھوں نے بھی حال ہی میں کلیات شائع کر دی ہے۔ کراچی کے غیر حاضر شاعروں کی جگہ جون ایلیا سے پر کی گئی، حالاں کہ بے چارے جون ایلیا دوسروں کی جگہ تو کیا، اس جگہ کو بھی ٹھیک طرح سے نہیں پر کر سکتے، جو خود ان کے لیے مخصوص کی جاتی ہے۔

اس مشاعرے کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ کراچی کے کئی شاعروں کو مدعو نہیں کیا گیا، مثلاً محشر بدایونی، اقبال صفی پوری، صبا اکبر آبادی، شاعر لکھنوی اور پروین شاکر وغیرہ۔ ان شعرا کے بغیر ہم کراچی کے مشاعرے کا تو کیا، کراچی کی آب وہوا کا بھی تصور نہیں کر سکتے۔ خدانخواستہ ہمارا اشارہ فضائی آلودگی کی طرف نہیں، بلکہ عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ان شعرا کی خوبصورت شاعری نے کراچی کی تہذیبی زندگی کی صورت گری کی ہے۔ ان کا کسی مشاعرے میں نہ بلایا جانا منتظمین کی بدذوقی اور بدانتظامی سے زیادہ بداخلاقی سے تعلق رکھتا ہے۔

یہ مشاعرہ فیض احمد فیض کی یاد میں تھا، لیکن مشاعرے میں جو ہنگامہ آرائی ہوئی اور صہبا اختر جیسے نامور شاعر کے ساتھ جو ناگفتہ بہ سلوک ہوا، اس کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ فیض کا نام اس مشاعرے سے منسوب کر کے مرحوم کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔

صہبا اختر کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ ایک محب وطن شاعر ہیں اور پاکستان کی محبت میں سرشار رہتے ہیں۔ انھوں نے ایک ایسی نظم سنانی چاہی، جس کا مرکزی خیال پاکستان کی محبت تھا۔ بعض لوگوں نے یہ نظم سننے سے انکار کر دیا۔ اگر صہبا اختر بھی بعض دوسرے شاعروں کی طرح مذہب اور وطن کی تضحیک پر مبنی کلام سناتے تو کامیاب ہو سکتے تھے، لیکن انھوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ منتظمین سے سامعین اور شاعر

کے درمیان معرکہ آرائی نہ دیکھی گئی اور انھوں نے میکروفون کو بے صدا کر دیا، تاکہ شاعر کی کوئی بات سامعین تک نہ پہنچے اور سامعین کے کلام سے شاعر پوری طرح محظوظ ہو۔ نتیجہ یہ نکلا کہ صہبا اختر منظر سے ہٹ گئے۔ صہبا اختر کی زندگی کا یہ پہلا موقع ہے کہ ان کے ساتھ یہ سلوک ہوا، ورنہ اب تک جوش ملیح آبادی کی طرح سامعین پر وہی لاٹھی چارج کیا کرتے تھے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صہبا اختر کے ساتھ جو سلوک ہوا، اس پر تمام شعرا کو احتجاج کرتے ہوئے مشاعرے کا بائیکاٹ کر دینا چاہیے تھا۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔ اس سے صہبا اختر کو تو کوئی فائدہ نہ پہنچتا، بائیکاٹ کرنے والے ہی نقصان میں رہتے۔ ایک تو موجودہ مشاعرے کا محنتانہ کھٹائی میں پڑ جاتا، دوسرے اگلے سال مشاعرے میں شرکت کی دعوت نہ ملتی۔ شعرائے کرام اپنے ایک معزز ساتھی کی بے عزتی برداشت کر سکتے ہیں، لیکن یہ گوارا نہیں کر سکتے کہ سادات امروہہ والوں سے ان کی ان بن ہو جائے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی تاریخ میں جو اہمیت سادات بارہہ کو حاصل تھی، ادب کی تاریخ میں ویسی ہی اہمیت سادات امروہہ کو حاصل ہے۔

مشاعرے کی کامیابی کا ایک سبب یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس کے کنڈکٹر جناب محسن بھوپالی تھے۔ ایک شاعر ابھی پوری طرح کلام سنا نہیں پاتا تھا کہ کنڈکٹر صاحب دوسرے شاعر کو آواز دیتے تھے۔ گویا مشاعرے کی کنڈکٹری بھی بس کی کنڈکٹری تھی کہ مسافر پوری طرح اترتے بھی نہیں اور کنڈکٹر "جانے دو" کا مژدہ سنا دیتا ہے۔ بہرحال یہ ماننا پڑے گا کہ محسن بھوپالی نے نہایت عمدگی سے مشاعرے کو چلایا۔ یہ دوسری بات ہے کہ خود ان کی اپنی شاعری اس عمدگی سے نہیں چلی۔ محسن بھوپالی اگر صرف شاعر ہوتے تو چھٹے یا پانچویں نمبر پر کلام سنا کر ایک طرف بیٹھ جاتے۔ یہ کنڈکٹری ہی کا فیضان ہے کہ وہ شروع سے آخر تک مشاعرے پر چھائے رہے۔

مشاعرے کی صدارت سندھ اسمبلی کے اسپیکر حسین ہارون صاحب نے کی۔ موصوف چوں کہ شائستہ مزاج ہیں، اس لیے وہ طرفین (شعرا اور سامعین) کی شاعری کو زیادہ دیر تک برداشت نہ کر سکے اور صدارت کے فرائض جناب رئیس امروہوی کے سپرد کر کے رخصت ہو گئے۔ جناب رئیس نے یہ فرائض نہایت عمدگی سے انجام دیے، یعنی انھوں نے صدارت کی ساری مدت یحییٰ خان کی طرح غنودگی کے عالم میں گزار دی۔ شعرا کلام سناتے رہے اور جناب صدر خوابِ غفلت کے مزے لوٹتے رہے۔ حد تو یہ ہے کہ کیفی اعظمی کے مصرعوں سے بھی جناب صدر کے خراٹے ہم آہنگ رہے۔ منتظمین میں سے کسی نے صدر صاحب کو جگانے کی جسارت کی اور کہا۔ "کیفی اعظمی صاحب کلام پڑھ رہے ہیں، اب تو سونا ختم کیجیے۔" وہ سمجھے کہ ان سے مشاعرہ ختم کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے، لہٰذا انھوں نے فوراً مشاعرہ ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ گویا انھوں نے یہ ثابت کر دکھایا کہ مشاعرہ ختم ہو سکتا ہے، نیند کا سلسلہ ختم نہیں ہو سکتا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مشاعرہ ختم کرنے کی جلدی میں وہ کلام سنانا بھی بھول گئے۔ سامعین نے بھی اس غلطی کی

تلافی کے لیے اصرار نہ کیا۔ یہ اچھا ہی ہوا ورنہ بدخواہوں کو یہ کہنے کا موقع ملتا کہ...... اس شاعری میں عزتِ سادات بھی گئی۔

دوسرے دن انجمن سادات امروہہ کی طرف سے سیمینار منعقد ہوا، جس میں فیض احمد فیض کے شاعرانہ کمالات بیان کیے گئے۔ شرکت کرنے والوں میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ بھی تھے۔ سادات امروہہ والوں کا بڑا احسان ہے کہ وہ ہر سال ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو کراچی بلاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے علم و فضل اور پرکشش شخصیت کی وجہ سے پاکستان میں بے حد مقبول ہیں۔ کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے کہ جس طرح پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں میں قیدیوں کا تبادلہ ہوتا رہتا ہے، اسی طرح ادیبوں کا تبادلہ بھی ہوا کرے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے عوض ہم اپنے ہاں سے صہبا لکھنوی کو بھیجنے کے لیے تیار ہیں، بشرطیکہ صہبا صاحب کو ہر سال سادات امروہہ کے مشاعرے میں شرکت کے لیے بلایا جائے، کیوں کہ کبھی کبھی تو ان سے ملنے کو بھی جی چاہا کرے گا۔ ہماری اس تجویز سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ہم ڈاکٹر صاحب اور صہبا لکھنوی کو یکساں قدر و قیمت کی اشیائے تبادلہ سمجھتے ہیں۔ ہندوستان والے امریکہ کو سونا دے کر کھاد منگوا سکتے ہیں تو ہم سے ڈاکٹر نارنگ کے بدلے میں صہبا لکھنوی کو کیوں نہیں منگوا سکتے۔

ڈاکٹر صاحب ہر طبقۂ خیال کے ادیبوں میں مقبول ہیں۔ ترقی پسند انھیں دوستوں میں شمار کرتے ہیں، رجعت پسند انھیں اپنا رہنما سمجھتے ہیں، جدیدیے ان سے کسبِ فیض کرتے ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ انجمن سادات امروہہ والے بھی انھیں اپنوں میں شمار کرتے ہیں۔ اسی لیے یہ افواہ آج کل زوروں پر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو آئندہ "السید گوپی چند نارنگ امروہوی" کہا جائے گا۔ "السید" کا سابقہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ عرب ممالک میں "مسٹر" کے معنوں میں مستعمل ہے، لیکن انھیں "امروہوی" قرار دینے کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ مصحفی واقعی امروہہ کے ہیں لیکن ان کے قول و فعل سے ثابت نہیں ہوتا۔

ڈاکٹر صاحب نے انجمن ترقی اردو کے زیرِ اہتمام "سانحۂ کربلا، شعری استعارہ، ایک نیا رجحان" کے موضوع پر ایک مقالہ بھی پڑھا۔ یہ فکر انگیز مقالہ ان کے موجودہ سفر کا حاصل تھا۔ موضوع بھی نیا تھا اور اندازِ بیان بھی تازہ و شاداب۔ ڈاکٹر صاحب نے تفصیل سے بتایا کہ افتخار عارف اور پروین شاکر کی شاعری میں اس نئے رجحان کی عکاسی کس طرح ہوئی ہے۔ ضمناً انھوں نے بعض کم معروف شاعروں یعنی میر، غالب اور اقبال وغیرہ کا بھی ذکر کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے مقالہ پڑھنے سے پہلے بتایا کہ انھوں نے مقالے پر ابھی نظر ثانی نہیں کی۔ امید ہے نظر ثانی کے وقت میر و غالب اور اقبال کے ذکر کو حذف کر دیا جائے گا، تاکہ مقالہ غیر ضروری مواد سے گراں بار نہ ہو۔

(۱۳ مئی ۱۹۸۵ء)

☆..........☆..........☆

شاعری کا نشہ اور کالم کی ترشی

پچھلے ہفتے ہم نے سادات امروہہ کے مشاعرے پر کالم کیا لکھا، گویا کوئی جرم کر ڈالا۔ کچھ لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہم مشاعرے کے خلاف ہیں۔ واقعہ ہے کہ مشاعرہ تو کیا، ہم شاعری کے بھی خلاف نہیں، حالاں کہ اہل نظر منشیات کے خلاف چلائی جانے والی تحریک کے دائرۂ عمل میں شاعری کو بھی شامل کرنے کے حامی ہیں۔ ہم سے کئی مرتبہ کہا گیا کہ منشیات کے خلاف شاعری کے حوالے سے کچھ لکھا جائے، لیکن ہم نے اس بنا پر انکار کر دیا کہ شاعری ایسا نشہ نہیں ہے، جسے ہمارے کالم کی ترشی اتار دے۔

جہاں تک سادات امروہہ کے مشاعرے کا تعلق ہے، ہم اس کی افادیت کے دل سے قائل ہیں۔ اسی لیے ہم نے واضح لفظوں میں اعتراف کیا تھا کہ اس مشاعرے کی وجہ سے ہر سال کراچی کی ادبی رونق میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے باوجود بعض کرم فرماؤں نے ہمارے کالم کو مخالفانہ سمجھا اور مختلف طریقوں سے ہمیں راہِ راست پر لانے کی کوشش کی۔ ایک صاحب نے فرمایا:

''اگر آپ اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے تو اگلے سال آپ کو سادات امروہہ کے مشاعرے میں پڑھوا دیا جائے گا۔''

خدا کا شکر ہے کہ ہم شاعر نہیں، ورنہ جاں بحق ہونے کے لیے یہ دھمکی ہی کافی تھی۔ ہم تو خیر کیا پڑھیں گے، خدا نے چاہا تو اگلے سال بھی یہ مشاعرہ بوگس حیدر آبادی اور ان کی قبیل کے شاعر لوٹ کر لے جائیں گے۔

اسی سلسلے میں کچھ خط بھی موصول ہوئے ہیں۔ جی تو چاہتا ہے کہ یہ سب خط شائع کر دیے جائیں، لیکن ایسی صورت میں ''تکبیر'' کا یہ شمارہ خطوط نمبر بن جائے گا، لہٰذا بطور نمونہ صرف دو خط پیش کیے جاتے ہیں۔ پہلا خط جن صاحب کا ہے، انھوں نے اپنا نام خط شکستہ میں لکھا ہے۔ بڑی مشکل سے ''امروہوی'' پڑھنے میں آیا، لیکن نام کا جزو اول یعنی تخلص نہ پڑھا جا سکا۔ خط کے مطالب سے اندازہ ہوتا ہے کہ مکتوب نگار ''محرم رازِ درون ِ خانہ'' قسم کی چیز ہیں، یعنی انجمن سادات امروہہ کے اندرونی معاملات سے پوری طرح باخبر ہیں۔ موصوف فرماتے ہیں:

''آپ نے اپنے کالم میں مشاعرے کے صرف تاریک پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، حالاں کہ یہ کراچی کی تاریخ کا کامیاب ترین مشاعرہ تھا۔ اگر اس میں ہوٹنگ ہوئی تو یہ غیر متوقع بات نہیں تھی۔ اس کے بغیر مشاعرہ بے مزہ ہوتا ہے۔ منتظمین نے مشاعرے کو کامیاب بنانے کے لیے دل کھول کر رقم صرف کی۔ اس کے مقابلے پر ٹکٹوں سے جو آمدنی ہوئی، وہ بہت کم تھی۔ اخراجات کا اندازہ آپ اس سے کیجیے کہ ہر مقامی شاعر کو پانچ سو روپے معاوضہ پیش کیا گیا۔ باہر سے آنے والے پاکستانی شعرا کو ہزار روپے اور ہندوستانی شعرا کو دو ہزار روپے فی کس ادا کیے گئے۔ بیرونی شعرا کو ہوائی جہاز کا آمد و رفت کا کرایہ دیا گیا اور ان کے قیام و طعام کے انتظامات بھی شاندار پیمانے پر کیے گئے۔ انجمن نے اب کے صرف کھانے کا انتظام کیا تھا، پینے کا انتظام شعرا نے خود یا ان کے احباب نے کیا تھا۔ کراچی میں قحطِ آب کی وجہ سے شعرا کرام کو بتا دیا گیا تھا کہ انجمن پینے پلانے کی ذمہ داری نہیں لے سکتی۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ شعرا نے بقیہ ہوش و حواس کلام سنایا، یہاں تک کہ عطا شاد نے پچھلے سال جو غزل ادھوری چھوڑی تھی، اس کے بھی باقی شعر اس سال سنا دیے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ انجمن کی طرف سے ہر شاعر کو ایک قیمتی گھڑی تحفے میں دی گئی۔ خاص خاص شاعروں کو کچھ اور تحفے بھی دیے گئے۔ کیا ان حقائق کے پیشِ نظر کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ مشاعرہ کامیاب نہیں رہا۔''

محترم مکتوب نگار نے جو معلومات فراہم کی ہیں، ان کی بنا پر مشاعرے تو کیا کسی شاعر کو بھی ناکام نہیں کہا جا سکتا۔ انجمن سادات امروہہ کی فراخ دلی قابلِ ستائش ہے کہ اس نے محنتانے کے ساتھ شاعروں کو گھڑیاں بھی دیں، تاکہ وہ وقت کی قدر کریں اور اسے کسی بہتر کام میں صرف کریں، البتہ آمد و رفت کے کرائے والی بات جزوی طور پر صحیح نظر نہیں آتی، کیوں کہ بہت سے بیرونی شعرا ابھی کراچی ہی میں مقیم ہیں۔ انھیں یقیناً واپسی کا کرایہ نہیں ملا ہوگا، ورنہ یہ اب تک کراچی سے جا چکے ہوتے۔

یہ صحیح ہے کہ ایک رات میں جتنی آمدنی شاعروں کو ہوتی ہے، اتنی تو ان کو بھی نہیں ہوتی، لیکن اس سلسلے میں مقامی، بیرونی اور ہندوستانی کی درجہ بندی نہ کی جاتی تو اچھا تھا۔ یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ کون کتنا فاصلہ طے کر کے آیا، یہ دیکھنا چاہیے کہ کس کی کتنی ہوٹنگ ہوئی۔ اس معیار سے محنتانہ دیا جاتا تو مقامی شعرا باقی شعرا سے یقیناً بازی لے جاتے۔ صہبا اختر تو راتوں رات لکھ پتی بن جاتے۔

دوسرا خط مشہور شاعر جناب محسن بھوپالی کا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''گاہے گاہے ''تکبیر'' نظر سے گزرتا رہتا ہے۔ تازہ شمارے میں سادات امروہہ کے مشاعرے

کے سلسلے میں لکھتے ہوئے آپ نے تحریر فرمایا ہے۔ "بہرحال یہ ماننا پڑے گا کہ محسن بھوپالی نے نہایت عمدگی سے مشاعرے کو چلایا۔" اس کے بعد آپ نے جو یہ کمنٹ دیا ہے کہ ـــــ یہ دوسری بات ہے کہ خود ان کی اپنی شاعری اس عمدگی سے نہیں چلی، تو گزارش ہے کہ میں نے دو تازہ قطعات اور ایک تازہ غزل اس مشاعرے میں سنائی تھی۔ مجھے مختلف اشعار پر داد بھی ملی اور جب میں نے غزل ختم کی تو حاضرین نے ایک اور فرمائش بھی کی، جس کے جواب میں میں نے مائیک پر کہا تھا کہ میں تو کراچی کا ہی ہوں، پھر کبھی سن لیجیے گا۔ واضح رہے کہ یہ گفتگو میرے ویڈیو کیسٹ میں محفوظ ہے۔ اس وضاحت سے میرا مقصد ذاتی تشہیر نہیں، بلکہ اظہار حقیقت ہے۔

اب دوسری بات صہبا اختر سے متعلق۔ وہ میرے دیرینہ دوست ہیں۔ ان کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کا سبھی کو افسوس ہے۔ ڈائس پر تابش دہلوی اور ضمیر جعفری سے لے کر پیرزادہ قاسم تک بھی شعرا موجود تھے۔ یقیناً یہ اور دوسرے شعرا بائیکاٹ کرنے یا نہ کرنے کے پوری طرح مجاز تھے۔ آپ کی طرح کم از کم میں ان حضرات پر موجودہ مشاعرے کے محنتانے کے کھاتے میں پڑنے اور آئندہ سال نہ بلائے جانے کے اندیشے کو ترجیح دینے کا الزام نہیں لگا سکتا۔

صحیح صورت حال کو سمجھنے کے لیے آیئے، تھوڑی دیر کے لیے پھر مشاعرے میں چلتے ہیں۔ مشاعرہ ابھی شروع نہیں ہوا ہے۔ حاضرین کثیر تعداد میں اپنی نشستوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ شعرا کو مسند پر تشریف رکھنے کی دعوت دی گئی ہے اور شعرا ایک طویل صف کی صورت میں بیٹھ رہے ہیں۔ صہبا اختر جیسے ہی آ کر بیٹھے، حاضرین میں سے ایک صاحب اٹھے اور انھیں مخاطب کر کے کہا۔ "صہبا اختر صاحب! طویل نظم نہیں سنایئے گا۔" صہبا اختر نے وہیں سے جواب دیا۔ "میں تو طویل نظم سناؤں گا، نہیں سننا تو چلے جائیں۔" اس مکالمے کے میرے علاوہ یعقوب لطیف، جون ایلیا اور کئی سامعین گواہ ہیں۔

میں نے بحیثیت کمپیئر جب صہبا اختر کو کلام سنانے کی دعوت دی تو سامنے بیٹھے ایک گروپ نے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ میں نے فوراً مائیک پر اپیل کی۔ "حضرات! یہ ادبی محفل ہے، آپ مشاعرے کی فضا کو برقرار رکھیے۔" اس دوران صہبا اختر نے دو تین قطعات سنائے اور پھر نظم کے عنوان کا اعلان کیا "کنفیڈریشن" اور نظم شروع کر دی۔ دو تین بند کے بعد اسی گروپ نے پھر ہنگامہ آرائی شروع کر دی۔ دو ایک اور گوشوں سے بھی نعروں کی آواز بلند ہوئی۔ میں نے پھر اپیل کی، حاضرین سے کہا کہ وہ مشاعرے کی فضا کو برقرار رکھیں۔ ابھی اپیل جاری تھی کہ صہبا اختر نے مائیک پر دو ٹوک انداز میں کہا اگر میں غدار ہوں تو آپ سب غدار ہیں! اس پر لوگ بے قابو ہو گئے اور صہبا اختر اپنی نظم پوری نہیں کر سکے۔ صہبا اختر چوں کہ مسئلہ اپنے ہاتھ میں لے چکے تھے، اس لیے شعرا اور منتظمین خود کو بے بس محسوس کر رہے تھے۔ بہرحال اس ادبی سانحے پر ہم سب کو دلی افسوس ہے۔ جہاں تک مجمع کے مزاج کا

تعلق ہے تو بطور مثال عرض کرتا چلوں کہ صہبا اختر سے کافی پہلے پیرزادہ قاسم سے فرمائش کر کے اس مجمع نے دو غزلیں سنیں۔ ان کے بعد اقبال عظیم کو متعدد فرمائشیں پوری کرنا پڑیں اور انھوں نے تقریباً ۲۰ منٹ تک کلام سنایا۔

آخری بات! محب وطن ہونے اور پاکستان کی محبت میں سرشار رہنے کے لیے کسی سرٹیفکیٹ یا اجازت کی ضرورت نہیں۔ ہر پاکستانی محب وطن ہے۔ اگر وہ غدار ہے یا غیر محب وطن ہے تو اس کے لیے پاکستان کا آئین اور تعزیراتی قانون ہے، جو وقتاً فوقتاً حرکت میں آتا رہتا ہے۔ جہاں تک شعرا کا تعلق ہے، مختلف اصناف سخن میں اپنی تخلیقی صلاحیت کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں اور بعض ایسے بھی ہیں، جن کے لیے میں نے بہت پہلے ایک قطعہ کہا تھا:

پھولوں میں تھے ، چاند ستاروں میں رہے ہیں
کچھ لوگ ہمیشہ ہی بہاروں میں رہے ہیں
ہے ان سے توقع ہی غلط حرمتِ فن کی
ہر دور کے جو نقش نگاروں میں رہے ہیں

(محسن بھوپالی)

جناب محسن بھوپالی کے ہم ممنون ہیں کہ انھوں نے یہ وضاحتی مکتوب لکھ کر ہماری معلومات ہی میں نہیں، اردو مکتوب نگاری کے ذخیرے میں بھی گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ کیا تعجب کہ ادب کی تاریخ میں ان کا نام ان کے خطوط کی وجہ سے باقی رہ جائے۔ بالکل ویسے ہی، جیسے مولانا محمد حسین آزاد اور ڈپٹی نذیر احمد زندگی بھر شاعری کرتے رہے، لیکن آج ہم انھیں ان کی نثر کی وجہ سے جانتے ہیں۔

محسن صاحب نے ہماری دو باتوں کا حوالہ دیا ہے۔ ایک یہ کہ انھوں نے مشاعرے کو بہت عمدگی سے چلایا، دوسری یہ کہ ان کی شاعری اتنی عمدگی سے نہیں چلی۔ محسن صاحب نے پہلی بات کو تو مان لیا، حالاں کہ ہم نے مشاعرے کی تنظیم کو بسوں کے مماثل قرار دیا تھا، لیکن ہماری دوسری بات کی تردید میں انھوں نے فرمایا ہے کہ مشاعرے میں انھیں بعض شعروں پر خوب داد ملی اور مزید کلام سنانے کی فرمائش کی گئی۔ محسن صاحب نے بجا فرمایا، لیکن انھوں نے ہماری بات کو سیاق و سباق سے الگ کر کے پیش کیا ہے۔ ہم نے ہرگز یہ نہیں کہا تھا کہ سادات امروہہ کے مشاعرے میں ان کی شاعری نہیں چلی۔ مشاعرے میں تو سب کچھ چل جاتا ہے۔ ہم مشاعرے سے باہر کی بات کر رہے تھے۔ اب آپ ہمارا جملہ دوبارہ پڑھیے تو آپ کو تردید کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

صہبا اختر کے بارے میں محسن بھوپالی کا لہجہ بڑا ہمدردانہ اور دوستانہ ہے، لیکن ان کی تحریر کا بین السطور مفہوم خاصا سخن گسترانہ ہے۔ یعنی وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ صہبا اختر کے ساتھ جو کچھ ہوا، اس کے

ذمہ دار وہ خود ہیں۔ ہمیں تو اب تک یہی معلوم تھا کہ صہبا اختر صرف اپنی شاعری کی حد تک ذمہ داری قبول کرتے ہیں، یہ پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ ہوٹنگ کے ذمہ دار بھی وہی تھے۔ صہبا اختر کے طرف داروں کا تو یہ کہنا ہے کہ اگر مشاعرے کی نظامت محسن بھوپالی کے ہاتھ میں نہ ہوتی تو مشاعرہ صہبا اختر کے ہاتھ میں ہوتا۔ اس صورت میں محسن بھوپالی سے ہم یہی کہہ سکتے ہیں: ؎

وہی قتل بھی کرے ہے ، وہی لے ثواب الٹا

خط کے آخر میں محسن بھوپالی نے اپنا جو قطعہ درج کیا ہے، اس کا ہدف بھی صہبا اختر ہیں۔ کسی زمانے میں صہبا اختر نے پیپلز پارٹی کا نوحہ لکھا تھا۔ ہمارے خیال میں یہ ایسا ''جرم'' نہیں ہے، جو نا قابل معافی ہو۔ جب پیپلز پارٹی کے آلہ مکبر الصوت مولانا کوثر نیازی صاحب چار دانگ عالم میں اپنا کلام سنا سکتے ہیں تو صہبا اختر سادات امروہہ کے مشاعرے میں اپنی نظم کیوں نہیں پڑھ سکتے؟

(۳۱ مئی ۱۹۸۵ء)

☆......☆......☆

کسرتی شاعر

ایسا کم ہی دیکھنے میں آیا ہے کہ کوئی اچھا خاصا پڑھا لکھا شخص پڑھنے لکھنے سے اتنا بیزار ہو جائے کہ دنیا کو ایک بازی گاہ سمجھ کر اپنی پوری زندگی مختلف بازیوں کی نذر کر دے۔ مرغ بازی، بٹیر بازی، تیتر بازی، کبوتر بازی، پتنگ بازی، لطیفہ بازی، پتے بازی (تاش) اور بیت بازی سے لے کر ہاکی، کرکٹ، فٹ بال، پہلوانی، باکسنگ، شطرنج، گھڑ سواری اور شکار تک کی بازیوں اور تفریحوں کی شاید ہی کوئی قسم ہوگی، جس سے ہمارے آج کے کالم کے ہیرو کا تعلق نہ رہا ہو۔ اس سے پہلے کہ ہم اُن کے بارے میں کچھ عرض کریں، ان کے ایام جوانی کی تفصیل خود انھیں کی زبان سن لیجیے:

''میرا یہ معمول تھا کہ صبح ہوتے ہی سواری کے لیے کھیتوں میں نکل جاتا ——— دو تین گھنٹے اس کام میں صرف ہو جاتے تھے۔ نو بجے کے قریب واپس آتا اور دو گھنٹے کسرت کرتا۔ ڈنڈ بیٹھک سے لگاتا، مگدر اور منگلیوں سے کسرت کرتا۔ اس کے بعد مالش کروا کر نہاتا اور باہر مردانے میں بیٹھ کر ملنے والوں اور مریضوں سے ملاقات کرتا۔ ایک بجے کے قریب کھانا کھاتا اور ایک سے چار بجے تک سوتا یا آرام کرتا۔ اس کے بعد اکھاڑے میں کشتی لڑتا۔ غروب تک یہ شغل جاری رہتا ——— رات کو کوئی نہ کوئی کھیل تماشا ضرور ہوتا ...... کبھی بہروپیے آتے، کبھی بھانڈ، کبھی بھاٹ، کبھی دیہاتی موسیقار، کبھی پکا گانے والے بھی آ جاتے ...... ایسی محفلیں نصف شب تک جاری رہتی تھیں۔ اگلی صبح پھر وہی معمول ہوتا۔''

آپ یقیناً سوچ رہے ہوں گے کہ یہ معمولات تو گاماں پہلوان، محمد علی کلے یا صہبا لکھنوی کے ہی ہو سکتے ہیں۔ جی نہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں، جو اتنی کسرت کے بعد مریضوں سے ملاقات کرے۔ ان ڈاکٹروں سے ملاقات کی نوبت آ سکتی ہے۔

قارئین کرام کو زیادہ دیر تک تذبذب کے عالم میں رکھنا ٹھیک نہیں، لہٰذا ہم بتائے دیتے ہیں کہ

ہمارے ممدوح کنور مہندر سنگھ بیدی ہیں، جو اُردو کے نامور شاعر ہیں اور پاک و ہند، دونوں ملکوں میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔ پاکستان میں کنور صاحب کی مقبولیت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ ان کی آپ بیتی "یادوں کا جشن" پہلی مرتبہ پاکستان میں شایع ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہندوستان پبلشروں نے اسے چھاپنے سے انکار کر دیا تھا اور یہ بھی نہیں کہ پاکستانی پبلشروں کو چوں کہ ملکی مصنفین کی کتابیں چھاپنے سے دلچسپی نہیں ہے، اس لیے کسی نے سردار دیوان سنگھ مفتون کی آپ بیتی "ناقابل فراموش" کی طرح کنور صاحب کی آپ بیتی کو بھی بلا اجازت اس خیال سے چھاپ دیا ہوگا کہ سکھوں کے لطیفوں کی طرح سکھوں کی کتابیں بھی خوب چلتی ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ کنور صاحب کی آپ بیتی ان کی اجازت سے چھاپی گئی ہے، گو خود کنور صاحب نے اس کتاب کے لکھنے کے سلسلے میں کسی سے اجازت لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

یوں تو یہ کتاب ۱۹۸۳ء میں چھپ گئی تھی، مگر ناشر نے اسے پورے دو سال بعد شائع کیا ہے۔ کتاب کو چھاپ کر سرد خانے میں رکھنے کا سبب شاید یہ ہے کہ اس میں جوش صاحب کی "یادوں کی برات" جیسے گرما گرم لطیفے خاصی تعداد میں ہیں۔ ناشر نے سوچا ہوگا، سرد خانے میں پڑے پڑے ان لطیفوں کی گرمی زائل ہو جائے تو کتاب کو مارکیٹ میں لایا جائے، مگر یہ اندازہ غلط نکلا۔ لطیفے ویسے ہی گرما گرم ہیں، جیسے دو سال پہلے تھے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ان لطیفوں میں سے ایک دو بھی بطور نمونہ یہاں پیش نہیں کیے جاسکتے۔ جن لوگوں کی نظر سے "یادوں کی برات" گزری ہے، صرف وہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ کنور صاحب نے کیا کیا سخن آرائیاں کی ہوں گی۔ موصوف نے دیباچے میں عرض کیا ہے:

> "میں بھی آدمی ہوں اور گناہ ابن آدم کی سرشت ہے۔ میں کوئی ولی یا پارسا نہیں ہوں اور نہ ہی میرا دل پتھر کا بنا ہوا ہے، مگر مجھ میں جوش صاحب کی سی اخلاقی جرأت نہیں کہ میں اس قدر صاف گوئی سے کام لوں۔"

یہ محض انکسار ہے۔ جہاں تک اخلاق اور اخلاقی جرأت کا تعلق ہے، جوش صاحب اور کنور صاحب میں بس انیس بیس کا فرق ہے اور اس کا فیصلہ قرعہ اندازی ہی سے ہو سکتا ہے کہ انیس کون ہے اور بیس کون؟

کنور مہندر سنگھ بیدی اور جوش ملیح آبادی کی آپ بیتیوں میں جو مماثلت پائی جاتی ہے، وہ صرف گرما گرم لطیفوں کی حد تک نہیں ہے، بلکہ خود جوش صاحب کی ذات بھی دونوں آپ بیتیوں میں مشترک عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ کنور صاحب نے جوش صاحب کا ذکر کثرت سے کیا ہے۔ شاید دوران تحریر انھیں یاد نہیں رہا کہ وہ اپنے متعلق بارے میں کتاب لکھ رہے ہیں یا جوش صاحب کے بارے میں۔ اگر جوش صاحب سے متعلق تمام حصوں کو الگ کر لیا جائے تو ایک اور یادوں کی برات تیار ہو سکتی ہے۔

کنور صاحب کا کمال یہ ہے کہ...... انھوں نے جوش صاحب کے حوالے سے کوئی ایسا واقعہ نہیں لکھا، جو "یادوں کی برات" میں موجود ہو۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جوش صاحب کے بیان کردہ بیشتر واقعات ان کی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے عکاس ہیں۔ جوش صاحب کو شعر لکھنے ہی میں نہیں، واقعات تصنیف کرنے میں بھی کمال حاصل تھا۔ کنور صاحب نے جوش صاحب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ "یادوں کی برات" میں اٹھارہ معاشقوں کا ذکر تھا۔ انیسویں کی تفصیل کنور صاحب نے پیش کی ہے۔ بازی سے لے کر لطیفہ بازی تک جتنی شریفانہ بازیاں ہو سکتی ہیں، کنور صاحب ان سب کے دلدادہ اور سب کی خدمت پر آمادہ رہتے ہیں۔

ادب اور فنون لطیفہ سے گہری دلچسپی اور اہم سرکاری عہدوں پر تعیناتی کی وجہ سے کنور صاحب کو گونا گوں تجربے حاصل ہوئے اور مختلف طبقوں کے بے شمار افراد کو قریب سے دیکھنے کے مواقع ملے۔ اُن کی کتاب انھیں تجربات و مشاہدات کا مرقع ہے۔ سوا چار سو سے زائد صفحات میں شاید ہی کوئی صفحہ ہوگا، جو دلچسپی سے خالی ہو، بشرطیکہ اس صفحے پر کنور صاحب نے اپنا کلام بلاغت نظام درج نہ فرمایا ہو۔

کنور صاحب کو جو لوگ ذاتی طور پر جانتے ہیں، انھیں معلوم ہے کہ موصوف باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔ اُن کی شخصیت کی یہ خصوصیت ان کی تحریر میں بھی پائی جاتی ہے۔ جب وہ کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں یا کسی کا شخصی خاکہ لکھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم کتاب نہیں پڑھ رہے۔ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ حد تو یہ ہے، جہاں کہیں کنور صاحب نے اپنے بعض گناہوں کا ذکر کیا ہے، پڑھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ یہ گناہ خود اس سے سرزد ہو رہے ہیں۔ اس سلسلے میں کنور صاحب کو کم سے کم لفظوں میں زیادہ سے زیادہ مطالب ادا کرنے کا فن بھی آتا ہے۔ اگر انھیں مطالب کو ڈاکٹر عبادت بریلوی ادا کرتے تو سوا چار سو صفحے بھی سوا چار ہزار صفحے بن جاتے۔

کنور صاحب نے تقریباً ایک سو افراد سے اپنے تعلقات کی روداد بیان کی ہے یا اُن کے بارے میں اپنے مشاہدات کو قلم بند کیا ہے۔ وہ ایک آدھ صفحے ہی میں متعلقہ فرد کی خوبیاں اور خامیاں بڑی خوبصورتی سے بیان کر دیتے ہیں۔ جن افراد پر کنور صاحب نے لکھا ہے، ان میں سیاست دان بھی ہیں اور شاعر بھی، علما بھی ہیں اور سرکاری عہدے دار بھی، فلمی اداکار بھی ہیں اور غیر معروف اشخاص بھی۔ یہ سب لوگ اپنے اصل خد و خال کے ساتھ ہمارے سامنے آتے ہیں۔ کنور صاحب نے روایتی اخلاق سے کام لے کر کسی تصویر کو اصل سے بہتر بنانے کی کوشش نہیں کی۔

کنور صاحب نے دوسروں کے بارے ہی میں نہیں، اپنے بارے میں بھی بعض سنسنی خیز انکشافات کیے ہیں۔ مثلاً کچھ بدخواہوں نے یہ افواہ اڑادی کہ کنور صاحب خود شعر نہیں لکھتے، دوسروں سے لکھواتے ہیں۔ کنور صاحب نے اس الزام کی تردید میں بہت زور قلم صرف کیا ہے، حالاں کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ کنور صاحب کا کلام ایسا ہے کہ اس کا مصنف خود ان کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ مثلاً کنور صاحب نے

جو پہلا شعر کہا تھا، وہ یہ تھا:

ذرا ہشیار رہنا ، دیکھنا ، دھوکا نہ کھا جانا
حسینوں نے چھپایا آستیں میں مار ہوتا ہے

کنور صاحب آج بھی اسی قسم کے شعر کہتے ہیں۔ یہ انھیں کا حوصلہ ہے اور انھیں کا رنگِ خاص ہے۔ کوئی دوسرا اس قسم کے شعر کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا، کیوں کہ عام شاعروں نے حسینوں سے مار تو کھائی ہوگی، ان کی آستینوں میں مار بھی نہیں دیکھے ہوں گے۔

کنور صاحب نے اپنی بادہ آشامی پر بھی ایک باب لکھا ہے۔ انھوں نے اپنے آپ کو "بادہ پرست" کہا ہے، "شراب خور" نہیں۔ اس کی انھوں نے یوں وضاحت کی ہے:

"بادہ پرستی مے سے لطف اندوز ہونے کو کہتے ہیں اور شراب خوری مے سے رسوائی حاصل کرنے کا نام ہے۔"

کنور صاحب نے اپنی لطف اندوزی کا ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے:

"جب وہسکی کے تین چار دور چل چکے تو مسٹر اندر ناتھ چپ کہنے لگے کہ بیدی صاحب! آج آپ کو خاص ڈرنک پلاتا ہے۔ اگر وہ پی کر آپ قائم رہے تو آپ کو استاد مانیں گے۔ میں نے کہا۔ "شراب نوشی کوئی ایسا ہنر یا فن نہیں، جس میں استاد بن کر میں اپنا سر اونچا کرسکوں، لیکن اگر آپ مجھے نیچا دکھانا چاہتے ہیں تو میں آپ کا یہ چیلنج منظور کرتا ہوں، مگر آپ کو ایسا کرنا تھا تو مجھے پہلے وہسکی نہیں دینی چاہیے تھی، کیوں کہ شرابیں شرابوں میں ملیں تو نشہ دو چند ہو جاتا ہے۔" ..... مسٹر چپ نے خدا جانے کیا کیا ملا کر ایک بہت بڑے شیشے کے جگ میں ڈال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ میں اسے پانچ سات منٹ میں پی گیا۔ نشہ تیز تو ہوگیا، مگر مجھ پر اس کا کوئی شدید اثر نہ ہوا۔ تمام لوگ میرے منھ کی طرف دیکھ رہے تھے اور توقع کر رہے تھے کہ میں ابھی گرا کہ گرا۔ پندرہ بیس منٹ اور گزر گئے، مگر میں بدستور قائم رہا تو مسٹر چپ کہنے لگے۔ "بیدی صاحب! کچھ اور آئے۔" میں نے کہا۔ "کوئی حسرت دل میں باقی ہے تو وہ بھی نکال لو۔" چنانچہ وہ پہلے سے بھی بڑا ڈرنک ملا کر لے آئے۔ میں نے وہ بھی پی لیا۔ جب کھانا میز پر چن دیا گیا اور ہم سب اٹھ کر اُدھر جانے لگے تو مسٹر چپ اور مسز کپلا میرے دائیں بائیں چلنے لگے، تاکہ میں گرنے لگوں تو مجھے سنبھال لیں، لیکن میں صحیح سلامت کھانے کی میز تک چلا گیا ..... جب کھانا ختم ہوا اور سب اپنے گھر جانے لگے تو کئی مہمان ایسے تھے، جن کے پاس موٹر گاڑی نہیں تھی۔ میں نے ان سے کہا کہ چلیے میں آپ کو اپنی گاڑی میں لے چلتا ہوں۔ وہ اس ڈر سے میری گاڑی میں نہیں بیٹھے کہ کہیں

راستے میں حادثہ نہ کر بیٹھوں۔ آخر دو ایک تیار ہوئے اور میں نے انھیں اُن کے گھر چھوڑا اور اپنے گھر لوٹا۔"

اس واقعے سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ کنور صاحب کی طرح ان کی موٹر بھی پٹرول کی بجائے شراب ہی سے چلتے ہوگی۔

(۱۳ر جون ۱۹۸۵ء)

☆..........☆..........☆

جوشؔ صاحب کا انیسواں معاشقہ

اپنے ایک کالم میں ہم نے عرض کیا تھا کہ کنور مہندر سنگھ بیدی کی آپ بیتی "یادوں کا جشن" میں جوش صاحب کی "یادوں کی برات" جیسے گرما گرم لطیفے خاصی تعداد میں ہیں، لیکن یہ مماثلت صرف لطیفوں کی حد تک نہیں ہے، بلکہ خود جوش صاحب کی ذات بھی دونوں آپ بیتیوں میں مشترک عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ کنور صاحب نے جوش صاحب کا ذکر کثرت سے کیا ہے۔ شاید دوران تحریر انھیں یاد نہیں رہا کہ وہ اپنے بارے میں کتاب لکھ رہے ہیں یا جوش صاحب کے بارے میں۔ اگر جوش صاحب سے متعلق تمام حصوں کو الگ کرلیا جائے تو ایک اچھی خاصی کتاب تیار ہو سکتی ہے۔

کنور صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے جوش صاحب کے بارے میں کوئی ایسا واقعہ نہیں لکھا، جو "یادوں کی برات" میں موجود ہو۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جوش صاحب کے بیان کردہ بیشتر واقعات ان کی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے عکاس ہیں۔ جوش صاحب کو شعر لکھنے ہی میں نہیں، واقعات تصنیف کرنے میں بھی کمال حاصل تھا۔ کنور صاحب نے جوش صاحب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ "یادوں کی برات" پر اضافے کا درجہ رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک عدد معاشقے کا بھی انھوں نے اضافہ کیا ہے۔ "یادوں کی برات" میں اٹھارہ معاشقوں کا ذکر تھا، انیسویں کی تفصیل کنور صاحب نے پیش کی ہے۔

کنور صاحب نے جوش صاحب سے عقیدت و محبت کا اظہار بڑے والہانہ انداز سے کیا ہے، لیکن بیان حقیقت میں کسی مصلحت کو راہ نہیں دی۔ ان کی کتاب ابھی عام نہیں ہوئی، اس لیے اس کے کچھ دلچسپ اقتباسات ذیل میں پیش کیے جاتے ہیں۔ قارئین کرام یہ تصور کرلیں کہ اس ہفتے کا کالم ہم نے نہیں، کنور مہندر سنگھ بیدی نے لکھا ہے۔

...... کچھ دنوں کے بعد جب جوش صاحب واپس پاکستان جانے لگے تو شام کو میرے پاس آئے اور دیر تک بیٹھے رہے۔ میں نے معلوم کیا آپ ان تمام مراعات اور احترام کو نظر انداز کرکے آخر پاکستان

کیوں چلے گئے۔ کہنے لگے، میرا تو جس طرح بھی ہوتا، یہاں گزر ہو جاتا، مگر میرے بچوں کا یہاں کوئی مستقبل نہیں۔ اُدھر پاکستان والوں نے مجھے جو کچھ دینے کا وعدہ کیا ہے، اس سے کم از کم اٹھارہ ہزار روپیہ ماہوار کی آمدنی تو فوراً شروع ہو جائے گی۔ اب پاکستان والوں نے کہاں تک اپنا وعدہ پورا کیا، مجھے اس کا علم نہیں، لیکن میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ جس جوش ملیح آبادی نے تمام عمر سرمایہ داری اور سرمایہ داروں کی مذمت کی، وہ خود سرمایہ کی ہوس میں پاکستان منتقل ہو گئے۔ میں نے خود جوش صاحب سے کئی بار کہا، اگر آپ منکر خدا نہ ہوتے تو پاکستان جانے سے میں آپ کو روکنے کی کوشش بھی نہ کرتا، مگر آپ خدا کی ذات کو تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ اب آپ ہی بتایئے، کسی خالص اسلامی ملک میں ایک ملحد کا فر کیسے پنپ سکے گا۔ اس بات کا جوش صاحب کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

جن دنوں جوش صاحب رسالہ "آج کل" کے ایڈیٹر تھے ان کے تین نائب ایڈیٹر ہوا کرتے تھے، جو عرش ملسیانی، جگن ناتھ آزاد اور سردار بلونت سنگھ تھے۔ سردار بلونت سنگھ ایک روز جوش صاحب کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ مجھے پستول کے لائسنس کی ضرورت ہے، مگر پستول کا لائسنس صرف چیف کمشنر دہلی ہی دے سکتا ہے۔ ان دنوں شنکر پرشاد جی چیف کمشنر تھے، جو جوش صاحب کے مداح تھے اور جوش صاحب کی بہت قدر کرتے تھے۔ جوش صاحب سردار بلونت سنگھ کو لے کر ان کے پاس گئے۔ شنکر پرشاد جی نے پوچھا کہ جوش جی! کیسے کیسے تشریف لائے تو جوش صاحب نے بلونت سنگھ سے کہا کہ بھئی بتاؤ ہم کیسے آئے ہیں۔ بلونت سنگھ نے کہا کہ مجھے پستول کا لائسنس چاہیے۔ جوش صاحب نے کہا، ہاں صاحب! انھیں پستول کا لائسنس چاہیے۔ شنکر پرشاد کہنے لگے، بلونت سنگھ جی! آپ تو ایک رسالے کے نائب ایڈیٹر ہیں، بھلا آپ کو اس کی کیا ضرورت ہے۔ جوش صاحب نے کہا، بلونت سنگھ جی! شنکر پرشاد جی صحیح فرما رہے ہیں۔ ایک ایڈیٹر یا نائب ایڈیٹر کو پستول کی کیا ضرورت ہے۔ اس پر بلونت سنگھ پھر شنکر پرشاد جی سے مخاطب ہوئے اور کہا کہ میرا گھر دور ہے اور شام کو گھر دیر سے پہنچتا ہوں۔ اندھیرا ہو جاتا ہے، راستہ مخدوش ہے، اس لیے پستول کی ضرورت ہے۔ جوش صاحب بھی کہنے لگے کہ بلونت سنگھ کا کہنا درست ہے۔ یہ دیر سے گھر جاتے ہیں، راستہ مخدوش ہے، ان کو لائسنس چاہیے۔ اس پر شنکر پرشاد صاحب نے بلونت سنگھ سے کہا۔ آپ دفتر سے اٹھ کر سیدھے گھر چلے جایا کیجیے۔ گھر جانے میں دیر نہ کیا کیجیے۔ ابھی بلونت سنگھ کچھ کہنا ہی چاہتے تھے کہ جوش صاحب بول پڑے کہ چیف کمشنر صاحب بالکل بجا فرما رہے ہیں۔ آپ اندھیرا ہونے سے پہلے ہی گھر چلے جایا کریں۔ بلونت سنگھ نے پھر کہا کہ بعض اوقات میرے پاس دفتر کا کچھ کیش ہوتا ہے، اس کی حفاظت کے لیے بھی پستول ضروری ہے۔ جوش صاحب نے کہا یہ بات تو درست ہے۔ کیش کی حفاظت کے لیے پستول درکار ہے۔ اس پر شنکر پرشاد جی نے کہا کہ دفتر کا کیش گھر لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ دفتر میں ہی جمع کرا دینا چاہیے۔ جوش صاحب نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور کہنے لگے کہ بلونت سنگھ!

شنکر پرشاد جی بالکل درست فرما رہے ہیں، دفتر کا کیش دفتر میں ہی جمع ہونا چاہیے۔ اس پر بلونت سنگھ نے دم توڑ دیا اور ہاتھ جوڑ کر جوش صاحب سے کہنے لگے کہ جوش صاحب! مجھے لائسنس ملے یا نہ ملے، مگر آپ خدا کے لیے خاموش رہیے، میں آپ کی سفارش سے باز آیا۔ اس پر شنکر پرشاد جی بھی ہنسنے لگے اور فرمانے لگے، بلونت سنگھ جی! آپ جوش صاحب کو ساتھ لے کر آئے ہیں۔ میں آپ کو لائسنس ضرور دے دوں گا، چناں چہ انھوں نے سردار بلونت سنگھ کی درخواست پر لائسنس منظور کر دیا۔

جوش صاحب نے فخر سے اپنے اٹھارہ معاشقوں کا ذکر "یادوں کی برات" میں کیا ہے، اس لیے اگر میں ان کے ایک معاشقے کا کوئی واقعہ سنا دوں تو مجھے یقین ہے کہ ان کی روح مجھے معاف فرما دے گی۔

ایک بار جوش صاحب کی وہ محبوبہ، جس کو سمندر میں ڈوبنے سے بچانے کے لیے جوش صاحب گیٹ وے آف انڈیا بمبئی پر تیرنا نہ جاننے کے باوجود سمندر میں کود پڑے تھے، دہلی آئی۔ جوش صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ اگر ان کے لیے ایک جائے رہائش اور ایک موٹر گاڑی کا انتظام کر دیا جائے تو وہ دو چار دن دہلی ہی میں اپنی محبوبہ کے ساتھ گزارنا پسند کریں گے، چنانچہ ان کی خواہش کے مطابق شاہدرہ میں ایک بنگلے کا بندوبست ہو گیا اور میرے ایک نہایت ہی عزیز دوست نے اپنی موٹر گاڑی ان کے حوالے کر دی۔ جوش صاحب نے اپنی بیگم صاحبہ سے دو ایک مشاعروں سے شریک ہونے کا بہانہ کیا اور گھر سے رخصت ہو کر شاہدرہ آ گئے۔ اب ان کی شامت آئی کہ ایک شام وہ اپنی محبوبہ کو لے کر ہوا خوری کے لیے نئی دہلی میں گھوم رہے تھے کہ بیگم جوش نے انھیں کہیں دیکھ لیا، لیکن جوش صاحب نے گاڑی روکی نہیں اور تیز کر دی اور فوراً شاہدرہ پہنچ کر مجھے فون کیا۔ میں گھر پر نہیں تھا، لیکن جب گیارہ بجے کے قریب گھر پہنچا تو جوش صاحب موجود تھے اور بہت پریشان نظر آتے تھے۔ میرے پوچھنے سے پہلے ہی اپنا سارا واقعہ سنایا اور کہا کہ جس طرح بھی ہو، مجھے بچاؤ۔ جوش صاحب ایک باغی شاعر اور منکر خدا تو تھے، مگر اپنی بیوی سے اتنا ڈرتے تھے کہ خدا کی پناہ۔ کہنے لگے کہ اگر کسی نہ کسی ترکیب سے یہ معاملہ سلجھایا نہ گیا تو مجھے زندہ ہی دیوار میں چنوا دیا جائے گا۔ میں نے انھیں لاکھ تسلی دی اور یہ بھی کہا کہ آپ کے ہاں چار نکاحوں تک کی اجازت ہے۔ آپ اپنی محبوبہ سے نکاح کیوں نہیں کر لیتے، مگر انھوں نے اسے محض مذاق سمجھا اور تاکید کی کہ کوئی صورت بھی اختیار کرنی پڑے، انھیں بچایا جائے۔ چنانچہ میں اگلی ہی صبح جوش صاحب کے گھر گیا۔ بیگم جوش جاتے ہی مجھ پر برس پڑیں اور کہنے لگیں کہ سنا، تمہارے دوست نے کیا کیا۔ میں نے لاعلمی ظاہر کی تو کہنے لگیں کہ تم سب ایک جیسے ہی ہو۔ میں نے کہا، کچھ بتائیے تو سہی۔ تو کہنے لگیں کہ وہ مردود مجھ سے مشاعرہ کا بہانہ کر کے گیا ہے، لیکن اس بمبئی والی چڑیل کو لے کر یہیں دہلی میں گھوم رہا ہے۔ میں نے کہا، نہیں بھابی جان! ایسا نہیں ہو سکتا، وہ تو مجھے بھی دھوکا ہو گیا۔ کل شام میں کناٹ پلیس میں کھڑا ہوا تھا تو دیکھا جوش صاحب ایک نہایت ہی خوبصورت عورت کے ساتھ ایک دوکان سے نکل کر موٹر گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔ میں فوراً

لپکا اور پیچھے سے جا کر جوش صاحب کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیے اور کہا کہ بتائیے، میں کون ہوں؟ جب وہ کچھ نہیں بولے تو میں نے ہاتھ ان کی آنکھوں سے ہٹا لیے اور جب انھوں نے گھوم کر میری طرف دیکھا تو مجھے سخت ندامت ہوئی۔ وہ جوش صاحب نہیں تھے، لیکن بالکل ایسی شکل اور حلیہ تھا کہ جیسے جوش صاحب کے جڑواں بھائی ہوں۔ میں انھیں دیکھ کر حیران رہ گیا، بلکہ ان کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس پر بیگم جوش نے دنیا کے تمام مردوں کی بے وفائی اور دوستوں کو ایک دوسرے کی جائز ناجائز امداد کرنے اور بیویوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے پر طویل، مگر پرجوش لیکچر دیا۔ جب ان کا غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو میں نے پھر کہا کہ بھابی جان! میرے ساتھ چلیے، آج شام پھر وہ صاحب کہیں نہ کہیں مل جائیں گے۔ آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیجیے گا۔ اس پر وہ خاموش ہو گئیں، مگر ایسا محسوس ہوا کہ انھوں نے سو فیصد تو یقین نہیں کیا، لیکن میرا تیر نشانہ کے قریب ضرور لگا ہے۔ میں جب لوٹ کر گھر آیا تو جوش صاحب وہاں موجود تھے۔ میں نے سارا قصہ سنایا اور رائے بھی ظاہر کی کہ بیگم صاحبہ کی کچھ نہ کچھ تو تسلی ہو گئی ہے، مگر ابھی کوئی کوئی ڈرامہ اور کھیلنا پڑے گا، چنانچہ یہ طے ہوا کہ جہاں جوش صاحب نے مشاعرہ میں شریک ہونے کا بہانہ کیا تھا، وہاں سے ایک تار جوش صاحب کی جانب سے بیگم جوش کو دلوایا جائے کہ دو مشاعروں میں سے ایک مشاعرہ ملتوی کر دیا گیا ہے اور جوش صاحب کل صبح واپس آ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی طے ہوا کہ سردار دیوان سنگھ مفتون کی "خدمات" بھی اس سلسلے میں حاصل کی جائیں، چنانچہ جوش صاحب مفتون صاحب کے پاس پہنچے اور ساری بات بتائی اور ان سے کہا کہ آپ خدا پر تو یقین رکھتے نہیں ہیں، میری خاطر ایک جھوٹی قسم بھی کھا لیجیے۔ کافی دیر سوچنے کے بعد یہ طے ہوا کہ دیوان سنگھ مفتون اپنے اخبار ریاست کے ساتھ ستر پرچے لے کر انھیں ریشمی رومال میں لپیٹ کر بیگم جوش سے ملیں اور کہیں کہ سنا ہے کہ آپ کے دل میں شک پیدا ہو گیا ہے کہ جوش صاحب اپنی کسی محبوبہ کے ساتھ یہیں دہلی میں عیش کر رہے ہیں۔ میں آپ کا یہ شک دور کرنے آیا ہوں اور اپنے ساتھ گرنتھ صاحب بھی لایا ہوں، تا کہ آپ کے سامنے گرنتھ صاحب کی قسم اٹھاؤں، چنانچہ دیوان سنگھ مفتون ان کے گھر گئے اور بیگم جوش سے یہی فقرے کہے۔ اس پر بیگم جوش نے جوش صاحب کی گزشتہ کارستانیوں اور کردار پر ایک تفصیلی تقریر فرما دیا۔ مفتون صاحب سنتے رہے اور جب وہ ارشاد کر چکیں تو کہنے لگے کہ بھابی صاحب! یہ دیکھیے میں "گرنتھ صاحب" اپنے ہمراہ لایا ہوں۔ گرنتھ صاحب پر ہاتھ رکھ کر یہ کہہ رہا ہوں کہ آپ کو دھوکا ہوا ہے۔ مجھے خود دھوکا ہوا ہے۔ وہ کوئی اور آدمی تھا، جوش صاحب نہیں تھے۔ بیگم جوش نے یہ سمجھا کہ ان ریشمی رومالوں میں واقعی گرنتھ صاحب ہے اور انھیں یقین آ گیا۔ مفتون صاحب نے لوٹ کر جوش صاحب کو یہ خوشخبری سنائی، مگر اس کے باوجود وہ اپنی بیگم کے سامنے جانے سے گھبرا رہے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بیگم جوش ہر مشاعرہ کے بعد جوش صاحب سے پائی پائی کا حساب لیتی تھیں۔ اس مرتبہ جوش صاحب کے لیے دوستوں نے کچھ روپیہ فراہم کیا اور کہا کہ بیگم

صاحب کی خدمت میں پیش کر دینا کہ مشاعرہ والوں نے یہ دیا ہے۔ اب جب جوش صاحب گھر جانے لگے تو مجھ سے کہنے لگے، آپ بھی ساتھ چلیے۔ چنانچہ میں بھی ساتھ ہولیا اور جب ہم ان کے گھر پہنچے تو مجھے لے جاتے ہی بیگم جوش سے کہا کہ لیجیے آپ کا مجرم حاضر ہے اور ساتھ ہی ساتھ جوش صاحب کو کوسنا بھی شروع کر دیا کہ آپ کے گھر سے چلے جانے کی وجہ سے بیگم صاحب کو اور ہم سب کو کن کن غلط فہمیوں میں مبتلا ہونا پڑا اور اب ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ اول تو آپ کو مشاعرہ میں جانے ہی نہ دیا جائے اور اگر آپ کو مجبوراً جانا ہی پڑے تو کوئی نہ کوئی گھر والا ساتھ ہو۔ اس پر بیگم جوش کے چہرہ پر ذرا سی مسکراہٹ آئی۔ ہم سب نے سمجھا کہ تیر نشانے پر لگا ہے۔ جوش صاحب نے بھی سر ہلایا اور کہا کہ جیسا آپ چاہیں گے، ویسا ہی ہوگا۔ اس کے بعد میں اٹھنے لگا تو جوش صاحب نے کہا، بھئی! ناشتہ کر کے جانا اور بیگم صاحب سے کہا کہ ان کے لیے ناشتہ منگوایئے۔ جب وہ یہ کر اٹھیں تو جوش صاحب کے چہرے پر تبسم آیا اور فرمانے لگے کہ یہ مصرع مدتوں سے سنتے آ رہے تھے:

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

لیکن آج صحیح طور پر سمجھے کہ اس کے معنی کیا ہیں۔

(۲۱ رجون ۱۹۸۵ء)

☆ ☆ ☆

اکیڈمی آف لیٹرز کی شان میں ایک کالم

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب سے اکیڈمی آف لیٹرز وجود میں آئی ہے، پاکستان سے ادب رخصت ہو گیا ہے، کیوں اب ادیبوں کی تخلیقی سرگرمیاں اہل قلم کانفرنس میں شرکت کرنے یا نہ کرنے تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ جنھیں اہل قلم کانفرنس میں بلایا جاتا ہے، وہ بزعم خود یہ سمجھتے ہیں کہ وہ تخلیقی سطح پر زندہ ہیں اور جنھیں نہیں بلایا جاتا، انھیں یہ شبہ ہوتا ہے کہ ان کا ادب سے برائے نام تعلق بھی نہیں رہا۔

ہمیں اس قسم کے غیر ادبی اور غیر تخلیقی خیالات سے اتفاق نہیں ہے۔ اگر اہل قلم کانفرنس میں شرکت کرنا تخلیقی سطح پر زندہ ہونے کے مترادف ہوتا تو محسن بھوپالی ملک کے سب سے بڑے تخلیقی فنکار ہوتے کہ انھوں نے پانچوں کانفرنسوں میں شرکت کی ہے اور فیض احمد فیض مرحوم کی اتنی بھی اہمیت نہ ہوتی، جتنی استاد اختر انصاری اکبر آبادی کی ہے، کیوں کہ فیض صاحب نے کبھی کسی اہل قلم کانفرنس میں شرکت نہیں کی۔

سب سے زیادہ قابل رحم حالت ان لوگوں کی ہے، جنھیں اہل قلم کانفرنس میں مدعو نہیں کیا جاتا اور وہ اس کے باوجود کانفرنس کا بائیکاٹ کر دیتے ہیں۔ پانچویں کانفرنس کے انعقاد سے ایک دن قبل پاکستان رائٹرز گلڈ، صوبہ سندھ کی مجلس عاملہ نے اکیڈمی آف لیٹرز کی مذمت کرتے ہوئے یہ الزام لگایا ہے کہ سندھ سے مدعو کیے جانے والے افراد کی اکثریت غیر ادیب افراد پر مشتمل ہے، جب کہ ممتاز اور انعام یافتہ ادیبوں کو نظر انداز کیا گیا ہے۔

ممکن ہے، بعض لوگ یہ سوال کریں کہ چار کانفرنسیں پہلے بھی ہو چکی ہیں اور ہر مرتبہ مہمانوں کے انتخاب میں دھاندلی ہوتی رہی ہے، لیکن گلڈ کی عاملہ نے کبھی قرار داد مذمت منظور نہیں کی، اس سال کون سا خلاف قاعدہ کام ہوا، جو معاملہ مذمت تک پہنچ گیا۔ اس متوقع سوال کا پیشگی جواب عرض ہے کہ پہلے ہر کانفرنس میں گلڈ کی مجلس عاملہ کے تمام اراکین ہی کو نہیں، ان کے متوسلین و متعلقین اور اہل خانہ کو بھی مدعو کیا جاتا تھا، لیکن اس مرتبہ سرے سے مجلس عاملہ کے معزز اراکین ہی کو نظر انداز کر دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ یہ

صورتِ حال لائق مذمت ہی نہیں، سزاوار تعزیت بھی ہے۔

اس موقع پر ہمیں اکیڈمی کے سابق ڈائریکٹر جنرل مسیح الدین صدیقی صاحب بے اختیار یاد آرہے ہیں۔ خدا انھیں خوش رکھے، کیا وضع دار آدمی تھے۔ اہلِ قلم کانفرنس کے دعوت نامے اس طرح تقسیم کرتے تھے، جس طرح عبدالعزیز خالد اپنے صحائف تقسیم کرتے ہیں۔ یعنی جو شخص بھی نظر آیا، اسے دعوت نامہ پیش کر دیا۔ یہ نہ دیکھا کہ وہ دعوت نامے کی عبارت پڑھ بھی سکتا ہے یا نہیں۔ ایک مرتبہ صدیقی صاحب نے ازراہِ کرام ہمیں بھی مدعو کیا تھا۔ ہم نے ادب سے کوئی تعلق نہ ہونے کا عذر پیش کیا تو انھوں نے فرمایا:

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے، آپ صورت سے تو ادیب نظر آتے ہیں۔"

ہم نے پوچھا:

"وہ کیسے؟"

تو انھوں نے فی البدیہہ ارشاد فرمایا:

"پچھلی مرتبہ جب آپ سے ملاقات ہوئی تھی، اس کے مقابلے میں اب آپ کی صورت خاصی مسخ ہو چکی ہے۔"

اس سال اہلِ قلم کانفرنس سے چند روز پہلے یہ سانحہ بھی گزرا کہ پروفیسر ابوالخیر کشفی نے اکیڈمی کی مجلس نظما سے استعفے دے دیا، جو فلمی اصطلاح میں خاصا "دھماکہ خیز" ثابت ہوا۔ کشفی صاحب نے اکیڈمی پر کئی سنگین الزامات لگائے ہیں، جن میں سے بعض یہ ہیں:

۱)۔ اکیڈمی کی مجلس نظما ایک غیر مؤثر ادارہ بن کر رہ گئی ہے۔

۲)۔ اکیڈمی اپنا علمی مجلہ شائع نہیں کر سکی، جس کا فیصلہ کئی برس پہلے کیا گیا تھا۔

۳)۔ اکیڈمی کے خبرنامے کا معیار انتہائی پست ہے۔

۴)۔ اکیڈمی ادیبوں کے لیے کسی قسم کی سہولتیں حاصل نہیں کر سکی، یہاں تک کہ ریل اور جہاز کے کرایوں میں بھی ادیبوں کو رعایت نہیں مل سکی۔

۵)۔ اکیڈمی کی مجموعی کارکردگی ایسی نہیں، جس پر اطمینان کا اظہار کیا جا سکے۔

کشفی صاحب "سوئے اتفاق" سے اصول پسند ادیب ہیں، اس لیے بعض لوگوں کو ان کے استعفے پر اتنا تعجب نہیں ہوا، جتنا اس بات پر کہ انھوں نے کئی سال اکیڈمی کی مجلس نظما کے رکن کی حیثیت سے کس طرح گزار لیے۔ بہرکیف صورتِ حال کچھ بھی ہو، ہمیں کشفی صاحب کے الزامات پسند نہیں آئے۔ اکیڈمی کے ایک ادنیٰ خیر خواہ اور دعا گو کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ان الزامات کو رد کیا جائے۔ لہٰذا نکتہ بہ نکتہ عرض ہے کہ:

۱)۔ اکیڈمی کی مجلس نظما پر غیر مؤثر ہونے کا الزام بے بنیاد ہے۔ کشفی صاحب کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ

انھوں نے "مجلس نظما" کو انتظامی امور سے متعلق ادارہ سمجھا، حالاں کہ "مجلس نظما" کا لغوی مفہوم "نظمیں لکھنے والوں کی مجلس" ہے۔ ہمیں ذاتی طور پر علم ہے کہ اکیڈمی کی مجلس نظما میں کئی نظم گو شاعر شامل ہیں اور وہ بڑی باقاعدگی سے ایسی نظمیں لکھ رہے ہیں، جو خاصی مؤثر ثابت ہوئی ہیں۔ اگر کشفی صاحب اکیڈمی کی کارکردگی کو شعر و شاعری کے معیار سے جانچتے تو انھیں ایک بے بنیاد الزام عاید کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

۲)۔ یہ سچ ہے کہ اکیڈمی نے کئی برس پہلے ایک علمی مجلہ شائع کرنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن کوئی فیصلہ کرنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس پر عمل بھی کیا جائے گا اور جب فیصلہ غلط ہو تو اس پر عمل نہ کرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اصولی بات یہ ہے کہ اکیڈمی ایک ادبی ادارہ ہے، اس کا علم سے کیا تعلق، جو علمی جریدہ شائع کیا جاتا۔ ملک میں پہلے ہی درجنوں علمی جریدے شائع ہوتے ہیں۔ اکیڈمی کے وابستگان اور پسماندگان نے انھیں سے کب استفادہ کیا ہے، جو ان کی علمی تشنگی کو بجھانے کے لیے ایک نیا علمی جریدہ شائع کیا جاتا۔

۳)۔ یہ بھی غلط ہے کہ اکیڈمی کے خبرنامے کا معیار پست ہے۔ کشفی صاحب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس خبرنامے کا سرے سے کوئی معیار ہی نہیں، لہٰذا بلندی یا پستی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

۴)۔ یہ الزام بھی غلط ہے کہ اکیڈمی ادیبوں کے لیے کسی قسم کی سہولتیں حاصل نہیں کر سکی۔ ہمارے خیال میں اکیڈمی کے قیام کے بعد سب سے بڑی سہولت تو یہ حاصل ہوئی کہ جس کا جی چاہے، ادیب ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ اہلِ قلم کی جو پانچ کانفرنسیں ہو چکی ہیں، اگر ان کے مندوبین کی فہرستیں شائع کی جائیں تو کم از کم پچاس فیصد ایسے لوگوں کے نام ملیں گے، جنھیں ادب تخلیق کرنے کا تو کیا، پڑھنے کا بھی کوئی تجربہ نہیں ہے۔

اکیڈمی کی طرف سے ادیبوں کو یہ سہولت بھی دی گئی ہے کہ ان کے انتقال فرما جانے کی صورت میں اکیڈمی کفن دفن کی ذمہ داری سنبھال لیتی ہے اور ہر مرحوم ادیب کے پسماندگان کو چار پانچ ہزار روپے کی رقم کا چیک بھیج دیتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض اوقات چیک مرنے والے کے نام کا ہوتا ہے، جو صرف دوسری دنیا ہی میں کیش ہو سکتا ہے۔

۵)۔ کشفی صاحب فرماتے ہیں کہ اکیڈمی کی مجموعی کارکردگی ایسی نہیں ہے کہ اس پر اطمینان کا اظہار کیا جا سکے۔ سوال یہ ہے کہ اطمینان کا اظہار کرنے کے لیے کیا اکیڈمی کی کارکردگی ہی رہ گئی ہے؟ اطمینان کا اظہار کرنا ہی تھا تو اس پر کیا ہوتا کہ اکیڈمی کے قیام کے بعد سے ہمارے ادیبوں کی مجموعی کارکردگی اچھی ہے کہ وہ اسلام آباد جا کر مزے لے لے کر سرکاری نمک کھاتے ہیں اور اعلیٰ ادب تخلیق کرتے ہیں۔

کشفی صاحب نے ایک معاملے میں خاموشی اختیار کی ہے اور وہ یہ ہے کہ اکیڈیمی ادیبوں کی مدد کس حد تک کرتی ہے۔ اتفاق سے اس سلسلے میں ایک واقعے کا ہمیں علم ہے، لہٰذا قارئین کی آگہی کے لیے عرض ہے کہ کراچی کے ایک مشہور اور ممتاز ادیب ان دنوں بیروزگاری کی وجہ سے شدید مالی بحران سے دوچار ہیں۔ صورت حال اس حد تک نازک ہو چکی ہے کہ ان کے پاس رہنے کے لیے مکان بھی نہیں ہے اور وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ انھیں مشورہ دیا گیا کہ وہ اکیڈیمی کو مالی مدد کے لیے لکھیں۔ وہ راضی نہیں ہوتے تھے، لیکن بعض خیر خواہوں کے اصرار پر انھوں نے اکیڈیمی کو درخواست بھجوا دی۔ وہاں سے نہایت غیر ہمدردانہ، بلکہ غیر اخلاقی جواب آیا:

> آپ کی درخواست مجلس وظیفہ کے اجلاس میں پیش کی گئی تھی، لیکن بوجوہ منظور نہیں ہو سکی، اس لیے ہماری طرف سے معذرت قبول کیجیے۔
>
> اکاؤنٹس آفیسر

یہ خط نہیں، آئینہ ہے، جس میں اکیڈیمی کا اصل چہرہ دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک اہم اور ممتاز ادیب کی عزت افزائی کے لیے خط کا جواب اکیڈیمی کے کسی عہدے دار نے نہیں لکھا، بلکہ ایک دفتری اہلکار نے لکھا ہے۔

بعض لوگ مطالبہ کرتے ہیں کہ اکیڈیمی ان ادیبوں کی فہرست شایع کرے، جن کو اکیڈیمی کی طرف سے اب تک مالی امداد دی گئی ہے یا دی جا رہی ہے، لیکن ہم اس مطالبے کی تائید نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ اس فہرست میں ہمارے بعض ایسے کرم فرماؤں کے نام بھی شامل ہیں، جنھیں مالی امداد سے زیادہ دعائے خیر کی ضرورت ہے۔ خصوصاً ان کرم فرماؤں کو، جنھیں کتابیں چھاپنے کے نام پر بڑی بڑی رقوم سے نوازا گیا ہے۔

ہم بھی کہاں سے کہاں نکل گئے۔ ارادہ تھا، پانچویں اہل قلم کانفرنس پر کچھ لکھنے کا اور اور لکھ ڈالیں ادھر ادھر کی باتیں۔ اس کانفرنس میں کیا ہوا، یہ تو شرکائے کرام ہی بتا سکتے ہیں، ہم تک تو صرف افتتاحی اجلاس کی روداد پہنچی ہے۔ کانفرنس کے کسی دوسرے اجلاس کی کارروائی کو پاکستان کے کسی اخبار نے اشاعت کے قابل نہیں سمجھا۔

افتتاحی اجلاس میں صدر مملکت کی تقریر بڑی فکر انگیز تھی۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ پاکستان ادب کے رجحانات کا تجزیہ کیا، بلکہ بعض شعرائے کرام کا نمونہ کلام بھی پیش کیا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب صدر ادب کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں۔

جناب صدر نے قومی یا بین الاقوامی اردو کانفرنس منعقد کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ یہ تجویز ابھی پچھلے دنوں جمیل الدین عالی نے اپنے کالم میں پیش کی تھی۔ خوشی کی بات ہے کہ اس تجویز کو جناب صدر کی تائید حاصل ہو گئی۔ کیا ہی اچھا ہو کہ اس کانفرنس کے انعقاد کے لیے جو انتظامی مجلس بنائی جائے، اس میں

عالی صاحب کو شریک کیا جائے، تاکہ ان کا تجربہ ایک عظیم الشان بین الاقوامی اردو کانفرنس کی کامیابی کا ضامن بن سکے۔

صدر مملکت نے نہایت دلچسپ پیرائے میں ادبی رسالوں کا ذکر کیا اور فرمایا کہ اخبارات کے ایڈیشنوں کی وجہ سے ہفت روزے ختم ہو چکے ہیں۔ اب نظر آ رہا ہے کہ ماہنامے بھی چلتے بنیں گے۔ سامعین میں حکیم محمد سعید بھی تشریف رکھتے تھے۔ جناب صدر نے حکیم صاحب سے فرمایا کہ وہ "ادبی دنیا" اور "ہمایوں" کے معیار کا ایک ادبی رسالہ جاری کریں۔ اگر اس سلسلے میں مالی امداد کی ضرورت ہو تو حکومت حاضر ہے۔

ہم نہایت ادب سے گزارش کریں گے کہ حکیم محمد سعید صاحب بحیثیت وزیر نہیں چلے تو بحیثیت مدیر کیا چلیں گے۔ وہ بے حد مصروف ہیں اور بے شمار بڑے بڑے کام انھوں نے اپنے ذمے لے رکھے ہیں۔ کہیں شام ہمدرد ہے اور کہیں صبح مدینۃ الحکمت ہے اور کہیں شب روح افزا۔ اس ہجوم کار، بلکہ ہجوم شوق میں انھیں اتنی فرصت کہاں کہ کوئی ادبی رسالہ جاری کریں۔ حکیم صاحب گزشتہ کئی برس سے آوازۂ اخلاق بلند کر رہے ہیں۔ اگر وہ ادب کی طرف آ گئے تو انھیں اپنے اخلاق کے تصور میں ترمیم کرنی پڑے گی۔ بفرض محال اگر حکیم صاحب ادبی رسالہ جاری کرنے پر آمادہ ہو بھی گئے تو انھیں حکومت کی مالی امداد کی کیا ضرورت ہو گی۔ حکیم صاحب کو مالی مدد دینا ویسا ہی ہے، جیسے سمندر پر بارش برسانا۔ بہتر یہ ہو گا کہ جو دو چار ادبی رسالے سسک سسک کر نکل رہے ہیں، حکومت ان کی مدد کرے۔ "فنون"، "اوراق"، "سیپ"، "تنگ خیال" اور "افکار" جیسے رسالوں کو باقاعدگی سے سرکاری اشتہار دیے جائیں اور ملک کے تمام تعلیمی و بلدیاتی اداروں کی لائبریریوں کو ہدایت دی جائے کہ وہ ان رسالوں کو خریدیں۔ ابھی پچھلے دنوں انظیر جاوید نے بددل ہو کر اپنے رسالے "تخلیق" کو بند کر دیا ہے۔ حکومت چاہے تو انظیر جاوید کی بددلی کو خوش دلی میں تبدیل کر سکتی ہے۔ اہل قلم کانفرنسوں پر جو لاکھوں روپے ضایع کیے جاتے ہیں، ان کا دسواں حصہ بھی ادبی رسالوں میں تقسیم کر دیا جائے تو یہ رسالے اکیڈیمی آف لیٹرز سے بہتر طور پر ادب کی خدمت کر سکتے ہیں۔

(۵ جولائی ۱۹۸۵ء)

☆............☆............☆

آج کل کے ایڈیٹر بھی چٹھی رساں ہیں

دو سال پہلے ''روایت'' کا پہلا شمارہ شایع ہوا تھا تو ہم نے دلی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ تن آسانی اور سہل پسندی کے اس دور میں، جب کہ لوگ محض وزیٹنگ کارڈ چھپوا کر صاحبِ تصنیف بن جاتے ہیں، کسی علمی جریدے کا اجرا فالِ نیک ہے۔ اردو کے علمی جرائد میں ''روایت'' نے ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی ہے اور پڑھنے والوں کو سنجیدہ مسائل پر سوچنے کا راستہ دکھایا ہے اور اب ''روایت'' کا دوسرا شمارہ ہمارے سامنے ہے تو ہم اپنی پہلی رائے پر نہ صرف قائم ہیں، بلکہ اس پر یہ اضافہ بھی کریں گے کہ ''روایت'' محض ایک رسالہ نہیں، ایک دبستانِ فکر ہے۔ حیات و کائنات کے اہم اور بنیادی مسائل کو سمجھنے سمجھانے کا وسیلہ ہے۔ اردو میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور منفرد رسالہ ہے، جس میں شامل بیشتر تحریریں باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت منتخب کی جاتی ہیں۔ عام رسالوں جیسا حال نہیں کہ فقیر کے کشکول کی طرح تازہ، باسی، مرغن، روکھا سوکھا، ہر طرح کا مال موجود ہے۔ ہمارا ایک قول برحق ہے کہ آج کل کے ایڈیٹر پوسٹ مین کا درجہ رکھتے ہیں، جو مصنّفین کے بند لفافے قارئین تک پہنچا دیتے ہیں۔ یعنی جو کچھ چھاپتے ہیں، اسے خود بھی نہیں پڑھتے، لیکن ''روایت'' کے ہر مضمون پر ایڈیٹر کی چھاپ ہے۔ یہاں تک کہ غزلیں بھی ایسی ہیں، جیسے طرح مصرع دے کر لکھوائی گئی ہوں۔

''روایت'' کے ایڈیٹر محمد سہیل عمر نوجوان ہیں۔ حیرت ہے کہ اس کم عمری میں اتنے سنجیدہ کیسے ہو گئے۔ احمد مشتاق نے تو ۲۵ برس کی عمر میں کہا تھا:

ابھی تو دن ہیں مرے کھیلنے کے کھانے کے

لیکن سہیل عمر کا بقول غالب یہ حال ہے:

اے طفلِ خود معاملہ قد سے عصا بلند

ہم تاریخ گو نہیں۔ اگر حضرت رئیس امروہوی اور جناب شان الحق حقی چاہیں تو غالب کے اس مصرعے سے سہیل عمر کی تاریخ پیدائش برآمد کر سکتے ہیں، مگر ان دونوں حضرات سے اس کارِ خیر کی امید

نہیں، کیوں کہ انھیں قطعۂ تاریخ لکھنے کا خیال اس وقت آتا ہے جب کوئی ہمارے درمیان سے اٹھ جاتا ہے۔ سہیل عمر کے لیے تو ہم دست بدعا ہیں کہ اس عزیز کو خدا عمرِ نوح نہیں تو کم از کم عمرِ پسرِ نوح عطا کرے کہ یہ پسر بھی چار پانچ سو سال سے کم کیا جیا ہوگا۔

''روایت'' کے زیرِ نظر شمارے میں تہذیب، فنونِ لطیفہ، ادب، تاریخ اور مذہب کے حوالے سے ایک درجن سے زیادہ مقالے شامل ہیں۔ ایک حصہ شعر و ادب کے لیے مخصوص ہے اور ایک سو سے زیادہ صفحات میں کتابوں پر تبصرے ہیں۔ حصۂ مقالات میں تراجم خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ ابوبکر سراج الدین (مارٹن لنگز)، شیخ عبدالواحد یحییٰ (رینے گینوں)، حسن عبدالحکیم اور سید حسین نصر جیسے اسلامی مفکرین کی تحریروں کے تراجم محمد یوسف عرفان، جمال پانی پتی، تحسین فراقی اور خود محمد سہیل عمر نے کیے ہیں۔ اصل تحریریں، جن کی نظر سے گزری ہیں، وہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان تحریروں کا ترجمہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ فلسفیانہ موضوعات پر ان خشک تحریروں کو جس خوبصورتی سے اُردو میں منتقل کیا گیا ہے، اس سے مترجمین کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ..... خود اردو زبان کے اس وصف کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس میں نازک سے نازک اور پیچیدہ خیالات کو ادا کرنے کی بڑی صلاحیت ہے۔ کاش اردو زبان کو سہیل عمر جیسے کچھ سرپھرے مل جائیں، جو دوسری زبانوں کی اہم کتابوں کے ترجمے کرتے ہیں، پھر اردو کی ترقی و ترویج اور نفاذ کے لیے جلسے کرنے اور جلوس نکالنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

سابقہ شمارے کے مقابلے پر اس مرتبہ ''روایت'' میں ادبیات کا حصہ بڑھا دیا گیا ہے۔ اس سے کئی فائدے حاصل ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ ہم جیسے آوارہ خوانوں کو پڑھنے کے لیے زود ہضم مواد ملے گا۔ یعنی ادھر پڑھا اور ادھر بھول گئے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ سنجیدہ قاری کی طبیعت بہلے گی۔ رینے گینوں کو پڑھتے ہوئے اب وہ تھک جائے گا تو احمد جاوید کی غزلیں پڑھ کر وہ اپنے آپ کو شاعر کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کرے گا۔

ادبی حصے میں یوں تو بہت سی قابلِ ذکر تحریریں ہیں، لیکن سب سے دلچسپ چیز شاہ اودھ واجد علی شاہ اختر کے خط ہیں۔ محمد اکرام چغتائی نے دو سال قبل یورپ کے سفر کے دوران بہت سے نوادر تلاش کیے تھے۔ ان میں واجد علی شاہ کے خطوط کے بعض ایسے مجموعے بھی ہیں، جو کبھی شایع نہیں ہوئے۔ ان مجموعوں میں سے چار خط ''روایت'' میں شایع کیے گئے ہیں، جو بادشاہ کی دو بیگمات کے نام ہیں۔ یہ خطوط، جو کلکتے میں قید کے زمانے میں لکھے گئے تھے، دلچسپ بھی ہیں اور عبرت انگیز بھی۔ ان خطوں سے بادشاہ کی بے بسی اور بے کسی کا نقشہ سامنے آتا ہے۔ لُٹے لُٹائے بادشاہ کی حالت کا اندازہ اس مثال سے کیجیے:

''والدہ اور بھائی کا انتقال ہوا۔ فرانس کے ملک میں دونوں دفن ہوئے۔ قبریں کچی پڑی ہیں۔ اتنا میرے پاس نہیں، جو انھیں پختہ کراؤں۔''

ہمیں اکرام چغتائی کا ممنون ہونا چاہیے کہ انھوں نے اپنی عادت کے برعکس اب کے ایسے تحقیقی

نوادر پیش کیے ہیں، جو عام لوگوں کی دلچسپی کے ہیں، ورنہ اب تک انھوں نے جو تحقیق کی ہے، وہ خواص کے کام کی ہے اور خواص بھی ایسے، جو زندگی سے بیزار ہوں یا عمر کی آخری منزل میں ہوں۔ چغتائی صاحب کی تحقیق میں اتنی گہرائی اور گیرائی ہوتی ہے کہ اس سے استفادہ کرنے کے بعد قاری پھر کسی اور چیز سے (خواہ وہ زندگی ہی کیوں نہ ہو) استفادہ کرنے کے لائق نہیں رہتا۔

''روایت'' کے حصۂ ادبیات پر سراج منیر چھائے ہوئے ہیں۔ ان کے کئی مقالے، نظمیں، غزلیں اور دیگر تحریریں شائع کی گئی ہیں، جن کی بنا پر اس شمارے کو سراج منیر نمبر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ سراج کی مختلف النوع تحریروں کو پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اس جواں رعنا نے کیسا زرخیز ذہن پایا ہے۔ وہ جس صنفِ ادب میں اظہار خیال کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسی میدان کے شہسوار ہیں۔ ان کی تنقیدی بصارت اور بصیرت کا تو ہمیں علم تھا، لیکن یہ پہلی بار معلوم ہوا کہ وہ شاعر بھی ہیں اور داستان گو بھی۔ انھوں نے ایک طویل مقالہ تو ''تہذیب اور فنونِ لطیفہ'' کے موضوع پر لکھا ہے اور ایک تقریر ارشاد فرمائی ہے، جو ادب کی ماہیت کے بارے میں ہے۔ ''یادداشت'' کے عنوان سے بظاہر بے ربط، لیکن بامعنی کہانی'' بھی لکھی ہے۔ کئی غزلیں ہیں، جنھیں ''غزلیہ نظم'' کا نام دیا گیا ہے۔ علامہ اقبال کی نظم ''مسجد قرطبہ'' کے بعض شعروں کی تضمین پر مشتمل ایک طویل نظم بھی ہے ''قرطبہ کے گنبدوں میں ایک بازگشت''۔ سراج منیر کے یوں تو کئی شعر دامن کش دل ہوئے، لیکن ایک شعر غضب کا ہے:

ایک خوابِ خوش گماں کی ساعتوں کے روبرو
عمر بھر ساکت رہا ہوں میں مثالِ آئینہ

جس وقت ہم مسجد قرطبہ والی نظم پڑھ رہے تھے تو حضرت لاغر مراد آبادی بھی تشریف لے آئے۔ ہمارے ساتھ وہ بھی نظم سے محظوظ ہوتے رہے۔ ہم نے ان کی رائے پوچھی تو فرمایا:

''اقبال اور غالب جیسے شاعروں کے شعروں کی تضمین کرنا ایسا ہی ہے، جیسے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگایا جائے، تاہم سراج منیر نے بعض مصرعے زوردار لکھے ہیں، لیکن کہیں کہیں وہ اپنے زور میں عروض کی پٹری سے اتر گئے ہیں۔''

ہم نے وضاحت طلب کی تو انھوں نے فرمایا:

''بعض مصرعے بحر میں نہیں ہیں۔ نظم کا وزن ہے: مفتعلن فاعلن مفتعلن فاعلن۔ سراج منیر کے یہ مصرعے اس وزن میں نہیں ہیں:

(۱ اسم اور موسوم میں ربط و تعلق عجب۔ (۲ منتشر ہونے لگے فلسفوں کے نجوم۔
(۳ کشتِ امید و یقین آخرش پامال گشت۔ (۴ برگ وحی بہرہ مند نخلِ نواے او۔

آخری مصرعے میں ''وحی'' کی ''ح'' کو متحرک باندھا گیا ہے، لہٰذا مصرع ناموزوں ہوگیا۔''

یہ کار گیرانہ بحث ہماری سمجھ میں نہ آئی اور ہم نے عرض کیا:

''جناب آج کل تو ایسی شاعری لکھی جارہی ہے، جس کا عروض سے تو کیا شاعری سے بھی کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اگر سراج منیر نے دو چار مصرعے خارج از بحر لکھ دیے تو کون سی قیامت آجائے گی۔''

انھوں نے فرمایا:

''اچھا نہیں لگتا کہ سراج منیر کوئی فنی غلطی کریں۔ فنی غلطیاں اخلاقی غلطیوں کے لیے راہ ہموار کرتی ہیں، لہٰذا ان سے بچنا ہی بہتر ہے۔ ویسے سراج منیر چاہیں تو اپنا کلام اشاعت سے پہلے مجھے دکھا لیا کریں۔ میں ان کے مصرعوں ہی کو نہیں، خود ان کو بھی بحر سے خارج نہیں ہونے دوں گا۔''

لاغر صاحب چلے گئے تو ہم نے اس نظم کو دوبارہ دیکھا۔ نظم کا انتساب انتظار حسین کے نام ہے۔ اس انتساب کی رعایت سے اگر پوری نظم ہی خارج از بحر ہوتی تو کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ انتظار حسین بہت بڑے نثر نگار ہیں، ان کے نام میں اتنا اثر تو ہونا چاہیے کہ شاعری، نثر بن جائے۔

جمال پانی پتی نے محمد ارشاد کے اس مضمون کا دنداں شکن جواب لکھا ہے، جس میں جمال صاحب کی فلسفہ دانی کو مشتبہ ٹھہرایا گیا تھا۔ انھوں نے بعض فلسفیانہ اصطلاحات کی توضیح و تشریح بڑے سلیقے سے کی ہے۔ حیرت ہے کہ داغ کے رنگ میں غزلیں کہنے والے دھان پان شاعر نے اپنے نازک و ناتواں کندھوں پر علم کا اتنا بوجھ کیسے اٹھالیا۔ محمد ارشاد نے اپنے مضمون میں جمال پانی پتی کے بارے میں لکھا تھا: ...... ''فلسفہ ان کے بس کا روگ نہیں۔ یہ پڑھنے کی نہیں، سیکھنے کی چیز ہے۔'' ...... لیکن جمال صاحب کا مضمون پڑھ کر ہم نے یہ رائے قائم کی ہے کہ موصوف اتنا فلسفہ سیکھ چکے ہیں کہ انھیں اسی کے لیے وقف ہوجانا چاہیے۔ اسی طرح انھیں شعر کہنے کی فرصت نہیں ملے گی اور یوں فلسفہ اور شاعری دونوں فائدے میں رہیں گے۔

''روایت'' میں کتابوں پر تبصرے روایتی انداز کے نہیں ہیں۔ یعنی ویسے نہیں، جیسے عام طور پر رسالوں میں ہوتے ہیں کہ کتاب و مصنف کے نام، صفحات کی تعداد اور قیمت کے سوا کوئی بات تبصرہ نگار کے مطالعے کا نتیجہ نہیں ہوتی۔ ''روایت'' کے تبصرہ نگاروں نے کتابیں پڑھ کے تبصرے لکھے ہیں۔ وہاں ایک تبصرہ ہمیں پسند نہیں آیا۔ اس میں پروفیسر نظیر صدیقی بے تکلف ہونے کی کوشش کی گئی ہے۔ تبصرہ انداز بیان اور مواد دونوں کے اعتبار سے ہمارے کالم کی طرح غیر معیاری ہے اور ''روایت'' کے سنجیدہ معیار کے منافی ہے۔ ویسے بھی نظیر صدیقی کے جملہ حقوق ہمارے نام محفوظ ہیں، کوئی دوسرا ان پر طبع آزمائی کرے تو ہمیں اچھا نہیں لگتا۔

(۱۲ر جولائی ۱۹۸۵ء)

مذاکرہ یا مذاقرہ

عام طور پر "اوراق" اور "فنون" ایک آدھ مہینے کے فرق سے موصول ہوتے ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، جب نظریاتی اختلاف ہو تو پھر اور بھی سو طرح سے اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں، لیکن اب کے خلاف معمول ڈاکیہ ایک ہی دن یہ دونوں رسالے لے کر آ گیا۔ ہم اس قران السعدین پر بے حد خوش ہوئے اور دل سے دعا نکلی کہ جس طرح یہ رسالے یکجا ہوئے ہیں، خدا کرے ایک دن اسی طرح ان رسالوں کے ایڈیٹر بھی یکجا ہو جائیں۔...... رسالوں کی ضخامت سے ڈاکیہ البتہ قدرے ناخوش تھا۔ کہنے لگا ...... "صاحب آپ کی آج کی ڈاک بڑی وزنی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا، جیسے میں نے کسی کے گناہوں کا بوجھ اٹھا رکھا ہو" ...... ہم نے اُسے ڈانٹا اور سمجھایا ...... "یہ گناہوں کا نہیں، ہمارے ملک کے بہترین ادیبوں کی تخلیقات کا بوجھ ہے۔ اس بوجھ کو اٹھانے والے کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔" ...... ڈاکیے نے حیرت سے ہماری طرف دیکھا اور جاتے جاتے یہ کہہ گیا ...... "میں نے تو اپنے گناہ معاف کرا لیے، اب آپ اپنے گناہ معاف کراتے رہیے۔"

پچھلا پورا ہفتہ ہم نے ان دونوں رسالوں کی رفاقت میں گزارا۔ کبھی اس کا کوئی مضمون چکھ لیا اور کبھی اُس کا۔ کبھی کوئی ادب پارہ یہاں سے سونگھ لیا اور کبھی وہاں سے۔ اس طریق کار کا یہ فائدہ ہوا کہ ایک کے اثرات کا ازالہ دوسرے کے اثرات سے ہوتا رہا۔ ہماری صحت پر کوئی خاص اثر نہ پڑا۔ سوائے اس کے کہ سردرد کی شکایت رہی، لیکن یہ کوئی ایسی شکایت نہیں، جو قابل ذکر ہو۔ جب سے ہمیں ادب سے دلچسپی پیدا ہوئی ہے، ہم دردِ سر اور دورانِ سر دونوں کے عادی ہو چکے ہیں۔

"فنون" کا ضخیم شمارہ، عام شمارہ ہے اور اس میں بہت سی کام کی چیزیں ہیں۔ ایک حصہ فیض کی یاد میں ہے، جس میں اوپر تلے بیسیوں نظمیں ہیں، جنھیں پڑھ کر اندازہ ہوا کہ کسی اچھے شاعر کو بری شاعری کے ذریعے بھی نہایت خوش اسلوبی سے خراج عقیدت پیش کیا جا سکتا ہے، اس لیے کہ اصل اہمیت عقیدت کی

ہے، نہ کہ شاعری کی۔ ایک خاتون کے نام فیض کے دو خط بھی شائع کیے گئے ہیں۔ ان سے مکتوب نگار کی زندگی کے بعض خاص پہلو سامنے آتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے اور لکھنے والے کو داد دیجیے کہ نثر میں غزل کے مضامین کو کس خوبصورتی سے باندھا ہے:

"آج تمہاری آواز سننے میں آئی۔ یوں تو کافی انتظار کے بعد ہم نے دل کو منوا لیا تھا کہ دوستی کوئی قرض تو نہیں ہے، جس کا تقاضا کیا جائے۔ نہ کوئی خونی یا قانونی رشتہ ہے، جس کے منقطع ہونے کی شکایت کی جائے، اگر کسی کا دل بھر گیا ہے تو صبر کر لینا چاہیے ...... اب جو تم نے وعدہ کیا ہے کہ کسی دن ان سب کج ادائیوں کا بدلہ ادا کر دو گی تو یہ گلہ جاتا رہا ......"

گزشتہ کئی برسوں سے "فنون" میں محمد حسن عسکری کے خلاف مضامین کا جو سلسلہ جاری ہے، اس کی تازہ ترین کڑی رشید ملک کا مضمون ہے، جس میں ثابت کیا گیا کہ عسکری صاحب موسیقی کے اسرار و رموز سے ناواقف تھے۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ عسکری صاحب نے موسیقی کے علم کو جاننے کی کوشش نہ کی کہ یہ علم جاننے والا پھر کسی اور کام کا نہیں رہتا۔ ظاہر ہے، موسیقی کا علم جاننے کے بعد عسکری، عسکری نہ رہتے، رشید ملک بن جاتے۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دبستانِ فنون کے لیے تو ایک ہی رشید ملک کافی ہے، دوسرا کس کام آئے گا؟ ہمارا خیال ہے کہ دوسرے رشید ملک کی خدمات دبستانِ سرگودھا کو سپرد کر دی جائیں، آخر سرگودھا والوں کو بھی تو ثابت کرنا ہوتا ہے کہ لاہور والے موسیقی کے سوا کچھ اور نہیں جانتے۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے اب کے "انشائیہ کیا نہیں" کے موضوع پر لکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے گزشتہ چند برسوں میں انشائیے پر اتنا کچھ لکھا ہے کہ ان کی سب تحریروں کو جمع کیا جائے تو داستانِ امیر حمزہ کی ضخامت کی کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ ہم اس موضوع پر پڑھتے پڑھتے تھک گئے ہیں، لیکن ڈاکٹر صاحب اسے لکھتے لکھتے نہیں تھکے۔ ڈاکٹر صاحب پڑھے لکھے آدمی ہیں، خدا نے انھیں اتنا علم دیا ہے کہ اگر وہ اسے کپڑوں کی جگہ پہنیں اور غذا کی جگہ تناول فرمائیں تو بھی ختم نہیں ہو سکتا، تاہم احتیاط لازمی ہے۔ فضول خرچی دولت کی ہو یا علم کی، آخر کو رنگ ضرور لاتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو، اگر ڈاکٹر صاحب انشائیے کا "سیاپا" چھوڑ کر کوئی مفید کام کریں۔ مثلاً ایک مفید کام یہ ہو سکتا ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر وزیر آغا کے خلاف جو مضامین لکھے ہیں، انھیں کتابی صورت میں جمع کر دیں۔ انتساب ڈاکٹر انور سدید کے نام ہو اور کتاب کا نام "دشنامِ یار" ہو۔

"اوراق" کے انشائیہ نمبر پر کچھ عرض کرنے سے پہلے کیوں نہ انشائیے ہی کے بارے میں کچھ باتیں کر لی جائیں۔

ہم کسی صنف ادب کے خلاف نہیں ہیں، یہاں تک کہ ریختی بھی ہمیں اچھی لگتی ہے، جسے پرانے زمانے میں انشا، رنگین اور جان صاحب نے اظہارِ کمال کا ذریعہ بنایا تھا اور موجودہ زمانے میں شوکت تھانوی، پروین شاکر اور مولانا کوثر نیازی کے کلام میں اس صنف کے اچھے نمونے مل جاتے ہیں۔ غزل بھی ہمیں

پسند ہے، مشاعرے کی ہو یا محفل موسیقی کی۔ منی بیگم کی ہو یا ناصر زیدی کی۔ سننے والوں پر یکساں اثر انداز ہوتی ہے۔ قصیدہ بھی کارآمد صنف ہے کہ پرانے زمانے میں امیروں، رئیسوں اور بادشاہوں کے قصیدے لکھ کر انعام و اکرام حاصل کیے جاتے تھے۔ آج کل بھی قصیدہ نگاروں کو محکمۂ اطلاعات اور ٹرسٹ کے اخباروں میں ملازمتیں آسانی سے مل جاتی ہیں۔ رباعی کے اختصار میں بھی جادو ہے۔ عبدالعزیز خالد اڑھائی سو شعروں کی نظم میں جو خیال پیش کرتے ہیں، جوش صاحب اسی خیال کو چار مصرعوں میں سمو دیتے تھے۔ نثری نظم بھی فائدے سے خالی نہیں کہ اس کے ذریعے ناموزوں طبع افراد شاعر بن سکتے ہیں..... ہم کہاں تک گنوائیں، بے شمار اصناف ادب ہیں۔ ناول، افسانہ، مسدس، مخمس، مثنوی، مرثیہ..... ان سب اصناف کو ہر دور میں برتا گیا۔ اچھے بُرے ہر طرح کے لکھنے والے اپنی اپنی بساط کے مطابق ان کے ذریعے اپنے خیالات کو ظاہر کرتے یا چھپاتے رہے، لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی صنف ادب بنائے فساد بن جائے۔ یہ اعزاز انشائیے اور صرف انشائیے ہی کو حاصل ہوا ہے۔ انشائیہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ جیسے سوالوں کے جواب فراہم کرنے میں عمریں صرف کی جا رہی ہیں۔ ایک طرف دبستان سرگودھا ہے، جہاں سب سے پہلے انشائیے کی کاشت ہوئی۔ دوسری طرف دبستان لاہور ہے، جہاں پیوندکاری کے عمل سے انشائیے کی ایسی فصل تیار کی گئی، جو ادب سے زیادہ منشیات کے دائرے میں آتی ہے، گویا ایک طرف انشائیے کی تحریک چلانے والے ہیں اور دوسری طرف چلتی گاڑی میں روڑہ اٹکانے والے ہیں۔

تحریک چلانے والوں کی خدمت میں بصد ادب عرض ہے کہ ادب میں تحریکیں اصناف کے نام پر نہیں چلتیں۔ کبھی کسی نے غزل، مثنوی، رباعی یا قصیدے کے نام پر تحریک نہیں چلائی، یہاں تک کہ محسن بھوپالی نے بھی کبھی اس قسم کی کوئی بات نہیں کی، حالاں کہ وہ صنف ادب کے موجد ہی نہیں، خاتم بھی ہیں۔ اگر وہ چاہتے تو "نظمانے" کے نام پر اچھی خاصی تحریک چلا سکتے تھے۔ حمایت علی شاعر "ثلاثی" کے موجد ہیں۔ ان کے لیے بھی "ثلاثی" کی تحریک چلانے میں کوئی امر مانع نہیں تھا، لیکن انھوں نے ضبط و تحمل سے کام لیا۔

انشائیے کی تحریک چلانے والوں کی خدمت میں مزید عرض ہے کہ اصناف ادب کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی، اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ کسی صنف کے ذریعے جو ادب پیش کیا جا رہا ہے، وہ کس معیار کا ہے۔ صاف گوئی معاف، ہمیں تو ڈاکٹر وزیر آغا کے علاوہ کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا، جس کے انشائیوں سے ادبی مسرت حاصل ہو۔ انشائیے ہی نہیں، انشائیہ نگار بھی ایک ہی جیسے نظر آتے ہیں۔ کسی انشائیے کو کوئی بھی عنوان دے دیجیے اور بطور مصنف کسی کا بھی نام لکھ دیجیے، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

معاف کیجیے، انشائیے کے بارے میں غیر ضروری گفتگو کچھ زیادہ ہی طویل ہو گئی۔ تو اب آئیے "اوراق" کے انشائیہ نمبر کی طرف۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ اپنے موضوع پر بے مثال پیش کش ہے۔ اسے بڑی محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ بہت سے تازہ بہ تازہ انشائیے ہیں، تنقیدی مقالے ہیں، تجزیاتی مطالعے ہیں،

مذاکرے ہیں، غیر ملکی انشائیوں کے تراجم ہیں، انشائیے سے متعلق کتابوں پر تبصرے ہیں اور انشائیہ نگار جمیل آذر کا گوشہ ہے۔ ابھی ہم نے صرف ڈاکٹر وزیر آغا کا نیا انشائیہ "دستر خوان" پڑھا ہے۔ جی خوش ہوا۔ خدا کرے اس نمبر کے باقی انشائیے بھی ایسے ہی ہوں۔ ہماری دعائیں اور نیک تمنائیں ان انشائیوں کے قارئین کے ساتھ ہیں۔

اس نمبر کا آغاز کراچی کے ایک مذاکرے کی روداد سے ہوتا ہے، جس میں اے خیام، علی حیدر ملک، صبا اکرام، شہزاد منظر، محمد رضا کاظمی، ممتاز احمد خان، راغب شکیب نے شرکت کی۔ معلوم نہیں یہ سب حضرات اتفاقی طور پر یکجا ہو گئے تھے یا انشائیہ دشمن عناصر کی کسی سازش کے تحت انھیں یکجا کیا گیا تھا۔ بہرحال جس جوش و خروش سے ان لوگوں نے گفتگو کی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عزیزان گرامی اپنی زندگی کو انشائیے کے فروغ کے لیے وقف کر چکے ہیں۔ کراچی میں انشائیے کی مقبولیت راغب شکیب کا کارنامہ ہے، گو اس وجہ سے خود راغب شکیب کی مقبولیت میں اضافہ نہیں ہو سکا۔ حیرت ہے کہ اس مذاکرے میں منظر علی خان کو مدعو نہیں کیا گیا، جب کہ وہ کراچی ہی کے نہیں، پورے سندھ کے بہترین انشائیہ نگار ہیں۔ مذکورہ حضرات کو خطرہ ہوگا کہ منظر صاحب کی شمولیت سے ان کا مذکرہ کہیں مذاقرہ نہ بن جائے۔ سو ہم ان کو یقین دلاتے ہیں کہ منظر صاحب کے بغیر بھی ان کا مذاکرہ اچھا خاصا مذاقرہ ہی تھا۔

اس مذاکرے میں رشید امجد کے اس قول فیصل کو دہرایا گیا کہ مستقبل میں صرف انشائیہ رہ جائے گا، دوسری اصناف ادب ختم ہو جائیں گی ......لہٰذا ہم اعلان کرتے ہیں کہ آج سے ہمارے کالموں کو انشائیہ تصور کیا جائے، تا کہ ہم نے اب تک جو کچھ لکھا ہے، وہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائے۔

(۱۹/جولائی ۱۹۸۵ء)

☆......☆......☆

ادبیات اور ذاتیات لازم و ملزوم ہیں

(۱)

ہمارے بعض قارئین کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ خط لکھ کر ہماری معلومات کا امتحان لیتے رہتے ہیں۔ کبھی کوئی پوچھتا ہے کہ قمر جمیل نے کالم نگاری چھوڑ دی، شاعری کیوں نہیں چھوڑی؟ کوئی سوال کرتا ہے کہ دبستان فنون اور سرگودھا کو اگر ایک دوسرے میں "ضم" کر دیا جائے تو کیسا رہے گا؟ کسی کا مطالبہ ہے کہ پیر پگارا صاحب نے اپنی تقریروں اور بیانات میں طنز و مزاح کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا ہے، اس کی بنا پر انھیں اکیڈمی آف لیٹرز اور رائٹرز گلڈ کا نگرانِ اعلیٰ مقرر کر دیا جائے تو ادیبوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟ اس قسم کے سوالوں کو ہم جمع کرتے جا رہے ہیں۔ ان شاء اللہ حسب توفیق آیندہ کسی کالم میں ان کا جواب دیا جائے گا۔ اس وقت ایک ایسا سوال درپیش ہے، جس کا جواب دینے سے ہم قاصر ہیں۔ شاعر اور افسانہ نگار پاشا رحمان نے واجدہ تبسم کے ایک مضمون کا اقتباس بھیجا ہے، جو بمبئی کے رسالے "فن اور شخصیت" کے ساحر لدھیانوی نمبر میں شایع ہوا ہے۔ اس اقتباس میں ایک پاکستانی شاعر کا ذکر ہے۔ پاشا رحمان صاحب نے پوچھا ہے کہ یہ پاکستانی شاعر کون ہے؟ اگر کوئی صاحب پاشا رحمان صاحب کے سوال کا صحیح جواب فراہم کر سکیں تو انھیں شاعر مذکور کے تمام مجموعہ ہائے کلام تحفتہً پیش کیے جائیں گے۔ واجدہ تبسم کے مضمون کا اقتباس یہ ہے:

"ایک بار پاکستان سے ایک مشہور شاعر آ کے ساحر کے مہمان ہوئے، کافی دن ٹھہرے۔۔۔۔

۔۔۔۔ ان کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت کی تو بمبئی کے ادیبوں شاعروں کے علاوہ بہت سارے فلمی لوگ، بزنس مین وغیرہ آئے۔ مہمان شاعر نے خوب شراب پی۔ خوب قے کی، بے حد غلاظت کی۔ خوب کھانا کھایا اور سب سے آخرت میں بے حد شاعری سناتے چلے جا رہے ہیں۔ غزل پیچھے غزل۔ غزل پیچھے غزل۔ سارے مقامی مہمان چلے گئے۔۔۔۔

۔۔۔۔ مہمان شاعر سے ذرا سا چھٹکارا پا کر ساحر ہمارے میں کمرے میں آئے اور بے حد مزے لے لے کر ہنس ہنس کر کہہ رہے ہیں ۔۔۔ کم بختوں کو اپنے گھر ٹھہراؤ، شراب پلاؤ، کھانا کھلاؤ، غلاظت سمیٹو اوپر سے شاعری سنو۔"

(۲)

سرگودھا سے شاعر جمیل یوسف نے ہمیں دو خط بھیجے ہیں۔ ایک ہمارے نام ہے اور دوسرا شاعر اور کالم نگار ظفر اقبال کے نام۔ ہمارے نام انھوں نے جو خط لکھا ہے، وہ یہ ہے:

"پچھلے دنوں برادرم ظفر اقبال سے میرا ایک قلمی مباحثہ نوائے وقت کے ادبی کالموں میں چل نکلا۔ شاید آپ کی نظر سے گزرا ہو۔ ظفر اقبال صاحب نے ۱۳ را پریل کو ایک نہایت غیر ذمہ دارانہ کالم لکھا، جس میں موصوف ادبیات سے ذاتیات کی سطح پر اتر آئے۔ نوائے وقت والوں نے اسے تو شایع کر دیا، مگر اس کے جواب میں میرا مکتوب، جس میں کسی قسم کی کوئی غیر شایستہ بات نہیں ہے، یہ کہہ کر چھاپنے سے انکار کر دیا کہ بحث کی تگی ذاتی نوعیت اختیار کر گئی ہے۔ نوائے وقت کا یہ دستور زبان بندی انصاف پر مبنی نہیں ہے۔ ایک فریق کو دشنام طرازی اور غلط بیانی کا موقع فراہم کرنا اور دوسرے کو جواب دینے سے محروم کر دینا ٹھیک نہیں ہے۔ اندریں حالات آپ سے درخواست ہے کہ براہِ کرم میرے مراسلے کو "سخن در سخن" میں شایع فرما کر ممنون کریں، تا کہ ادب کے قارئین کو میرے موقف کا علم ہو۔"

جمیل یوسف صاحب کی خدمت میں عرض ہے کہ نوائے وقت کا قلمی مباحثہ ہماری نظر سے نہیں گزرا، لیکن جناب ظفر اقبال کے کلام نظم و نثر سے مستفید ہونے کی سعادت ہمیں حاصل ہے۔ بلاشبہ وہ عہد حاضر کے ان چند قلم کاروں میں سے ہیں، جو اپنی بات اپنے ہی انداز میں کہتے ہیں۔ انھیں تلوار کی دھار پر چلنے اور تلوار کی نوک سے لکھنے میں ہی مزہ آتا ہے۔ جب انھوں نے اپنی شاعری میں اپنے محبوب کی کبھی تعریف نہیں کی تو نثر میں کسی دوسرے کی تعریف کیسے کر سکتے ہیں۔ رہی یہ بات کہ وہ ادبیات سے ذاتیات کی سطح پر اتر آئے ہیں تو یہ کوئی قابل اعتراض "حرکت" نہیں ہے۔ ہماری ناقص رائے میں ادبیات اور ذاتیات لازم و ملزوم ہیں۔ ادب کو ہم ادیب کی ذات سے الگ نہیں کر سکتے۔ ادیب جو کچھ لکھتا ہے، وہ اس کی شخصیت یعنی ذات کا عکس ہوتا ہے۔ ادب اور ذات کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے تو ادب بے ذائقہ اور ذات بے ادب ہو جاتی ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ متعلقہ اخبار نے آپ کا جوابی مراسلہ شایع نہیں کیا تو اس کی شکایت فضول ہے۔ اخبار والے آزادیِ اظہار کا مطالبہ اپنے لیے کرتے ہیں۔ مراسلہ نگاروں کے لیے نہیں۔ اگر آپ کو مراسلے کی اشاعت کا ایسا ہی شوق تھا تو اسے بطور اشتہار چھپوا لیا ہوتا۔ اشتہاروں کے معاملے میں اخبار والے بڑے فراخ دل ہوتے ہیں۔ کوئی اصول یا ضابطہ اخلاق سدِ راہ نہیں ہوتا۔ یہاں

تک کہ اداریے کو بھی بطور اشتہار چھاپا جا سکتا ہے، بشرطیکہ مشتہر صاحب اقتدار ہو۔

ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کا مراسلہ بنام ظفر اقبال اپنے کالم میں شائع نہیں کر سکتے۔ یہ کالم ہے، ظفر اقبال کا دیوان نہیں کہ ہر طرح کے مضامین کی گنجائش نکل آئے۔ ویسے بھی ہم دوسروں کے جھگڑوں میں اس وقت تک دخل نہیں دیتے، جب تک جھگڑے میں آگے بڑھنے کا امکان نظر نہ آئے۔ آپ دونوں ماشاءاللہ سمجھ دار ہیں، اس لیے جلد ہی صلح کر لیں گے۔ جب صلح ہی کرنی ہے تو پھر آپ ہمیں کیوں کانٹوں میں گھسیٹتے ہیں؟

(۳)

''تخلیق'' کا شمار اُردو کے بہترین رسالوں میں ہوتا ہے۔ اظہر جاوید نے محدود وسائل اور نامساعد حالات کے باوجود سولہ برس تک اس رسالے کو جاری رکھا۔ اس خدمت کا انھیں جو صلہ ملا، اس کی تفصیل انھیں کی زبان سے سنیے۔ اظہر جاوید کے ایک طویل مراسلے کے کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں:

''تخلیق کو میں نے بچوں کی طرح پالا تھا، بلکہ یہ کہنا بھی جھوٹ نہیں ہوگا کہ بسا اوقات میں نے اپنے بچوں کا حصہ چھین کر اس کی زندگی کی نذر کیا۔ میں نے اسے خونِ دل سے سینچا اور محبتوں سے پروان چڑھایا۔ خود فاقے کیے، مگر اس کا پیٹ بھرتا رہا...... تخلیق کو زندہ رکھنے، بلکہ تمام ادبی رسائل کی بقا کے لیے میں نے کیا کیا جتن کیے، کتنا دربدر اور خاک بسر ہوا۔ اس کی تفصیل طولانی بھی ہے اور دردناک بھی۔ نواب زادہ شیر علی خاں کی وزارت سے لے کر صدر الصدور جنرل ضیاء الحق کی چوکھٹ تک کیسی کیسی جبہ سائی کی ...... یہ داستان دردناک بھی ہے اور شرم ناک بھی۔ نسیم درانی، سلطان رشک، وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی گواہ ہیں کہ ہم نے ادبی رسائل کو زندہ رکھنے کے لیے اپنی انا کو بھی مارا اور ہر اس صاحبِ اختیار کو بھی پکارا، جس کی معرفت دم توڑتے ہوئے ادبی رسائل کو زندگی کی رمق مل سکتی تھی ...... پانچ برس پہلے جب اہلِ قلم کانفرنس میں صدر صاحب نے ارشاد فرمایا کہ ادبی رسائل کے مسائل حل کر دیے گئے ہیں تو ہم ایسے سادہ لوحوں نے بہت تالیاں بجائیں اور آپس میں مبارک سلامت کے ڈونگرے بھی برسائے...... مگر نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ معاف کیجیے ایک نتیجہ ضرور نکلا کہ سولہ برس سے انتہائی نامساعد حالات کے باوجود چھپنے والا رسالہ تخلیق آخر آخر دم توڑ گیا۔''

ممکن ہے ان سطور کو پڑھ کر بعض لوگوں کے دلوں میں اظہر جاوید اور ''تخلیق'' کے لیے ہمدردی کے جذبات پیدا ہوں، مگر ہمیں تو اظہر جاوید کی سادگی اور سادہ لوحی پر ہنسی آئی۔ اول تو یہی بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی، اظہر جاوید کو ادبی رسالہ نکالنے کی ضرورت کیا تھی۔ کوئی فیشن میگزین نکالا ہوتا، کسی جاسوسی ڈائجسٹ قسم کی چیز میں ہاتھ ڈالا ہوتا۔ پھر کسی چوکھٹ پر ماتھا رگڑنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ رہا یہ کہ دم توڑتے ہوئے ادبی رسائل کی مدد اکیڈمی آف لیٹرز بھی نہ کر سکی تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اکیڈمی کے سامنے اس سے بھی زیادہ اہم کام ہیں۔ مثلاً ...... معاف کیجیے اس وقت کوئی مثال یاد نہیں آ رہی۔ یہ اکیڈمی کا نہیں، ہمارے حافظے کا قصور ہے اور سب سے زیادہ قصور وار تو اظہر جاوید ہیں، جو برس ہا برس اپنے رسالے کے مسائل حل کرنے کے لیے دوسروں کی طرف دیکھتے اور اہلِ قلم کانفرنس میں تالیاں بجاتے رہے، جب کہ ان مسائل کو حل کرنا خود ان کے اپنے ہاتھ میں تھا۔ بعد از خرابیٔ بسیار سہی، آخر کار انھوں نے ''تخلیق'' کو بند کر کے سب مسائل نہایت عمدگی سے حل کر لیے۔ دوسرے ادبی رسالوں کے ایڈیٹروں کو بھی اظہر جاوید کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے۔

(۴ راگست ۱۹۸۵ء)

☆......☆......☆

ایک تعزیت نامہ برائے استاد

۱۸ / اگست ۱۹۸۵ء کو شام کے سات بجے بہاول پور سے قرۃ العین کے ایس ایچ او کا فون آیا کہ ایک مقامی ہوٹل میں اختر انصاری اکبر آبادی مردہ حالت میں پائے گئے ہیں۔ اُن کے وارثوں سے کہیے کہ مجھ سے رابطہ قائم کریں۔

تھوڑی دیر بعد ہوٹل کے مالک کا فون آیا۔ اس نے بتایا:

''آج صبح تک اختر صاحب ٹھیک ٹھاک تھے۔ نو بجے کے قریب وہ اپنے کمرے کے باہر ٹہلتے اور سگریٹ پیتے رہے۔ پھر وہ اندر جا کر لیٹ گئے۔ تین بجے اُن کے ایک ملاقاتی آئے۔ اختر صاحب کو اطلاع کرنے کے لیے بیرا اُن کے کمرے میں گیا تو معلوم ہوا کہ وہ انتقال کر چکے ہیں۔ پولیس کو اطلاع کی گئی۔ ان کی لاش مقامی مردہ خانے میں رکھی ہے۔ ان کے وارثوں کو اطلاع کر دیجیے کہ یہاں آ جائیں۔''

اختر انصاری اکبر آبادی، جنھیں عام طور پر ''استاد'' کہا جاتا تھا، ان کا کوئی ایک وارث ہوتا تو اسے اطلاع کی جاتی۔ استاد کے وارث تو وہ سب لوگ تھے، جن کا اردو زبان و ادب سے تعلق ہے......... اور اس کی تصدیق ۲۰/ اگست کو شام کو اس وقت ہوئی، جب حیدر آباد سندھ میں چھاؤنی کے قبرستان میں استاد کو سپردِ خاک کیا جا رہا تھا۔ سوگواروں کا ایک ہجوم قبرستان میں موجود تھا۔ ادیب ہی نہیں، زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے بے شمار لوگ استاد کے لیے سوگوار تھے۔ کراچی کے ادیبوں کا ایک قافلہ بھی ہجومِ سوگواراں میں شامل تھا۔

استاد ایک عرصے سے بیمار تھے۔ مستقل کھانسی اور دورانِ سر، دمہ، بلڈ پریشر، ذیابیطس، جوڑوں کا درد اور نہ جانے کیا کیا بیماریاں ان کی جان کے ساتھ لگی ہوئی تھیں، مگر سب سے بڑی بیماری اردو زبان کی محبت تھی۔ یہی بیماری دوسری تمام بیماریوں کی جڑ تھی۔ استاد اردو ہی کے لیے جیے اور بالآخر اُردو ہی کے

لیے مر گئے۔

استاد یوں تو دو درجن کے قریب کتابوں کے مصنف اور مؤلف تھے، شاعر بھی تھے اور نثر نگار بھی، لیکن یہ ان کے ضمنی مشاغل تھے۔ ان کا اصل کام اردو زبان کی ترویج و اشاعت تھا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے اپنے آپ کو وقف کر دیا تھا۔ اُن کا قیام حیدر آباد میں تھا، لیکن یہ قیام برائے نام تھا، اُن کا زیادہ تر وقت سفر میں گزرتا تھا۔ سفر اور مسلسل سفر۔ استاد کے نزدیک اردو کی ترویج و اشاعت کی ضرورت بڑے شہروں سے زیادہ چھوٹے شہروں اور دیہاتوں میں تھی۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ عمر بھر سرگرمِ عمل رہے۔ کہیں ان کے ایما پر مشاعرہ ہو رہا ہے، کہیں ادبی نشست ہے، کہیں کوئی لائبریری قائم کی جا رہی ہے، کہیں اردو کانفرنس ہے، کہیں سندھی اردو سیمینار ہے۔ غرض کہ اس قسم کی مصروفیات کا ایک طویل سلسلہ تھا، جس کے نتیجے میں اُردو زبان و ادب سے ان لوگوں میں بھی دلچسپی پیدا ہوئی، جن کی یہ مادری زبان نہیں تھی۔

استاد میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ آگرے میں پلے بڑھے، قیامِ پاکستان کے بعد کراچی آ گئے۔ یہاں اولاً انھوں نے رسالہ ''نشیمن'' کی ادارت کی اور پھر ''مشرب'' جاری کیا۔ ''مشرب'' اعلیٰ معیار کا ادبی جریدہ تھا، جسے برصغیر کے تمام اہم لکھنے والوں کا تعاون حاصل تھا۔ کچھ عرصے بعد استاد نے محسوس کیا کہ اردو کی نشر و اشاعت کے کام کی ضرورت کراچی سے زیادہ سندھ کے اندرونی علاقوں میں ہے۔ ۱۹۵۶ء میں حیدر آباد سندھ منتقل ہو گئے اور وہاں سے ''نئی قدریں'' جاری کیا۔ یہ اندرونِ سندھ کا واحد ادبی رسالہ ہے، جو باقاعدگی سے کئی برسوں تک شائع ہوتا رہا۔ اس رسالے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے ذریعے بے شمار نئے لکھنے والوں کو متعارف کرایا گیا۔ استاد قریہ قریہ گھوم کر نئے اور گم نام ادیبوں کا سراغ لگاتے، ان کی تخلیقات حاصل کرتے اور انھیں اپنے رسالے میں شائع کرتے۔ استاد کی اس مہم کے نتیجے میں بہت سے ایسے ادیب منظرِ عام پر آئے، جو آج ہمارے ادب میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔

استاد نے آج سے بہت پہلے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اردو کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ پاکستان کی علاقائی زبانوں کے ادب سے استفادہ کیا جائے۔ انھوں نے اپنے رسالے میں سندھی ادب کے بے شمار تراجم شائع کیے، جن کی وجہ سے اردو والوں کو یہ معلوم ہوا کہ سندھی ادب کتنا باثروت ہے۔ استاد نے ''نئی قدریں'' کا ایک ضخیم ''سندھی ادب نمبر'' شائع کیا، جو آج بھی ایک کتابِ حوالہ کا درجہ رکھتا ہے۔ سندھی ادب سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے اُردو میں اس سے بہتر کام اب تک نہیں ہوا۔

استاد کے مداحوں اور قدر دانوں کا حلقہ بڑا وسیع تھا۔ کراچی سے لے کر پشاور تک ہر جگہ ان کے قدر دان موجود تھے، جو ان کے مقاصد میں ہر طرح سے تعاون کرتے تھے۔ ایک چھوٹا سا گروہ استاد کے حاسدوں اور ناپسند کرنے والوں کا بھی تھا۔ حاسد ان کی ''استادی'' سے بلاوجہ خائف تھے اور ناپسند کرنے

والے استاد کی اس ادا سے نالاں تھے کہ انھوں نے ادب کو ذریعہ معاش بنا رکھا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جس ملک میں رشوت، چور بازاری، اسمگلنگ اور منشیات فروشی کو ذریعۂ معاش بنانے کا عام رواج ہو، وہاں ادب کو ذریعہ معاش بنانے پر اعتراض کیا جائے۔ استاد کی معاش ہی کیا تھی؟ چند پیکٹ سگریٹ کے، چند پیالیاں چائے کی، ایک وقت کا معمولی کھانا، معمولی اور سادہ لباس اور گرد وغبار سے اٹا ہوا کرائے کا مکان۔ استاد جو کچھ حاصل کرتے تھے اپنے رسالے پر صرف کر دیتے تھے اور یہ رسالہ بڑی تعداد میں مفت تقسیم ہوتا تھا۔ یہی حال ان کتابوں کا تھا، جو استاد کے ادارے کی طرف سے شائع ہوئی تھیں۔

استاد میں بے شمار خوبیاں تھیں۔ سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ قناعت پسند تھے اور اپنی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کوئی بڑا روگ پالنے کے قائل نہ تھے۔ ایک مرتبہ حیدرآباد کے ایک علم دوست اور بڑے سرکاری عہدے دار نے چاہا کہ استاد کے لیے کوئی مستقل ذریعہ آمدنی پیدا کر دیا جائے۔ انھوں نے استاد کے نام تجارتی پلاٹ الاٹ کرنے کا فیصلہ کیا۔ استاد نے ان سے کہا:

"میں اس پلاٹ کو کیا کروں گا۔ آپ بس اتنا کیجیے کہ میرے رسالے کے دس بارہ خریدار بنوا دیجیے، تا کہ اس مہینے کے اخراجات پورے ہو جائیں۔"

اور سو خوبیوں کی ایک خوبی یہ تھی کہ کہ اگر کبھی ان کے بارے میں "سخن گسترانہ" باتیں لکھی جاتیں تو وہ برا نہ مانتے۔ ہم نے بیسیوں مرتبہ اپنے کالموں میں استاد کا ذکر "باندازِ دیگر" کیا، لیکن کبھی انھوں نے شکایت نہ کی۔ کالم پڑھ کر فون ضرور کرتے اور یہ کہتے:.......... "یہی کیا کم ہے تم کسی نہ کسی بہانے مجھے یاد رکھتے ہو۔".......... اُن کی جگہ کوئی اور ہوتا تو بعض "کرم فرماؤں" کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ناراض ہو جاتا۔

انتقال سے چند روز پہلے انھوں نے "نئی قدریں" کا تیس سالہ نمبر شائع کیا تھا اور اسی نمبر کے سلسلے میں انھوں نے مختلف مقامات کے دورے کا پروگرام بنایا تھا۔ سب سے پہلے وہ بہاول پور گئے اور وہیں ان کی زندگی کا سفر ختم ہو گیا۔ حالاں کہ بقول خود

عجیب شخص تھا اختر کہ تھک گیا تھا بہت
مگر ارادۂ ترکِ سفر نہ رکھتا تھا

"نئی قدریں" کے تیس سالوں میں ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر نجم الاسلام، ڈاکٹر انور سدید، جیلانی کامران، محمد علی صدیقی، ڈاکٹر سلیم اختر، انجم اعظمی، رضا ہمدانی، ڈاکٹر طاہر تونسوی، مظفر ضیا، محسن احسان اور بہت سے دوسرے ادیبوں نے استاد اور ان کے رسالے کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

"اردو زبان اور ادب کے فروغ کے لیے جناب اختر انصاری اکبر آبادی نے جو کچھ کیا

ہے، اس کی اہمیت اور افادیت کے تو اب ان کے دشمن بھی معترف ہیں۔ حیدرآباد سندھ کی خشک آب و ہوا میں اردو کا پودا لگانا اور پھر تیس برس تک اس کی آبیاری کرنا، نہ صرف آبیاری کرنا، بلکہ اسے زمانے کی نظرِ بد سے بچانے کے لیے سینہ سپر ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اختر انصاری اکبر آبادی ایک درویش صفت ادیب اور شاعر ہیں، جو ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر پوری لگن، بلکہ دیوانگی کے ساتھ اپنے کام میں منہمک ہیں۔ "نئی قدریں" ان کی پہچان بن چکا ہے۔ اس کے ذریعے انھوں نے نہ صرف نئے ادیبوں کی ایک پوری کھیپ کو اردو دنیا سے روشناس کرایا ہے، بلکہ ان کی تربیت بھی کی ہے۔ وہ اپنے علاقے میں روشنی کے ایک مینار کی طرح ہیں، جس سے روشنی کی شعاعیں نکل کر دور دور تک جا رہی ہیں اور بھولے بھٹکے مسافروں کو ان کی منازل تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ اپنی طویل علالتوں کے باوجود اور معاشی بدحالی کے منحوس سائے میں رہ کر بھی انھوں نے اپنا سب کچھ اردو زبان اور ادب پر نچھاور کر دیا ہے۔ سو ضرورت اس بات کی ہے کہ نہ صرف حکومتی سطح پر ان کی خدمات کا اعتراف کیا جائے، بلکہ اردو سے محبت کرنے والے بھی ان پر اعزازات کی بارش کر دیں۔"

لیکن اب استاد وہاں ہیں، جہاں اُن کی خدمات کے اعتراف کی ضرورت نہیں رہی، البتہ اردو زبان کے مفاد میں ضروری ہے کہ استاد کے مشن کو جاری رکھا جائے۔ رسالہ "نئی قدریں" باقاعدگی سے شائع ہوتا رہے۔ اس کام کو ہمارے خیال میں ایک ہی شخص کر سکتا ہے اور اس کا نام صابر وسیم ہے۔ حیدرآباد سندھ کے اس نوجوان شاعر سے زیادہ کوئی دوسرا شخص استاد کے قریب نہیں تھا۔ استاد سے صابر وسیم کو جو محبت تھی، اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ استاد کی وفات کی خبر سننے کے بعد یہ شاعر تین روز تک سویا نہیں۔ وہ استاد کے رشتہ داروں کا سراغ لگانے کے لیے پہلے کراچی گیا اور پھر بہاول پور۔ استاد کی میت کو ایک ایمبولینس میں لے کر حیدرآباد آیا، تدفین کا کام بھی اسی نے کیا۔ استاد خوش قسمت تھا کہ اسے صابر وسیم جیسا عقیدت مند ملا۔ ایسا عقیدت مند ہی استاد کے کام کو جاری رکھ سکتا ہے۔

(۶ دسمبر ۱۹۸۵ء)

☆..........☆..........☆

دس گرام کی شاعری

پچھلے ایک ڈیڑھ مہینے سے ہمارا کالم معمول کے مطابق شائع نہیں ہو رہا۔ کبھی ہم ناغہ کر جاتے ہیں اور کبھی ہمارا اخبار۔ اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے استاد لاغر مراد آبادی نے فرمایا:

"آپ کی کالم نگاری مقدار اور معیار، دونوں کے اعتبار سے خاصی مایوس کن ہے۔"

ہم نے مقدار والی بات تو مان لی کہ اس کے ماننے میں کوئی نقصان نہیں تھا، لیکن معیار والی بات سے اختلاف کرتے ہوئے ہم نے عرض کیا:

"معیار کا تعلق تو پڑھنے والوں کے مزاج سے ہوتا ہے۔ کوئی کسی تحریر کو معیاری سمجھتا ہے اور کوئی اسی تحریر کو غیر معیاری۔ جب ایک ہی تحریر کے بارے میں دو مختلف رائیں ہوں تو پھر خود لکھنے والے کی رائے فیصلہ کن ہوتی ہے۔"

انھوں نے فرمایا:

"تو گویا آپ کی فیصلہ کن رائے میں آپ کی تحریریں معیاری ہوتی ہیں۔"

ہم نے جب اس غیر ضروری سوال کے جواب میں خاموشی اختیار کی تو استاد نے تنبیہ کی:

"یاد رکھیے! آپ کالم نگاری کے ذریعے اپنا اور دوسروں کا وقت ضایع کر رہے ہیں۔"

اب ہم خاموش نہ رہ سکے اور عرض کیا:

"یہ بات تو ٹھیک ہے کہ ہم اپنا وقت ضایع کرتے ہیں، لیکن دوسروں کے بارے میں ایسا کہنا درست نہیں۔ ہمارے نام جو اتنے بہت سے خط آتے ہیں، ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہم جن مسائل پر لکھتے ہیں، دوسرے ان مسائل پر مزید لکھنے کے لیے مائل ہوتے ہیں۔"

یہ کہہ کر ہم نے ڈاکٹر انور سدید کا خط استاد کے سامنے رکھ دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا:

"مجی خامہ بگوش صاحب! انگبیر میں مقتدرۂ قومی زبان کے املا سیمینار کے بارے میں آپ کا

پُرلطف کالم پڑھا۔ آپ کا ممنون ہوں کہ اس میں آپ نے اس ناچیز کا ذکر بھی کیا ہے۔ پنجابی ہونے کے ناتے مجھے اپنی املا کے درست ہونے کا دعویٰ نہیں، تاہم ریکارڈ کی درستی کے لیے عرض کرتا ہوں کہ مجھے املا سیمینار میں مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ ہاں اس میں سیمینار کے آخری جلسے میں اصلاح املا کے لیے اپنے طور پر شریک ہوا تھا۔ اس میں شمولیت کا فائدہ بھی ہوا، یعنی اب میری املا پہلے سے بھی زیادہ خراب ہوگئی ہے۔ لکھتے لکھتے تکنیک میں پڑ جاتا ہوں کہ "کاتب" کو "قاطب" یا "تکبیر" کو "طقبیر" لکھوں۔

"آپ نے مرزا ادیب صاحب کے خط مرموزہ کا ذکر کیا ہے اور ان کی خوش خطی کو بہت اچھا خراج تحسین ادا کیا ہے۔ مقتدرہ میرزا صاحب کے اس اضافی وصف سے واقف تھا، چنانچہ انھیں باضابطہ طور پر مدعو کیا گیا اور شرکائے مجلس کو ان کے خط مرموزہ سے عبرت حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ خط مرموزہ کے ایک اور ماہر ڈاکٹر سلیم اختر ہیں۔ میرزا صاحب کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ اپنا لکھا ہوا پڑھ لیتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر تو اپنا لکھا ہوا بھی پڑھ نہیں سکتے۔ خط مرموزہ کے ارتقا میں ڈاکٹر سلیم اختر کی خدمات زیادہ ہیں۔ افسوس کہ مقتدرہ نے انھیں مدعو نہیں کیا اور آپ نے بھی اس ناانصافی کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔ از رہِ کرم اس کی تلافی کیجیے۔ بصورت دیگر مختصر ترین تاریخ کے آیندہ ایڈیشن میں وہ آپ کے ساتھ بھی وہی سلوک کریں گے، جو انھوں نے انشائیے کے ساتھ سابقہ ایڈیشنوں میں کیا ہے۔"

یہ خط پڑھ کر استاد نے فرمایا:

"انور سدید صاحب کمال کے آدمی ہیں۔ جو شخص اتنے دلچسپ خط لکھ سکتا ہو، اسے ڈاکٹر وزیر آغا پر خشک مضامین اور کتابیں لکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ انھیں چاہیے کہ مکتوب نگاری پر اکتفا کریں۔ خدا نے چاہا تو ایک دن غالب کے خطوں کی طرح ان کے خط بھی نصاب میں شامل ہو جائیں گے۔"

استاد لاغر مراد آبادی کے جانے کے بعد ہم نے انور سدید صاحب کے خط کو دوبارہ پڑھا۔ اس میں اور سب باتیں تو درست نظر آئیں، لیکن ڈاکٹر سلیم اختر کے بارے میں انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس سے ہمیں اتفاق نہیں ہے۔ موصوف فرماتے ہیں: ...."ڈاکٹر سلیم اختر تو اپنا لکھا ہوا بھی نہیں پڑھ سکتے۔"

..........ہمارے خیال میں کوئی بھی عاقبت اندیش مصنف اپنا لکھا ہوا پڑھنے کی جسارت نہیں کرتا۔ اس طرح کم از کم ایک شخص کی رائے اس کے بارے میں خراب ہونے سے بچ جاتی ہے۔

انور سدید صاحب کو شکایت ہے کہ مقتدرہ نے ڈاکٹر سلیم اختر سے جو بے انصافی کی ہے، ہم نے اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ہم نے کبھی ان بے انصافیوں کے خلاف بھی آواز نہیں

الٰہی، جو خود ڈاکٹر سلیم اختر نے دوسروں کے ساتھ روا رکھی ہیں۔ مثلاً انھوں نے ڈاکٹر انور سدید ہی کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔ ہم چاہتے تو آسانی ایک آدھ کالم انور سدید صاحب کے حق میں لکھ سکتے تھے، لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا، کیوں کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ اردو ادب کی مختصر ترین تاریخ کے اگلے ایڈیشن میں ڈاکٹر سلیم اختر ایک باب کالم نگاری پر بھی باندھیں گے۔ اس ایڈیشن کی طباعت تک ہم ان کے خلاف ایک لفظ لکھنا تو کجا، سننا بھی گوارا نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر انور سدید کا خط آپ نے پڑھا ہے تو ایک خط اور بھی پڑھ لیجیے۔ کراچی کے ذوالفقار مصطفیٰ صاحب لکھتے ہیں:

''میں آپ کا کالم باقاعدگی سے پڑھتا ہوں۔ اس سے بقول آپ ہی کے معلومات اور درجۂ حرارت دونوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں عرض کروں گا کہ آپ کی کچھ باتیں مجھے پسند نہیں آتیں۔ ایک تو آپ ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی کے جھگڑے میں کھلم کھلا ڈاکٹر وزیر آغا اور ان کے حواریوں کی طرف داری کرتے ہیں۔ دوسرے آپ اپنے بعض قریبی لوگوں کا تذکرہ بلا ضرورت کرتے رہتے ہیں۔ مثلاً ہر پانچویں کالم میں سلطان جمیل نسیم اور لاغر مراد آبادی کا ذکر ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے ان صاحبوں نے آپ کو اپنا پبلسٹی ایجنٹ مقرر کر رکھا ہے۔ بعض لوگوں پر آپ بلا ضرورت تنقید کرتے ہیں اور بعض کی بلا ضرورت تعریف۔ آپ کو اپنی تحریروں میں توازن پیدا کرنا چاہیے۔ ہاں کبھی کبھی ادبی تقریبات میں بھی شرکت کر لیا کیجیے اور ان کا آنکھوں دیکھا حال لکھ دیا کیجیے۔ ابھی پچھلے دنوں طاہر مسعود اور عرفانہ عزیز کی کتابوں کے جلسے ہوئے تھے۔ ان کتابوں کی رونمائی کا حال آپ کو لکھنا چاہیے تھا۔''

ذوالفقار مصطفیٰ صاحب کا بہت بہت شکریہ کہ وہ ہمارا کالم باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ انھوں نے جو اعتراضات کیے ہیں۔ ان کے بارے میں ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ انھیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور جناب احمد ندیم قاسمی دونوں ہمارے بزرگ ہیں اور ان دونوں کے لیے ہمارے دل میں یکساں احترام ہے۔ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کی طرف داری کی جائے۔ ہم تو دونوں کے طرف دار ہیں اور دونوں ہی کو اپنی اپنی جگہ درست سمجھتے ہیں۔ اسی غیر جانبداری کا نتیجہ ہے، کہ ہم نے کبھی ان دونوں کے باہمی جھگڑے کو ختم کرانے کی کوشش تو کیا، خواہش بھی نہیں کی۔ جو بات بزرگوں کے نزدیک درست ہو (یعنی جھگڑا وغیرہ) وہ ہمارے نزدیک کس طرح غلط ہو سکتی ہے۔

لاغر مراد آبادی اور سلطان جمیل نسیم کا ذکر ہم گاہے گاہے ضرور کرتے ہیں، لیکن اس کا سبب یہ نہیں کہ ہم ان کے پبلسٹی ایجنٹ ہیں۔ ان کے بارے میں ہم نے اب تک جو کچھ لکھا ہے، اگر وہ پبلسٹی کے ذیل میں

آتا ہے تو اجازت دیجیے کہ آیندہ اس قسم کی باتیں آپ کے حوالے سے لکھی جائیں۔ یہ صحیح ہے کہ مذکورہ حضرات کو اپنی افسانہ نگاری اور شاعری سے اتنی شہرت نہیں ملی، جتنی ہمارے کالموں سے، لیکن ایسی شہرت کس کام کی کہ لوگ ان دونوں کو افسانہ نگاری اور شاعری کے حوالے سے تو بھول گئے اور ہمارے کالموں کے حوالے سے یاد رکھا۔

ذوالفقار مصطفیٰ صاحب نے ہمیں مشورہ دیا ہے کہ ہم اپنی تحریروں میں توازن پیدا کریں۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ''توازن'' محمد علی صدیقی کے مشہور تنقیدی مجموعے کا نام ہے۔ جتنا توازن تھا، وہ انھوں نے صرف کر ڈالا۔ ہمارے لیے کچھ بچا ہی نہیں۔

رہی تقریبات کا حال لکھنے کی تجویز تو آپ ہی بتایئے کہ طاہر مسعود کی کتاب کی تقریب رونمائی کے بارے میں ہم کیا لکھتے۔ جب ان کی کتاب پوری کی پوری فروخت ہو گئی یا بقول شخصے مفت تقسیم ہو گئی تو انھیں اس کی رونمائی کا خیال آیا۔ یہ ایسی ہی بات ہے، جیسے شادی کے بعد ضرورت رشتہ کا اشتہار چھپوایا جائے۔ طاہر مسعود چوں کہ وقت سے پہلے مصنف بنے تھے، اس لیے انھوں نے اپنی کتاب کو وقت کے بعد رونمائی کے لیے پیش کیا۔

عرفانہ عزیز کی کتاب کی رونمائی میں ہم اس لیے شریک نہیں ہوئے کہ تقریب سے پہلے ایک لطیفہ سن لیا تھا۔ اس کتاب کے ناشر جناب صہبا لکھنوی ایک محفل میں کتاب کی تعریف کر رہے تھے۔ کہنے لگے:

''میں نے کتاب کو نہایت خوبصورت انداز سے چھاپا ہے، بہترین کاغذ لگایا ہے، سو گرام آفسٹ پیپر۔''

اس پر ایک شریک محفل نے کہا:

''تعجب ہے، دس گرام کی شاعری پر آپ نے سو گرام کا کاغذ لگا دیا۔''

(۱۳ر ستمبر ۱۹۸۵ء)

☆ ☆ ○ ☆

”بہرام کی واپسی“

ایک زمانہ تھا کہ ادبی رسالے باقاعدگی سے ہر مہینے شائع ہوتے تھے۔ ساقی، نگار، ادب لطیف، ادبی دنیا، نیرنگ خیال۔ نہ جانے کتنے رسالے تھے، جن سے ادبی دنیا میں چہل پہل رہتی تھی۔ ہر رسالے کی کوشش یہ ہوتی تھی، کہ وہ بہترین تخلیقات شائع کرے۔ لکھنے والوں کو معلوم تھا کہ کمتر درجے کی کوئی چیز شائع نہیں ہو سکے گی، اس لیے وہ جی لگا کر لکھتے تھے۔ ان رسالوں کے قارئین کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ سالانہ خریداروں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ اس وجہ سے مالی حالات اتنے اچھے تھے کہ کاتبوں، جلد سازوں اور پریس والوں ہی کو نہیں، ادیبوں کو بھی معاوضہ دیا جاتا تھا اور اب یہ حال ہے کہ ماہانہ رسالوں کی روایت ختم ہو چکی ہے۔ لے دے کے ایک ”افکار“ ہے، جو صہبا لکھنوی کی مسیحا نفسی کی بدولت باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ باقی تمام رسالے ”مرضی وار“ نکلتے ہیں۔ کوئی سال میں دو مرتبہ اور کوئی سال میں ایک مرتبہ۔ رسالے کیا ہیں، فقیر کا کشکول ہیں۔ کسی نے سوکھی روٹی کا ٹکڑا ڈال دیا، کسی نے باسی کڑھی انڈیل دی، کسی نے دیوانی ہانڈی سے کچھ تبرک نکال کر دے دیا۔ ادیبوں کی بارگاہ سے جو کچھ اور جتنا کچھ مل جاتا ہے، مدیران کرام صبر شکر سے اسے چھاپ دیتے ہیں۔ اسی لیے تو مرضی وار رسالے عموماً بدہضمی کا شکار ہوتے ہیں۔ یعنی ضخامت اتنی زیادہ ہوتی ہے، جیسے کلیات عبدالعزیز خالد ہو۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ رسالے محدود تر تعداد میں چھپتے ہیں اور قیمت کی زیادتی کی وجہ سے محدود تر تعداد میں فروخت ہوتے ہیں...... ایسا ہی ایک رسالہ ”تخلیقی ادب“ ہے، جو چھ برس پہلے جاری ہوا تھا اور اب کہیں جا کر اس کا چوتھا شمارہ شائع ہوا ہے۔ اوسط ہے ڈیڑھ سال میں ایک شمارہ۔ گویا ادبی رسالہ نہ ہوا، فیملی پلاننگ والوں کا ترجمان ہو گیا کہ دو شماروں کے درمیان خاصا معقول فاصلہ رکھا گیا ہے۔

”تخلیقی ادب“ کے مرتبین میں ایک نام مشفق خواجہ کا بھی ہے، جن کا تعلق تحقیقی ادب سے ہوتو ہو، تخلیقی ادب سے صرف اتنا ہے کہ کسی زمانے میں غزلیں کہتے تھے۔ پھر ان غزلوں کا مجموعہ ”ابیات“ کے

نام سے چھاپ کر خود بھی شرم سار ہوئے اور انھیں بھی شرمسار کیا، جنھیں یہ مجموعہ تحفتہً دیا گیا تھا۔ ”ابیات“ کو ادبی حلقوں میں تو کیا، گانے بجانے والوں میں بھی مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ یہ مجموعہ منی بیگم کی نگاہِ انتخاب سے بھی محروم رہا۔ اسی سے مشفق خواجہ کے تخلیقی معیار کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ کچھ ایسا ہی حال اُن کے رسالے کا ہے، جو ادب سے زیادہ آثار قدیمہ کا ترجمان معلوم ہوتا ہے۔ نئی تحریریں کم ہیں اور پرانی زیادہ۔ اور جو نئی ہیں، وہ بھی پرانے زمانے کی معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے محسن بھوپالی کی غزلیں کہ سو سال پہلے گلدستۂ ”خدنگ نظر“ میں اسی قسم کی غزلیں چھپا کرتی تھیں۔

جس طرح عجائب گھر میں ہر طرح کی نادر چیزیں مل جاتی ہیں، اسی طرح ”تخلیقی ادب“ میں بھی ہر قسم کے ادیب مل جاتے ہیں۔ اسلام پسند ادیب بھی اس میں موجود ہیں اور اشتراکی ادیب بھی۔ جدیدیے بھی ہیں اور کلاسیکیے بھی۔ دبستان سرگودھا والے بھی ہیں اور دبستان فنون بھی اور ایسے ادیب بھی ہیں، جن کے بارے میں یہ طے نہیں ہو سکا کہ وہ کس دبستان فکر سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس صورتِ حال کی وجہ سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ رسالے کا مزاج کیا ہے۔ ”فنون“ کو دیکھیے، اس کا ہر شمارہ ایک مخصوص مزاج کا حامل ہوتا ہے۔ ایک نظر ہی میں معلوم ہو جاتا ہے کہ موجودہ عہد میں زندگی کو کیا کیا مسائل درپیش ہیں۔ یہی حال ”اوراق“ کا ہے، اس سے زندگی کے نہ سہی، انشائیے کے مسائل تو بہر حال معلوم ہو جاتے ہیں، مگر ”تخلیقی ادب“ سے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اسے مرتب کرنے والوں کے کیا مسائل ہیں اور انھوں نے اتنا ضخیم رسالہ شائع کرنے کی زحمت کیوں اٹھائی ہے۔

بہر حال اب جب کہ یہ رسالہ شائع ہو چکا ہے تو اس کے مندرجات پر ایک نظر ڈالنے میں کوئی حرج نہیں۔ اس میں سب سے پہلے کمال الدین عالی کے منظوم ڈرامے ”انسان“ کا ساتواں باب شائع کیا گیا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ ”گلستان“ کے پانچویں باب کی طرح یہ باب بھی عالی صاحب کے دوہوں جیسی رنگینی کا حامل ہوگا، لیکن تو یہ خالص فلسفیانہ چیز نکلی۔ اگر عالی صاحب کو کالم نگاری سے فرصت ملی اور انھوں نے اس ڈرامے کو مکمل کر دیا تو یہ اردو میں اپنی نوعیت کی منفرد تخلیق ہوگی۔

اس کے بعد افسانوں، نظموں، غزلوں، مقالوں وغیرہ کا سلسلہ ہے، جنھیں لکھنا آسان ہو تو ہو، پڑھنا آسان نہیں۔ ان حصوں کو چھوڑتے ہوئے ہم آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک نظر افتخار عارف کی غزل پر جا پڑی۔ ویسے تو اس غزل کے سارے شعر بہت اچھے ہیں، لیکن مطلع اور مقطع کا جواب نہیں ہے:

غزل بعد از یگانہ سرخرو ہم سے رہے گی
مخاطب کوئی بھی ہو گفتگو ہم سے رہے گی
انیس، آتش، یگانہ محرمان عالم حرف
اور اب اس سلسلے کی آبرو ہم سے رہے گی

ممکن ہے بعض سخن فہم لوگوں کو ان شعروں میں تعلّی نظر آئے، مگر ہمیں تو سوائے انکسار کے کچھ نظر نہیں آیا۔ افتخار عارف نے یگانہ کے بعد کی غزل کو سرخرو کرنے کا عہد کیا ہے، حالاں کہ وہ چاہتے تو قلی قطب شاہ کے بعد کی غزل کو بھی سرخرو فرما سکتے تھے۔ اس طرح خود یگانہ کو بھی سرخرو ہونے کا موقع مل جاتا۔ مقطع میں افتخار عارف نے انیس، آتش اور یگانہ کی برابری کا دعویٰ نہیں کیا، بلکہ ان تینوں کی بچی کھچی آبرو کو بچانے کا پختہ ارادہ ظاہر کیا ہے۔ خدا انھیں اس نیک ارادے میں کامیاب کرے۔

"تخلیقی ادب" میں یوں تو کئی خصوصی گوشے ہیں، جو جوگن پیسے، جیلانی بانو، مرزا یگانہ اور ڈی ایچ لارنس وغیرہ کے بارے میں ہیں۔ ہمیں ساقی فاروقی اور محمد حسن عسکری مرحوم سے متعلق گوشے بہت پسند آئے۔ ساقی ہمارے عہد کے اہم شاعر ہیں اور اب ایک اہم نقاد کی حیثیت بھی حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ اس کا فائدہ کسی اور کو ہو نہ ہو، خود ساقی کو یہ ہوگا کہ وہ کسی دوسرے نقاد کے محتاج نہیں رہیں گے۔ جب ضرورت ہوگی، اپنے شعروں کے بیچے خود ہی کر لیا کریں گے۔ گوشۂ ساقی میں متعدد نظمیں، غزلیں اور دو مضامین شامل ہیں۔ ایک نظم انگریزی میں بھی ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ اردو کی طرح انگریزی زبان پر بھی مشکل وقت آ سکتا ہے۔

ساقی کی نظمیں، غزلیں تقریباً سب وہی ہیں، جو "بہرام کی واپسی" میں شامل ہیں۔ "بہرام کی واپسی" نیلی چھتری والے ظفر عمر کی تصنیف نہیں، بلکہ ساقی کا تازہ مجموعۂ کلام ہے، جسے بعض لوگوں نے جاسوسی ناول کے دھوکے میں خریدا ہے۔ گویا یہ مجموعۂ کلام کی وجہ سے نہیں، نام کی وجہ سے خاصا مقبول ہوا ہے، لیکن ساقی کی شاعری نام کی نہیں، کام کی شاعری ہے۔ خصوصاً وہ غزل تو بہت ہی کام کی ہے، جو اس حاشیے سے مزین ہے:

"یہ غزل ایک طرح سے میری شاعری کا مینی فیسٹو بھی ہے اور یہ جتانا بھی مقصود ہے کہ جدید غزل منیر نیازی کی ختمی غزل کا سا مجلا پن نہیں، بلکہ خون، حرارت اور علم مانگتی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ آج میں اپنے ایک اور ہم عصر کو ناراض کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ منیر اپنی فقیری میں تنقید برداشت کرنا بھول گئے ہیں اور اپنی ہی خوشبو سے پریشان رہتے ہیں۔"

ہمارا خیال ہے کہ منیر نیازی اس حاشیے سے ناراض نہیں ہوں گے، کیوں کہ انھوں نے کبھی ساقی کا متن نہیں پڑھا تو یہ حاشیہ کیا پڑھیں گے۔ منیر اپنی فقیری میں تنقید برداشت کرنا ہی نہیں، پڑھنا بھی بھول چکے ہیں۔

ڈاکٹر وزیر آغا نے ساقی کے بارے میں لکھا ہے:

"اب آپ فن کی ان بلندیوں پر ہیں کہ لوگ آپ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں تو ان کی ٹوپیاں اور پگڑیاں گرتی ہیں۔"

اس پر ہم یہ اضافہ کریں گے کہ جن لوگوں کی ٹوپیاں اور پگڑیاں ساقی کے فن کی طرف دیکھنے سے نہیں گرتیں، انھیں ساقی خود اپنے ہاتھ سے گرا دیتے ہیں۔ یقین نہ آئے تو منیر نیازی والا مذکورہ حاشیہ ایک مرتبہ پھر پڑھ لیجیے اور وہ دونوں مقالے بھی، جو "تخلیقی ادب" میں چھپے ہیں اور جن میں سے ایک کے بارے میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا خیال ہے کہ اس کا فیض والا حصہ خاصا دھماکہ خیز ہے۔

"تخلیقی ادب" کا سب سے اہم وہ حصہ ہے، جس میں محمد حسن عسکری مرحوم کے ۸۶ خطوط چھاپے گئے ہیں۔ یہ خط ڈاکٹر آفتاب احمد کے نام ہیں۔ وہی آفتاب احمد، جو غالب اور راشد پر بے مثال مضمون لکھ چکے ہیں اور اپنی "مختصر نویسی" کے باوجود اردو کے اہم نقادوں میں شمار ہوتے ہیں۔ عسکری صاحب کے یہ خطوط، جو تقریباً ڈیڑھ سو صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں اور جن کا زمانۂ تحریر ۱۹۴۵ء سے ۱۹۷۷ء تک کا ہے، نہایت قیمتی معلومات کا خزینہ ہیں۔ خود عسکری صاحب کے بارے میں، ان کے بہت سے ہم عصروں کے بارے میں اور ہم عصر ادب کے بارے میں، ان خطوں میں جو مواد ملتا ہے، وہ دلچسپ بھی ہے اور "سنسنی خیز" بھی۔ ان خطوں میں عسکری صاحب کے مداحوں اور مخالفوں دونوں کے لیے اتنا بہت کچھ ہے کہ دونوں گروہ ایک ایک درجن مقالے با آسانی لکھ سکتے ہیں۔ اسلوبِ بیان کے اعتبار سے بھی یہ خطوط بڑے اہم ہیں۔ انھیں عسکری صاحب کی شگفتہ ترین تحریروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ ایک دو اقتباسات آپ بھی دیکھیے:

"میرا کمرہ شاید لائق رہائش ہو، مگر قابل نمائش ہرگز نہیں۔ میرے کمرے کو دیکھ کر اگر کوئی صرف ہنس کر چپ ہو گیا تو سمجھیے بڑی شریف طبیعت کا تھا۔ مثال کے طور پر میرے صحن کی موجودات کا حال سنیے۔ سنتروں کے چھلکے، کاغذ، آب خورے، محلے والوں کے ٹاٹ، جو وہ سوکھنے کے لیے ڈال گئے ہیں، ان کے کبوتر، کبوتروں کا دانہ اور بیٹیں، ریت کی بوری، جو مالک مکان نے مکان کی مرمت کرانے کے بعد وہیں چھوڑ دی ہے۔ میرے کمرے میں جھاڑو صرف اسی وقت دی جاتی ہے، جب محلے کی عورتوں کو ترس آ جاتا ہے۔"

....

"احتشام حسین کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ابھی شائع ہوا۔ انھوں نے جو نسخہ عبادت بریلوی کو دیا ہے، اس پر یہ تحریر ہے ...... "مجھے امید ہے، میرا تنقیدی نقطۂ نظر عام ہو کے رہے گا اور اس کے ہر دل عزیز بنانے میں عبادت بریلوی کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہوگا۔" ....

[illegible] کہ روئیں یا ہنسیں۔

(۲۰ ستمبر ۱۹۸۵ء)

☆..........☆..........☆

سالانہ ادبی "ناجائزے"

تقریباً بیس ہفتوں کی گمشدگی کے بعد ہم اپنے قارئین کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں۔ غیر حاضری کا سبب صرف اتنا تھا کہ جس طرح ادیب برادری کے اکثر اراکین پڑھنے سے کتراتے ہیں۔ اسی طرح ہم لکھنے سے جی چراتے ہیں۔ کالم لکھنا بہت ہی مشکل کام ہے۔ یہ کوئی ناول، افسانہ، نظم، غزل، انشائیہ اور تنقید قسم کی چیز تو ہے نہیں کہ بے تکان اور بلا سبب لکھتے چلے گئے۔ اس کے لیے خاصی محنت کرنی پڑتی ہے، بہت کچھ پڑھنا پڑتا ہے اور پھر اس پر سوچنا پڑتا ہے۔ تب نظر آتی ہے اک مصرع تر کی صورت۔

کالم نگار کو اس ساری محنت کا صلہ یہ ملتا ہے کہ کسی ادبی تاریخ میں تو کیا، سالانہ ادبی جائزوں میں بھی اس کی حوصلہ افزائی کے لیے نہ سہی، تفریح طبع کے لیے بھی دو لفظ نہیں لکھے جاتے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس قسم کے سالانہ جائزے، بقول ڈاکٹر سلیم اختر "ناجائزے" کہلانے کے مستحق ہیں اور یہ تیسری بات ہے کہ سالانہ جائزے لکھنے کی روایت خود ڈاکٹر سلیم اختر کی قایم کردہ ہے۔ یہ سالانہ جائزے کیا ہوتے ہیں، جمع و خرچ کے گوشوارے ہوتے ہیں۔ کتابوں اور مصنفوں کے نام جمع کیے جاتے ہیں اور جائزے لکھنے والے اسی تگ و دو میں خرچ ہو جاتے ہیں۔

کالم نگاری سے گریز کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جن لوگوں کا ذکر کیا جاتا ہے، وہ عموماً ہم سے ناراض ہو جاتے ہیں اور یہ الزام لگاتے ہیں کہ ہمارے کالموں میں نیک نیتی کا عنصر نہیں ملتا۔ یہ الزام اتنا ہی غلط ہے، جتنی یہ بات کہ آج کل جو ادب تخلیق ہو رہا ہے، اس کا معیار اکادمی ادبیات کے خبرنامے سے بہتر ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ کالم لکھتے وقت ہماری نیت تو نیک ہوتی ہے، مگر نتیجہ خراب نکلتا ہے۔ یعنی ہم دو اور دو کو چار ہی کہتے ہیں، شمیم احمد کی طرح پانچ نہیں کہتے۔

اگر ہم کتابوں کی تقاریبِ اجرا کے خلاف ہیں تو محض اس لیے کہ ان کے ذریعے جھوٹی تعریفوں کے پل باندھے جاتے ہیں اور جب صاحبانِ کتاب ان پلوں کے ذریعے ادب کا سمندر عبور کرنا چاہتے ہیں تو

وہ پل سمیت، بلکہ ایڈمرل ایم آئی ارشد سمیت سمندر کی موجوں میں بہہ جاتے ہیں۔ یہی حال اکادمی ادبیات کا ہے کہ اس کے بارے میں ہم کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہیں۔ ہماری یہ سوچی سمجھی رائے ہے کہ اس ادارے نے بعض لوگوں کو انفرادی طور پر فائدے ضرور پہنچائے ہیں، لیکن ادیبوں کے اجتماعی مفاد کے لیے کچھ نہیں کیا۔ حد تو یہ ہے کہ اکادمی کے پاس ادیبوں کی اجتماعی تفریح کے لیے ایک ہی شے تھی...... مسیح الدین صدیقی...... اسے بھی رخصت کر دیا۔ صدیقی صاحب تھے تو ایسا لگتا تھا، اکادمی زندہ ہے اور اب یہ حال ہے کہ بقول علامہ اقبال:

بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

اب اگر ہم اس ادارے کے بارے میں کبھی کبھی خامہ فرسائی کر لیتے ہیں تو اسے بدبختی پر کیوں محمول کیا جائے۔ اسی طرح جب ہم بعض مصنفوں اور کتابوں کے بارے میں سخن گسترانہ باتیں کرتے ہیں تو اسے کردار کشی کا نام دیا جاتا ہے، حالاں کہ بعض مصنفین اپنی تصانیف کے ذریعے خود اپنی کردار کشی اس حد تک کر لیتے ہیں کہ کسی دوسرے کو اس سلسلے میں زحمت کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

بس کچھ اسی قسم کی باتیں تھیں کہ جن کے پیش نظر ہم نے فیصلہ کر لیا کہ اب ہمیں کالم نہیں لکھنا چاہیے اور یہ کام انھیں لوگوں کو کرنا چاہیے، جو ہر ایک کو خوش رکھنے کا فن جانتے ہیں۔ نظریہ ضرورت کے تحت پہلے ہم بیمار پڑے اور پھر سیر و تفریح کے لیے ملک سے باہر چلے گئے اور اس توقع کے ساتھ صحت مند ہو کر واپس آئے کہ لوگ ہمیں اور ہماری کالم نگاری کو بھول چکے ہوں گے، مگر معاملہ اس کے برعکس نکلا۔ ہماری عدم موجودگی میں جناب ابن قلم نے ہمارا ذکر اس کثرت سے کیا کہ جنھوں نے ہمارے کالم نہیں پڑھے تھے، ان کا بھی اصرار تھا کہ ہم دوبارہ اپنی جگہ پر واپس آ جائیں۔ حد تو یہ ہے کہ محترم صہبا لکھنوی کا پیغام بھی ملا کہ خامہ بگوش نہیں ہے تو شہر میں سناٹا ہے۔ یہ محبت بھرا پیغام سن کر خاموش رہنا ممکن نہ تھا، لہٰذا ہم اپنے پڑھنے والوں کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہیں۔ اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ ہم نے دوبارہ کالم نگاری چوں کہ جناب صہبا لکھنوی کے ایما پر شروع کی ہے لہٰذا اس کام کے عذاب و ثواب میں موصوف کو برابر کا شریک سمجھا جائے۔

ہماری بیس ہفتوں کی عدم موجودگی میں بہت سے اہم واقعات رونما ہوئے، جن پر تفصیل سے گفتگو ہم آیندہ کریں گے۔ فی الحال خاص خاص واقعات کی طرف اشارے کیے جاتے ہیں، تاکہ یہ معلوم ہو کہ ہماری عدم موجودگی سے کس کس نے فائدہ اٹھایا ہے اور کتنا۔

☆ محترم احمد ندیم قاسمی نے کسی ادبی تقریب میں ادبی کالم نگاری کو "کرائے کے قاتل" کا خطاب دیا۔ اس پر ایک کرائے کے قاتل نے پوچھا:

"ان کالم نگاروں کے بارے میں کیا خیال ہے، جو دوسروں کو حیات دینے کے لیے کالم

لکھتے ہیں۔''

یہ بات مجھ میں نہ آئی۔ وضاحت طلب کی گئی تو کراچی کے قاسمی نے ایک لطیفہ سنایا۔ ایک بہت بڑے کالم نویس اخبار ''الف'' میں لکھتے تھے۔ کسی وجہ سے انھوں نے اخبار ''الف'' سے قطع تعلق کر کے اخبار ''ب'' میں لکھنا شروع کر دیا۔ اخبار ''الف'' کے ایڈیٹر سے پوچھا گیا:

''اس تبدیلی کا آپ کے اخبار پر کیا اثر پڑا؟''

ایڈیٹر نے جواب دیا:

''ہمارے اخبار کی اشاعت بڑھ گئی ہے۔''

☆ انیس ناگی کا لاہور کے ایک اخبار میں ایک انٹرویو شائع ہوا ہے، جس میں انھوں نے شمشیر زنی کا بے مثال مظاہرہ کیا ہے۔ فیض احمد فیض، محمد حسن عسکری، قیوم نظر، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، ڈاکٹر وزیر آغا، مظفر علی سید اور بہت سے دوسرے ادیبوں کے بارے میں انھوں نے بے شمار سنسنی خیز باتیں کی ہیں۔ مثلاً مظفر علی سید کے بارے میں کہا ہے کہ ان کا تعلق ادب کے بھتوڑا گروہ سے ہے۔ انیس ناگی کو شاید یہ معلوم نہیں کہ سید صاحب گزشتہ دو برسوں سے محترمہ طاہرہ نسیم کے مجموعوں کی رونمائیوں میں باقاعدگی سے مقالے پڑھ رہے ہیں، لہٰذا اب ان کا تعلق ادیبوں کے اس گروپ سے ہے، جو وزیروں، سرکاری افسروں اور ان کی بیویوں کی کتابوں پر نظریہ مروّت کے تحت تنقید لکھتا ہے۔

☆ ہندوستانی ادیبوں کا ایک وفد پاکستان آیا۔ یہ وفد اکادمی ادبیات کا مہمان تھا۔ اکادمی والوں نے وفد کے اراکین کو خاص خاص پاکستانی ادیبوں سے ملنے دیا۔ عام ادیبوں سے اس طرح چھپایا، جیسے شریف لوگ اپنے عیبوں کو چھپاتے ہیں۔ ہندوستانی وفد اپنے ساتھ ساڑھے تین ہزار کتابیں لایا، جن کی نمائش کی گئی۔ نمائش میں سب سے زیادہ کتابیں گلشن نندہ کی تھیں۔ اس پر شہزاد منظر نے کہا:

''گلشن نندہ کی کتابوں کو دیکھ کر امید بندھتی ہے کہ جب ہندوستان میں پاکستانی کی نمائش ہوگی تو اس میں میرا اکلوتا ناول ''اندھیری رات کا تنہا مسافر'' بھی شامل کیا جائے گا۔''

واضح رہے کہ شہزاد منظر کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ بھی حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ اس پر ایک انگریزی اخبار میں تبصرہ چھپا ہے، جس میں کتاب کا نام Raddi Amal لکھا گیا ہے۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ کتاب کا اُردو نام ''ردِّ عمل'' ہے، جسے انگریزی حروف میں ''ردّی عمل'' بنا دیا گیا ہے۔ یہ شہزاد منظر اور فنِ تنقید دونوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہے۔ مقتدرہ قومی زبان جہاں اور بہت سے فالتو کام کر رہی ہے، وہاں اُسے اردو الفاظ کو انگریزی حروف میں لکھنے کے اصول بھی وضع کر لینے چاہئیں، تاکہ تنقید جیسے مفید عمل کو ''ردّی عمل'' نہ کہا جا سکے۔

☆ سلطان جمیل نسیم کے افسانوں کا مجموعہ ''کھویا ہوا آدمی'' بالآخر شائع ہو گیا۔ یہ کھویا ہوا آدمی گزشتہ دس برسوں سے زیرِ طبع تھا۔ اتنی مدت زیرِ طبع رہنے کی وجہ سے طباعت خاصی گاڑھی ہوئی ہے، البتہ افسانے ویسے ہی ہیں، جیسے دس برس پہلے تھے۔ مجموعے کے فلیپ پر غلام عباس، شوکت صدیقی، احمد ندیم قاسمی، انور عنایت اللہ، ڈاکٹر وزیر آغا، محمد علی صدیقی، احمد ہمدانی اور عتیق احمد کی تحریریں ہیں۔ جو کمی رہ گئی تھی، وہ مشفق خواجہ نے دیباچہ لکھ کر پوری کر دی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کیا پڑھنے کے لیے ایک درجن ادیبوں کی تحریریں کم تھیں، جو سلطان جمیل نے کتاب میں اپنے افسانے بھی شامل کر دیے؟

☆ ہندوستانی رسالے ''جواز'' میں شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب ''افسانے کی حمایت میں'' پر وارث علوی کا ایک مقالہ شائع ہوا ہے، جو ضخامت میں فاروقی کی کتاب سے دگنا ہے۔ وارث علوی کی خوبی یہ ہے کہ جب وہ کسی کتاب یا ادیب پر اظہارِ خیال کرتے ہیں تو اس پر اپنی دلیلوں سے زیادہ اپنے مقالے کی طوالت کا بوجھ لاد دیتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر دلیلیں کمزور بھی ہوں تو موضوع مقالے کی طوالت کے بوجھ تلے دب کر دم توڑ دیتا ہے۔

(۷/فروری ۱۹۸۶ء)

☆..........☆..........☆

پتلون، ٹماٹر اور شعر

انیس ناگی پر ہمیں رشک آتا ہے۔ اللہ اللہ، کیسا ذہن رسا پایا ہے۔ شاعری، نا شاعری، ناول، غیر ناول، تنقید اور ماورائے تنقید، کون سی صنف ہے، جس میں انھوں نے کمال حاصل نہ کیا ہو۔ ڈیڑھ درجن کتابیں ان کے نام نامی سے پہچانی جاتی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کتابوں کو خود ان کے ناموں سے کوئی نہیں جانتا۔ ایک ہم جانتے ہیں، لیکن ہمارا جاننا، نہ جاننا برابر ہے کہ ہم ایسی کتابوں کے بطورِ خاص شائق ہیں، جن سے لوگ عموماً پرہیز کرتے ہیں۔ اس کساد بازاری کی وجہ خود انیس ناگی نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

"ہمارا معاشرہ اَن پڑھ معاشرہ ہے۔ ادبی کتابیں فروخت نہیں ہوتیں۔ کوئی پڑھتا نہیں۔ غالب بھی اپنے دور میں کتاب اپنے پلے سے چھاپتا تھا۔ آج ہم بھی ......"

انیس ناگی کا مذکورہ بیان ہم نے ان کے ایک انٹرویو سے لیا ہے، جو تین مہینے پہلے لاہور کے ایک اخبار میں شائع ہوا تھا۔ اگرچہ تین مہینے کی مدت میں ہمارے ہاں کتابیں تک آؤٹ آف ڈیٹ ہو جاتی ہیں، لیکن انیس ناگی کا یہ انٹرویو اتنا دلچسپ ہے کہ مدت گزر جانے کے بعد بھی تر و تازہ ہے۔ مولوی عبدالحق نے علامہ شبلی نعمانی کے بارے میں ایک مرتبہ لکھا تھا کہ اُن کی تصانیف کو ابھی سے لونی لگنی شروع ہو گئی ہے، مگر اُن کے خطوط سدا بہار ہیں۔ اسی قسم کی بات انیس ناگی کے مذکورہ انٹرویو کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ مستقبل کا ادبی مورخ انیس ناگی کو اسی انٹرویو کے حوالے سے یاد رکھے گا۔ (بشرطیکہ اس نے ادبی تاریخ نثری نظم میں قلم بند کی۔)

انیس ناگی نے اس انٹرویو میں بہت سے ادبی مسائل اور شخصیات کے بارے میں بڑی بے باکی سے اظہار خیال کیا ہے۔ اُن کی جرأت قابلِ داد ہے کہ وہ کسی بھی بڑی سے بڑی شخصیت سے مرعوب نہیں ہوتے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ جب وہ کسی بڑی ادبی شخصیت کا ذکر کرتے ہیں تو وہ از خود بہت چھوٹی نظر آنے

لگتی ہے۔

محمد حسن عسکری کے بارے میں انیس ناگی کہتے ہیں کہ تنقید لکھتے ہوئے:

"جب وہ اپنے گروہ کی طرف رجوع کرتے ہیں تو اس میں ڈنڈی مار جاتے تھے۔ اُن کا گروہ اُردو بولنے والوں کا گروہ تھا۔ وہ لوگ ہمیں کہیں گے کہ ناصر کاظمی اُردو کا سب سے بڑا غزل گو ہے۔ انتظار حسین سب سے بڑا افسانہ نگار ہے۔ سلیم احمد سب سے بڑا نقاد ہے، لیکن انھیں اس کے علاوہ اس خطے پر اور کوئی آدمی نظر نہیں آئے گا، کیوں کہ انھوں نے گروپنگ کی ہوئی تھی۔"

اس پر انٹرویو لینے والوں نے کہا:

"لیکن وہ (عسکری) منٹو کو اون (own) کرتے تھے۔"

اس کے جواب میں ناگی صاحب نے کہا:

"عسکری صاحب ہندوستان سے پاکستان آئے تو انھیں اپنے قدم جمانے کے لیے ایک ایسا شخص چاہیے تھا، جو آتش فشاں ہو۔ انھوں نے سب سے پہلے یہ کیا کہ منٹو کو گھیرنے کی کوشش کی کہ کسی طرح یہ ہمارے ساتھ شامل ہو جائے۔"

قطع نظر اس سے کہ "اردو بولنے والوں" سے انیس ناگی کی کیا مراد ہے، ہم تو انیس ناگی کو بھی اردو بولنے والوں میں شمار کرتے ہیں، کیوں کہ زیر بحث انٹرویو میں انھوں نے تمام سوالوں کے جواب اُردو ہی میں دیے ہیں اور جواب بھی خاصی سمجھ میں آ جانے والی اُردو ہے، لیکن ہمیں حیرت اس پر ہے کہ آج جب کہ محمد حسن عسکری ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں، اُن کا گروپ ہی ادب پر چھایا ہوا ہے۔ غزل میں ناصر کاظمی، افسانے میں انتظار حسین اور تنقید میں سلیم احمد کے سامنے آج بھی کسی کا چراغ نہیں جلتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عسکری صاحب خود تو چلے گئے، لیکن اپنا گروپ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اردو ادب پر مسلط کر گئے۔ رہی یہ بات کہ عسکری صاحب نے پاکستان میں قدم جمانے کے لیے منٹو کو گھیرا تھا، تو عرض ہے کہ منٹو کون سا ایسا تیس مار خاں تھا، وہ بے چارہ تو خود اپنے قدم جمانے کے لیے باہر سے آیا تھا۔ اس سرزمین سے اُس کا اتنا ہی تعلق تھا، جتنا عسکری کا۔ یہ اتفاق ہے کہ پاکستانی ادب کی شناخت بھی دونوں بن گئے۔ پاکستان میں جہاں ہم نے بہت سی غلطیوں کو برداشت کیا ہے، وہاں اس ایک غلطی کو بھی برداشت کر لینا ہی چاہیے۔

انتظار حسین سے انیس ناگی کچھ زیادہ ہی خفا ہیں۔ ان کی تنقیدی کتاب "علامتوں کا زوال" ان کے نزدیک ایک "غلط کتاب" ہے۔ اُن کا ناول "بستی" سرے سے ناول ہی نہیں ہے۔ افسانہ نگاری ان کے لیے قابل قبول نہیں کہ جس سرزمین پر انتظار حسین آباد ہیں، اُس سے ذہنی اور جذباتی رشتہ نہیں رکھتے۔ ان کی اردو اس گم گشتہ وہ جگہ ہے، جہاں انھوں نے جنم لیا اور جہاں بچپن گزارا۔

ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ اگر انتظار حسین اس سرزمین کو اپنی فردوسِ گم گشتہ سمجھتے ہیں، جہاں انھوں نے جنم لیا تھا اور اپنا بچپن گزارا تو یہ کوئی اعتراض کی بات نہیں، کیوں کہ ہر شخص کا ماضی ہی اُس کی فردوسِ گم گشتہ ہوتا ہے۔ جو لوگ ماضی کو فراموش کر دیتے ہیں، وہ مستقبل کو بھی سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے، لیکن ہم اس ثقیل قسم کی بحث میں پڑ کر اپنے کالم کو انیس ناگی کا تنقیدی مضمون نہیں بنانا چاہتے۔ ہمیں تو صرف اس سے دلچسپی ہے کہ انیس ناگی جس سرزمین پر آباد ہیں، اس سے وہ خود کس قسم کا ذہنی اور جذباتی رشتہ رکھتے ہیں۔ اس سوال کا جواب ہمیں مذکورہ انٹرویو کے ایک سوال ہی میں مل جاتا ہے۔

انٹرویو کرنے والوں نے انیس ناگی سے پوچھا:

"آپ نے جو تراجم کیے ہیں، ان میں زیادہ تر فرانس کے ژاں جینے، پال ورلین اور رامبو کے ترجمے ہیں۔ ان میں کچھ لوگ ایسے ہیں، جنھیں انارکسٹ کہا گیا۔ مثلاً ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی کو کہا: تم ایک نیا تجربہ چاہتے ہو ـــــ یہ لو، اور اسے چاقو گھونپ دیا۔ اس کے علاوہ کچھ ہم جنسی کے بھی شوقین رہے۔ اخلاقیات کو چھوڑیں، جن نظریات کا یہ پرچار کرتے ہیں، وہ ہمارے نزدیک زوال پذیر ہیں اور ہمارے معاشرے کے ساتھ ان کی کوئی مطابقت نہیں بنتی۔ آپ نے تراجم کے لیے ان لوگوں کو کیوں منتخب کیا۔"

سوال بہت تیکھا تھا، لیکن ہمیں انیس ناگی نے بہت سیدھا سادہ اور تشفی بخش جواب دیا:

"شاعری ایک نظم یا غزل نہیں، ایک بہاؤ ہے، ایک ایسا بہاؤ ہے، جو سارے عصری شعور کو سمیٹتا ہے، اس کے لیے مجھے ماڈل کی ضرورت تھی، جو مجھے فرانسیسی شعرا میں نظر آئے.....

رامبو مخربِ اخلاق شخص تھا، لیکن اُس کی تمام شاعری ایک مخصوص معنوں میں تصوف ہے.....

اُس کی نظموں میں گہرائی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سچائی کے لیے اختلالِ حواس کی ضرورت ہے۔ زمانے کے نظم و ضبط نے اختلالِ حواس کو ختم کر کے اندر کی سچائی کو ختم کر دیا ہے، چناں چہ وہ اختلالِ حواس کے لیے منشیات تجویز کرتا ہے۔ آدمی شراب پیتا ہے، جس سے اس کی پتلیاں پھیل جاتی ہیں اور وہ ایسے مناظر دیکھتا ہے، جو دوسرا آدمی نہیں دیکھ سکتا۔"

انیس ناگی کا یہ جواب سن کر ہمیں ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ سچ بولنے ہی کے لیے نہیں، اس قسم کا سچ سننے کے لیے بھی اختلالِ حواس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس وقت ہماری آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی ہیں اور ہمیں اپنی سرزمین سے ذہنی اور جذباتی رشتے کے رنگا رنگ مناظر نظر آ رہے ہیں۔

انیس ناگی سے سوال کیا گیا:

"کیا ہم فیض کو پاکستان کا پابلو نرودا کہہ سکتے ہیں؟"

انیس ناگی نے جواب دیا:

"پابلو نرودا بہت بڑا شاعر ہے۔ فیض تو اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں۔ نرودا کی رینج بہت وسیع ہے۔ وہ عام باتوں مثلاً پتلون، ٹماٹر وغیرہ پر نظمیں لکھتا ہے اور رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اتنا بڑا شاعر تو صدیوں میں پیدا ہوتا ہے کہ جس چیز کو چاہے، شعر بنا دے۔"

پتلون اور ٹماٹر کو شعر بنا دینا واقعی بہت بڑا کمال ہے، ورنہ ہمارے ہاں کے شاعر، خصوصاً نثری نظمیں لکھنے والے تو شعر کو پتلون اور ٹماٹر بنا کے رکھ دیتے ہیں۔

انیس ناگی نے مژدہ سنایا ہے کہ انھوں نے فرانسیسی زبان سیکھ لی ہے اور اب وہ نرودا کی نظموں کا ترجمہ کر رہے ہیں، جو ہسپانوی سے فرانسیسی میں منتقل ہو چکی ہیں۔ ہسپانوی زبان کی نظموں کو فرانسیسی کے توسط سے اردو میں منتقل کرنے کا خیال بہت عمدہ ہے۔ براہِ راست ترجمہ بعض اوقات غلط بھی ہو جاتا ہے۔ ترجمہ در ترجمہ کا فائدہ یہ ہے کہ غلطی محسوس نہیں ہوتی، کیوں کہ تیسری زبان میں ترجمہ تخلیق کا درجہ حاصل کر لیتا ہے۔

یہاں ہمیں ایک لطیفہ یاد آ رہا ہے، جس کا زیرِ بحث موضوع سے کوئی تعلق نہیں۔ چوں کہ لطیفہ یاد آ گیا، اس لیے سنا دینے میں کوئی ہرج نہیں۔ ایک ادیب نے دوسرے سے کہا:

"میں نے تھوڑی بہت جرمن زبان سیکھ لی ہے، اب میں گوئٹے کا ترجمہ کروں گا۔"

دوسرے ادیب نے کہا:

"بڑا مبارک خیال ہے، لیکن پہلے وہ زبان بھی تھوڑی بہت سیکھ لو، جس میں ترجمہ کرنے کا خیال ہے۔"

انیس ناگی نے بزرگ ادیب قیوم نظر کے بارے میں دلچسپ انکشافات کیے ہیں:

"حلقہ اربابِ ذوق میں انھوں (مجید امجد) نے ایک نظم پڑھی، جو ایک پرندے کے بارے میں تھی۔ وہ بہت اچھی تھی۔ قیوم نظر میرے پاس بیٹھے تھے، وہ مجھے مسلسل اکساتے رہے کہ مجید امجد کی نظم پر تنقید کر کے اس کی کھال ادھیڑ دو۔ یہی بات منٹو کے ایک افسانے کے بارے میں قیوم نظر نے کی تھی۔ منٹو گورنمنٹ کالج آئے، افسانہ پڑھا، افسانہ کمزور تھا، قیوم نظر نے مجھ سے کان میں کہا کہ لاٹھی چارج کرو۔ قیوم صاحب کا یہ وتیرہ تھا کہ نوجوانوں کو بزرگوں کے خلاف اکساتے تھے۔"

وہ زمانہ گیا، جب قیوم نظر کے اشارے پر انیس ناگی لاٹھی چارج کیا کرتے تھے۔ اب وہ خدا کے فضل سے اس معاملے میں خاصے خود کفیل ہو گئے ہیں اور اس قسم کی باتیں بڑی بے تکلفی سے کہہ جاتے ہیں۔ اتنی بے تکلفی، بلکہ روانی اور فراوانی سے تو عبدالعزیز خالد شعر بھی نہیں کہتے۔

☆ اُس زمانے میں حنیف رامے بھی ہوا کرتے تھے، وہ اپنی داد گیری الگ کرتے تھے۔

☆ مظفر علی سید اور وارث علوی کا تعلق ادب کے تھوڑا گروپ سے ہے۔

☆ قرۃ العین حیدر کا "آگ کا دریا" صرف ضخامت کے اعتبار سے بڑا ناول ہے۔

☆ نقاد، شاعر اور افسانہ نگار کی بجائے مجھے ڈاکٹر وزیر آغا بطور جاگیردار زیادہ پسند ہیں۔

انٹرویو کے آخر میں انیس ناگی نے کہا:

"کاش! میں ایک کل وقتی ادیب ہوتا۔ میں ایک جز وقتی ادیب ہوں۔ وہ کچھ نہیں لکھ سکا، جو لکھنا چاہتا ہوں۔"

اس کے جواب میں یہی عرض کیا جا سکتا ہے:

"تو پھر آپ وہی کچھ لکھتے رہتے، جو آپ لکھنا نہیں چاہتے اور دوسرے پڑھنا نہیں چاہتے۔"

(۱۳ فروری ۱۹۸۶ء)

☆............☆............☆

ادب کا ہاتھی

سوال: ایک عجیب بات یہ ہے کہ آپ کے جو ہندوستانی نقاد ہیں، اُن کا رویہ آپ کے ساتھ نرم ہوتا ہے، جب کہ پاکستان میں آپ پر ہر قسم کے نظریاتی اور فنی الزامات عاید کیے جا چکے ہیں، تو یہ کیا بات ہے؟

جواب: بھئی اس لیے کہ ہندوستانی نقاد زیادہ سمجھ دار ہیں۔

سوال: سمجھ دار اس لیے کہ وہ آپ کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھتے ہیں؟

جواب: یوں ہی سمجھ لیجیے۔ جب مجھ سے ہمدردی برتیں گے تو یہ ان کی سمجھ داری کی دلیل ہے۔ اب گوپی چند نارنگ ہیں، شمس الرحمٰن فاروقی ہیں، شمیم حنفی ہیں اور ہاں وارث علوی ہیں، جن کے اسٹائل کا اور بیان کا میں بہت قائل ہوں۔ یہ سب بڑے اچھے نقاد ہیں .... نقادوں کا ایک پورا گروہ سامنے آیا ہے۔ ۴۷ء کے بعد ہندوستان میں جو اچھی تنقید لکھ رہے ہیں۔

سوال: تنقید کی ایسی روایت پاکستان میں کیوں نہیں بننے پائی؟

جواب: .... بدقسمتی سے وہ نئے نقاد، جو اس وقت بن رہے تھے، وہ چھکتے چلے گئے .... مظفر علی سید ہمارے ساتھ ہی چلا تھا اور ہم یہ سمجھ رہے تھے کہ بھئی یہ بہت اہم نقاد بنے گا .... مگر مظفر علی سید کے دھندے ہی دوسرے ہو گئے .... جتنا اس کا ٹیلنٹ تھا، اس کے مطابق وہ نہیں بن پایا .... سجاد باقر رضوی تھے، وہ چلتے چلتے اپنے بیچ ہی میں پھنک گئے بے چارے .... سراج منیر لکلا تھا، وہ بھی اپنے دھندے میں چلا گیا .... اس لیے تنقید کی جو روایت ہندوستان میں بنی ہے، نئے نقادوں کے حوالے سے، وہ پاکستان میں نہیں بن پائی۔

یہ سوال و جواب پڑھ کر یقیناً آپ سوچ رہے ہوں گے کہ سوال بھی فرضی ہیں اور جواب بھی فرضی، لیکن ایسا نہیں ہے۔ ہمیں کالم لکھنے کے لیے فرضی باتوں پر انحصار نہیں کرنا پڑتا۔ اصلی باتیں ہی اتنی مل جاتی

ہیں کہ اگر ہم اپنی طرف سے کچھ بھی نہ لکھیں تو کالم تیار ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم سائل اور مسئول کے نام بتائیں، یہ بتا دینا ضروری ہے کہ ہم صحت مند ہندوستانی نقادوں کے طرف دار ہیں نہ بکے ہوئے پاکستانی نقادوں کے، بلکہ ہم اس حد تک غیر جانبدار ہیں کہ نقادوں کے لیے سمجھ دار ہونے کی اس شرط کو بھی غیر ضروری سمجھتے ہیں، جس کا اوپر کی سطروں میں ذکر کیا گیا ہے۔ .... اس ضروری وضاحت کے بعد عرض ہے کہ مذکورہ اقتباس ہندوستانی رسالے ''نئی نسلیں'' میں شائع شدہ ایک گفتگو کا ہے۔ سوال آصف فرخی کے ہیں اور جواب انتظار حسین کے۔

قطع نظر اس سے کہ انتظار حسین نے جن ہندوستانی نقادوں کو اچھا اور سمجھ دار کہا ہے، وہ خود ایک دوسرے کے بارے میں اس قسم کی انتہا پسندانہ رائے نہیں رکھتے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی نقاد کے سمجھ دار ہونے کا معیار یہ ہے کہ وہ انتظار حسین کا ہمدرد ہو، تو پھر جو پاکستانی نقاد انتظار حسین کو از کار رفتہ نظر آتے ہیں، انھوں نے کب اور کہاں انتظار حسین سے غیر ہمدردانہ رویے کا اظہار کیا؟ انتظار حسین نے جن پاکستانی نقادوں کے نام لیے ہیں، وہ ان کے ہمدردوں ہی میں نہیں، غمگساروں میں شمار ہوتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان والے ہمدردی کریں تو انھیں سمجھ دار ہونے کا سرٹیفکیٹ عطا ہو اور یہی کام پاکستان والے کریں تو انھیں ''پچکتے چلے جانے'' کا طعنہ ملے۔

انتظار حسین نے اسی پر اکتفا نہیں کی، یہ بھی کہا ہے کہ ...... ''ہمارے نقاد لنگڑے نقاد ہیں۔ جو نامی گرامی نقاد ہیں، وہ بھی لنگڑے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ شاعری پورا ادب ہے۔ وہ ایک بیساکھی کے ساتھ چل رہے ہیں، فکشن والی ٹانگ غائب ہے۔'' ...... نقادوں کو لنگڑا کہنا بڑی زیادتی ہے، حالاں کہ آج کل تو نقاد خود بیساکھیاں بنے ہوئے ہیں اور تقریبات رونمائی میں معذوران ادب کے کام آتے ہیں۔ کم از کم ہم اس بے ادبی کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر ہم نقاد ہوتے تو انتظار حسین پر ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کر دیتے، مگر ہمیں معلوم ہے، اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلتا، کیوں کہ انتظار حسین کہتے، پہلے اپنی حیثیت عرفی ثابت کرو، پھر ازالے کی بات ہوگی۔ بہر حال کچھ بھی ہو، ہمارے نقادوں کو انتظار حسین جیسے غیر ذمہ دار تخلیق فنکاروں کی دریدہ دہنی کا سدباب کرنا چاہیے، ورنہ کل ان کی دوسری ٹانگ بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔

اپنے مخالف نقادوں کے بارے میں انتظار حسین فرماتے ہیں:

''نقاد ...... جو خلاف لکھتے رہتے ہیں میرے، جب یہ نہیں لکھتے تو مجھے پریشانی ہونے لگتی ہے کہ کہیں اب میں اس مقام پر تو نہیں پہنچ گیا کہ جب آدمی اتنا گیا گزرا ہو جاتا ہے کہ کسی اعتبار سے قابل ذکر نہیں رہتا۔ خوش قسمتی سے میرا کوئی نہ کوئی دشمن پیدا ہوتا رہتا ہے، جو مجھے میرے وجود کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ آج کل بھی میرا ایک دوست میرا دشمن بنا ہوا ...... صفدر میر، جس سے ہماری دوستی بھی رہی ہے اور دشمنی بھی ...... صفدر میر کے ہاں جو جہالت

ہے، وہ نظریاتی جہالت ہے۔ ویسے وہ پڑھا لکھا آدمی ہے۔ نظریاتی جہالت کو میں تھوڑی دیر کے لیے معاف کر دیتا ہوں اور پورا کالم اس کا ...... پوری توجہ اور یکسوئی سے پڑھتا ہوں۔''

ہندوستانی نقاد انتظار حسین کی تعریف کرتے ہیں اور خود اپنے وجود کا احساس دلاتے ہیں۔ اس کے برعکس پاکستانی نقاد مخالفانہ فضا میں لکھ کر انتظار حسین ان کے وجود کا احساس دلاتے ہیں۔ پہلا کام آسان ہے کہ اس کے لیے علم اور ذہانت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ دوسرا کام مشکل ہے کہ علم اور ذہانت کے بغیر انجام پا ہی نہیں سکتا۔ حیرت ہے کہ انتظار حسین آسان کام کرنے والوں کو سمجھ دار کہتے ہیں اور مشکل کام کرنے والوں کو نا سمجھ۔ انتظار حسین کو تو خوش ہونا چاہیے کہ انھیں صفدر میر جیسے مخالف ملے، ورنہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جیسے مداح تو احمد ہمیش کو بھی مل جاتے ہیں۔

آصف فرخی نے پوچھا:

''کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کہانی کے ذریعے اپنے پچھلے جنموں کو یاد کر رہے ہوں؟''

اس کے جواب میں انتظار حسین نے کہا:

''کبھی کبھی مجھے احساس ہوتا ہے کہ ان کہانیوں کے ذریعے کہ میں بھی پہلے بہت جی چکا ہوں اور میں نے بہت جنم لیے ہیں اور مجھے اس واسطے سے، یہ جو دیو مالا پڑھ رہا ہوں اور یہ جو پرانے قصے ہیں، ان کے ذریعے شاید مجھے کسی پچھلے جنم کا کھوج مل جائے، کیوں کہ دو شخصیتوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھیں پچھلے جنم یاد ہیں۔ ایک مہاتما بدھ اور ایک ہاتھی .... میں مہاتما بدھ بن نہیں سکتا ...... ہاتھی تو بن سکتا ہوں۔''

انتظار حسین کے لیے ہاتھی بننا واقعی کوئی مشکل کام نہیں اور اگر وہ بہت بڑے افسانہ نگار نہ ہوتے، صرف شاعر یا صرف نقاد ہوتے تو ان کے لیے سفید ہاتھی بننا بھی بہت آسان تھا۔ بہر حال انھیں دیکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو افسانے کے دروازے پر ایک مست ہاتھی جھول رہا ہے، جس کے پاؤں میں سب کا پاؤں ہے اور جس کے کھانے کے دانت بھی وہی ہیں، جو دکھانے کے۔ اس ہاتھی کے مخالف بہت ہیں، انھیں یہ معلوم نہیں کہ ہاتھی کے ساتھ گنے چوسنے کی ہر کوشش رائیگاں جاتی ہے، کیوں کہ ہاتھی کی ٹکر ہاتھی سنبھال سکتا ہے۔ مخالفوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ انتظار حسین ان کی طرح کسی کا نہیں، ادب کا ہاتھی ہے، جو لاکھ لٹے، پھر بھی دس من کا ہوتا ہے۔

ہاتھی کے حوالے سے اور بہت سے قابل استعمال محاورے ہیں، مگر افسوس! جگہ کی کمی کی وجہ سے ہم اس موضوع کو مناسب طریقے سے ختم نہیں کر سکتے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ ہاتھی نکل گیا، دم اٹکی رہ گئی ہے۔

(۲۱ر فروری ۱۹۸۶ء)

☆.........☆.........☆

شاعری اور بڑھئی کے کام کو ایک ہی چیز سمجھا جائے

آج کل ہندوستانی نقاد شمس الرحمٰن فاروقی کا نام پاکستانی اخبارات میں یوں اچھالا جا رہا ہے، جیسے کسی کے عیب اچھالے جاتے ہیں۔ ہر ہفتے اخباروں کے ادبی صفحات پر ان کا ذکر خیر ہوتا ہے۔ سب سے پہلے وہ وارث علوی کے حوالے سے خبروں میں آئے۔ یہ اطلاع چھپی کہ وارث علوی نے فاروقی کے تنقیدی غبارے سے ہوا نکال دی ہے، حالاں کہ اس غبارے میں ہوا تھی ہی نہیں۔ علم تھا اور علم غبارے میں ہو یا کسی تحریر میں، اسے باہر نکالنا مشکل ہی نہیں، ناممکن ہوتا ہے۔ پھر ایک اخبار میں فاروقی صاحب کا ایک خط چھپا، جس کا بہت چرچا ہوا۔ اس خط میں انھوں نے شمیم احمد کے اس الزام کی تردید کی تھی کہ وہ پبلک ریلیشنگ کے آدمی ہیں۔ فاروقی صاحب نے فرمایا تھا، اگر مجھے پبلک ریلیشنگ کا ہنر آتا تو میں ہندوستانی ادیبوں کے اس سرکاری وفد کا سربراہ نہ سہی، رکن ضرور ہوتا، جس نے گزشتہ جنوری میں پاکستان کا دورہ کیا تھا۔ اس طرح ایک طرف تو انھوں نے اپنی بے ہنری کا اور دوسری طرف وفد میں شامل ادیبوں کے "ہنر مند" ہونے کا اعتراف کیا تھا۔ گویا فاروقی صاحب کے نزدیک کنور مہندر سنگھ بیدی، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور ڈاکٹر خلیق انجم وغیرہ اپنی ادبی حیثیت کی بنا پر وفد میں شامل نہیں کیے گئے تھے۔ فاروقی صاحب کا یہ الزام بے بنیاد ہے۔ انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ان بزرگوں کے کمالات بے شمار ہیں اور سوائے ادب کے، ہر جگہ یہ اپنی ادبی حیثیت ہی سے شامل ہوتے ہیں، یہاں تک کہ میٹرک اور منشی فاضل کے نصاب میں بھی شامل ہو چکے ہیں۔ اگر فاروقی کسی وفد یا نصاب میں شامل نہیں ہو سکے تو یہ خود انھیں کا قصور ہے۔ ریاض میں کچھ کمی رہ گئی ہوگی۔

ریاض میں کمی والی بات شاید کچھ لوگوں کے وضاحت طلب ہو، اس لیے اس کا پس منظر بتانا ضروری ہے۔ مرزا یگانہ اور استاد بندو خاں بمبئی میں زیڈ اے بخاری کے گھر مہمان تھے۔ یگانہ رات بھر فکر سخن کرتے تھے۔ طریق کار یہ تھا کہ مصرعے لکھتے اور قلم زد کرتے رہتے۔ بندو خاں یہ سب کچھ حیرت سے

دیکھتے رہتے تھے۔ ایک دن ان سے نہ رہا گیا اور انھوں نے یگانہ سے پوچھا:........ "حضرت! آپ یہ کیا کرتے رہتے ہیں؟"...... یگانہ نے جواب دیا:...... "فکر سخن کرتا ہوں۔"...... بندو خاں نے کہا:......

"ریاض کی کمی معلوم ہوتی ہے، ورنہ آپ کو بار بار لکھنے اور قلم زد کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔"

ریاض کی کمی کی وجہ سے فاروقی صاحب ادیبوں کے وفد میں شامل نہ ہو سکے، لیکن خوبیٔ قسمت سے سرکاری افسروں کے ایک وفد میں شامل ہو کر اسلام آباد آئے اور سرکاری مصروفیات سے کچھ وقت نکال کر پاکستان کے ادبی مرکز لاہور پہنچ گئے۔ ڈیڑھ دن وہاں گزارا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ لاہور کے اخباروں کو ڈیڑھ دن کے قیام سے ڈیڑھ مہینے تک خبریں چھاپنے کا مواد مل گیا۔ اب یہ حال ہے کہ ہر اخبار میں شمس الرحمٰن فاروقی کے حوالے سے تصویریں، خبریں، فیچر اور کالم اس طرح چھپ رہے ہیں، جیسے بڑی مقدار میں ہیروئن کے پکڑے جانے پر چھپتے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے کہ لاہور کے اخبارات علم اور ہیروئن کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہیں۔

انتظار حسین نے فاروقی صاحب کے بارے میں ایک دلچسپ کالم لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ لاہور والوں کے ذہن میں یہ واقعہ تازہ تھا کہ فاروقی نے احمد مشتاق کو فراق سے بڑا شاعر قرار دیا ہے، اس لیے انھوں نے فاروقی کو آڑے ہاتھوں لیا، لیکن فاروقی بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے، وہ اپنے موقف پر سختی سے قائم رہے۔ عالم مسافرت کی بے سروسامانی کے باوجود یہ دلیل پیش کی کہ فراق کے ہاں فالتو الفاظ بہت ہوتے ہیں، جب کہ احمد مشتاق کے ہاں بالکل نہیں ہوتے۔ انھوں نے فراق کا یہ شعر سنایا:

ذرا وصال کے بعد آئینہ تو دیکھ اے دوست!
ترے جمال کی دوشیزگی نکھر آئی

اور فرمایا:

"یہاں اے دوست کیا کر رہا ہے۔ یہ دونوں لفظ فالتو ہیں جو مصرعہ پورا کرنے کے لیے ڈالے گئے ہیں۔ احمد مشتاق کے ہاں یہ ستم دکھائی نہیں دے گا۔"

فاروقی صاحب کی ثابت قدمی قابل تعریف ہے، لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فراق کے شعر میں فالتو الفاظ کے باوجود وہ حسن ہے، جو احمد مشتاق کے گزشتہ و آئندہ کلام میں دور دور تک نظر نہیں آتا۔ اگر فراق صرف یہی ایک شعر کہتے تو بھی ان کا درجہ بہ اعتبار شاعر، احمد مشتاق اور شمس الرحمٰن فاروقی دونوں سے بڑا ہوتا۔ ہماری رائے میں یہ انتہا پسندانہ رائے ہے۔ فراق سے احمد مشتاق اور فاروقی کا موازنہ کرنا تو کیا، موازنے کا تصور کرنا بھی تضیع اوقات ہے۔ "اوقات" کا لفظ ہم نے یہاں انھیں معنوں میں استعمال کیا ہے، جن معنوں میں میر نے اس مصرعے میں کیا تھا:

ع معلوم ہو گئی ہمیں اوقات آپ کی

بعض لوگوں کا یہ خیال بھی ہے کہ فاروقی صاحب نے فراق کے مذکورہ شعر کے جن الفاظ کو فالتو بتایا ہے، شعر ان کے بغیر مکمل ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر فراق دوست کو مخاطب نہ کرتے تو پھر یہ معلوم کرنا مشکل ہو جاتا کہ روئے سخن کس کی طرف ہے۔ آخر فراق کو الہ آبادی میں رہنا تھا کہ جہاں سے رسالہ ''شب خون'' نکلتا ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ دوست کو مخاطب کیے بغیر اس قسم کا شعر کہہ دیتے، تو شارحین شعر ہی یہ مطلب نکالتے کہ فراق دوست کی نہیں، کسی دشمن کی دوشیزگی کے نکھرنے کا ذکر کر دیتے ہیں۔

فاروقی صاحب کے بیان سے متاثر ہو کر استاد لاغر مراد آبادی نے احمد مشتاق کے دونوں دیوان دیکھ ڈالے۔ وہ فرماتے ہیں:

''فاروقی صاحب کو فراق کے ہاں صرف فالتو لفظ نظر آتے ہیں، لیکن احمد مشتاق کے ہاں تو پورے پورے شعر فالتو ہیں۔ حیرت ہے کہ اس کے باوجود فاروقی صاحب، احمد مشتاق کو فراق سے بڑا شاعر قرار دیتے ہیں۔ اس سے بہتر تو یہ تھا کہ فاروقی خود اپنے بارے میں یہ فرما دیتے کہ وہ فراق سے بڑے شاعر ہیں۔ تب ہم یہ بھی مان لیتے کہ فراق شاعری کی ابجد سے بھی واقف نہیں، بشرطیکہ شاعری اور بڑھئی کے کام کو ایک ہی چیز سمجھا جائے۔''

ہم اس تبصرے پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے، کیوں کہ ہم شمس الرحمن فاروقی، احمد مشتاق اور استاد لاغر مراد آبادی تینوں کے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں اور بڑھئی کے کام کو شاعری کے مقابلے پر ایک مفید کام سمجھتے ہیں۔ بڑھئی لکڑی سے اچھی اچھی چیزیں بناتا ہے اور شعرا فکر سخن میں اپنی صحت خراب کر لیتے ہیں، یعنی خود ہی سوکھ کر لکڑی ہو جاتے ہیں اور یہ لکڑی بڑھئی کے کام کی بھی نہیں ہوتی!

وارث علوی اور شمس الرحمن فاروقی کے حوالے سے انتظار حسین لکھتے ہیں کہ ایک محفل میں:

''وارث علوی کے مخالفانہ مقالے کا ذکر آیا تو شمس الرحمن فاروقی نے ان ادیبوں کے برخلاف، جو اپنے پر ذرا سی تنقید سے بکھر جاتے ہیں، بڑی عالی ظرفی کا مظاہرہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ وارث علوی کی تحریر دلچسپ ہوتی ہے، مگر استدلال کمزور ہوتا ہے۔ پھر کہا...... ہمارے ہاں ناول کم لکھا جا رہا ہے، وارث علوی اپنے مضامین سے اس کمی کو پورا کر رہے ہیں۔''

ناول والی بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ وارث علوی کا ہر مقالہ طوالت کے اعتبار سے امیر حمزہ کی داستان ہوتا ہے، مگر کمزور استدلال والی بات ہمارے دل کو نہیں لگی۔ ہاں، اگر یہ کہا جاتا کہ وارث علوی کے مقالے پڑھنے والوں کی صحت کمزور ہو جاتی ہے تو بات بن جاتی۔

انتظار حسین نے شمس الرحمن کی عالی ظرفی کا ذکر کیا ہے۔ اس کا مظاہرہ ایک اور جگہ بھی ہوا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق ایک محفل میں ڈاکٹر انور سدید کے ایک سوال کے جواب میں فاروقی صاحب نے کہا:

''وارث علوی کے مضامین ہم نے ''شب خون'' میں ابن حسین کے نام سے چھاپے تھے۔

جب وہ جم گئے تو ہمیں کوڑنے لگے۔''

ہمارا خیال ہے کہ وارث علوی ابھی پوری طرح جمے نہیں۔ ابھی تو انھوں نے فاروقی کی صرف ایک کتاب پر مضمون لکھا ہے۔ باقی کتابوں پر وہ لکھنے کا اعلان کر چکے ہیں۔ اس کے بعد، امید ہے کہ وارث علوی ہی نہیں، فاروقی بھی اچھی طرح جم جائیں گے۔

فاروقی صاحب پر وارث علوی کے مقالے کا ہر شخص ذکر کرتا ہے، لیکن کوئی یہ نہیں بتاتا کہ اس مقالے میں ہے کیا اور وارث علوی نے کس کس انداز سے اپنے ممدوح کو ڈسا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس مقالے کی شہرت تو ہر طرف پھیل گئی، لیکن مقالہ کسی کی نظر سے نہیں گزرا۔ ہم کوشش کریں گے کہ اگلے ہفتے اس مقالے کے خاص خاص حصے اپنے تبصرے کے ساتھ پیش کریں۔ اپنا تبصرہ اس لیے کہ ہمارے کالم میں کوئی چیز تو فکر انگیز ہونی چاہیے۔

(۲۸ فروری ۱۹۸۶ء)

☆..........☆..........☆

ادب ساز، ادیب ساز اور تاریخ ساز آدمی

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی کتاب ...... "افسانے کی حمایت میں" ...... میں پلاٹ سے بحث کرتے ہوئے مثلاً ایک واقعے کی چند ترتیبیں لکھی ہیں۔ ان میں سے ایک ترتیب یہ ہے:

"زید ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ اچانک اس کے پیٹ میں درد اٹھا۔ اسے خون کی قے ہوئی اور وہ مر گیا۔"

وارث علوی نے فاروقی کی مذکورہ کتاب پر جو مقالہ لکھا ہے، اس میں بھی اس قسم کا ایک واقعہ بیان کیا ہے:

"وارث ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ اچانک اس کے پیٹ میں درد اٹھا۔ اسے خون کی قے ہوئی اور وہ مر گیا۔ جو کتاب وہ پڑھ رہا تھا، اس کا نام "افسانے کی حمایت میں" تھا۔"

دونوں واقعے ایک ہی جیسے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ جس کتاب کو پڑھتے ہوئے زید کی وفات ہوئی، اس کا نام معلوم نہیں۔ وارث کے انتقال کا سبب ایک معلوم کتاب ہے۔ البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جب کتاب کے مطالعے کے دوران وارث کا انتقال ہو چکا تھا تو اس نے اس کتاب پر وہ مقالہ کیسے لکھ لیا، جس کی ضخامت کتاب سے تین گنی ہے۔ یہ تو سنا تھا کہ ہمارے شعرائے کرام انتقال کے بعد بھی فکرِ سخن فرماتے رہتے ہیں اور اس قسم کے شعر کہتے رہتے ہیں:

اور فانی بڑھ گئی بے تابیِ دل بعدِ مرگ
کیا کہیں ، مر کر گرفتارِ بلا کیوں ہو گئے

لیکن یہ پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ ہمارے نقاد بھی شاعروں سے کم نہیں اور وفات کے بعد ان کی بے تابیِ دل شاعروں سے بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے نتیجے میں وہ خود گرفتارِ بلا نہیں ہوتے، بلکہ وہ لوگ ہوتے ہیں، جو ان کی تنقید کا موضوع بنتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے افسانے کی حمایت میں جو کتاب لکھی ہے، وہ بہت دلچسپ ہے اور اس میں افسانے کی حمایت اس بنیاد پر کی گئی ہے کہ

"افسانہ ایک معمولی صنفِ سخن ہے اور علی الخصوص شاعری کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا۔"

ظاہر ہے کہ اس بنیاد پر جو عمارت اٹھائی ہوگی، وہ بہت عظیم الشان ہوگی، لیکن وارث علوی کسی دوسرے کی تعمیر کردہ عمارت کی عظمت کو تسلیم نہیں کرتے، اس لیے وہ جب تک تنقید کے نام پر اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ نہ بنالیں، انھیں چین نہیں آتا۔ وارث کو چاہیے تھا کہ وہ فاروقی کی کتاب سے اپنے علم میں اضافہ کرتے، لیکن انھوں نے اپنے بلڈ پریشر میں اضافہ کر لیا۔ مقالے کی تمہیدی سطور میں وہ فرماتے ہیں:

"اب دیکھیے، فاروقی صاحب نے اپنی کتاب میں افسانے کو اسی طرح رگیدا ہے، جس طرح کسی زمانے میں کلیم الدین احمد نے غزل کو رگیدا تھا۔ کلیم الدین احمد کی تنقید غلط تھی، لیکن پرخلوص تھی۔ غزل کے بارے میں انھوں نے وہی لکھا، جو وہ خلوصِ دل سے محسوس کرتے تھے اور جو کچھ لکھا، سوچ سمجھ کر لکھا اور یہ سوچ سمجھ اس نقاد کی تھی، جو آکسفورڈ کا پڑھا ہوا تھا۔ کلیم الدین احمد کے ہاں کوئی ڈراما نہیں ہے، اس لیے ان پر تنقید بہت ہوئی۔ سخت اختلافِ رائے بھی کیا گیا، گالیاں تک دی گئیں، لیکن کوئی ان کا مذاق نہیں اڑا سکا۔ وجہ یہ تھی کہ کلیم الدین احمد کے ہاں اکڑ نہیں تھی، غصہ نہیں تھا، اترانا نہیں تھا۔ بناوٹ، دھونس اور رعونت نہیں تھی۔ ان کی تنقید کی گاڑی (جسے وہ لندن سے خرید کر لائے تھے) جیسی تھی، اس میں نفاست سے بیٹھتے اور سبق پڑھانے چل دیتے۔ سبق کے دوران اردو شاعری اور اردو تنقید سب کا ملیا میٹ ہو جاتا، لیکن کبھی یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ یہ شخص شرارت کر رہا ہے، دھاندلی مچا رہا ہے ...... فاروقی کا معاملہ کلیم الدین احمد سے بالکل مختلف ہے۔ افسانے پر ان کی تنقید غلط بھی ہے اور کینہ پرور بھی۔ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس میں خلوص نہیں، محض اتراہٹ، دھونس اور رعونت ہے۔ ان کی شخصیت میں زبردست بناوٹ ہے۔ جیسے وہ ہیں، ویسے تو کہیں نظر نہیں آتے۔ چھپ چھپ کر اپنی دل ربائی کی نمائش کرتے ہیں، اپنی ذہانت کی دھاک بٹھاتے ہیں، بلند جبینی کا رعب جماتے ہیں۔ ان کے اندر کا افسر اپنی نوکر شاہی کے چونچلے سے باز نہیں آتا۔ وہ افسانے کو اس طرح ڈانٹتے ہیں، جیسے کوئی چاق و چوبند افسر چپراسی کو ڈانٹ رہا ہے اور چپراسی سہم جاتا ہے۔ اسے کیا خبر کہ افسر اندر سے کھوکھلا ہے۔ فکشن کا تجربہ اس کا صفر ہے، فکشن کی تنقید کا مطالعہ سطحی۔"

یہاں وارث علوی کسی قدر غصے میں نظر آتے ہیں۔ یہ ان کا عام انداز نہیں ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ وارث علوی نے یہ اعتراف کیا ہے کہ ...... "قدوسی کی ولادتِ مسعود کے بعد تنقید وزن سے گرتی رہی

ہے۔"...... لیکن تنقید کے ذریعے طنز و مزاح کا معیار جس طرح انھوں نے بلند کیا ہے، اس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ وہ دن گئے، جب لوگ طنز نگار یا مزاح نگار کہلاتے تھے۔ اب صرف تنقید نگار یا صرف وارث علوی کہلانا کافی ہے۔ وارث علوی کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے تنقید کو تقلید سے آزاد کیا ہے۔ اسے ایک محدود دائرے سے نکال کر کھلے میدان میں لا بٹھایا ہے۔ پہلے تنقید پڑھ کر آدمی زندگی سے بیزار ہو جاتا تھا، اب خود تنقید ہی سے بیزار ہو جاتا ہے۔ وارث علوی نے تنقید کی خشکی دور کر کے اسے باغ و بہار بنا دیا ہے۔ ان کا انداز بے حد شگفتہ ہے اور وہ بظاہر غیر سنجیدہ انداز میں بڑی فکر انگیز باتیں کہہ جاتے ہیں۔ مثلاً زیرِ نظر مقالے میں ایک جگہ انھوں نے بتایا ہے کہ ہر نقاد کے پاس تنقید کی ایک گاڑی ہوتی ہے۔ ان گاڑیوں کی تفصیل ملاحظہ ہو:

"کلیم الدین احمد کے پاس بڑی آسٹن ہے اور اس میں زیادہ لوگوں کی گنجائش نہیں۔ افسانہ نگار اور ناول نگار کو اس میں جگہ نہیں ملتی۔ وحید اختر کے پاس سفید گھوڑی والی بگھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ علی گڑھ کا ہر پروفیسر ایسی بگھی رکھتا ہے۔ محمود ہاشمی کے پاس اسکوٹر ہے۔ ان کے کِک کی چوٹ اوپر سے کہیں معلوم ہوتی ہے۔ آلِ احمد سرور کے پاس ایک سائیکل ہے، جو تنے ہوئے رستے پر اپنا توازن قائم رکھتی ہے۔ باقر مہدی کے پاس بھی ایک سائیکل ہے، جسے انھوں نے پیٹرس سے خریدا ہے۔ روزانہ اسے ولایتی کتابوں کا تیل پلاتے رہتے ہیں، لیکن چلاتے کا ہے ماہے سر را ہے ہی ہیں۔ شمیم حنفی کے پاس ٹرانسپورٹ کا ایک ٹرک ہے، جس میں مغرب کے تمام فلسفیوں کو لاد کر وہ کاٹھ گودام کے کاٹھ کے الوؤں کو فلسفہ پڑھانے چل نکلتے ہیں اور فدوی کے پاس آپ جانتے ہی ہیں کہ تانگہ ہے۔ ہر مضمون سنگِ میل ہوتا ہے، اس لیے میل بھر لمبا ہوتا ہے اور گھوڑا جتنی گھاس کھاتا ہے، اتنی ہی لید کرتا ہے، جسے تنقید کی زبان میں معاملے کو ٹھکانے لگانا کہتے ہیں۔ فاروقی کے پاس بھی تنقید کی گاڑی ہے۔ ماڈل نہ پوچھیے، کیوں کہ کالرج اور رچرڈز سے لے کر علمِ بیان کے تمام اساتذہ کے پرزے اس میں لگے ہوئے ہیں۔ ڈرائیونگ کا انداز بالکل پلے بوائے کا ہے۔ منہ میں پائپ اور نوجوان نقاد و شاعر پہلو میں۔ زور سے ہارن بجتا ہے اور جوش و فراق لپک کر فٹ پاتھ پر چڑھ جاتے ہیں ---- کار بیدی اور منٹو پر گرد اڑاتی، سجاد حیدر یلدرم کی کتابوں سے گرد اڑاتی اور فکشن کے تصورات کو گرد آلود کرتی دوڑتی رہتی ہے۔"

شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے:

"بات یہ ہے، رام لعل صاحب! ان معاملات پر مناسب ترین رائے محمود ہاشمی سے مل سکتی ہے۔"

اس پر وارث علوی نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے:

"بظاہر یہ جملہ بے ضرر اور انکسارانہ ہے، لیکن اس کے تیور ایسے ہیں کہ لگتا ہے، جیسے ایک آکسفورڈ ڈین دوسرے آکسفورڈ ڈین کا حوالہ دے رہا ہے۔ یہ وہ کرتب ہے، جس میں محمود ہاشمی کو تو بانس پر چڑھایا ہی گیا ہے، لیکن بانس بھی فاروقی کی ٹھنڈی پر ہے۔ فاروقی انھیں لوگوں کو بانس پر چڑھاتے ہیں، جو اوپر چڑھنے کے بعد ہاتھ پیر نہ ہلائیں، تاکہ باہمی توازن قائم رہے۔ ویسے بھی فاروقی اب تنقید کے اس مقام میں داخل ہو گئے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ کسی بھی ادیب کے متعلق ان کا بیان اس کے ادبی مقدر کو بگاڑ یا سنوار سکتا ہے اور وہ لوگ بھی، جن کا ادبی مقدر اپنی تخلیقی صلاحیتوں سے زیادہ نقادوں کے بیانات کا مرہونِ منت رہتا ہے، اسی میں اپنی عافیت سمجھتے ہیں کہ نقاد انھیں مجمع سے الگ کر کے بانس پر چڑھائے تو وہ اوپر دم سادھے بیٹھے رہیں اور جب نیچے اتریں تو اس کے قدموں میں لوٹ پوٹ جائیں۔ فاروقی بظاہر بہت سخت نقاد نظر آتے ہیں، لیکن وہ سخت ہیں اپنے مخالف حلقے کے لیے۔ اپنے حلقے کے لکھنے والوں کے لیے حوصلہ افزائی کے نقاب کے تحت خوش کرنے والی باتیں کرتے رہتے ہیں۔"

اوپر کے اقتباس میں محمود ہاشمی کے معاملے میں جو کمی رہ گئی تھی، وہ یوں پوری کی گئی ہے:

"فاروقی نے اپنے ایک انٹرویو میں بھی محمود ہاشمی کو ہندوستان کی جدید اردو تنقید کا نمایندہ کہا تھا۔ اب یوں اگر دیکھے جائیں تو محمود ہاشمی کا مرتبہ نقاد سے بھی بڑا ہے کہ وہ ادب ساز، ادیب ساز اور تاریخ ساز ہو گئے ہیں۔ یہ ان کی ہنرمندی کا کمال ہے کہ ادیب جو ادب اپنی کتاب میں تخلیق کرنے سے قاصر رہتا ہے، اسے محمود ہاشمی اپنی تنقید میں پیدا کر دیتے ہیں اور اس طرح ادیب کو وہ جو کچھ ثابت کرنا چاہتے ہیں، کر دیتے ہیں۔ مثلاً صلاح الدین پرویز کے ناول "نمرتا" میں جو اسطور سازی خود ناول نگار نہیں کر سکا، وہ محمود ہاشمی نے اپنے مضمون میں کر ڈالی۔ تنقید میں یہ طاقت کہاں کہ ایسے کمالات دکھائے۔ وہ تو جو کچھ ہے، اسے دیکھتی ہے، جب کہ محمود ہاشمی جو کچھ نہیں ہے، وہ بھی دکھاتے ہیں۔"

وارث علوی نے فاروقی کے ساتھ بے چارے ہاشمی کا حساب بھی برابر کر دیا۔ گویا گیہوں کے ساتھ گھن بھی پیس ڈالا، لیکن وارث علوی کا یہ کہنا درست نہیں ہے کہ تنقید جو کچھ ہے، اسے دیکھتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ آج کل تنقید سرے سے کچھ دیکھتی ہی نہیں۔ جب بغیر دیکھے ہی اچھا خاصا کام چل رہا ہے تو آنکھوں پر غیر ضروری بوجھ ڈالنے کی ضرورت ہی کیا ہے!

(۷ر مارچ ۱۹۸۶ء)

ترقی پسند تحریک کی گولڈن برسی

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک کی ہڈیاں بھی سرمہ ہو چکی ہیں، ایسے گڑے مردے کو اکھیڑنا سراسر رجعت پسندی ہے، مگر ہمیں اس خیال سے اتفاق نہیں ہے، کیوں کہ سرمہ بڑی مفید چیز ہے، اس کے استعمال سے آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے، ہمارے اس جواب سے معترضین مطمئن نہیں ہوں گے اور وہ یہ کہیں گے کہ سرمے کے مفید ہونے میں کوئی شک نہیں، لیکن اس کے استعمال کے لیے آنکھیں بھی تو ہونی چاہئیں۔

ہم نے بہر حال آنکھوں میں کسی قسم کا سرمہ لگائے بغیر ہی ترقی پسندوں کی گولڈن جوبلی دیکھی، جو ان معنوں میں گولڈن ضرور تھی کہ وہاں ایسے ایسے چہر نظر آئے، جن کی تعریف آبِ زر سے لکھی جانے کے قابل ہے، بشرطیکہ زر اُن سرمایہ داروں کا ہو، جن کے تعاون سے یہ تماشا وجود میں آیا۔ یہاں وہ تمام لوگ موجود تھے، جو رائٹرز گلڈ اور اکادمی ادبیات کے ذریعے خفیہ اور علی الاعلان مراعات حاصل کرتے رہے ہیں، یہاں تک کہ معذوروں کے سرکاری فنڈ سے وظیفے بھی لیتے رہے ہیں۔ یہاں وہ لوگ بھی تھے، جو سرمایہ داروں کے نام پر قایم شدہ آدم جی اور داؤد انعامات ایوب خان جیسے آمرِ مطلق کے دستِ مبارک سے وصول کرتے رہے ہیں یا ان انعامات کے لیے ججوں کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ وہ لوگ بھی تھے، جنھوں نے ایوب خان کے زمانے میں نقد رقم لے کر اپنے رسالوں کے بنیادی جمہوریت نمبر نکالے۔ وہ لوگ بھی تھے، جو سرمایہ داروں کے نجی ملازم ہیں اور اپنے آقاؤں کے مفادات کا تحفظ اس طرح کرتے ہیں، جیسے یہ ترقی پسند کا تقاضا ہو........ اور ان سب سے بڑھ کر وہ لوگ بھی خاصی تعداد میں نظر آ رہے تھے، جنھوں نے لکھنا تو کیا، زندگی میں کبھی کچھ پڑھنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ شاید انھیں لوگوں کے مزاج کا خیال رکھتے ہوئے دعوت کارڈ پر ایسی فاختہ کی تصویر چھاپی گئی تھی، جو اپنے پنجوں میں پستول پکڑے ہوئے ہے۔ مطلب یہ کہ وہ زمانہ گیا، جب قلم کا استعمال ہوتا تھا، اب پستول کا زمانہ ہے۔ امن کی فاختہ بڑی مشکلوں سے اپنے سے دس گنا وزنی پستول ترقی پسندوں کے لیے لے کر آئی ہے۔ گویا یہاں بھی دکھ جھریں بی فاختہ........ والا معاملہ ہے۔

ترقی پسندوں کی اس محفل میں ہمیں پروفیسر احمد علی نظر نہیں آئے، جو ترقی پسند تحریک کے اصل بانی ہیں۔ ان کا قصور شاید یہ ہے کہ انھوں نے حال ہی میں قرآن شریف کا انگریزی ترجمہ کیا ہے۔ جس کانفرنس کا آغاز قرآن شریف کی تلاوت سے نہیں ہوا، اس کانفرنس میں کسی ایسے شخص کی شمولیت کیسے گوارا کی جا سکتی تھی، جو قرآن شریف کا مترجم ہو۔ احمد ندیم قاسمی مرحوم بھی نظر نہیں، جن کے بغیر پاکستان میں ترقی پسندی کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ قاسمی صاحب کا قصور شاید یہ ہے کہ انھوں نے اس کانفرنس کے انعقاد سے صرف دو مہینے پہلے اپنے رسالے ''فنون'' میں ایک اداریہ لکھا تھا، جس میں ان ترقی پسندوں کی مذمت کی گئی تھی، جو دنیاوی فوائد حاصل کرنے کے لیے پاکستان کے دشمنوں کی طرف بھی دوستی کا ہاتھ بڑھا لیتے ہیں۔ قاسمی صاحب کا یہ اداریہ ایک ایسا آئینہ ہے، جس میں ترقی پسندوں کی اصل صورت دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کانفرنس میں میرزا ادیب بھی نہیں تھے، جنھوں نے ''ادبِ لطیف'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بہت سے ترقی پسندوں کی ذہنی تربیت کی ہے۔ انھیں شاید اس لیے نہیں بلایا گیا کہ وہ اب کسی ترقی پسند کو کسی رسالے کی بیساکھیاں فراہم کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ پروفیسر ممتاز حسین کی عدم موجودگی کا سبب بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ شاید اپنی عافیت پسندی کی بنا پر انھوں نے ملک سے باہر چلے جانا ہی مناسب سمجھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہندوستان سے ترقی پسند یہاں آئے اور یہاں کا سب سے بڑا ترقی پسند وہاں چلا گیا۔

اس کانفرنس کا افتتاح بزرگ ادیب مجنوں گورکھپوری نے کیا۔ اس کام کے لیے ان سے بہتر شخصیت کا تصور نہیں کیا جا سکتا، اس لیے کہ کچھ عرصہ قبل ترقی پسند تحریک کے زوال کے اسباب پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا:

> ''اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ ہم صرف یہ دیکھتے ہیں کہ روس اور چین میں کیا نعرہ چلتا ہے۔ ہم نے یہ نہیں دیکھا کہ ان کے نعرے ہمارے جغرافیائی حالات سے ہم آہنگ ہیں یا نہیں۔ ان کی روایات مختلف تھیں اور بغیر کسی فکر کے انھیں قبول کر لیا...... تحریک پر زوال نہیں لائے گا تو کیا لائے گا...... ایک تو میں ترقی پسند کے لفظ کا مخالف ہوں۔ اس میں پسند اور ناپسند کا کیا سوال ہے۔ زندگی تو از خود ترقی کرے گی...... ذرا آپ جا کر علی سردار جعفری اور سبطِ حسن سے پوچھیے کہ ان کے پاس کیا پروگرام ہے؟ ان کے پاس کوئی پروگرام نہیں ہے۔ ظاہر ہے، ایسی صورت میں تحریک کو زوال سے ہم کنار ہونا ہی ہے...... (زوال کی) وجہ یہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کو کمیونزم کی تحریک تصور کر لیا گیا...... (ترقی پسندوں) میں سے کسی نے کوئی قربانی نہیں دی...... آپ کو اپنے نظریے پر یقین ہے (تو) قربانی ضرور دینی چاہیے اور اگر آپ کا نظریہ محض عیاشی ہے تو

کام نہیں چلے گا...... ترقی پسند تحریک ختم ہوگئی۔ اب اس کے پاس کوئی نیا پروگرام نہیں ہے، کیوں کہ ان ملکوں کے پاس بھی نیا پروگرام نہیں ہے، جن سے انھوں نے کمیونزم لی تھی۔ کمیونزم کا تقاضا یہ تھا کہ اپنے خیالات کی تبلیغ کر کے تسخیر حاصل کرلو، لیکن روس جارحیت اور غاصبانہ قبضے کے ذریعے کمیونزم پھیلا رہا ہے...... نئے خیالات روس کے پاس بھی نہیں ہیں۔''

مجنوں صاحب کے ان خیالات پر علی سردار جعفری کا ردِ عمل یہ تھا:

''مجنوں صاحب کے بارے میں کیا عرض کروں۔ وہ میرے بزرگ ہیں اور میں ان کا احترام کرتا ہوں، لیکن عمر کی رفتار کے کرشمے بہت عجیب ہوتے ہیں...... وہ مجھ سے یا سبطِ حسن سے یہ سوال نہ کریں کہ ہمارے پاس کیا پروگرام ہے۔ شاعر اور ادیب کے پاس پروگرام نہیں ہوتا، پیام ہوتا ہے، طلب ہوتی ہے، آرزو ہوتی ہے، جستجو ہوتی ہے......''

مجنوں صاحب کو خدا سلامت رکھے، ان کی عمر بیاسی برس کی ہے اور سردار جعفری، کہ خدا، تہتر برس پورے کر چکے ہیں۔ اگر مجنوں صاحب کی باتوں میں عمر کی رفتار کے کرشمے نظر آتے ہیں تو سردار جعفری کی باتیں بھی کرشمہ سازی سے خالی نہیں۔ اب کہیں جا کر یہ راز کھلا ہے کہ ان کے پاس پیام ہے، طلب ہے، آرزو ہے، جستجو ہے...... شاعری بھی ہوگی، لیکن اس کا ذکر، معلوم نہیں، انھوں نے کیوں نہیں کیا۔

مجنوں صاحب اور جعفری صاحب کے خیالات ہم نے اختصار سے پیش کیے ہیں۔ جو لوگ تفصیل کے خواہاں ہوں، انھیں طاہر مسعود کی کتاب ''یہ صورت گر کچھ خوابوں کے'' دیکھ لینی چاہیے، جس کے نئے ایڈیشن میں سردار جعفری کا وہ خط بھی شامل ہے، جس کا اقتباس ہم نے پیش کیا ہے۔

ترقی پسندوں کی کانفرنس کا خطبۂ صدارت شوکت صدیقی صاحب نے ارشاد فرمایا۔ خطبے سے پہلے انھوں نے اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ علی سردار جعفری اور مجروح سلطان پوری وغیرہ کو پاکستانی ویزا نہیں ملا، اس لیے یہ لوگ کانفرنس میں شریک نہیں ہو سکے۔ ویزا نہ ملنے والی بات عذرِ لنگ معلوم ہوتی ہے کہ سردار جعفری بارہا پاکستان آ چکے ہیں اور مجروح سلطان پوری بھی پچھلے سال آئے تھے اور کئی مہینے یہاں مقیم رہے تھے۔ شاید ترقی پسندوں نے اپنی کانفرنس کو ساداتِ امروہہ کا مشاعرہ سمجھ رکھا تھا کہ ادھر سے اشارہ ہوا اور ادھر سے شعرائے کرام کچے دھاگے سے بندھے چلے آئے۔ ساداتِ امروہہ والے خدمت کا نقد معاوضہ ادا کرتے ہیں اور ترقی پسندوں نے صرف مشاعرے کی داد پر ٹرخانا چاہا۔ ہندوستانی شاعر کچی گولیاں نہیں کھیلے، جو صرف داد کی توقع پر چلے آتے۔

شوکت صدیقی نے اپنے خطبے میں یہ بھی کہا کہ اغیار نے ترقی پسند تحریک کی وفات کا اعلان کیا تھا، لیکن یہ تحریک زندہ ہے، توانا ہے، گزرتے وقت کے ساتھ نئی منازل طے کرتی آگے، اور آگے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اگر شوکت صاحب بعض نوعمر اور نودریافت مقرروں کی جوشیلی تقریروں کے بعد صدارتی خطبہ ارشاد فرماتے تو اس جملے میں ''آگے، اور آگے کی بجائے ''حد سے آگے'' کے الفاظ انھیں استعمال کرنے پڑتے۔ یہ عجیب ادبی اجتماع تھا، جس میں ادب کے سوا ہر مسئلے کو الجھانے کی کوشش کی گئی۔ ادب کی جان بخشی اس لیے ہوگئی کہ اس کے بارے میں کسی نے کچھ کہا ہی نہیں۔ کسی کے پاس کہنے کے لیے کچھ تھا ہی نہیں۔

شوکت صاحب کو ترقی پسند تحریک کے زندہ اور توانا ہونے پر اصرار ہے تو ہمیں بھی اس سے انکار نہیں۔ ایک زمانے میں مرادآباد میں مردے زندہ ہوتے تھے، اب کراچی میں بھی یہی کچھ ہونے لگا ہے۔

موصوف نے فرمایا کہ پاکستان میں امریکہ کی خوش نودی کی خاطر ایسے حالات پیدا کیے گئے کہ ''انجمن ترقی پسند کا تنظیمی ڈھانچہ ایسا بکھرا کہ ملبے کا ڈھیر بن گیا، مگر اس پر آشوب دور میں بھی ترقی پسند ادیبوں کے قلم زنگ آلود نہ ہوئے۔'' بجا فرمایا! ڈھانچہ تھا تو ملبے کا ڈھیر ہوا، قلم تھے ہی نہیں تو زنگ آلود کیا ہوتے اور اب تو خیر قلم کا سوال ہی نہیں رہا کہ لوحِ جہاں پر ترقی پسندی کا حرفِ مکرر پستول سے لکھا جائے گا۔

افتتاحی اجلاس میں مرکزی تنظیمی کمیٹی کے سیکریٹری نے بھی رپورٹ پڑھی، جس میں زبان و بیان کی اغلاط کے ساتھ معنوی اغلاط کی بھی کمی نہ تھی۔ اس رپورٹ کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ترقی پسندی کے نام پر جو ادب تخلیق کیا جائے گا، وہ کیسا ہوگا۔ زبان و بیان اور مواد کے اعتبار سے اس سے بہتر رپورٹ تو ہر سال اسلام سلمانی، سیکریٹری جنرل آل پاکستان باربر ایسوسی ایشن پیش کر دیتے ہیں۔

اس کانفرنس کا مجموعی تاثر یہ ابھرتا ہے کہ بعض سیاسی طالع آزماؤں نے ادب کو اپنی ذاتی ترقی کا زینہ بنانے کے لیے گولڈن جوبلی کا کھڑاگ الایا ہے۔ یہاں ادب کا ذکر برائے نام تھا، زیادہ تر سیاسی مسائل پر گفتگو ہوئی۔ اردو زبان اور پاکستان کے ایک صوبے کے خلاف علی الاعلان جلے دل کے پھپھولے پھوڑے گئے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے...............

(۱۴ر مارچ ۱۹۸۶ء)

☆......☆......☆

احمد ندیم قاسمی

حرفِ اوّل

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ادب میں ترقی پسندی کا مفہوم یکسر بدل گیا ہے اور ایک خاص نوعیت اور ایک خاص نظریے کی سیاست ادب کی اس زندگی افروز تحریک کے خدوخال بگاڑنے پر تل گئی ہے۔ ترقی پسندی کے دو واضح طور پر مختلف نظریات صورت پذیر ہونے لگے ہیں۔ ان میں سے ایک کو مصلحتی ترقی پسندی کا نظریہ کہیے اور دوسرے کو سچی ترقی پسندی کا نظریہ۔ جو ترقی پسندی آج کل پورے کرۂ ارض پر اصول تاتے ہجاتی پھر رہی ہے اور ایمان کی حد تک ترقی پسندی پر یقین رکھنے والوں کے ناموں اور کارناموں پر خطِ تنسیخ کھینچ رہی ہے، وہ ابن الوقت قسم کی مصلحتی ترقی پسندی ہے۔ ابن الوقت یوں کہ وہ اپنے پسندیدہ سیاسی نظام کی

کسی قلابازی کے ساتھ ہی فوراً قلابازی کھا جاتی ہے اور نہیں کھاتی تو اس کا "ایمان" خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ یہی ترقی پسندی کے علمبردار یا تو تعداد میں کم ہیں یا شور و غل مچانے کے معاملے میں کمزور ہیں، چنانچہ یہ لوگ، جنھوں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ ترقی پسند ادب کی تحریک کو ہر دل عزیز بنانے اور اس تحریک کے مخالفین کی اینٹوں کا جواب پتھروں سے دینے کا منصب سنبھال رکھا تھا، آج اُن ترقی پسندوں کی زد میں ہیں، جن کا مقصدِ حیات کوٹھی، کار، بینک بیلنس اور امرا کے حلقۂ ثقافت کی رکنیت سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ ان عناصر نے ترقی پسندی کو ان کے غیر مقاصد کے حصول کے ایک ذریعے کے طور پر استعمال کیا اور آج وہ نہ صرف اصلی ترقی پسند کہلوانے سے نہیں شرماتے، بلکہ ان تخلیق کاروں کی مذمت سے بھی نہیں گھبراتے، جن کے کندھوں پر سوار ہو کر انھوں نے گزشتہ ۳۸ برس طے کیے۔ یہ احسان فراموشی اور طوطا چشمی، اُس بورژوا ایت کا کردار خاص ہے، جس کو ترقی پسند اہل قلم نے اپنے ایمان میں سے ایک یعنی وہ گوش ہمیشہ کے لیے رخصت کر دینے کی قسم کھائی تھی۔ بورژوا ایت کی آرام کرسی پر ان نیم ورانا عناصر کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس طرح وہ ترقی پسندی کے نظریے کی جڑیں کاٹ رہے ہیں اور رجعت پسندوں اور قدامت فروشوں کی پیش قدمی کے لیے راستہ صاف کر رہے ہیں۔

یہی ترقی پسندی کے مقاصد میں جہاں حق و صداقت، عدل و انصاف، مساوات و یگانگت، امن و سکون اور انسان کو اس کا وقار واپس دلانا شامل ہے، وہیں ان نیک مقاصد کو پاکستان کی آزادی اور سلامتی کے ساتھ مشروط قرار دیتی ہے۔ اگر کوئی پاکستان کا بدخواہ ہے تو وہ اس ترقی پسندی کے نزدیک سزاوار مذمت ہے۔ اگر کوئی پاکستان کا دوست ہے تو اس ترقی پسندی کے نزدیک لائق تعاون ہے۔ مگر یہ دشمنی اور دوستی مجرد الفاظ نہیں ہیں۔ یہی ترقی پسندی اس دشمنی اور دوستی کو اپنے نظریات اور مقاصد کی کسوٹی پر پرکھتی ہے۔ اسی لیے حکومت وقت کی سیاسی دشمنیاں اور دوستیاں اس ترقی پسندی کو کوئی معیار فراہم نہیں کرتیں۔ اس کا معیار اپنے نظریات کے ساتھ دیانت ہے اور بس۔ یہی وجہ ہے کہ یہی ترقی پسندی کے علمبردار اپنی پسند کی جلاوطنی اختیار کر کے فراری ذہنیت کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ وہ حکومت کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر حق و صداقت اور جمہوریت و آزادی کا نعرہ سر کرتے ہیں اور یوں اپنا منصب ادا کر دیتے ہیں۔ پاکستان کے دشمنوں کے ساتھ دوستی انھیں کسی قیمت پر گوارا نہیں ہے۔ ہماری ان چند سطور کو قارئین "فنون" کی عدالت میں ایک رضاکارانہ بیان تصور کیا جائے۔

(ماہنامہ فنون، دسمبر ۱۹۸۵ء)

☆..........☆..........☆

ترقی پسند ادب کا غلط نامہ

ترقی پسندی کو بطور تخلص استعمال کرنے اور صحیح معنوں میں ترقی پسند ہونے کا فرق اس وقت سامنے آیا، جب سرشار صدیقی نے اسرار طارق کی کتاب کی رونمائی میں یہ کہا کہ ہم اپنی تہذیبی اور مذہبی روایات کا احترام کرتے ہیں، اس لیے جلسے کا آغاز تلاوت قرآن پاک سے کیا جائے گا۔ واضح رہے کہ سرشار صدیقی نے ترقی پسندوں کی گولڈن جوبلی کانفرنس میں مندوب کی حیثیت سے شرکت کی تھی اور اس کانفرنس میں خدا کے نام اور کلام سے کوئی تعلق نہیں رکھا گیا تھا۔ رائٹرز گلڈ کی طرف سے ہندوستانی شاعر غلام ربانی تاباں کے اعزاز میں جو تقریب ہوئی تھی، اس میں بھی سرشار صدیقی نے ترقی پسندی کے معروف معنوں سے انحراف کرتے ہوئے کہا کہ اگر غیر متعلق لوگوں کو بلایا جاتا تو بہت بڑا مجمع اکٹھا کیا جا سکتا تھا، مگر ہم نے صرف ادیبوں کو مدعو کیا ہے۔ ظاہر ہے یہاں بھی سرشار صدیقی کا اشارہ مذکورہ کانفرنس کی طرف تھا، جس میں ادیبوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی اور یہ نمک بھی ترقی پسندی کے آٹے میں "دم" ہو کر اپنی شناخت کھو بیٹھا تھا۔

سرشار صدیقی کی طرح ہم نے اور بھی کئی مندوبین کو ترقی پسندوں کی کانفرنس سے علی الاعلان بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ظاہر ہے، جو لوگ علاقائی اور لسانی تعصبات کو ہوا دینے اور مذہب کو تقویم پارینہ سمجھنے کا شوق نہیں رکھتے، ان کے نزدیک ترقی پسندی کا مفہوم ذرا مختلف ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سرشار صدیقی اور ان جیسے دوسرے "باغی" ترقی پسندوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ استاد لاغر مراد آبادی کی قیاس آرائی یہ ہے کہ باغیوں کو یہ سزا دی جائے گی کہ انھیں ڈائمنڈ جوبلی کانفرنس میں مدعو نہیں کیا جائے گا۔ ہم نے عرض کیا ...... "گولڈن جوبلی اور ڈائمنڈ جوبلی کے درمیان ۲۵ برس کی طویل مدت پڑی ہے، اس دوران میں بھی تو باغیوں کو سزا ملنی چاہیے۔" ...... استاد نے فرمایا ...... "ترقی پسندی کا مردہ ۲۵ برسوں سے پہلے کروٹ نہیں لیتا، اس لیے اب جو کچھ ہوگا، ڈائمنڈ جوبلی کے موقع پر ہی ہوگا۔"

خیر یہ ترقی پسندوں کا داخلی معاملہ ہے، جس کروٹ چاہیں، رہیں اور اپنے باغیوں سے جو چاہیں سلوک کریں، لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ حبیب جالب نے ترقی پسندوں پر سرمایہ داروں سے گٹھ جوڑ کا جو الزام لگایا تھا، غیر ترقی پسند یعنی رجعت پسند اس کی تائید میں طرح طرح کی دلیلیں کیوں پیش کر رہے ہیں۔ مثلاً ایک دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ایک ایسے اخبار نے، جو ایک بہت بڑے سرمایہ دار کی ملکیت ہے، گولڈن جوبلی کانفرنس کو اتنی اہمیت دی، جیسے یہ کوئی بین الاقوامی یا قومی نوعیت کا حادثہ یا سانحہ ہو۔ اگر سرمایہ داروں اور ترقی پسندوں کا گٹھ جوڑ نہ ہوتا تو اس کانفرنس کی بھی ویسی ہی خبریں اندرونی صفحات پر چھپتیں، جیسے پاکستان فیڈریشن آف بزنس اینڈ پروفیشنل ویمنز کی چھپتی ہیں۔ رنگین ضمیمے منظر عام پر نہ آتے، پہلے صفحے پر سہ کالمی خبریں شائع نہ ہوتیں۔

ہمیں یہ دلیل بے بنیاد نظر آتی ہے۔ اگر مذکورہ اخبار ایک سرمایہ دار کا ہے تو ترقی پسند کون سے ایسے غریب الغربا ہیں کہ انھیں سرمایہ داروں سے کمتر سمجھا جائے۔ بڑے بڑے ہوٹلوں میں اجلاس منعقد فرمانا اور وہیں مندوبین کے قیام و طعام کا انتظام کرنا عام لوگوں کے بس کی بات نہیں۔ ترقی پسند غریبوں کے ہمدرد ضرور ہیں، لیکن اتنے بھی عاقبت نا اندیش نہیں کہ اس مقصد کی خاطر اپنی شاہانہ وضع چھوڑ دیں۔

ہم تو مذکورہ اخبار کے بے حد ممنون ہیں کہ اس کی وجہ سے ہمیں بہت سے لطائف سے محظوظ ہونے کا موقع ملا۔ مثلاً پچھلے ہفتے جنوبی ایشیا میں ترقی پسند ادب کے رجحانات پر جو مذاکرہ شائع ہوا ہے، اس سے جنوبی ایشیا تو کیا، لانڈھی کورنگی کے ادبی رجحانات پر بھی روشنی نہیں پڑتی۔ اس مذاکرے میں ترقی پسندوں کے دوش بدوش جن لوگوں نے ترقی پسندی کے معاملات سلجھائے، ان میں اخبار مذکور کے ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن اور ایگزیکٹو سیکریٹری بھی شامل تھے۔ معلوم نہیں اخبار کے پروف ریڈروں کو مذاکرے میں شامل کیوں نہیں کیا گیا۔ اس سے کم از کم یہ فائدہ تو ہوتا کہ ہاتھ کے ہاتھ غلطیوں کی تصحیح بھی ہو جاتی۔ موجودہ صورت میں تو یہ مذاکرہ نہیں، اچھا خاصا غلط نامہ ہے۔

مذاکرے میں زیادہ تر وقت اخبار مذکور کے مالک کا شکریہ ادا کرنے میں صرف ہوا اور اس قسم کی باتیں ہوئیں:

"میں ترقی پسند گولڈن جوبلی کانفرنس کے تمام منتظمین اور مندوبین کی جانب سے ...... کا شکریہ ادا کرتا ہوں ...... صاحب اپنے پیشے سے بخوبی واقف ہیں اور ان کا تجربہ بہت وسیع ہے ...... نہ صرف پاکستان کا سب سے بڑا اخبار ہے، بلکہ میں تو یہاں تک یقین رکھتا ہوں کہ پاکستان میں دوسرے جتنے اخبارات شائع ہوتے ہیں، ان کی مجموعی اشاعت سے بھی زیادہ شائع ہوتا ہے۔ اردو صحافت کی تاریخ میں اتنی بڑی اشاعت کا کوئی اخبار موجود نہیں ہے۔ پاکستان کے علاوہ مشرق وسطیٰ کے ملکوں میں بھی پاکستانی، ہندوستانی یا دیگر اُردو داں

لوگوں کا سب سے مقبول اخبار یہی ہے۔ اسی طرح اس کا لندن سے شائع ہونے والا انٹرنیشنل ایڈیشن ہے، جو یورپ وغیرہ میں بہت مقبول ہے ...... ایک بڑا اخبار ہے اور اس کی تشکیل و تعمیر اور ترقی میں ...... صاحب کا جو ہاتھ ہے، وہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ کسی انگریزی اخبار میں تو اتنا اچھا دفتر اتنی بڑی عمارت، اتنی اچھی لائبریری اور اتنے لکھنے والوں کا تعاون ہو سکتا ہے، لیکن ہمارے ہاں کسی اُردو اخبار میں یہ ممکن نہیں ہے۔"

یہ اقتباس ہم نے اس لیے درج کیا ہے کہ یہ معلوم ہو سکے کہ جنوبی ایشیا میں جو ترقی پسند ادب تخلیق ہو رہا ہے، اس کی نوعیت کیا ہے۔ گولڈن جوبلی کے موقع پر ترقی پسند تحریک سے متعلق دستاویزات کا ایک مجموعہ شائع کیا گیا ہے۔ کیا ہی اچھا ہو، اگر اس مجموعے کے اگلے ایڈیشن میں مذکورہ اقتباس بھی شامل کر لیا جائے، تاکہ ترقی پسندی کی عظمت سے متعلق ایک اور دستاویز تاریخ کا حصہ بن جائے۔

اس مذاکرے میں ہندوستانی ادیب ڈاکٹر قمر رئیس بھی شامل تھے۔ انھیں جنوبی ایشیا میں ترقی پسند ادب نظر نہیں آیا، صرف انتظار حسین دکھائی دیے اور وہ بھی کچھ اس انداز سے ...... فرماتے ہیں:

"انتظار حسین ...... کی جو انفرادیت ہے، وہ اس طرح ہے کہ جس طرح ایک گہرے اندھے کنویں میں پڑا ہوا آدمی چیخیں مار رہا ہو یا ان کا جو تشخص ابھرتا ہے وہ ایسا ہے، جیسے گہرے دھندلکوں میں بیٹھا ہوا کوئی انسان ماضی کی روشنیوں کی طرف نگاہیں اٹھا کر دیکھ رہا ہو، لیکن ایسی نگاہوں سے، جو خود بہت دھندلائی ہوئی ہیں۔ میں ان کی تحریروں کو ترقی پسند ادب ماننے سے انکار کرتا ہوں، لیکن خود ہمارے ادب میں اور پاکستان میں بھی ۱۹۳۶ء سے اب تک کے ترقی پسند ادب میں ایک تسلسل کا احساس ملے گا۔ اس میں مایوسی نہیں ہے، ماضی پرستی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں اور پاکستان میں بھی بہت سے لوگوں نے اعلیٰ پائے کا ترقی پسند افسانوی ادب تخلیق کیا ہے۔ ان میں شوکت صدیقی صاحب یہاں موجود ہیں۔"

اندھے کنویں میں پڑے ہوئے انتظار حسین کی چیخیں اس وقت اور تیز ہو گئیں، جب ہم نے انھیں رسالہ گفتگو (بمبئی) کا چار پانچ سال پہلے شائع ہونے والا ترقی پسند ادب نمبر دکھایا، جس کے مرتبین میں علی سردار جعفری کے ساتھ ڈاکٹر قمر رئیس بھی شامل ہیں۔ اس نمبر میں گزشتہ ۴۰۔۵۰ برسوں کے ایسے افسانے شامل کیے گئے ہیں، جو مرتبین کے نزدیک ترقی پسند ادب کی نمایندگی کرتے ہیں۔ ہم نے انتظار حسین سے اتنا زیادہ چیخنے کا سبب پوچھا تو انھوں نے کہا:

"ظالموں نے اس ترقی پسند نمبر میں میری کہانی بھی شامل کر رکھی ہے۔"

ہم نے عرض کیا:

"تو پھر آپ کو اس اندھے کنوئیں سے باہر آ جانا چاہیے۔"

انھوں نے مزید چیختے ہوئے کہا:

''اب میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ اب کنویں سے باہر نہیں آؤں گا۔ ترقی پسندوں میں شمار ہونے سے بہتر ہے کہ اسی کنویں میں پڑا رہوں۔''

اسی گہرے اندھے کنویں میں بیٹھ کر انتظار حسین نے گزشتہ ہفتے کے ''مشرق'' میں ''ترقی پسند تحریک پچاس سال بعد'' کے عنوان سے ایک کالم بھی لکھا ہے، جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ اس تحریک کی وجہ سے ادب میں تجربہ گم ہوتا گیا اور اس کی جگہ نعروں اور نسخوں کا عمل دخل بڑھتا گیا۔ اگر انتظار حسین اندھے کنویں سے باہر نکل کر اس تحریک پر نظر ڈالتے تو انھیں معلوم ہوتا کہ تجربہ ہی گم نہیں ہوا، گولڈن جوبلی میں یاروں کے حواس بھی گم تھے۔

ڈاکٹر قمر رئیس نے شوکت صدیقی کی ترقی پسندی کو جو خراج عقیدت پیش کیا ہے، اسے استاد لاغر مراد آبادی نے ادبی منافقت سے تعبیر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:

''شوکت صاحب چوں کہ سامنے بیٹھے تھے، اس لیے وہ قمر رئیس کو نظر آ گئے، لیکن جب قمر رئیس ''گفتگو'' کا ترقی پسند ادب مرتب کر رہے تھے، اس وقت شوکت صدیقی سامنے نہیں، کہیں اور بیٹھے تھے، اس لیے ان کا کوئی افسانہ اس نمبر میں شامل نہ کیا جا سکا، جب کہ اس میں انور سجاد تک کا افسانہ موجود ہے۔''

ہم استاد لاغر مراد آبادی کے اس بیان پر کوئی تبصرہ نہیں کریں گے، کیوں کہ کسی ادیب کے ترقی پسند ہونے کا دار و مدار اس پر نہیں کہ ڈاکٹر قمر رئیس کیا کہتے ہیں، بلکہ اس پر ہے کہ خلق خدا کیا کہتی ہے اور خلق خدا یہ کہتی ہے کہ سب سے بڑا ترقی پسند وہ ہے، جس نے صدر ایوب مرحوم سے آدم جی انعام وصول کیا تھا۔

اس مذاکرے میں ہندوستان کے ڈاکٹر شارب ردولوی بھی شریک تھے۔ نہایت نستعلیق اور شریف قسم کے آدمی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے مروتاً یا سہو قلم سے ترقی پسندوں میں شامل ہو گئے ہوں۔ انھوں نے اردو تنقید میں ترقی پسند رجحانات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

''ترقی پسند تحریک کا یہ بہت بڑا کنٹری بیوشن ہے کہ اس نے تنقید میں عام آدمی کو شریک کر کے تنقیدی بصیرت کو عام کیا۔''

ڈاکٹر شارب نستعلیق اور شریف آدمی تو پہلے ہی تھے، اس فرمان کے بعد تو ان کے معصوم ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں رہا۔ ڈاکٹر صاحب نے ممتاز حسین اور محمد علی صدیقی کا نام لے کر اپنی بات کی وضاحت کی، مگر اس وضاحت سے معاملہ کچھ اور الجھ گیا۔ ان دونوں محترم نقادوں کی تحریریں جنھوں نے پڑھی ہیں، وہ جانتے ہیں کہ عوام تو کیا، خواص بھی ترقی پسند تنقید کے قریب جاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔

اس مذاکرے کا اختتام ہندوستانی ادیب کمال احمد صدیقی کی تقریر پر ہوا۔ انھوں نے یہ انکشاف کیا کہ ہندوستان میں ترقی پسند تحریک کو لکھنے لکھانے کے کام سے نہیں، فلموں کے ذریعے فروغ ہوا ہے۔ یہ بات درست نظر آتی ہے، کیوں کہ جب کوئی شخص افسانہ یا نظم لکھتا ہے تو اسے زیادہ سے زیادہ پچاس ساٹھ لوگ پڑھتے ہیں، جب کہ اس کے مقابلے پر فلموں میں کام کرنے والوں کو ان کے فن کی داد لاکھوں اور کروڑوں عوام سے ملتی ہے۔ پاکستانی ترقی پسندوں کو اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے، بشرطیکہ سنجیدہ ہونے اور غور کرنے کی انھیں فرصت ہو۔

(۲۱ مارچ ۱۹۸۶ء)

☆............☆............☆

اقبال اور ٹنڈو آدم

علامہ اقبال کا انتقال تو ایک ہی مرتبہ ۲۱ر اپریل کو ہوا تھا، مگر ان کے نام جیسے عقیدت مندوں کو ہر سال کئی کئی مرتبہ اس مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہ سانحہ بار بار اس لیے پیش آتا ہے کہ سارا سال علامہ کے بارے میں ایسے ایسے مضامین اور کتابیں چھپتی رہتی ہیں کہ جنھیں دیکھ کر خیال آتا ہے کہ آخر علامہ سے ایسی کون سی غلطی ہوگئی تھی، جس کی انھیں سزا مل رہی ہے۔ ان مضامین اور کتابوں سے، مانا کہ لکھنے والوں کو شہرت ملتی ہے، لیکن یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ علامہ کی شہرت اور ان کے عقیدت مندوں کی صحت خراب ہو رہی ہے۔

اب تک علامہ اقبال کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا وزن بلا مبالغہ کئی ہزار من ہوگا اور اگر اس میں لکھنے والوں کی غلطیوں اور غلط کاریوں کا وزن بھی شامل کرلیا جائے تو صورت حال خاصی تشویش ناک ہو جاتی ہے۔

اس طومار نویسی اور بسیار نگاری کا سبب یہ ہے کہ اقبال پر مضمون لکھنے اور کتاب بنانے کے ایسے سانچے ایجاد ہو گئے ہیں کہ بغیر کسی زحمت کے، حتیٰ کہ سوچے سمجھے بغیر بھی کام چل جاتا ہے۔ ایک طرف سے ان سانچوں میں علامہ اقبال کے شعر ڈالے جاتے ہیں اور دوسری طرف سے مطلوبہ ضخامت کا مضمون یا کتب برآمد ہو جاتی ہے۔ مثلاً اگر آپ کو ''اقبال اور شاہین'' کے موضوع پر مضمون لکھنا ہے تو کلیات اقبال کا اشاریہ دیکھ کر ان تمام شعروں کو یکجا کر لیجیے، جن میں شاہین کا ذکر آیا ہے۔ شعروں کے درمیان نثر کے ایک ایک دو دو جملے (جو اقبال ہی کے شعروں کا سلیس اردو میں ترجمہ ہوں) درج کرتے چلے جایئے، مضمون تیار ہو جائے گا۔ اگر مضمون کو طویل کرنا مقصود ہو تو شاہین غازی پوری، شاہین مفتی اور امیر اللہ شاہین جیسے شاعروں کی غزلوں کے مقطعے بھی مضمون میں شامل کر لیجیے۔ جب یہ شعرا علامہ اقبال کے شاہین سے تخلص مستعار لے سکتے ہیں تو علامہ کے شاہین کو بھی حق حاصل ہے کہ ان کے مقطعوں کو تضمین فرما

جھپٹ کر ان پر ہاتھ صاف کرے۔

یہ مشہور واقعہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ جب ''اقبال اور بھوپال'' اور ''اقبال اور حیدر آباد'' جیسی کتابوں کی شہرت ہوئی تو ایک صاحب نے ''اقبال اور ٹنڈو آدم'' کے موضوع پر کتاب لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ جب ان صاحب سے یہ کہا گیا کہ علامہ اقبال تو کبھی ٹنڈو آدم گئے ہی نہیں تھے تو پھر آپ اس موضوع پر کتاب کیسے لکھ سکتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا:

''میں اپنی مجوزہ کتاب میں یہی تو ثابت کروں گا کہ علامہ اقبال کبھی ٹنڈو آدم گئے ہی نہیں تھے۔''

یہ تو خیر پرانا لطیفہ تھا، نیا لطیفہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کے حقیقی بھتیجے شیخ اعجاز احمد نے ''مظلوم اقبال'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، جسے پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ اقبال مظلوم تو پہلے ہی تھے، اب مظلوم تر، بلکہ مظلوم ترین ہو گئے ہیں۔ اس کتاب میں بظاہر تو معلومات پیش کی گئی ہیں، لیکن اصل مقصد یہ ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ اقبال قادیانی تھے یا کم از کم قادیانیوں کے خلاف نہیں تھے۔ بقول مصنف، اقبال نے ۱۹۳۵ء میں بعض مخصوص حالات کے تحت قادیانیوں کی مخالفت شروع کی اور انھیں مسلمانوں سے الگ ایک فرقہ قرار دیا۔

شیخ اعجاز احمد لکھتے ہیں:

''ان دنوں تو تعصب کا دور دورہ ہے، لیکن ایک زمانہ آئے گا، جب تعصب کی گھٹا چھٹ جائے گی اور محقق حضرات ضرور اس بات کی چھان بین کریں گے کہ احمدی جماعت ...... ۳۵ء میں ایکا ایکی کیوں علامہ کی رائے میں دائرۂ اسلام سے یکسر خارج ہوگئی۔ ایسی تحقیق کے نتیجے میں انھیں معلوم ہوگا کہ احمدیت کے متعلق علامہ کی رت میں تبدیلی ...... کی وجہ کانگریس احرار سازش کے تحت احرار کا دباؤ اور ان کی ریشہ دوانیاں تھیں۔ سازشیوں کی خوش قسمتی سے انھیں دنوں ایک ذاتی معاملے میں علامہ کا احساس محرومی بھی شامل ہو گیا، جس کی وجہ سے احمدیت کے خلاف ان کے بیانات میں وہ شدت اور تلخی در آئی، جو عام طور پر ان کے شیوہ کے مطابق نہ تھی۔'' (صفحہ ۱۹۹)

شیخ اعجاز احمد نے اقبال کے جس احساس محرومی کا ذکر کیا ہے، اس کی تفصیل انھوں نے یہ بتائی ہے کہ اقبال، وائسرائے ہند کی ایگزیکٹو کونسل کی رکنیت کے امیدوار تھے۔ وزیر ہند نے چودھری سر ظفر اللہ کا تقرر کر دیا، اقبال کو بہت غصہ آیا۔ وزیر ہند پر تو وہ اپنا غصہ اتار نہیں سکتے تھے، لہٰذا چودھری سر ظفر اللہ کے قادیانی ہونے کی بنا پر قادیانیوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ مارو گھٹنا، پھوٹے آنکھ! شاید ایسے ہی موقعوں پر کہا جاتا۔ دوسرے لفظوں میں شیخ اعجاز احمد یہ فرما رہے ہیں کہ اقبال قادیانیوں کے عقاید کی وجہ

سے ان کے خلاف نہیں ہوئے، بلکہ اپنی ایک ذاتی محرومی کا انتقام لینے کے لیے یہ موقف اختیار کیا۔ یہ بھی لکھا ہے کہ مجلس احرار نے اقبال کو بلیک میل کر کے قادیانیوں کے خلاف لب کشائی پر آمادہ کیا۔ گویا شیخ صاحب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اقبال راسخ العقیدہ نہیں تھے، لیکن دوسروں کے بلیک میل کرنے سے راسخ العقیدہ ہو گئے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے اپنی کتاب "زندہ رود" کی تیسری جلد میں ان باتوں کی بہت عمدگی سے تردید کی ہے، حالاں کہ فضولیات کی تردید کی ضرورت نہیں ہوتی۔ شیخ اعجاز احمد نے اقبال کو قادیانی یا قادیانیت کا ہمدرد ثابت کرنے کے لیے ان کے بعض مصرعوں اور شعروں سے بھی فائدہ اٹھانے کی مضحکہ خیز کوشش کی ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں:

"ان (اقبال) کی بعض تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی روحانی "مصلح موعود" بانی تحریک قادیانیت" کی آمد کے منتظر نہ سہی، لیکن اس کی ضرورت محسوس کرتے تھے اور ایسے مصلح آنے کی خواہش کرتے تھے۔ اصل میں عقل و دل کی کشمکش میں ان کی راتیں ہی نہیں، دن بھی گزرتے تھے۔" (صفحہ ۱۹۱)

اس دعوے کے ثبوت میں شیخ صاحب نے اقبال کا یہ مصرع پیش کیا ہے:

اسی کشمکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں

معلوم ہوتا ہے کہ دوسرا مصرع شیخ صاحب کی نظر سے نہیں گزرا، ورنہ وہ اقبال کے ساتھ ساتھ رومی و رازی کو بھی اپنا ہم عقیدہ ثابت کر سکتے تھے۔

شیخ صاحب نے کتاب میں اپنے مذہب کی جو تبلیغ کی ہے، اس کا ایک آدھ نمونہ بھی دیکھ لیجیے اور داد دیجیے کہ انھوں نے اقبال کے شعروں سے کیا فائدہ اٹھایا ہے:

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے، وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

علامہ کی وفات کے بعد ایک نہیں کئی صحرائی شیر "ہوشیار" ہوئے ہیں، لیکن اس زمانے کی سلطنت روما (امریکہ) کو الٹنے کی بجائے فی الحال تو ایک دوسرے کی سلطنت کو الٹنے کی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ احیائے اسلام کا کام اس "خیر الماکرین" نے شاید شیروں کی بجائے اب کسی "مور ناتواں" سے لینے کا منصوبہ بنایا ہو، جسے آج کل ہر طرف سے کچلنے کی کوششیں ہو رہی ہیں، لیکن خود علامہ نے فرمایا ہے:

سفینۂ برگ گل بنا لے گا قافلہ مور ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش، مگر یہ دریا کے پار ہوگا

(صفحہ ۱۵۶)

اس کتاب کا ایک باب "شکوہ جور و جفا" بہت دلچسپ ہے۔ اس باب میں مصنف نے بتایا ہے کہ اپنوں اور غیروں نے علامہ اقبال پر کیا کیا مظالم کیے۔ سب سے پہلا ظلم تو اقبال کے والدین نے کیا کہ کم عمری میں ان کی شادی کر دی، جس کے نتیجے میں وہ خاصے پریشان رہے۔ دوسرا ظلم حالات نے کیا کہ لندن کے دوران قیام میں اقبال اس "گل" کو حاصل نہ کر سکے، جس کی یاد انھیں زندگی بھر تڑپاتی رہی۔ اس سلسلے میں مصنف نے دو خواتین کے نام بھی لیے ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کے لیے علامہ اقبال بے قرار تھے۔ شیخ اعجاز احمد کی سعادت مندی سے توقع تھی کہ وہ اپنے عم محترم کی "بے قراریوں" کی داستان اسی تفصیل سے لکھیں گے، جس تفصیل سے انھوں نے قادیانیت والے مسئلے پر لکھا تھا، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے کوئی "تبلیغی" مقصد حاصل ہونے کی امید نہ تھی، اس لیے اس لذیذ داستان کو مختصر کر دیا۔

شیخ اعجاز احمد نے اقبال پر ظلم کرنے والوں میں اپنے آپ کو شمار کیا ہے، فرماتے ہیں:

"۱۹۲۴ء کی آخری سہ ماہی میں علامہ نے راقم الحروف کے پنجاب کی جوڈیشل سروس میں لیے جانے کے سلسلے میں جو کوشش کی، اس میں سر شادی لال سے سفارش بھی شامل تھی۔ ان کی کوشش کامیاب رہی۔ ان دنوں تو نہیں، لیکن جلد ہی مجھے یقین ہو گیا کہ یہ بھی شادی لال کی ایک چال تھی۔ انھیں معلوم تھا کہ اگلے سال ہائی کورٹ میں ایک مسلم جج کی جگہ خالی ہونے والی ہے۔ اس نے علامہ کو اس سے محروم رکھنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ اس لیے علامہ کی سفارش پر ان کے ایک عزیز کو سب جج مقرر کر کے یہ ظاہر کیا کہ انھیں علامہ سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں۔ راقم الحروف کے لیے ابھی تک یہ احساس ندامت سوہان روح ہے کہ اس کے لیے علامہ نے شادی لال ایسے شخص سے "مومیائی" مانگی پڑی۔ راقم الحروف کو بھی علامہ پر ظلم کرنے والوں کی فہرست میں شامل سمجھنا چاہیے۔" (صفحہ ۳۳۹)

شیخ صاحب نے یہ واقعہ بیان کرتے ذرا تکلف سے کام لیا ہے، حالاں کہ علامہ اقبال پر ظلم کرنے والوں میں شامل ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ شیخ صاحب نے "مظلوم اقبال" جیسی کتاب لکھی ہے۔

(۲۸/مارچ ۱۹۸۶ء)

☆..........☆..........☆

منشی نہیں، بالتشدید منشی

حق مغفرت کرے، ایک بزرگ تھے، منشی محمد امین زبیری۔ ۱۸۷۲ء میں نینی تال میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۸ء میں کراچی میں اللہ کو پیارے ہوئے۔ عملی زندگی کا آغاز بمبئی کے مشہور حاجی ملا غلام حسین بوہرہ کی دکان سے کیا، جہاں وہ ملا صاحب کے کاروبار کا حساب کتاب لکھتے تھے۔ لکھنے کے اس شوق نے اس حد تک ترقی کی کہ وہ بھوپال جا کر باقاعدہ مصنف بن گئے۔ بمبئی میں حساب کتاب لکھتے تھے، بھوپال میں بے حساب لکھنے لگے۔ وہ اس طرح کہ بھوپال کے حکمران خاندان کی ملازمت اختیار کرلی۔ اس خاندان کے کئی افراد کی سوانح عمریاں لکھیں، جو فنِ سوانح نگاری سے نہیں، فرائضِ منصبی سے تعلق رکھتی تھیں۔ پھر انھوں نے بعض قومی مشاہیر کے وارثوں سے "معاملہ" طے کرکے ان کو سوانح عمریاں لکھیں اور جو مواد بھی ہاتھ لگا، اسے کتابی صورت میں شایع کردیا۔ یہ سب جمع و ترتیب کے کام تھے اور وہ بھی صحافیانہ نوعیت کے۔ علمی حلقوں میں منشی صاحب کو وہ مقام نہ مل سکا، جس کے وہ خواہاں تھے، لہٰذا انھوں نے سوچا کہ کوئی ایسا کام کرنا چاہیے، جو دنیا میں یادگار رہے۔ انھیں معلوم تھا کہ کسی زمانے میں علامہ شبلی نعمانی اور عطیہ بیگم فیضی میں خط و کتابت تھی، انھوں نے شبلی کے خطوط عطیہ بیگم سے حاصل کیے اور شایع کردیے اور پھر عطیہ بیگم سے ایک مضمون بھی لکھوایا، جس میں مولانا شبلی کی کردار کشی کی گئی تھی۔ مولانا شبلی نے جو خط لکھے تھے، ان میں سے بیشتر عطیہ بیگم کے خطوں کے جواب میں تھے، اس کے باوجود عطیہ بیگم نے اپنے آپ کو "معصوم" ثابت کرنے کی کوشش کی اور اپنے مضمون کے آخر میں بعض ایسے نازیبا الفاظ لکھے، جن سے علامہ شبلی کی سخت توہین ہوتی تھی۔

منشی محمد امین زبیری کی خواہش کے مطابق اس مجموعۂ مکاتیب کی بہت شہرت ہوئی۔ اس سے ان کا حوصلہ بڑھا۔ جب سید سلیمان ندویؒ کی "حیات شبلی" شایع ہوئی تو منشی صاحب نے اس پر ایک نہایت زہریلا تبصرہ لکھا، جو کتابی صورت میں شایع ہوا۔ اس میں علامہ شبلی کی "رنگین زندگی" کی تفصیلات پیش کی

گئی تھیں۔ پہلے "رنگین زندگی" سے صرف عطیہ بیگم کا تعلق تھا، مگر اب کے منشی صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی عطیہ بیگم کی سطح پر لا کھڑا کیا۔ اس بدتہذیبی پر پورے ہندوستان کے عالموں اور ادیبوں نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے تو یہاں تک لکھا کہ:

> "منشی محمد امین صاحب اس کتاب کے بعد ...... کسی مہذب سوسائٹی اور جماعت میں شریک ہونے کے قابل نہیں رہے۔"

لیکن سب سے دلچسپ تبصرہ سید ہاشمی فرید آبادی کا تھا۔ انھوں نے کہا:

> "منشی صاحب علامہ شبلی کے بارے میں بہت متشدد ہیں، اس لیے انھیں منشی نہیں، بالتشدید منشی کہنا چاہیے۔"

منشی صاحب اپنے اس کارنامے پر بے حد خوش تھے کہ انھوں نے "سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم" کے مصنف کی شخصیت کو داغدار کردیا، لیکن یہ محض ان کی خوش فہمی تھی۔ علامہ شبلی کے احترام میں کوئی کمی نہ آئی اور عطیہ بیگم کے نام ان کے خطوں کو ایک صاحب طرز ادیب اور شاعر کی خوش طبعی کے اظہار سے زیادہ اہمیت نہ دی گئی۔ ہاں، منشی صاحب کو یہ فائدہ ہوا کہ "حیات شبلی" پر تبصرہ شایع کرکے وہ ملک گیر شہرت کے مالک ہوگئے، ورنہ پہلے ان کو بھوپال سے باہر کوئی نہ جانتا تھا اور اگر جانتا بھی تھا تو ریاستی وقایع نویس کی حیثیت سے۔

پاکستان آنے کے بعد منشی صاحب نے "حیات شبلی" پر اپنا تبصرہ ازسرِنو لکھا اور اسے "شبلی کی رنگین زندگی" کے نام سے ۱۹۵۲ء میں کتابی صورت میں چھپوایا۔ اب کے انھوں نے اس میں عطیہ بیگم اور مولانا ابوالکلام آزاد کی جوانی کے زمانے کی تصویریں بھی کتاب میں شایع کیں، لیکن اس مرتبہ کتاب کو کسی نے اہمیت نہ دی، بلکہ اس پر افسوس کا اظہار کیا گیا کہ منشی محمد امین زبیری نے علامہ شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسی بلند مرتبہ شخصیتوں پر کیچڑ اچھالنے کو اپنا مقصدِ حیات بنا رکھا ہے۔ منشی صاحب کا خیال تھا کہ یہ کتاب خوب بکے گی، لیکن اسے کسی نے نہ پوچھا۔ سارا اسٹاک بالآخر دیمک کی نذر ہوگیا۔

اس صورتِ حال سے منشی صاحب بددل تو ہوئے، لیکن ہمت نہ ہاری۔ انھوں نے طے کیا کہ اب کسی ایسی شخصیت کی کردار کشی کرنی چاہیے، جس سے عام لوگوں کو بے پناہ عقیدت ہو۔ یہ سوچ کر انھوں نے علامہ اقبال کے "بت" کو پاش پاش کرنے کا منصوبہ بنایا۔ تین چار برس کی "محنت" کے بعد انھوں نے ۱۹۵۵ء میں ایک کتاب لکھی، جس کا تاریخی نام (۱۳۷۵ھ) "خدوخالِ اقبال" رکھا گیا۔

منشی صاحب اپنی اس کتاب کو ایک بہت بڑا "علمی" کارنامہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کتاب چھپتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک جائے گی اور "شبلی کی رنگین زندگی" چھاپ کر جو خسارہ ہوا تھا، وہ بھی پورا ہوجائے گا۔ منشی صاحب کی مالی حالت ان دنوں خاصی سقیم تھی، اس لیے انھوں نے کتاب کی اشاعت کے لیے

بہت کوشش کی۔ کئی ناشروں اور صاحبانِ ثروت کو شیشے میں اتارنا چاہا، لیکن جو بھی کتاب کا مسودہ دیکھتا، اس کی غیر علمی اور غیر سنجیدہ نوعیت کی بنا پر اسے شائع کرنے پر آمادہ نہ ہوتا تھا۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر منشی صاحب کو اپنی "محنت" کے ضائع جانے کا بے حد ملال ہوا، لیکن اس کے ساتھ ہی انھیں یہ خیال آیا کہ کتاب کی اشاعت سے نہ سہی، عدمِ اشاعت ہی سے فائدہ اٹھایا جائے۔ انھوں نے علامہ اقبال کے ایک عقیدت مند کو، جو ایک بڑے سرکاری عہدے دار تھے، یہ پیغام بھجوایا کہ تمہارے ممدوح کے خلاف ایک نہایت خطرناک کتاب شائع ہونے والی ہے، اگر تم علامہ کو دائمی رسوائی سے بچانا چاہتے ہو تو مصنف سے اس کا مسودہ خرید لو۔ سرکاری عہدے دار شریف آدمی تھے، انھوں نے سوچا کتاب چھپے گی تو بدمزگی پیدا ہوگی، انھوں نے شر کا راستہ بند کرنے کے خیال سے مسودہ خرید لیا۔

لیکن منشی صاحب کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ انھوں نے مسودے کی کئی نقلیں تیار کر رکھی تھیں۔ ان میں سے ایک سرکاری عہدے دار کو دے دی۔ وہ مطمئن ہو گئے کہ معاملہ ختم ہو گیا۔ ادھر منشی صاحب نے اپنی کتاب کو کسی غیر ملک، خصوصاً بھارت میں چھپوانے کی کوشش کی کہ یہاں نہیں تو وہاں چھپ جائے، لیکن وہاں بھی اس "کارِ فضول" کی اشاعت پر کوئی راضی نہ ہوا۔

یہ کتاب پورے ۳۱ برس تک پردۂ اخفا میں رہی اور اب بالآخر شائع ہو گئی۔ اس کی دریافت و اشاعت کا سہرا جناب خسروی کے سر ہے۔ یہ جناب خسروی وہی ہیں، جن کی مکتوب نگاری کی پورے ملک میں دھوم ہے۔ شاید ہی کوئی رسالہ یا اخبار ہوگا، جس کے مدیر کے نام انھوں نے خطوط نہ لکھے ہوں۔ ادیبوں شاعروں سے مراسلت بھی ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ شعر و شاعری سے بھی دلچسپی ہے۔ ان کا مزاحیہ کلام "اردو پنچ" میں ہماری نظر سے گزرا ہے۔ "خدوخالِ اقبال" کا مسودہ انھوں نے بڑی محنت اور تگ و دو سے حاصل کیا ہے اور زرِ کثیر صرف کر کے اسے شائع کیا ہے۔ جناب ناشر کتاب کے دیباچے میں تحریر فرماتے ہیں:

"یہ (کتاب) محض ان مخصوص مجاورانِ اقبال کی "می پراتنڈ" کی تردید ہے، جو اقبال کی قبر پر چڑھ کر اپنے قد کی بلندی کی مدعی ہیں اور محض اپنی مجاورت کی اہمیت و عظمت کے اظہار کے لیے اسے ہر قولی و فعلی و علمی و فکری بشری خامی سے معصوم "تیرہواں امام" ثابت کرنے کے لیے اپنی ساری علمی و ادبی، ذہنی و قلمی صلاحیتیں صرف کیے جا رہے ہیں۔ یہ بزعم خویش ماہرینِ اقبالیات اس مجاورانہ گُر کو خوب سمجھتے ہیں کہ کسی چھوٹے موٹے پیر کے مزار کے جاروب کشوں کی وہ توقیر نہیں ہوتی، جو کسی بڑی درگاہ کے مجاوروں کی ہوتی ہے اور پھر کیوں کہ اقبال کو ایوان ہائے حکومت میں بھی کرشمۂ قدرت سے ایک مقامِ رفیع حاصل ہے، لہٰذا اس کی قصیدہ خوانی اور مداح سرائی سے (چاہے کیسی ہی مضحک ہو) مادّی منفعت اندوزی

بھی کی جا سکتی ہے۔ ایسے ہی نام نہاد اقبال شناسوں، دراصل اقبال فروشوں کے خلاف زبیری مرحوم نے قلم اٹھایا تھا اور دستاویزی شہادتوں سے ثابت کیا ہے کہ علامہ اپنے عہد کے اور ایک جہت خاص میں نابغہ بے شک تھے، مگر دیگر جہات آدمیت میں ان کمزوریوں سے مبرا و منزہ نہیں تھے، جو بشریت کے لوازمات ہیں۔"

مجاورانِ اقبال تو اقبال کی قبر پر چڑھتے تھے، لیکن جناب مصنف اور ناشر نے تو اقبال کے سر پر چڑھنے کی کوشش کر ڈالی ہے۔ جناب ناشر نے مادّی منفعت اندوزی والی بات بالکل ٹھیک لکھی ہے۔ اس کی تائید زیرِ تبصرہ کتاب سے بھی ہوتی ہے۔ ۱۷۵ صفحوں کی کتاب کی قیمت صرف ۵۵ روپے ہے۔

منشی امین زبیری نے، بقول ناشر، یہ کتاب مجاورانِ اقبال کو راہِ راست پر لانے کے لیے لکھی تھی، لیکن اصل مقصد خود علامہ اقبال کو راہِ راست پر لانا ہے۔ اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ اقبال اچھے کردار کے آدمی نہیں تھے۔ جس فقر کی وہ تلقین کرتے تھے، خود اس پر عمل نہیں کرتے تھے۔ اہلِ ثروت کی مدح کر کے مادّی فوائد حاصل کرتے تھے۔ ۲۵۔ ۳۰ ہزار روپے صرف کر کے جاوید منزل تعمیر کر ڈالی، حالاں کہ اس رقم میں وہ کئی بار حج کر سکتے تھے۔ حیدرآباد دکن میں ملازمت کے لیے کوشش کرتے رہے۔ اسلام پر ایک کتاب لکھنے کا وعدہ کر کے ریاست بھوپال سے وظیفہ جاری کرایا، لیکن کتاب نہیں لکھی۔ وہ اپنی تصانیف کا معاوضہ وصول کرتے تھے، انھیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ دو مرتبہ گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گئے، لیکن ایک مرتبہ بھی وہاں کی ووکنگ مسجد میں جانے کی زحمت گوارا نہ کی۔ ۱۹۲۹ء میں انھوں نے افغانستان کی مدد کے لیے ایک فنڈ کھولا تھا، لیکن یہ معلوم نہ ہوا، رقم کہاں گئی۔ انھیں علی گڑھ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، لیکن معاوضہ لے کر لیکچر دینے چلے گئے۔ وہ کشمیری الاصل تھے، لیکن انھوں نے کشمیری مسلمانوں کے لیے کچھ نہ کیا۔ انھوں نے عطیہ بیگم کو ایسے خط لکھے، جو کسی کو دکھانے کے قابل نہیں۔ پہلی بیوی کی موجودگی میں دوسری اور دونوں کی موجودگی میں تیسری شادی کی۔ انھیں مسلمانوں کے مسائل سے عملی دلچسپی نہیں تھی، جس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے فلسطین سے متعلق کسی جلسے میں شرکت نہیں کی۔ گھر میں بیٹھ کر شاعری کرتے رہے۔ تصورِ پاکستان سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا، اسے بلاوجہ ان سے منسوب کر دیا گیا ہے۔

ان امور سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ منشی صاحب نے اقبال کا بت کس طرح پاش پاش کیا ہے۔ ان کا اندازِ استدلال بھی ایسا ہے کہ پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

"اقبال کے بڑے بھائی اوورسیر تھے اور انھوں نے کافی روپیہ کمایا تھا۔ تعجب ہے کہ (اقبال کی) والدہ نہایت متقی تھیں، لیکن فرزند (اقبال کے بڑے بھائی) پر کوئی اثر نہ تھا اور یہی روپیہ علامہ کی تعلیم پر صرف ہوا۔"

گویا منشی صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اقبال کے بڑے بھائی کی آمدنی ناجائز تھی اور اسی ناجائز آمدنی سے اقبال نے تعلیم حاصل کی۔ جناب ناشر کا دعویٰ ہے کہ مصنف نے سب کچھ دستاویزی شہادتوں سے ثابت کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دستاویزی شہادتیں سہو کاتب سے کتاب میں شامل ہونے سے رہ گئیں۔

کتاب کے آخر میں تین صفحے کا غلط نامہ ملتا ہے۔ معلوم نہیں، اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ جب پوری کتاب ہی غلط نامہ ہو تو مزید تین صفحے ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔

بہرحال ہمیں جناب ناشر کا ممنون ہونا چاہیے کہ ان کے ذریعے ہمیں ایک مزاحیہ کتاب پڑھنے کا موقع ملا۔

(۳۰ مئی ۱۹۸۶ء)

☆..........☆..........☆

اہانتِ مصنّفین کا سرکاری ادارہ

ہمارے ملک میں علم و ادب کے فروغ اور ادیبوں کی فلاح و بہبود کے لیے جو سرکاری ادارے موجود ہیں، ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہے، کیوں کہ عموماً یہ ادارے قایم تو اعلیٰ مقاصد کے لیے کیے جاتے ہیں، لیکن عملاً ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ بعض پسندیدہ شخصیتوں کو روزگار فراہم کر دیا جائے۔ ایک ایسا ہی ادارہ نیشنل بک کونسل بھی ہے، جس کا مقصد ملک میں کتاب شناسی کی فضا عام کرنا ہے، لیکن عملاً یہ ادارہ چند مخصوص افراد کے لیے دفتر روزگار بن کر رہ گیا ہے۔ اس ادارے کے اغراض و مقاصد کی تفصیلات آپ ان صفحات میں کسی دوسری جگہ ملاحظہ فرمایئے۔ بلند بانگ دعوے کیے گئے ہیں، لیکن گزشتہ ۲۰، ۲۲ برسوں میں کسی ایک جہت میں بھی کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ اس کونسل نے مصنّفین کی ایک ڈائرکٹری شایع کی تھی، جو غلط معلومات کا مجموعہ تھی۔ جب اخباروں میں اس پر لے دے ہوئی تو اس ڈائرکٹری کی فروخت روک دی گئی۔ کچھ عرصہ ہوا، اس ادارے نے ایک ریڈرز کلب قایم کیا تھا، جس کا مقصد یہ تھا کہ عام قارئین کو رعایتی نرخوں پر کتابیں فراہم کی جائیں۔ اصل صورت حال یہ ہے کہ اراکین کو ان کی پسند کی کتابیں فراہم نہیں کی جاتیں۔ اس سلسلے میں اخبارات میں متعدد مراسلے شایع ہو چکے ہیں۔

اس ادارے نے بس ایک ہی ڈھنگ کا کام کیا ہے اور وہ ہے ماہنامہ ''کتاب'' کی اشاعت۔ یہ ایک اچھا رسالہ ہے، جس میں کتابی دنیا سے متعلق خاصا مفید مواد شایع ہوتا ہے۔ اس رسالے کے معیاری ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس کے مدیر ذوالفقار احمد تابش ہیں، جو ذاتی دلچسپی لے کر نہایت محنت اور توجہ سے اسے مرتب کرتے ہیں، لیکن اس رسالے کا المیہ یہ ہے کہ اسے فروخت کے لیے عام مارکیٹ میں نہیں دیا جاتا۔ کم از کم کراچی میں ہم نے اسے کسی دکان پر نہیں دیکھا۔ اس رسالے سے استفادے کا دائرہ محدود، بلکہ معدوم ہے۔

نیشنل بک کونسل کا تازہ ترین کارنامہ یہ ہے کہ اس نے مصنّفین کی حوصلہ افزائی کا ایک منصوبہ بنایا

ہے۔ گزشتہ سال اخبارات میں مندرجہ ذیل اشتہار شائع کیا گیا:

مصنفین اور ناشرین کی حوصلہ افزائی

وزارت تعلیم حکومت پاکستان نے مصنفین کی حوصلہ افزائی کے لیے طبع زاد مسودات کے حصول کا ایک منصوبہ بنایا ہے۔ ماہرین کی کمیٹیاں مسودات کا انتخاب کریں گی۔ مصنفین مسودات کے چھپوانے کا اہتمام خود کریں گے۔ مصنف اور ناشر دونوں کو مالی نقصان سے محفوظ رکھنے کے لیے نیشنل بک کونسل کتاب کی اشاعت پر ۵۰۰ جلدیں طے شدہ قیمت پر خریدنے کی ضمانت فراہم کرے گا۔

☆ مسودات انگریزی یا اُردو زبان میں لکھے ہوئے ہوں۔

☆ موضوعات کا تعلق سائنس، تعلیم، معاشیات، ادبی نثر و دیگر مفید علوم سے ہونا چاہیے۔

☆ ٹیکسٹ بکس اور شائع شدہ کتابیں اس سکیم میں شامل نہیں۔

☆ مصنفین اپنے مسودات کی نقل ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۵ء تک زیر دستخطی کو بھجوا دیں۔

ڈائریکٹر جنرل، نیشنل بک کونسل آف پاکستان

۱۳ ۔ ڈی بلاک ڈی، امرتز ایف ۸، ایوب مارکیٹ، اسلام آباد

فون:..... ۸۵۳۵۸۱

یہ اشتہار ملک کے تمام اخبارات میں متعدد مرتبہ شائع ہوا۔ اتنے بڑے پیمانے پر اس منصوبے کی تشہیر سے یہ امید بندھی تھی کہ اب کے نیشنل بک کونسل ضرور کچھ کر گزرے گی۔ اس منصوبے کو ملک بھر میں پسند کیا گیا اور بہت سے مصنفین نے اپنے مسودے کونسل کو بھیجے۔ تازہ ترین اطلاعات کے مطابق کونسل نے مصنفین کی حوصلہ افزائی کے نام پر حوصلہ شکنی کا آغاز کر دیا ہے۔ کراچی کے کئی ممتاز مصنفین کے مسودے "ناقابل اشاعت" قرار دے کر سات آٹھ ماہ بعد واپس کر دیے گئے ہیں۔ ان "اعزاز یافتہ" مصنفین میں ڈاکٹر سہیل بخاری بھی شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے نام پر جو حوصلہ شکن اور توہین آمیز خط موصول ہوا ہے، اس کا عکس بھی مطالعے، بلکہ عبرت کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ (عکس کالم کے آخر میں دیا جا رہا ہے۔ مرتب)

شاید نیشنل بک کونسل والوں کو علم نہیں ہے کہ ڈاکٹر سہیل بخاری کس درجے کے ادیب ہیں اور انھوں نے اپنی جس کتاب کا مسودہ بھیجا تھا، وہ کس پائے کی ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری پاکستان کے ان بزرگ صاحبان علم و تحقیق میں سے ہیں، جنھوں نے ایک درجن سے زیادہ علمی و ادبی اور تحقیقی کتابیں لکھی ہیں، جو علمی و ادبی حلقوں میں مقبول ہیں۔ وہ پاکستان کے واحد ماہر لسانیات ہیں، جنھوں نے تشریحی اور تاریخی لسانیات پر مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ اردو کا واحد اشتقاقی لغت انھیں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ غالب اور اقبال پر ان کی دو کتابیں، ان موضوعات پر مستقل اضافے کا درجہ رکھتی ہیں۔ ناول نگاری کی تاریخ و

تنقید پر ان کی کتاب کو درجۂ استناد حاصل ہے۔ اتنے متنوع موضوعات پر ایسی علمی کتابیں تصنیف کرنے والے اہل علم ہمارے ملک میں دو چار ہی ہوں گے۔

ڈاکٹر سہیل بخاری کے جس مسودے کو نیشنل بک کونسل نے یہ کہہ کر ناقابل اشاعت قرار دیا ہے کہ وہ دوسرے موصولہ مسودات کے مقابلے پر کمتر اہمیت کا حامل ہے، اس کے بارے میں عرض ہے کہ یہ ڈاکٹر صاحب کا پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ ہے، جس کا عنوان ہے۔ "اردو کی نثری داستانوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ"۔ اس پر انھیں پنجاب یونیورسٹی نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی تھی۔ یہ مقالہ کس درجے کا ہے، اس کا اندازہ اس سے کیجیے کہ اس کے ایک ممتحن مشہور ہندوستانی محقق ڈاکٹر گیان چند تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب "اردو کی نثری داستانیں" کے دوسرے ایڈیشن میں اس سے استفادہ کیا ہے اور دیباچے میں اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ یہی نہیں، ڈاکٹر گیان چند نے اپنی ایک دوسری کتاب "ذکر و فکر" میں اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے کہ ڈاکٹر سہیل بخاری کا مقالہ، جو داستانوں کی تحقیق میں نہایت اہم معلومات کا حامل ہے، اب تک شائع کیوں نہیں ہوا۔ اب ڈاکٹر گیان چند کو کون بتائے کہ پاکستان کے نام نہاد علمی و ادبی ادارے یار جواڑے نہیں چاہتے کہ یہ بلند پایہ کتاب شائع ہو۔

نیشنل بک کونسل نے ڈاکٹر سہیل بخاری کے مسودے کو مسترد کر کے ایک بزرگ ادیب ہی کی نہیں، علم کی توہین کی ہے اور یہ مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے۔ نیشنل بک کونسل وفاقی وزارت تعلیم کا ایک ہی ادارہ ہے، اس لیے ہم وزیر تعلیم سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ

(۱) بتایا جائے کہ ڈاکٹر سہیل بخاری کا مسودہ کن کن وجوہ کی بنا پر مسترد کیا گیا ہے۔

(۲) ڈاکٹر صاحب کے مقابلے پر جن مسودات کو ترجیح دی گئی ہے، ان کی تفصیلات عام کی جائیں، تاکہ اندازہ کیا جا سکے کہ انتخاب کا معیار کیا ہے۔

(۳) نیشنل بک کونسل نے تمام "مسودات" ماہرین کی رائے کے لیے بھیجے تھے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری کا مسودہ بھی کس ماہر کو بھیجا گیا تھا، اس کی رائے ظاہر کی جائے۔ (ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ کوئی پڑھا لکھا شخص اس مقالے کے خلاف رائے نہیں دے سکتا۔)

(۴) بتایا جائے کہ وہ کون لوگ ہیں، جنھوں نے مسودوں کے آخری انتخاب کا فیصلہ کیا اور ان کی علمی و ادبی حیثیت کیا ہے؟

افسوس کہ نیشنل بک کونسل نے لاکھوں روپے اشتہار بازی پر صرف کر دیے۔ اتنی رقم سے تو درجنوں کتابوں کی اشاعت عمل میں آ سکتی ہے۔

(۶ر جون ۱۹۸۶ء)

عکس

National Book Council of Pakistan

1st Floor Block 14-D Al-Markaz F-8 Ayub Market, Islamabad

No.F.1-4/DSWP/86 19 May, 1986.

SUBJECT: ENCOURAGEMENT & SUPPORT TO CREATIVE PAKISTANI PUBLICATIONS

Dear Sir/Madam,

Your Manuscript entitled-------------------------------------- received and reviewed by the expert committee. It is regretted that the manuscript could not successfully compete with other entries. Your effort is however appreciated. Manuscript enclosed. With regards.

سہیل بخاری

215-A, Block-J
N' Nazimabad
Karachi

Yours Faithfully,

(Fida Hussain Khokhar)
Deputy Director

☆..........☆..........☆

بڑے باپ کے چھوٹے بیٹے

جناب صادق الخیری سدا بہار ادیب ہیں۔ ۴۵ برسوں سے وہ ادبی دنیا پر چھائے ہوئے ہیں۔ ان کے پڑھنے والے پڑھتے پڑھتے بوڑھے ہو گئے، مگر چشم بددور، وہ جوانوں کی سی مستعدی سے اپنے کام میں مصروف ہیں۔ وہ خوش قسمت ہیں کہ کسی ناشر کے محتاج نہیں، خود ہی لکھتے ہیں اور خود ہی چھاپتے ہیں۔ اسی لیے ان کی کتابیں باطنی حسن کے ساتھ ساتھ ظاہری حسن بھی رکھتی ہیں۔ ہر چھٹے مہینے نہیں تو ہر سال ضرور وہ ایک کتاب چھاپ دیتے ہیں۔ یہ کتابیں عید کارڈوں کی طرح تقسیم ہو کر اہل نظر کو مسرت عطا کرتی ہیں۔

صادق الخیری علامہ راشد الخیری کے صاحبزادے ہیں۔ بڑے باپ کے چھوٹے بیٹے۔ یعنی مولانا صادق الخیری بڑے بھائی تھے اور وہ چھوٹے ہیں۔ اسی وجہ سے معیاری اور ٹکسالی اردو لکھنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ وہ دائیں ہاتھ سے اُردو لکھتے تو خدا جانے کیا قیامت ڈھاتے۔ میر امن کی طرح صادق الخیری کو بھی اردو کا روڑا کہا جا سکتا ہے، لیکن وہ آج کل جناب صہبا لکھنوی کے راستے کا روڑا، بلکہ پتھر بننے کی کوشش فرما رہے ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ روزنامہ "جسارت" کراچی کی ایک حالیہ اشاعت میں صہبا لکھنوی کے نام ان کا ایک خط شائع ہوا ہے۔ خط کیا ہے، اچھی خاصی فردِ جرم ہے۔

ہم پہلے بھی کئی مرتبہ لکھ چکے ہیں، بلکہ اعتراف کر چکے ہیں کہ صہبا لکھنوی کا "افکار" پاکستان کا واحد ادبی اور معیاری رسالہ ہے، جو ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہوتا ہے۔ اس رسالے نے بعض خاص نمبر ایسے شائع کیے ہیں، جو اردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ جناب صہبا کی خواہش ہے کہ ان کے بعد بھی ان کا رسالہ جاری رہے اور ادب کی خدمت کرتا رہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے پہلے ایک لمیٹڈ کمپنی قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا، جس پر تبصرہ کرتے ہوئے ہم نے عرض کیا تھا کہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ "افکار" ایک لمیٹڈ کمپنی کے زیر انتظام چھپے گا، واضح رہے کہ اشاعت کے اعتبار سے یہ پہلے ہی خاصا لمیٹڈ ہے۔ اب صہبا صاحب نے "افکار" کے لیے ایک ٹرسٹ بنا دیا ہے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ صہبا

صاحب تادیر سلامت رہیں اور ان کی نگرانی میں افکار نرست پہلے سے زیادہ ادب کی خدمت کرے۔

جناب صادق الخیری نے اپنے مذکورہ مکتوب بنام صہبا لکھنوی میں لکھا ہے کہ صہبا صاحب کو ''افکار'' کے مستقبل کے بارے میں ضرور سوچنا چاہیے، کیوں کہ جس طرح 'ساقی'، 'ہمایوں'، 'نیرنگ خیال' اور 'زمانہ' اپنے مدیروں کے بعد جاری نہ رہ سکے، اسی طرح صہبا صاحب کے بعد ''افکار'' بھی باقی نہیں رہے گا۔ خیری صاحب کی منطق ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ دنیا میں جو شخص بھی آیا ہے، اسے ایک نہ ایک دن ضرور جانا ہے، اگر کوئی شخص کوئی اچھا کام کر رہا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ یہ کام اس کے بعد بھی جاری رہے تو اس کے لیے کوشش کرنے میں کیا برائی ہے۔ صہبا صاحب سے یہ کہنا کہ وہ ''افکار'' کے مستقبل کے بارے میں نہ سوچیں، ایسا ہی ہے، جیسے کسی سے کہا جائے کہ وہ اپنی اولاد کے مستقبل سے بے نیاز ہو جائے۔

صادق الخیری نے صہبا صاحب کو یہ مشورہ دیا ہے کہ اپنے رسالے کے حال کو بہتر بنائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو اعتراضات کیے ہیں، وہ کچھ اس قسم کے ہیں:

''مجھے شکوہ ہے کہ آپ نے اپنے آپ کو زیادہ تر اشتہارات کے لیے وقف کر رکھا ہے اور وہ محنت، وہ تفکر، وہ تلاش مسلسل اور وہ وقت، جو افکار کو اعلیٰ پائے کا جریدہ بنانے میں صرف ہونا چاہیے، آپ نہیں کرتے۔ سہل انگاری کی انتہا یہ کہ آپ اداریہ بھی خود نہیں لکھتے۔ یہ مہمان مدیر کیا ہوتا ہے..... تبصرے کے باب کا حال یہ ہے کہ آپ خود کتابوں، رسالوں پر رائے زنی نہیں کرتے۔ دوسروں سے لکھواتے ہیں..... آپ اپنے پچھلے بارہ شمارے لیجیے اور بتائیے کہ آپ نے ایک سال میں خود کتنی کتابیں پڑھیں اور کتنی پر اظہار خیال کیا..... چند افسانوں، چند مضامین اور چند نظموں وغیرہ کی ترتیب تو کاتب بھی کر لیتا ہے..... بے شک آپ اشتہارات کے حصول اور انتظامی معاملات کو وقت دیجیے، مگر اولین فرض رسالے کی ادارت ہے، اس کی طرف سے غفلت یا کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔''

حیرت ہے کہ خیری صاحب کو یہ شکایت ہے کہ مدیر ''افکار'' اشتہارات کے حصول پر اتنی توجہ کیوں دیتے ہیں، حالاں کہ خود خیری صاحب ایک اشتہاری ادارے سے منسلک رہ چکے ہیں اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ اشتہار بازی ہی میں گزرا ہے۔ ہم نے اس سلسلے میں جناب صہبا سے وضاحت چاہی تو انھوں نے فرمایا:

''بھائی میں نے تو اپنے رسالے میں اشتہار چھاپنے کا گناہ کیا ہے۔ صادق الخیری تو اپنی تصانیف میں تجارتی اداروں کے اشتہارات شائع کرتے رہے ہیں۔ دراصل ہم دونوں کی توجہ زیادہ تر اشتہارات کے حصول پر رہی، ورنہ میرے رسالے کی طرح ان کی کتابوں کا معیار بھی بہتر ہو سکتا تھا۔''

صہبا صاحب نے مزید فرمایا:

''صادق الخیری نے مجھ پر الزام لگایا ہے کہ میں اپنے رسالے پر محنت نہیں کرتا۔ جتنی محنت میں کرتا ہوں، اتنی تو آج کل کے مصنفین اپنی نام نہاد طبع زاد تصانیف پر بھی نہیں کرتے۔ میری محنت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ صادق الخیری کا خط آج سے ڈیڑھ سال پہلے مجھے ملا تھا۔ میں نے اس کا ایک ایک لفظ پڑھا تھا اور ناقابل اشاعت قرار دے کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا تھا۔ حیرت ہے کہ صادق الخیری ردی کی ٹوکری سے چیزیں نکال کر اپنے نام سے چھپوانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔''

جناب خیری کو اس پر اصرار ہے کہ صہبا صاحب اپنے رسالے کا اداریہ خود لکھیں۔ کل وہ یہ فرمائش کریں گے کہ صہبا صاحب اپنے رسالے کی کتابت بھی خود کریں۔ پرسوں ان کا اصرار ہوگا کہ رسالے کی جلد سازی بھی صہبا صاحب کو خود کرنی چاہیے۔ ہمارے خیال میں اداریہ نویسی، کتابت اور جلد سازی وغیرہ کا رسالے کی ادارت سے کوئی تعلق نہیں۔ ایڈیٹر تو پوسٹ مین ہوتا ہے، جو مصنفین کی نگارشات قارئین تک پہنچا دیتا ہے اور یہ کام جناب صہبا نہایت خوش اسلوبی سے انجام دے رہے ہیں، بلکہ اس بنا پر تو وہ اس کے مستحق ہیں کہ انھیں کراچی کا پوسٹ ماسٹر جنرل بنا دیا جائے۔ جب صادق الخیری صاحب کو یہ شکایت ہوگی کہ ان کی ڈاک گم ہو جاتی ہے یا ان تک وقت پر نہیں پہنچتی۔ شکایتوں کا کیا ہے، ان کا سلسلہ تو کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔

خیری صاحب کو یہ شکایت بھی ہے کہ صہبا صاحب اپنے رسالے میں کتابوں پر تبصرے خود نہیں کرتے۔ ایک ایسے دور میں، جب مصنفین اپنی کتابوں کے ساتھ خود ہی تبصرے لکھ کر ایڈیٹر کو پیش کر دیتے ہیں تو پھر ایڈیٹر کو کیا ضرورت ہے کہ وہ اپنا وقت ضائع کرے۔ بہر حال اگر خیری صاحب کی شکایت کا ازالہ کر دیا گیا تو پھر کوئی شخص یہ شکایت بھی کر سکتا ہے کہ صہبا صاحب تبصروں کی طرح اپنی غزلیں بھی خود کیوں نہیں لکھتے۔ یہ شکایت بھی نامناسب ہوگی، کیوں کہ صہبا صاحب اپنی غزلیں خود ہی لکھتے ہیں۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کی ہر غزل کے مقطع میں ان کا تخلص ہوتا ہے اور دوسرا ثبوت یہ ہے کہ جناب صادق الخیری نے اپنے مذکورہ مکتوب میں جناب صہبا کو مخاطب کر کے لکھا ہے کہ ''آپ خوش فکر شاعر ہیں۔'' ہم اس رائے کی تردید نہیں کریں گے، کیوں کہ اس طرح خیری صاحب کی سخن فہمی خطرے میں پڑ جائے گی، بالکل اسی طرح جس طرح صہبا صاحب کی سخن گوئی کی وجہ سے خود شاعری گونا گوں خطرات کا شکار ہے۔

خیری صاحب نے صہبا صاحب سے پوچھا ہے کہ آپ نے پچھلے ایک سال میں کتنی کتابیں پڑھیں۔ ہمارے خیال میں اس قسم کے ذاتی اور رازدارانہ معاملات میں کسی دوسرے کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ ویسے ہمیں ذاتی طور پر معلوم ہے کہ صہبا صاحب خاصے وسیع المطالعہ ہیں، لیکن ان کے پڑھنے

کی وہ رفتار نہیں، جو صادق الخیری کے لکھنے کی ہے۔ جتنی دیر میں صہبا صاحب ایک کتاب پڑھتے ہیں، اتنی دیر میں خیری صاحب دو کتابیں لکھ دیتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ صہبا صاحب پوری کتاب خود ہی پڑھتے ہیں، جب کہ خیری صاحب کی بعض کتابیں نصف سے زیادہ دوسروں کی تحریر کردہ ہوتی ہیں۔ مثلاً ان کی کتاب ''گنجینۂ گوہر کھلا'' کا نصف سے زیادہ حصہ ادیبوں کے خطوط پر مشتمل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خط دوسروں ہی نے لکھے تھے، نہ کہ خیری صاحب نے۔

ایک زمانے میں مذکورہ دونوں بزرگوں میں بڑے خوش گوار تعلقات تھے۔ ''افکار'' میں صادق الخیری کے بارے میں ایک گوشہ قایم کیا گیا تھا، جس میں ان کی تصویر اور حالاتِ زندگی کے ساتھ تعریفی و توصیفی مضامین بھی شایع کیے گئے تھے۔ معلوم نہیں کہ کیا پیچ پڑا کہ اب یہ دونوں بزرگ ایک دوسرے سے دور ہو گئے ہیں۔ ذرا دیکھیے، ان دونوں میں جو گہرے مراسم تھے، ان کی نوعیت کیا تھی۔ خیری صاحب نے اپنے خط کا آغاز ان جملوں سے کیا ہے:

''پچھلے کسی موقع پر میں نے آپ کو 'افکار' کے لیے ایک چیک بھیجا تھا...... اب ایک دوسرا چیک بھیجتا ہوں، جو محض ''افکار'' کی خدمات کا اعتراف ہے......''

صہبا صاحب سے ہم نے پوچھا کہ یہ چیکوں کا معاملہ کیا ہے۔ اکیڈمی آف لیٹرز سے تو آپ چیک لیتے ہی تھے، صادق الخیری کو بھی آپ نے نہیں چھوڑا۔ انھوں نے جواب دیا:

''بھائی! بات یہ ہے کہ خیری صاحب ''افکار'' کے سالانہ خریدار ہیں۔ چیک بھیج کر وہ ''افکار'' کی خدمات کا اعتراف نہیں کرتے، سال بھر رسالہ حاصل کرنے کی قیمت ادا کرتے ہیں۔''

خیری صاحب سے گزارش ہے کہ اب وہ ایک اور چیک صہبا صاحب کو بھیج دیں۔ ''افکار'' میں ان پر جو گوشہ قایم کیا گیا تھا، آخر اس کا حساب بھی تو بے باق ہونا چاہیے۔

(۲۰ رجون ۱۹۸۶ء)

☆..........☆..........☆

وہ آدمی کم ہیں اور غلط نامہ زیادہ

سوال: آپ کو گھر میں پیار سے کیا پکارتے ہیں؟

جواب: شنو۔

سوال: محبت، شہرت اور دولت میں آپ کا انتخاب؟

جواب: شہرت۔

سوال: آپ کی کمزوری؟

جواب: خود پرستی، انا، تکبر، اپنے آپ کو لائق سمجھنا۔

سوال: ایک شخصیت، جس کے لیے جان بھی قربان کی جا سکتی ہے؟

جواب: اپنی شخصیت۔

سوال: آپ کی کس عادت سے گھر والے تنگ ہیں؟

جواب: تقریباً ساری عادتوں سے، خصوصاً غصے اور تکبر سے۔

سوال: ایک سفر، جس سے خوف آتا ہو؟

جواب: آخرت کا سفر۔

سوال: دوبارہ زندگی ملے تو کیا بننا پسند کریں گے؟

جواب: ادیب، مصنف، ہدایت کار۔

سوال: رقم کس انداز میں پس انداز کرتے ہیں؟

جواب: خواہشوں پر پہرے بٹھا کر، دل جلا کر، آنسو بہا کر، آہیں بھر کے۔

سوال: ایک غلطی، جس پر آج بھی نادم ہوں؟

جواب: ایک ایک کر کے ڈھائی ہزار غلطیاں جمع ہو چکی ہیں۔

سوال: آپ کا قیمتی سرمایہ؟

جواب: بنک اکاؤنٹ نمبر ۳۰۶۲ پی ایل ایس۔

سوال: بالوں کو صابن سے دھوتے ہیں یا شیمپو سے؟

جواب: پہلے صابن سے دھوتا تھا، اب بچوں نے منع کر دیا ہے، شیمپو سے دھوتا ہوں۔

سوال: آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟

جواب: خدا نے کیا کیا مہربانیاں کی ہیں اور کیسا کیسا کرم کیا ہے۔

سوال: اگر ایک لاکھ کا انعامی بانڈ نکل آئے تو؟

جواب: پہلے نکل آتا تو ٹھیک تھا، اب تو یہ رقم بہت ہی کم ہے۔

سوال: اگر راستے میں آپ کی گاڑی خراب ہو جائے تو؟

جواب: کھڑی کر دیتا ہوں۔ بچے آ کر ٹھیک کر کے واپس گھر لے جاتے ہیں۔ خدا انھیں خوش رکھے۔

سوال: بچوں سے کیسا سلوک کرتے ہیں؟

جواب: اب تو یہ بچے ہی بتا سکتے ہیں، لیکن ان کی خفیہ رپورٹ ہے کہ بابا غصیل ہے اور ماضی کی شیخی بہت بگھارتا ہے۔

سوال: اگر ادیب نہ ہوتے تو؟

جواب: محکمہ فوڈ یا پی ڈبلیو ڈی یا ریلوے میں کوئی اچھا افسر ہوتا۔

سوال: سماجی زندگی میں کہاں تک دلچسپی ہے؟

جواب: تحریر کی حد تک۔ لوگوں کی فلاح اور بہتری کے لیے اچھے سے اچھا کالم لکھ سکتا ہوں، لیکن ان کے درمیان جا کر کام نہیں کر سکتا۔ انسانیت سے محبت کرتا ہوں، لیکن انسان سے نہیں۔

سوال: اپنے سے کمتر سے کیسا سلوک کرنا پسند کرتے ہیں؟

جواب: پسند کی حد تو اچھا سلوک ہی پسند کرتا ہوں، لیکن اس پر بھی عمل نہیں ہو سکا۔ دوسرے والا سلوک ہو جاتا ہے۔

یہ سوال اور ان کے جواب، جو ابھی آپ نے ملاحظہ فرمائے، پنجابی فلموں کے کسی ہیرو کے انٹرویو سے اخذ نہیں کیے گئے، بلکہ اردو کے مشہور افسانہ نگار، ڈراما نویس اور اُردو سائنس بورڈ کے ڈائریکٹر اشفاق احمد کے اس انٹرویو کا حصہ ہیں، جو اُردو کے سب سے بڑے اخبار میں گزشتہ ہفتے شائع ہوا ہے۔ اشفاق احمد کا انٹرویو پڑھ کر استاد لاغر مراد آبادی نے فرمایا:

''معلوم ہوتا ہے کہ اب ہمارے اخباروں کے پاس چھاپنے کے لیے اور ادیبوں کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا۔''

استادِ محترم کی اس رائے سے ہمیں اتفاق ضرور ہے، لیکن اس حد تک بھی نہیں کہ ہم یہ مان لیں کہ اشفاق احمد کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں رہا، بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ اب اشفاق احمد ہی کے پاس کہنے کے لیے کچھ رہ گیا ہے۔ باقی ادیبوں کو جو کچھ کہنا تھا، وہ کہہ چکے۔ اب ان کے لیے یہی بہتر ہے کہ وہ ادب سے ریٹائرمنٹ کا اعلان کر دیں، تا کہ اشفاق احمد کے ارشاداتِ عالیہ کی طرف یکسوئی سے توجہ کر سکیں۔

مذکورہ انٹرویو سے بعض بدخواہ یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اشفاق احمد سستی شہرت کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ ذہنی مریض ہیں کہ خود پرستی، انا اور تکبر کا شکار ہیں۔ اپنی شخصیت کو اس حد تک عظیم سمجھتے ہیں کہ اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ زندگی بھر غلطیاں کرتے رہے ہیں، جن کی تعداد کم از کم ڈھائی ہزار ہے۔ گویا آدمی نہ ہوئے، اچھا خاصا غلط نامہ ہو گئے۔ دولت سے محبت اتنی زیادہ ہے کہ اسے جمع کرنا زندگی کا اصل مقصد سمجھتے ہیں۔ انسانوں سے محبت کرنا ان کے مزاج کے خلاف ہے، اس لیے اپنے سے کمتر لوگوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک بھی روا رکھتے ہیں۔

ہمارے خیال میں اس انٹرویو سے اس قسم کے نتائج اخذ کرنا اشفاق احمد کے ساتھ بڑی زیادتی ہوگی، لہٰذا یہ ضروری ہے کہ اشفاق احمد کے ارشادات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے۔ اس مختصر کالم میں تو یہ ممکن نہیں کہ اشفاق احمد کے تمام جوابات کا تجزیہ کر کے انھیں راہِ راست پر گامزن دکھایا جائے، لہٰذا صرف چند امور پر اظہارِ خیال کر کے آئندہ کے لیے تمام غلط فہمیوں کے دروازے بند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر کوئی چور دروازہ کھلا رہ جائے تو اسے اُردو سائنس بورڈ کا دروازہ سمجھ لیا جائے کہ سائنس سے کوئی تعلق نہ ہونے کے باوجود اشفاق احمد اس ادارے کے ڈائریکٹر ہیں۔

اشفاق احمد نے محبت، شہرت اور دولت میں سے شہرت کا انتخاب کیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ بہترین انتخاب ہے۔ شہرت پسند انسان، حصولِ شہرت کے لیے ہر وقت سرگرمِ عمل رہتا ہے، جس کا اس کی صحت پر خوش گوار اثر پڑتا ہے۔ گویا شہرت کی خواہش طبی نقطۂ نظر سے بھی مفید ہے۔ اسی لیے بعض ادیبوں کو حکیم نسخوں میں لکھ کر دیتے ہیں کہ ہر قیمت پر شہرت حاصل کرو، خواہ اس کے لیے رسوا ہی کیوں نہ ہونا پڑے۔ اشفاق احمد نے بھی یقیناً کسی حکیم کے مشورے سے شہرت طلبی کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دیا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ محبت اور دولت سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔ ایک دوسرے سوال کے جواب میں انھوں نے دولت سے محبت ہی کی بنا پر اپنے بنک اکاؤنٹ کو اپنی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ قرار دیا ہے۔ دولت کی محبت کا جذبہ اس حد تک ارفع و اعلیٰ ہے کہ ایک لاکھ روپے کی رقم ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی رقموں کے پیچھے بھاگنے والوں کو دولت کے نادان دوست تو کہا جا سکتا ہے، چالاک رقم نہیں کہا جا سکتا۔

دولت کی محبت کا اندازہ اس سے بھی کیجیے کہ وہ تو دولتیوں کی طرح محنت سے کمائی ہوئی دولت کو

دونوں ہاتھوں سے لٹاتے نہیں، بلکہ اپنی خواہشوں پر پہرے بٹھا کر، دل جلا کر، آنسو بہا کر اور آہیں بھر کر جمع شدہ دولت کو محفوظ رکھتے ہیں۔ اپنی خواہشوں پر پہرے بٹھانا سلوک و معرفت کا پہلا مرحلہ ہے۔ اسی وجہ سے اشفاق احمد کو تصوف سے گہری دلچسپی پیدا ہوئی اور وہ رفتہ رفتہ جدید صوفیوں کے ایک مشہور سلسلے ''سلسلۂ شہابیہ'' کے سرگرم اور دردمند رکن بن گئے۔ دولت کی محبت میں عموماً لوگ خدا سے دور ہو جاتے ہیں، لیکن اشفاق احمد وہ خوش نصیب ہیں، جنھوں نے اس محبت میں سرشار ہو کر سلوک و معرفت کی ساری منزلیں طے کر ڈالیں۔

ممکن ہے، بعض لوگ یہ پوچھیں کہ جب اشفاق احمد کو تصوف سے اتنی دلچسپی ہے تو وہ سفرِ آخرت سے کیوں ڈرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس سوال کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ سفرِ آخرت اختیار کرنے کے بعد اکاؤنٹ نمبر ۳۲۲ پی ایل ایس میں اضافہ ممکن نہیں، اس لیے سیرِ دنیا سے گریز ہی مناسب ہے۔

اشفاق احمد نے خود پرستی، انا، تکبر اور اپنے آپ کو لائق سمجھنے کو اپنی کمزوریاں قرار دیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ کمزوریاں نہیں، شہ زوریاں ہیں۔ خود پرستی اور انا کی موجودگی انسان کو دیگر تمام موجودات سے بے نیاز کر دیتی ہے۔ وہ ہر معاملے میں خود کفیل ہو جاتا ہے، یہاں تک کہ خدا کی مہربانیوں کا ثبوت بھی اسے صرف آئینے سے ملتا ہے۔ ایک خود پرست انسان کے لیے تکبر لازمی ہے، ورنہ وہ اپنا آلہ تکبر الصوت نہیں بن سکتا۔ اپنے آپ کو لائق سمجھنا، کوئی خامی نہیں، مجبوری ہے، کیوں کہ یہ کام ایسا ہے، جو اشفاق احمد کے لیے دوسرے انجام نہیں دے سکتے۔

اشفاق احمد نے کہا ہے کہ اگر وہ ادیب نہ ہوتے تو پی ڈبلیو ڈی یا ریلوے میں ایک اچھے افسر ہوتے۔ ہمارا خیال ہے اشفاق احمد نے کسی غلط فہمی کی وجہ سے یہ بات کہی ہے، ورنہ انھیں اچھی طرح معلوم ہے کہ مذکورہ محکموں میں ملازمت اہلیت و صلاحیت کی بنا پر ملتی ہے، نہ خود پرستی اور تکبر کی وجہ سے۔

(۴ر جولائی ۱۹۸۶ء)

☆.........☆.........☆

اُن کی شاعری سہوِ قلم کا نتیجہ ہے

منظر علی خان منظر ادب اور زندگی دونوں میں فیملی پلاننگ کے قائل نہیں ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ ان کی پہلی کتاب ''کربِ آگہی'' شائع ہوئی تھی اور آج یہ صورت حال ہے کہ ان کی چار کتابیں منصۂ شہود پر آچکی ہیں اور اتنی ہی کتابت و طباعت اور جلد سازی کے مرحلوں میں ہیں اور جو زیرِ تصنیف و تالیف ہیں، ان کی تعداد خدا جانتا ہے یا خود منظر صاحب۔ آدمی کثیر العیال ہو یا کثیر التصانیف، دونوں صورتوں میں ہمدردی کا مستحق ہوتا ہے۔

ذاتی طور پر ہمارا یہ حال ہے کہ منظر صاحب کی ہر نئی کتاب کا بوجھ، گناہوں کے بوجھ سے زیادہ محسوس ہوتا ہے، کیوں کہ کتاب کو نہ صرف پڑھنا پڑتا ہے، بلکہ اس پر کالم بھی لکھنا پڑتا ہے۔ کالم لکھنا تو خیر آسان ہے کہ لکھتے لکھتے ہاتھ جم گیا ہے، لیکن کتاب کو پڑھنا بہت مشکل ہے کہ الفاظ پر نظر تو نہیں جمتی، رگوں میں خون جم کر رہ جاتا ہے۔

منظر صاحب کی تازہ ترین کتاب کا نام ہے ''یہ بات چلی مجھ سے''۔ جو ان کے خود اپنے ایک شعر سے ماخوذ ہے۔ شعر بھی سن لیجیے!

منسوب ترے قصے اوروں سے بھی تھے، لیکن
وہ بات بہت پھیلی، جو بات چلی مجھ سے

اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ بات ہی نہیں، ان کا محبوب بھی خاصی دور دور تک پھیلا ہوا ہے، کیوں کہ اس کے قصے منظر صاحب ہی سے نہیں، بے شمار لوگوں سے منسوب رہے ہیں۔ ایسا وسیع المشرب اور وسیع الاخلاق، بلکہ ''وسیع العشاق'' محبوب کسی دوسرے کو کاہے کو ملا ہو گا۔ ''وسیع العشاق'' کی ترکیب قواعد کے اعتبار سے غلط سہی، لیکن مذکورہ شعر کے حوالے سے بالکل درست ہے۔

''یہ بات چلی مجھ سے'' منظر صاحب کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے۔ ہم نے حساب نہیں کیا، لیکن خیال ہے کہ ''یک نشد دو شد'' سے اس کی تاریخ طباعت نکلتی ہے، کیوں کہ یہ محاورہ عموماً ایسے ہی موقعوں پر

استعمال ہوتا ہے۔

منظر صاحب شاعر بھی ہیں اور نثر نگار بھی۔ ان کے ایک بہی خواہ مشفق خواجہ نے انھیں مشورہ دیا تھا کہ وہ شاعری ترک کر کے نثر کی طرف توجہ کریں، تا کہ شاعری اور نثر دونوں کو فائدہ پہنچے۔ منظر صاحب نے اس مشورے پر عمل کیا اور یکے بعد دیگرے نثری مضامین کے دو مجموعے چھپوائے۔ شاعری کے بدخواہوں کو یہ بات پسند نہ آئی اور انھوں نے منظر صاحب کو دوبارہ شعر کہنے پر مجبور کیا۔ یہی مجبوری ان کے دوسرے مجموعۂ کلام کی صورت میں اس وقت ہمارے سامنے ہے۔

منظر صاحب کس درجے کے شاعر ہیں، اس کا فیصلہ تو وہی کر سکتے ہیں، جو اچھی اور بری شاعری میں تمیز کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ہمیں تو تمام شاعروں کا کلام ایک ہی جیسا نظر آتا ہے۔ دیوانِ غالب ہو یا دیوانِ منظر، ہمارے نزدیک دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ سوائے اس کے کہ دیوانِ غالب تعلیمی نصاب میں شامل ہے اور دیوانِ منظر نصاب باہر ہے۔ حیرت ہے کہ ہمارے ماہرین تعلیم نے دیوانِ غالب کو نصاب میں شامل کر رکھا ہے، جب کہ غالب کے بیشتر شعر اسکولوں اور کالجوں کے لڑکوں کی سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ اس کے برعکس منظر صاحب کا مجموعہ اس لائق ہے کہ اسے نصاب میں شامل کیا جائے۔ کیوں کہ ان کے شعروں سے کالجوں اور اسکولوں کے لڑکے بہتر طور پر محظوظ ہو سکتے ہیں۔ خصوصاً اس قسم کے شعر:

ہے تلاطم بپا سمندر میں
کون لینے لگا ہے انگڑائی

....

آئے گا انجمن میں اس بار وہ بھی منظر
صورت نکھار لیں ہم ، گیسو سنوار لیں ہم

....

ہم ادا کر نہ سکے شوقِ محبت کی نماز
عمر جب بیت چلی بات وضو تک پہنچی

....

لمس ہاتھوں کا مرے سب سے انوکھا ہوگا
میری جانب بھی کبھی ہاتھ بڑھا کر دیکھو

....

شکن ہے ان کی جبیں پر تو غم نہیں منظر
چلا ہے مجھ کو سزا ہے مری عبوری سی

آخری شعر میں ''سزا'' اور ''عبوری'' کے الفاظ سے ''بعبورِ دریائے شور'' والی سزا یاد آ جاتی ہے۔

منظر صاحب نے غزل کے میدان ہی کو پامال نہیں کیا، نظموں میں بھی اپنے کمالِ فن کا اظہار کیا ہے۔ خواتین کے سال پر انھوں نے ایک بے مثال نظم لکھی ہے، اس کے دو شعر سنیے:

عورتیں بہتر ہیں ، انسان ہیں ، سالا زار ہیں
مرد مفتوحہ رعایا ہیں ، ذلیل و خوار ہیں
ان کو معمولی نہ سمجھو حسن کی سرکار ہیں
گو نہیں وردی بدن پر ، پھر بھی تھانیدار ہیں

ایک نظم انھوں نے ''قومی لباس'' پر لکھی ہے، اس کا آخری شعر بہت عمدہ ہے:

تو اپنی ذات میں تبدیلیاں کرلے تو ہم جانیں
تری پوشاک گرچہ ہوگئی منظر شریفانہ

ہمارا خیال ہے کہ منظر صاحب جب تک شعر گوئی سے شغل فرماتے رہیں گے، تب تک انھیں شریفانہ پوشاک پر ہی گزارا کرنا ہوگا، ذات میں تبدیلیوں کا موقع نہیں ملے گا۔

سچی بات یہ ہے کہ منظر صاحب کی شاعری کی خصوصیات کا صحیح اندازہ ان کی شاعری سے نہیں، ان کے فلیپ نگاروں اور دیباچہ نویسوں کی آرا سے ہوتا ہے۔ دیوان کو شروع سے آخر تک پڑھ جائیے یا پڑھے بغیر ورق گردانی کر جائیے، آپ پر ایک نشہ سا طاری ہو جائے گا، لیکن اس کا سبب معلوم نہیں ہوگا۔ اب تین عدد فلیپ نگار اور تین عدد دیباچہ نویس آپ کو بتائیں گے کہ منظر صاحب کی شاعری کا جادو سر پر چڑھ کر کیوں بولتا ہے۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری فرماتے ہیں:

''یہ دیکھ کر دل خوش ہوا کہ منظر علی خاں منظر کے ادبی منظر نامے عیب سے پاک ہیں۔۔۔ جس طرح ان کی زندگی کا ایک خاص پس منظر ہے، اسی طرح ان کے لکھنے پڑھنے۔۔۔ کا بھی ایک خاص پس منظر ہے۔ یہ پس منظر کچھ تو اتفاقِ مزاج کے سبب اور کچھ ماحول کے زیرِ اثر ۔۔۔ یک رخا نہیں، ہمہ رخ ہے۔ زندگی کے ایک منظر کا عکاس نہیں، بلکہ تجربے کی گرفت میں آئے ہوئے سارے مناظر کا آئینہ دار ہے۔''

اس مختصر اقتباس میں لفظ ''منظر'' سات مرتبہ بصیغۂ واحد اور ایک مرتبہ بصیغۂ جمع استعمال ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے، فرمان صاحب نے ہاتھ روک کر دیباچہ لکھا ہے، ورنہ اس پیراگراف میں وہ چار چھ جگہ اور بھی لفظ ''منظر'' استعمال کر سکتے تھے، مثلاً پہلا جملہ یوں ہو سکتا ہے۔۔۔ ''یہ منظر دیکھ کر دل خوش منظر ہوا کہ منظر علی خاں منظر کے ادبی منظر نامے عیب مناظر سے پاک ہیں۔'' ۔۔۔ یہاں سہوِ قلم سے ''عیبِ تناظر'' کی

جگہ ''عیب مناظر'' لکھا گیا ہے۔ منظر صاحب کے معاملے میں اس قسم کا سہوِ قلم جائز ہے، کیوں کہ ان کی ساری شاعری ہی سہوِ قلم کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر انور سدید فرماتے ہیں:

''ان کے ہاں شاعری کا عمل خالی آسمان میں پتنگیں اڑانے کا عمل نہیں، وہ جذبے کے خوش رنگ پرند کو اپنی جانب راغب کرتے ہیں، غزل کی دہلیز پر بیٹھ کر اس سے باتیں کرتے ہیں اور پھر آزاد پرواز کے لیے دوبارہ ہوا میں اڑا دیتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ پرند فضا میں گم نہیں ہو جاتا، بلکہ ایک لمبی اڑان کے بعد دوبارہ ان کے ہاتھ پر آ بیٹھتا ہے۔''

یہ سب کچھ لکھتے وقت ڈاکٹر انور سدید کو شاید یاد نہیں رہا کہ منظر صاحب شاعر ہیں، شوقین مزاج نہیں ہیں۔ انھیں اتنی فرصت کہاں کہ کسی پرندے کو ہاتھ پر بٹھائے رکھیں۔ اسی ہاتھ سے تو وہ ایک ہی نشست میں آٹھ دس غزلیں اور دو چار مضمون لکھتے ہیں۔

ڈاکٹر لطف الرحمٰن کا دیباچہ خاصا طویل ہے، جو ۲۸ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ اس دیباچے کی رعایت سے کتاب کا نام ''یہ بات بہت پھیلی'' ہونا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر لطف الرحمٰن نے منظر صاحب کے آبائی وطن بھاگل پور کے تعلق سے نہایت نادر تاریخی و ادبی معلومات فراہم کی ہیں اور منظر صاحب کے بارے میں بھی اتنا کچھ لکھ دیا ہے کہ قاری کو مزید کچھ جاننے کی خواہش نہیں رہتی۔ ڈاکٹر صاحب نے منظر صاحب کی شاعری کی خصوصیات بتاتے ہوئے ان کا مقابلہ میرؔ اور غالبؔ سے بھی کیا ہے، حالاں کہ ان دونوں کا بھاگل پور سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے منظر صاحب کو تو میرؔ و غالبؔ کی سطح پر نہیں پہنچایا کہ اتنی اونچائی پر سانس رُک جانے کا خطرہ ہوتا ہے، لیکن میرؔ و غالبؔ کو منظر صاحب کی سطح پر لا گرایا ہے، تاکہ ان دونوں کو یہ معلوم ہو کہ شعر کہنا آسان ہے، اس کے نتائج بھگتنا آسان نہیں۔

ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر لطف الرحمٰن دونوں نے مشفق خواجہ کو اس پر مطعون کیا ہے کہ انھوں نے منظر علی خاں کو شاعری ترک کرنے کا مشورہ کیوں دیا اور یہ بھی کہا ہے کہ اگر منظر صاحب اس نامعقول مشورے پر عمل کرتے تو اردو شاعری کو سخت نقصان پہنچتا۔ ہم نے اس سلسلے میں خواجہ صاحب سے رابطہ قائم کیا تو انھوں نے کہا:

''منظر صاحب اگر شاعری ترک کر دیتے تو اس سے اردو شاعری کو تو کیا، ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر لطف الرحمٰن کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ وہ اپنے لکھے ہوئے دیباچوں میں شاعر کے نام اور کلام کو تبدیل کر کے کسی اور شاعر کے دیوان کے ساتھ چھپوا دیتے۔''

(۱۱ر جولائی ۱۹۸۶ء)

☆ ☆ ☆

نقاد یا قصیدہ نگار

ہر سال نظیر صدیقی صاحب کی ایک دو کتابیں ہمارے پاس تبصرے کے لیے ضرور آتی ہیں۔ معلوم نہیں، یہ عام افادے کے لیے چھپوائی جاتی ہیں یا محض اس وجہ سے کہ ہم ان سے علم یا عبرت حاصل کریں۔ بہر حال ہم یہی سمجھتے ہیں کہ نظیر صدیقی کی کتابیں صرف ہمارے علم میں اضافے کے لیے چھپتی ہیں۔ اہلِ علم کے لیے نہیں کہ ان کے پاس پہلے ہی سے اتنا علم ہے کہ نظیر صدیقی ان کو مزید نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

۱۹۸۶ء کا آدھا سال گزر چکا ہے۔ ہم پریشان تھے کہ نظیر صدیقی کی کوئی نئی کتاب اب تک شائع کیوں نہیں ہوئی۔ خیال آیا کہ کاغذ کی کمی کی وجہ سے ایسا ہوا ہوگا، لیکن یہ بات دل کو نہیں لگی، کیوں کہ حال ہی میں تقریباً پانچ درجن شاعروں کے دیوان شائع ہوئے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارا ملک کاغذ بنانے کے معاملے میں نہ سہی، ضائع کرنے کے سلسلے میں خود کفیل ہے۔ ایک خیال یہ بھی آیا کہ کہیں ایسا تو نہیں، نظیر صاحب نے لکھنے کا کام چھوڑ کر، نصیبِ دشمناں، پڑھنے کا کام شروع کر دیا ہو۔ ہم ابھی اسی قسم کے خیالوں میں گھرے ہوئے تھے کہ نظیر صدیقی بہ نفسِ نفیس کراچی تشریف لے آئے۔ گویا کتاب کی بجائے صاحبِ کتاب برائے تبصرہ موصول ہو گئے۔

چند ہفتے قبل کراچی میں آندھی اور بارش کا شدید طوفان آیا تھا۔ نظیر صدیقی کی آمد کے بعد اس طوفانِ باد و باراں کی تباہ کاریوں کو لوگ بھول گئے۔ شہر کے تمام ادبی حلقوں میں زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی۔ کہیں صدیقی صاحب کے اعزاز میں مشاعرہ ہو رہا ہے، کہیں ان کی صدارت میں تنقیدی نشست کا اہتمام ہے اور کہیں وہ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے کسی محفلِ سخن میں اپنا کلام بلاغت نظام سنا رہے ہیں۔ اتفاق سے آج کل کراچی میں آشوبِ چشم کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ نظیر صاحب بھی اس وبائے عام کا شکار ہو گئے۔ وہ ہر وقت رنگین چشمے کے ساتھ نظر آتے تھے، حالاں کہ وہ پہلے صرف تنقید لکھتے وقت اس چشمے کو استعمال کرتے تھے۔ آنکھوں کی تکلیف کے باوجود نظیر صاحب نے ادبی محفلوں کو رونق بخشی۔ دوستوں کے گھروں

پر اُن کی دعوتیں بھی ہوئیں، جہاں ہم جیسوں کو ان کی گل افشانی گفتار سے محظوظ ہونے کا موقع ملا۔

نظیر صدیقی صاحب کو ہم نے اب تک صرف پڑھا تھا، دیکھنے کا موقع پہلی مرتبہ طاہر مسعود کے گھر پر ملا، جہاں اُن کے اعزاز میں ایک شاندار اور پر تکلف دعوت دی گئی تھی۔ کھانا بھی مزے کا تھا اور نظیر صدیقی صاحب کی گفتگو بھی۔ ہم یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ کھانے اور گفتگو میں سے کون سی چیز زیادہ لذیذ تھی۔ کھانے اور گفتگو میں ایک قدر مشترک تھی اور جس طرح کھانا ایک حد تک کھایا جا سکتا ہے، اسی طرح نظیر صاحب کی گفتگو سے محظوظ ہونے کی بھی ایک حد ہے۔ یہ وہاں ختم ہوتی ہے، جہاں نظیر صاحب نثر کی بجائے نظم میں گفتگو شروع کرتے ہیں، یعنی اپنے شعر سناتے ہیں۔ نظیر صاحب کے شعر بلاشبہ بہت اچھے ہوتے ہیں، مگر ہم اُن جیسے عالم و فاضل سے شعر گوئی کی نہیں، کسی مفید کام کی توقع رکھتے ہیں۔

ہمیں یاد پڑتا ہے کہ جب نظیر صاحب کا مجموعۂ کلام کتابچے کی صورت میں شائع ہوا تھا تو ہم نے تبصرہ کرتے ہوئے عرض کیا تھا کہ یہ کتابچہ گویا خاندانی منصوبہ بندی کے کتابچوں کی طرح چھپا کر پڑھنے کی چیز ہے، لیکن جب سے نظیر صاحب کا کلام ان کی زبان سے سنا ہے، ہماری رائے بدل گئی ہے۔ اب ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ کلام مولانا اسماعیل میرٹھی کے کلام کی طرح بے ضرر ہے، کیوں کہ جب نظیر صاحب غزل سرا ہوتے ہیں تو صرف الفاظ سنائی دیتے ہیں، معنی دکھائی نہیں دیتے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ موصوف جب اپنا کلام سنا رہے تھے تو ہم بھی آشوبِ چشم میں مبتلا تھے۔

نظیر صدیقی کی شخصیت بڑی پہلو دار ہے۔ وہ شاعر ہیں، نقاد ہیں، انشائیہ نگار ہیں، اُردو کے استاد ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ڈاکٹر حنیف فوق کے شاگرد ہیں۔ استاد اور شاگرد میں تعلقات بڑے تکلف کے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر فوق استاد ہونے پر اور نظیر صدیقی شاگرد ہونے پر نادم ہیں۔

ایک عرصے سے ہماری خواہش تھی کہ نظیر صدیقی سے کچھ بات چیت ہو۔ یہ خواہش طاہر مسعود کے ہاں پوری ہوئی۔ ہم نے ان سے پوچھا کہ دبستانِ سرگودھا والے آپ کو انشائیہ نگار کیوں نہیں مانتے۔

انھوں نے فرمایا:

"جس طرح افیون کی کاشت آزاد قبائلی علاقے سے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے، اسی طرح دبستانِ سرگودھا والوں کا خیال ہے کہ انشائیے کے پودے کو سرگودھا کی مٹی ہی راس آ سکتی ہے، حالاں کہ یہ خیال غلط ہے۔ سرگودھا سے باہر بھی، بلکہ باہر ہی اعلیٰ درجے کا انشائی ادب پیدا ہوا ہے۔"

ہم نے عرض کیا:

"آپ کا خیال درست ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور انور سدید لاہور منتقل ہو گئے ہیں، اس لیے لاہور بھی انشائیے کا مرکز بن گیا ہے۔"

یہ بات سن کر وہ طیش میں آ گئے۔ فرمایا:

"مجھے آپ کی رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ میں نے جب انشائیے لکھے تھے اس وقت دبستانِ سرگودھا کا وجود نہیں تھا۔"

"تو پھر آپ نے اپنا الگ دبستان کیوں نہ بنا لیا؟"

ہمارے اس سوال کے جواب میں انھوں نے فرمایا:

"دبستان بنانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل چیز کام ہے۔"

ان کے لہجے میں خاصی خنکی تھی، لہٰذا ہم نے موضوع بدلنے کی خاطر کہا:

"آپ ہمارے درجۂ اوّل کے نقاد ہیں۔ آپ کے فکر انگیز مقالات نے اُردو تنقید کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ آپ کی تنقیدی بصارت اور بصیرت نے ہماری جدید نسل کی ذہنی تربیت کی ہے۔"

نظیر صاحب نے ہماری باتوں سے اختلاف نہ کیا، حالاں کہ اختلاف کی خاصی گنجائش تھی، البتہ انکسار سے کام لیتے ہوئے فرمایا:

"یہ آپ کا حسنِ ظن ہے۔"

ہم نے مزید عرض کیا:

"ایک خوبی، جو دوسرے نقادوں سے آپ کو ممتاز کرتی ہے، یہ ہے کہ آپ کا کوئی گروپ نہیں۔ آپ بالکل تنہا ہیں، حالاں کہ ہمارے ہر نقاد کے ساتھ دو چار نوحہ گر ضرور ہوتے ہیں۔ ان نوحہ گروں کے ذکر کے بغیر کوئی تنقیدی مقالہ مکمل نہیں ہوتا۔"

"بات تو یہ ہے" انھوں نے فرمایا۔ "گروہ بندی نے ادب کو بے حد نقصان پہنچایا ہے۔ اسی وجہ سے ہمارے ہاں ادیب، نقادوں کی اُنھی آرا کو پسند فرماتے ہیں، جو ان کے حق میں جاتی ہیں۔ کوئی شخص بھی دیانت دارانہ تنقید کو برداشت نہیں کرتا۔ رسالے چھاپنے والوں نے بھی اپنے اپنے گروپ بنا رکھے ہیں۔ ملک کے تمام ادبی رسالوں کے ایڈیٹر مجھ سے ناراض ہیں، کیوں کہ میں اپنی ایک آزاد رائے رکھتا ہوں۔ میں ایڈیٹروں کے لیے تنقید نہیں لکھتا۔ ادب کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے یہ کام کرتا ہوں۔"

"تو پھر ایک ادبی نکتہ بھی سمجھا دیجیے۔" ہم نے گزارش کی۔

"ضرور۔"

"آپ پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ آپ نے غالبؔ، اقبالؔ، فراقؔ، یگانہؔ، فیضؔ اور دوسرے کئی بڑے شعرا پر جو تنقیدی مضامین لکھے ہیں، وہ دس دس بارہ بارہ صفحوں سے زیادہ کے نہیں ہیں، لیکن پروین

شاکر پر آپ کا مضمون پچاس صفحوں کا ہے۔ کیا پروین شاکر کا مرتبہ غالبؔ اور اقبالؔ وغیرہ سے زیادہ ہے، جو آپ نے ان پر اتنے صفحات ضائع کیے؟

''صفحات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔'' انھوں نے فرمایا۔ ''دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ موضوع کا تقاضا کیا ہے۔ غالبؔ اور اقبالؔ وغیرہ کی شاعری کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لہٰذا میں نے ان شاعروں کے بارے میں وہی باتیں لکھیں، جو میرے نزدیک نئی تھیں۔ پروین شاکر کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ مجھ سے پہلے ان پر کسی نے نہیں لکھا تھا، اس لیے ان کی شاعری کی تمام خصوصیات کا احاطہ کرنا ضروری تھا۔''

ہم نے عرض کیا:

''بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ آپ نے انھیں میرؔ و غالبؔ سے بڑھا دیا ہے۔''

انھوں نے فرمایا:

''اگر ایسا ہے تو اس کے ذمہ دار میرؔ اور غالبؔ ہیں۔ میں نہیں ہوں۔''

یہ ایسا مسکت جواب تھا کہ ہم خاموش ہو گئے۔ حاضرینِ محفل میں سے ایک صاحب نے کہا:

''غالبؔ خوش قسمت تھا کہ اُسے عبدالرحمن بجنوری جیسا نقاد ملا۔ پروین شاکر خوش قسمت ہے کہ اسے نظیر صدیقی جیسا سخن فہم ملا۔''

محفل میں استاد لاغر مراد آبادی بھی موجود تھے۔ انھوں نے کہا:

''اور ہم بھی خوش قسمت ہیں کہ یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود زندہ ہیں۔''

ہمیں استادِ گرامی کی یہ بے تکلفی اچھی نہ لگی۔ نظیر صدیقی کا دل رکھنے کے لیے ہم نے استاد سے کہا:

''اس کا تو خیال کیجیے کہ نظیر صدیقی آج کی محفل کے مہمانِ خصوصی ہیں۔''

استاد نے جواب دیا:

''نظیر صدیقی ہیں کہاں؟ وہ تو پروین شاکر والے مضمون کے پچاس صفحوں کے ساتھ خود بھی ضائع ہو چکے ہیں۔''

(۱۸ر جولائی ۱۹۸۶ء)

☆.........☆.........☆

خوبصورت، جذباتی، جھوٹی کتاب

پچھلے ہفتے ہم نے ایک دلچسپ کتاب پڑھی ہے، اس کا نام ہے ''کرشن بھی مرگیا'' اور عرفیت ہے ''یادوں کا کارواں اس کی ارتھی کے ساتھ ساتھ چلا''۔ مصنف کا نام ہے محمد حسن۔ پہلے تو ہم یہ سمجھے کہ یہ مشہور ہندوستانی نقاد ڈاکٹر محمد حسن ہیں، لیکن کتاب کے ابتدائی چند صفحات پڑھنے سے اندازہ ہوا کہ کوئی دوسرے صاحب ہیں، جو خود تو پاکستانی ہیں، لیکن ان کی کتاب کا سارا مواد ہندوستانی ہے، یعنی اس میں بمبئی کے قیام کی یادیں قلم بند کی گئی ہیں۔

کتاب کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے مناسب ہوگا کہ جناب مصنف کے بارے میں یہ بتا دیا جائے کہ ان کا تعلق بازید پور (بہار) سے ہے۔ علی گڑھ میں انھوں نے تعلیم حاصل کی۔ بی ایس سی کا امتحان دیا اور کامیابی یا ناکامی کی پروا کیے بغیر ۱۹۴۰ء میں بمبئی چلے گئے۔ خواجہ احمد عباس کے ذریعے فلمی دنیا میں داخل ہوئے۔ بقول خود...... ''انھیں ایکٹنگ کی پیش کش کی گئی، لیکن انھوں نے منظر نامہ نگاری کو پسند کیا اور اپنا پیشہ بنایا۔ بمبئی میں انھوں نے سات سال گزارے اور پھر کراچی چلے آئے۔'' ...... زیرِ نظر کتاب میں انھیں سات برسوں کی یادیں جمع کی گئی ہیں۔ ۹ر مارچ ۱۹۷۷ء کو کرشن چندر کا انتقال ہوا تو اس کے حوالے سے جناب مصنف نے یادنویسی کا کام شروع کیا۔ ۱۱ر جولائی ۱۹۷۷ء کو انھوں نے پونے چار سو صفحات کی کتاب مکمل کرلی۔

مصنف کو اس پر اصرار ہے کہ ''وہ خاصے ذہین ہیں اور ان کی طبیعت شروع ہی سے ذہانت کی طرف مائل رہی ہے۔'' (صفحہ ۳۲۳)

یہی نہیں۔ ''ان کی طبیعت ہمیشہ سے اور بجلی بھی رہی ہے۔'' (صفحہ ۳۲۴)

ذہانت سے اور اور بجلیلی کے باوجود انھوں نے یہ بھی تحریر فرمایا ہے:

''ساحر مجھے شریر کہتا، خواجہ احمد عباس اجڈ دہقانی سمجھتے، عصمت چغتائی نے تو پگلوٹ کا لقب

ہی دے دیا تھا اور باقی دوستوں کی رائے بھی میرے بارے میں کچھ اچھی نہ تھی، لیکن کرشن چندران کے مقابلے میں بڑا فراخ دل تھا۔ اپنی خصوصی صفت میں مجھے برابر کا شریک رکھتا، مجھے احمق سمجھتا تھا۔'' (صفحہ ۳۰۴)

کتاب کو لفظ بلفظ پڑھنے کے بعد، ہمارا خیال ہے کہ مصنف نے خود اپنے بارے میں جو رائے قائم کی ہے، وہ ان کے دوستوں کی رائے کے مقابلے میں زیادہ درست ہے، لیکن ہمیں خطرہ ہے کہ کتاب کے تمام قارئین اگر مصنف کی طرح ذہین نہ ہوئے تو وہ خواجہ احمد عباس اور عصمت چغتائی وغیرہ کی تائید کریں گے۔ خدا کرے، یہ کتاب غیر ذہین لوگوں کی نظر سے نہ گزرے۔

بمبئی کے ہفت سالہ قیام کی یادیں بغیر کسی ترتیب کے مصنف کے ذہن میں آئیں اور پھر اسی بے ترتیبی سے کاغذ پر منتقل کردی گئیں۔ پونے چار سو صفحات کو ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے اور نہ کسی تاریخی یا واقعاتی ترتیب کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ بات سے بات اس طرح نکلتی ہے، جس طرح کلاشنکوف سے گولیاں۔ سردار جعفری اور سلطانہ جعفری کے معاشقے کا ذکر کرتے کرتے علامہ اقبال کی شاعری کے اوصاف بیان کردیے جاتے ہیں، جیسے یہ شاعری بھی انھیں مخصوص حالات کا نتیجہ ہو۔ اختر الایمان کے بارے میں یہ بتاتے ہوئے کہ وہ لڑکیوں کا پیچھا کس طرح کیا کرتے تھے، ٹیگور کی گیتانجلی کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ بنگال میں نہیں، بہار میں لکھی گئی تھی۔ مسعود پرویز کے ایک رومان کی تفصیل کے ضمن میں تذکرہ آجاتا ہے کہ خواجہ احمد عباس نے مصنف کے گلے پر چھری رکھ کر ان سے انجمن ترقی پسند مصنفین کی رکنیت کے فارم پر دستخط کرالیے تھے۔

یہی نہیں، ایک طرف تو جناب مصنف کسی فلم کے ہیرو اور ہیروئن کو بوسہ بازی کا منظر فلمانے کے آداب سکھاتے ہوئے نظر آتے ہیں اور دوسری طرف اسلامی تہذیب و ثقافت و ہندو تہذیب و ثقافت پر برتری بھی ثابت کرتے ہیں۔ موصوف روزے پابندی سے رکھتے ہیں اور روزے کی حالت میں جدن بائی کے کوٹھے پر جاتے ہیں اور جب وہ انھیں چائے کی پیالی پیش کرتی ہے تو یہ اُسے روزے سے ہونے کی اطلاع دیتے ہوئے اس کی بیٹی نرگس کی عمر کا حساب لگاتے ہیں کہ وہ چودہ برس کی ہے یا پندرہ برس کی۔

جناب مصنف خاصے پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں۔ فنون لطیفہ پر ان کی گہری نظر ہے۔ غالب اور اقبال کے تو وہ شیدائی ہیں۔ اس کتاب میں جا بجا علمی و ادبی بحثیں اس طرح بکھری ہوئی ہیں، جیسے صحرا میں پھول۔ ان بحثوں میں قارئین کی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہمیں تو کتاب کے وہ حصے بہت پسند آئے، جن میں مصنف نے فلمی دنیا کے مرہٹوں اور مارواڑیوں سے غالب اور اقبال کی شاعری اور فلسفے پر گفتگو کی ہے۔ ان لوگوں کو اُردو ہی کے نہیں، فارسی کے اشعار بھی سنائے جاتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ مرہٹے اور مارواڑی ان شعروں کو سن کر جھومتے بھی ہیں۔

کتاب کے شروع میں بلراج ساہنی اور اس کی بیوی کا بڑی تفصیل سے ذکر آیا ہے۔ بلراج کی بیوی سے جناب مصنف کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔ اس کے ساتھ وہ ساحل سمندر پر چہل قدمی بھی کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ خاتون نے بتایا کہ بلراج کو یہ شبہ ہے کہ اس کے وشوامتر عادل سے تعلقات ہیں۔ اس پر جناب مصنف نے خاتون کو مخاطب کرکے وشوامتر عادل سے اپنی نفرت کا اظہار ان خوبصورت لفظوں میں کیا ہے:

''تم پاگل ہوگئی، بلراج دیوانہ ہوگیا ہے۔ وہ وشوامتر، وہ احمق، جس کو قدرت نے ہر اچھی چیز سے محروم کرکے انسانوں کے درمیان محض اس لیے چھوڑ دیا کہ اولادِ آدم کو اشرف المخلوقات ہونے پر خود ہی شبہ ہونے لگے۔'' (صفحہ ۳۵)

مصنف کا حافظہ غضب کا ہے۔ انھیں ۳۰، ۳۵ برس کے واقعات اتنی تفصیل سے یاد ہیں، جیسے یہ واقعات کتاب لکھنے کے دوران وجود میں آئے ہوں۔ انھوں نے اپنی طویل گفتگوئیں اس انداز سے قلم بند کی ہیں کہ انھیں اپنا اور دوسروں کا ایک ایک لفظ ہی نہیں، کامے اور فل اسٹاپ بھی یاد ہیں۔ مگر ایک جگہ ان کا حافظہ جواب دے گیا۔ دو لڑکیاں تھیں، جن سے مصنف کی بڑی دوستی تھی۔ ہر وقت کا ملنا جلنا تھا۔ اس کے باوجود انھیں ان دونوں کے نام یاد نہیں رہے۔ یہ لڑکیاں مصنف پر اتنی مہربان تھیں کہ ایک ان کا سر دباتی تھی اور دوسری پاؤں۔ ممکن ہے، بعض لوگ یہ کہیں کہ لڑکیاں شاید جھوٹ کے پاؤں دبایا کرتی تھیں، اس لیے مصنف کو ان کے نام یاد نہیں رہے۔ ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے، کیوں کہ جھوٹ کے پاؤں ہوتے ہی نہیں، انھیں کوئی کیا دبائے گا۔

مصنف نے بے شمار شخصیات کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔ جوش صاحب پر تو انھوں نے صفحوں کے صفحے سیاہ کیے ہیں، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ انھوں نے جوش صاحب کے کردار کو بھی سیاہ کرڈالا ہے۔ جناب مصنف اور حضرت جوش کی عمروں میں دو چار سال کا نہیں، ۲۵، ۳۰ سال کا فرق تھا۔ اس کے باوجود انھوں نے کتاب کے ہر چوتھے صفحے پر جوش صاحب کو اس طرح ڈانٹا ہے، جیسے کوئی بزرگ کسی خورد کو ڈانٹتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ انھوں نے جوش صاحب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے:

''تم بدنصیب ہو۔ تم اپنی قدروں کو دوسروں پر مسلط کرنے کی غیر شریفانہ حرکت کے عادی ہوچکے ہو۔ شراب نوشی کو تم ایک مجرمانہ فعل بنا لیا ہے..... تم اس لائق نہیں ہو، جس دعوت میں گھریلو عورتیں شریک ہوں، اس میں تم کو مدعو کرلیا جائے۔''

ایک مرتبہ جوش صاحب کے صاحبزادے سجاد کا جناب مصنف سے کسی بات پر جھگڑا ہوگیا۔ اس نے جوش صاحب سے شکایت کی۔ جوش صاحب نے سجاد کی موجودگی میں جناب مصنف سے اس معاملے کی وضاحت چاہی تو موصوف نے سجاد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

"دیکھو سجاد! اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارے والد صاحب کی تھوڑی بہت جو میں عزت کرتا ہوں، وہ بھی ختم نہ ہو جائے تو تم ایسی حرکتیں چھوڑ دو۔"

پھر جوش صاحب کو مخاطب کر کے فرمایا:

"جوش صاحب! آپ کو بھی شرم آنی چاہیے۔ لونڈوں کی باتوں میں آ کر ایسے بن جاتے ہیں جیسے زندگی میں کبھی اچھے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کا اتفاق نہ ہوا ہو۔ کیا آپ کے ملیح آباد میں شریف لوگ اولاد کی باتوں میں آ کر اس طرح گنواری حمایت میں اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔"

یہ سن کر جوش صاحب سہم گئے اور سجاد سے کہا:

"اور مجھے گالیاں سنوا۔ گھر جا اپنی ماں کے پاس۔"

یہ سن کر سجاد چلا گیا اور جوش صاحب نے جناب مصنف سے ان الفاظ میں معذرت کی:

"بھائی! اولاد نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔"

اس سارے واقعے میں ہمیں ایک ہی جھوٹ نظر آیا ہے اور وہ یہ کہ جوش صاحب نے یہ کہا:..... "اولاد نے مجھے کہیں کا نہ رکھا۔"..... حالاں کہ اصل واقعہ یہ کہ جناب مصنف نے انھیں کہیں کا نہیں رکھا۔

بعض افراد کے بارے میں جناب مصنف کی رائے بھی سن لیجیے:

ساغر نظامی — "بالکل مصنوعی آدمی تھا۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، بات چیت کا انداز اور پہننا اوڑھنا قطعی مصنوعی تھا۔ وہ کپڑے اس انداز سے پہنتا تھا، جیسے پہننے کی چیز نہیں، ان کو بڑی احتیاط سے اپنے جسم پر رکھے ہوئے ہو۔"

مجتبیٰ جار چوی — "رئیس کا دھنی تھا۔ انتہائی درجے کا چلبلا۔ رئیس کورس میں لڑکیوں کو چھیڑنے میں رنگ تغزل دکھاتا۔ جس دلچسپی سے رئیس کھیلتا، اس لگن سے لڑکیوں کو چھیڑتا بھی۔ اور جب اپنے دلچسپ تجربے بیان کرتا تو حقیقت میں افسانے کی چاشنی سننے والوں کے دل میں چٹکیاں لینے لگتی۔"

پروفیسر مجتبیٰ حسین — "حمید بٹ نے مجتبیٰ حسین کو بھی مسودہ صاف کرنے کے لیے رکھ لیا تھا، جنھیں آج کل کراچی میں پروفیسر مجتبیٰ حسین کہا جاتا ہے۔ اس کو کچھ تنقید وغیرہ میں طبع آزمائی کا شوق ہے..... اب یہاں آ کر مجتبیٰ عاقل، بالغ اور ذہین بننے کی کوشش کر رہا ہے، حالاں کہ اس کی اوقات یہاں کراچی میں بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔"

زاہدہ حنا — "میرے حساب سے زاہدہ حنا کو کتابیں پڑھنے کا اتنا شوق نہیں، جتنا کتابیں جمع کرنے کی وحشت ہے۔"

مصنف نے ایک جگہ لکھا ہے:

"رونے کا معاملہ میرے ساتھ کچھ عجیب سا ہے..... میری سمجھ میں آج تک نہ آ سکا کہ مجھے رونا کیوں آتا ہے۔ شاید جھوٹے، مصنوعی اور نقلی قدروں کا ان دنوں جو پورے برصغیر میں دور دورہ تھا، اس میں مَیں بھی ویسی ہی مکر بھری زندگی گزر رہا تھا، لیکن شاید مجھے سچائی کی تلاش تھی۔ جہاں کہیں سچائی کی ذرا سی بھی جھلک مل جاتی، نایاب شے کے مل جانے کی خوشی میں رو پڑتا۔"

جب سے ہم نے یہ کتاب پڑھی ہے، ہم بھی خاصے رقیق القلب ہو گئے ہیں۔ جہاں بھی ذرا سی سچائی نظر آتی ہے، ہماری آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ کہ کتاب پڑھنے کے دوران ہماری آنکھیں خشک رہیں۔

کتاب کے سرورق پر جلی حروف میں خواجہ احمد عباس کی یہ رائے درج ہے:

"خوبصورت، جذباتی، جھوٹی کتاب"۔

قطع نظر اس سے کہ مصنف نے یہ نہیں بتایا کہ خواجہ صاحب نے یہ رائے کب اور کہاں ظاہر کی، ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ کتاب اور سب کچھ ہو سکتی ہے، جھوٹی نہیں ہو سکتی۔ مصنف نے جو کچھ لکھا ہے، ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ وہ سچ ہے۔ بفرض محال اگر خواجہ احمد عباس کی بات مان بھی لی جائے کہ یہ جھوٹی کتاب ہے تو تب بھی مصنف کو اس کاوش کی داد دینی چاہیے کہ پونے چار سو صفحوں میں مسلسل جھوٹ بولنا بڑی ہمت کی بات ہے۔

(۲۵/جولائی ۱۹۸۶ء)

☆.........☆.........☆

عارضوں اور معارضوں سے بھرپور تنقید

شمس الرحمٰن فاروقی عروضی اور معروضی تنقید لکھنے میں خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ ان کی تنقید کا تعلق عرض و معروض سے نہیں، عارضوں اور معارضوں سے ہوتا ہے یعنی ایک طرف تو وہ ان عوارض کی نشان دہی کرتے ہیں، جو ہمارے ادب اور ادیبوں کو لاحق ہیں اور دوسری طرف ایسے معارضوں میں بھی حصہ لیتے رہتے ہیں، جو ہمارے ادب اور ادیبوں میں مزے دار عوارض پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ گویا نقاد کی حیثیت سے فاروقی صاحب کو منفرد مقام حاصل ہے اور اسی وجہ سے وہ ہندوستان اور پاکستان، دونوں ملکوں میں مقبول ہیں۔ اُن کی مقبولیت کا اندازہ ہندوستان میں وارث علوی کے مشہور عالم مضمون سے اور پاکستان میں ہمارے کالموں سے کیا جا سکتا ہے۔ گزشتہ چند مہینوں میں ہم نے اُن پر متعدد مرتبہ طبع آزمائی کی ہے۔ ایک ہی موضوع پر بار بار لکھنا اگرچہ خوش مذاقی کی دلیل نہیں ہے، لیکن اس کا کیا علاج کہ گزشتہ چند مہینوں سے شمس الرحمٰن فاروقی ہی کا نام اور کام سرِفہرست ہے۔ حال ہی میں اُن کا ایک انٹرویو لاہور کے اخبار ''جنگ'' میں نظر سے گزرا ہے۔ یہ انٹرویو اُس وقت لیا گیا تھا، جب تین ماہ قبل فاروقی صاحب یہاں آئے تھے۔ اس انٹرویو کی اشاعت کی نوبت اب آئی ہے۔

یہ انٹرویو ایک نہ دو، اکٹھے آٹھ ادیبوں نے لیا ہے۔ ان ادیبوں کے نام بھی سن لیجیے۔ ڈاکٹر وزیر آغا، انتظار حسین، ڈاکٹر آغا سہیل، ڈاکٹر سلیم اختر، ڈاکٹر انور سدید، احمد ظفر، اصغر ندیم سید اور حسن رضوی۔ یہ فاروقی صاحب کا روحانی تصرف ہے کہ ڈاکٹر سلیم اختر اور ڈاکٹر انور سدید ایک جگہ مل بیٹھے، ورنہ یہ دونوں تو اتنے محتاط ہیں کہ ایک گھاٹ کا پانی بھی نہیں پیتے۔ اس انٹرویو کا اہتمام حسن رضوی نے کیا تھا۔ رضوی صاحب سے گزارش ہے کہ وہ ڈاکٹر انور سدید اور ڈاکٹر سلیم اختر کو اتنا قریب ہونے کا موقع نہ دیں کہ دونوں میں صلح ہو جائے۔ اگر ایسا ہوا تو اخبارات کے ادبی صفحوں کی تمام رونق ختم ہو جائے گی۔

فاروقی صاحب کا انٹرویو بہت دلچسپ ہے۔ اُن کی تحریروں کی طرح اُن کی گفتگو بھی بڑے مزے کی ہوتی ہے۔ ہمارے سامنے اس انٹرویو کا جو متن ہے، اس پر جا بجا استاد لاغر مراد آبادی نے حواشی لکھ رکھے

ہیں۔ آٹھ ادیبوں کے سوالات، فاروقی کے جوابات اور اُستاد کے تبصروں نے اسے سہ آتشہ بنا دیا ہے۔ کاش ہمارے کالم میں اتنی گنجائش ہوتی کہ ہم یہ پورا انٹرویو استاد کے تبصروں کے ساتھ نقل کر سکتے۔ اس کے خاص خاص حصے ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔ پہلے سوال ہے، پھر فاروقی صاحب کا جواب اور آخر میں استاد لاغر مراد آبادی کا تبصرہ۔

حسن رضوی: میں آپ سے دریافت کرنا چاہوں گا کہ آپ نے سب سے پہلے ادب کی کس صنف میں لکھنا شروع کیا تھا؟

فاروقی: بہت چھوٹی عمر میں ہم اپنے گھر میں ہی ہاتھ سے لکھ کر ایک پرچہ ''گلستاں'' کے نام سے نکالا کرتے تھے۔ کوئی واضح صنف متعین نہیں تھی۔ جو جی میں آتا تھا، لکھتے جاتے تھے۔

استاد: اب تک اسی روش پر عمل ہو رہا ہے، جو جی میں آتا ہے.....

انور سدید: بچپن کیسے گزرا؟

فاروقی: کتابوں اور کاپیوں کے اوراق میں گم ہو کر بے پاؤں گزر گیا۔ جب بڑا ہوا تو وہ کمی تاش کے کھیل نے پوری کر دی۔ اب جب کہ بڑھاپا آ گیا ہے تو اب وقت ہی نہیں ملتا، نہ وہ ذہن رہا ہے..... جب میں نے ''گلستان'' نکالا تو اس وقت میری عمر نو سال تھی۔ وہ پرچے میں نے سنبھال کر نہیں رکھا، کیوں کہ اس میں میرے لیے بدنامی اور رسوائی کے بہت سامان موجود تھے۔

استاد: یہ سامان تو اُن رسالوں اور کتابوں میں بھی موجود ہے، جنھیں آپ نے سنبھال کر رکھا ہے، بلکہ شایع بھی کرا دیا ہے۔

انور سدید: آپ نے اپنا تخلیقی سفر کیسے شروع کیا؟

فاروقی: میں نے اپنا تخلیقی سفر ایک مصرع سے ۱۹۴۴ء میں شروع کیا تھا۔ وہ مصرع اپنی تمام تر کمزوریوں کے ساتھ مجھے آج بھی یاد ہے۔

معلوم کیا کسی کو مرا حال زار ہے

استاد: ایسی بے سروسامانی کے عالم میں تو الٰہ آباد سے دہلی تک کا سفر بھی نہیں کرنا چاہیے، چہ جائیکہ تخلیقی سفر۔ فاروقی ہی کا حوصلہ ہے کہ انھوں نے اس مصرع سے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا۔ ہمیں تو اس مصرع میں کوئی کمزوری نظر نہیں آئی، ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ مصرع کہتے وقت شاعر کا حال زار کسی کو معلوم نہیں تھا، اب سب کو معلوم ہے۔

حسن رضوی: آپ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ احمد مشتاق فراق سے بڑے شاعر ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ آپ اس بیان کی وضاحت فرما دیں؟

فاروقی: فراق غزل کے لوازم کو پورا نہیں کرتے۔ فراق کے ہاں اچھا مصرع تو مل جاتا ہے، لیکن مصرع شعر میں ڈھلتا ہے تو وہ اس میں غیر متوازن ہو جاتا ہے۔ پھر بعض اوقات ان کے ہاں ایسے لفظ بھی ملتے ہیں، جو غیر ضروری ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں...... دو مصرعوں کے درمیان ربط کا فقدان بھی پایا جاتا ہے۔ فراق کی شاعری...... میں معنی آفرینی اور گہرائی بہت کم ہے...... اس لیے میرے خیال میں احمد مشتاق...... غزل کے تقاضوں کو فراق صاحب سے بہتر ادا کرتے ہیں۔

استاد: فراق کے ہاں اگر دو مصرعوں میں ربط نہیں پایا جاتا تو احمد مشتاق کے ہاں ایک ہی مصرع کے دونوں سروں میں کوئی ربط نہیں ہوتا۔ احمد مشتاق کے ہاں گہرائی کا اندازہ ان کے شعروں سے نہیں، کسی اور چیز سے ہوتا ہے۔ مثلاً:

یہ دریا خامشی سے بہہ رہا ہے
اسے دیکھیں کہ اس میں ڈوب جائیں

اب کسی کو کیا پڑی ہے کہ دریا کی گہرائی ناپنے کے لیے اپنی زندگی کو داؤں پر لگا دے۔ اگر فراق اور ایسی ہی تھی تو فاروقی کو چاہیے تھا کہ احمد مشتاق کی بجائے اپنے آپ کو فراق سے بہتر شاعر قرار دیتے۔ اس سے فراق کی شہرت ہی خراب ہوتی۔ بے چارہ احمد مشتاق مفت میں بدنام نہ ہوتا۔

حسن رضوی: وارث علوی کے ڈاکٹر وزیر آغا، انتظار حسین اور آپ کے بارے میں لکھے ہوئے مضامین کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

فاروقی: دراصل وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تحریر میں شگفتگی پیدا کرنے کے لیے جملے، لطیفے اور چٹکل جھڑیاں ضروری ہیں......... اگر یہ جملے اور فقرے نکال دیے جائیں تو مضمون بہت چھوٹے رہ جاتے ہیں۔

استاد: فاروقی کا اندازہ درست نہیں ہے۔ اگر وارث علوی کے مضامین سے لطیفے، جملے اور پھل جھڑیاں نکال دی جائیں تو باقی صرف عنوان رہ جاتا ہے۔

انور سدید: وارث علوی کے ہاں شگفتگی کے علاوہ دشنام بھی ہوتا ہے...... اس ناشائستہ رویے کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

فاروقی: جو مضمون انھوں نے میرے بارے میں لکھا تھا، اسے پڑھ کر مجھے بہت ہنسی آئی تھی۔ میرے خیال میں جس تحریر کو پڑھ کر ہنسی آئے، وہ شگفتہ ہی ہوتی ہے۔

استاد: ہمیں اس جواب پر ہنسی آ رہی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فاروقی کا جواب خاصا شگفتہ ہے، مگر انور سدید کا سوال تشنۂ جواب رہا۔ فاروقی صاحب کو چاہیے تھا کہ وہ وارث علوی

کے ناشائستہ رویے پر کوئی سزا تجویز کرتے۔ مناسب سزا یہی ہو سکتی ہے کہ وارث علوی کو دبستانِ سرگودھا کا اعزازی رکن بنا لیا جائے۔

انتظار حسین: ہندوستان میں نئی شاعری کے آغاز کے ساتھ کچھ نئے نام سامنے آئے تھے۔ بعد میں یہ سلسلہ رک سا گیا؟

فاروقی: بلراج کومل، عمیق حنفی، محمد علوی جنھیں بڑا شاعر کہا جاتا ہے، ایک دن میں نہیں بن گئے تھے۔

استاد: ہمیں فاروقی صاحب کی رائے سے اتفاق ہے۔ انھوں نے جن بڑے شاعروں کے نام لیے ہیں، وہ یقیناً ایک دن میں نہیں بنے تھے۔ اس سے کم وقت میں بنے ہوں گے۔

انتظار حسین: فراق پر بھی اتنا کام نہیں ہوا، جتنا میر یا غالب پر ہوا ہے، حالاں کہ فراق کے ہاں بھی ایک روانی موجود ہے، جو میر کی میراث گردانی جاتی ہے؟

فاروقی: آپ نے فراق کے ساتھ میر کا نام لیا ہے......... ان دونوں کا کوئی مقابلہ نہیں۔ میر جہاں سے اپنا سفر آغاز کرتے ہیں، فراق وہاں سے تین سو میل پیچھے ہیں۔

استاد: گھوڑ دوڑ میں تو فاصلہ ناپا جاتا ہے، لیکن شاعروں کے درمیان زمانی فاصلے کو معیار بنانا بالکل نئی بات ہے۔ اگر یہ اسلوبِ تنقید مروج ہو گیا تو اس قسم کی تنقید لکھی جائے گی: شمس الرحمٰن فاروقی وارث علوی سے ایک سو میل آگے ہیں، گوپی چند نارنگ سے ساٹھ میل پیچھے ہیں۔ باقر مہدی، وارث علوی سے چھ فٹ اونچے ہیں، کیوں کہ وہ علوی کے کندھوں پر سوار ہیں۔

حسن رضوی: ہندوستان اور پاکستان کا ادبی منظر نامہ آپ کے سامنے ہے۔ اس وقت ہندوستان میں تنقید، افسانے اور شاعری کو آپ کس طرح دیکھتے ہیں؟

فاروقی: افسانے اور شاعری میں مجھے دونوں ملکوں میں سرگرمیاں تیز نظر آتی ہیں......... پاکستان میں تنقید کے بنیادی فکری پہلو اور سوالات......... پر کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا، حالاں کہ ہندوستان میں ادنیٰ سے ادنیٰ نقاد بھی ان بنیادی مسائل سے الجھا ہوا نظر آتا ہے۔

استاد: اطلاعاً عرض ہے کہ پاکستان میں ادنیٰ سے ادنیٰ نقاد نہیں پائے جاتے۔ سارے ہی اعلیٰ سے اعلیٰ نقاد ہیں، اس لیے وہ بنیادی مسائل سے خود نہیں الجھتے، مسائل ہی کو الجھائے رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر سلیم اختر: بھارت میں اُردو کا مستقبل کیا ہے؟

فاروقی: میں اُردو کے مستقبل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔

استاد: نقادوں کو تو خود اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوتا، وہ کسی ادب کے مستقبل کے بارے میں کیا بتا سکتے ہیں۔

(یکم اگست ۱۹۸۶ء)

شاعری کو دریا میں ڈال

پچھلے دنوں ایک کتاب ہماری نظر سے گزری، جس کا نام ہے "کمان اور زخم"۔ اس نام سے ہم یہ سمجھے کہ علامتی افسانوں کا کوئی مجموعہ ہوگا، کیوں کہ اس قسم کے افسانوں کو بھی کمان کی طرح خاصا زور لگا کر کھینچنا پڑتا ہے، تب کہیں علامت کی چڑھی کمان اترتی ہے، لیکن مذکورہ کتاب کی ورق گردانی کی تو معلوم ہوا، اس کا تعلق تنقید سے ہے۔ تنقیدی کتابیں، ہم کیا، کوئی بھی معقول آدمی نہیں پڑھتا، لیکن ورق گردانی کے دوران اس کتاب کے جو جملے نظر سے گزرے، وہ اتنے دلچسپ تھے کہ ہم اس کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھنے پر مجبور ہو گئے۔ یہی مجبوری اب ہم سے یہ کالم لکھوا رہی ہے، تاکہ ہم یہ بتا سکیں کہ "کمان اور زخم" ہر اس شخص کو پڑھنی چاہیے، جو جدید اُردو ادب، خصوصاً جدید اردو تنقید سے دلچسپی رکھتا ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم اس کتاب کے بارے میں مزید کچھ عرض کریں، یہ بتا دینا مناسب ہوگا کہ اس کا مصنف کون ہے۔ اوپر کی سطروں میں ہم نے اس کتاب کی جو تھوڑی سی تعریف کی ہے، اس سے ذہین قارئین نے یہ نتیجہ ضرور اخذ کر لیا ہوگا کہ ہمیں اس کتاب کے مصنف ہیں، کیوں کہ آج کل عموماً خود مصنفین ہی اپنی کتابوں کی تعریف کرتے ہیں، لیکن بخدا اس کتاب کے مصنف ہم نہیں، فضیل جعفری ہیں۔

فضیل جعفری ہندوستان کے جدید شاعروں اور نقادوں میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ پاکستان میں بھی خاصے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ پہلی بار انھیں اس وقت پہچانا گیا، جب سلیم احمد مرحوم کی تنقید نگاری کے بارے میں ان کا مقالہ شائع ہوا۔ دوسری مرتبہ ان کو اس وقت شہرت ملی، جب ڈاکٹر وزیر آغا کی تنقید نگاری پر ان کے مضمون کے جواب میں ڈاکٹر انور سدید کا فکر انگیز مقالہ شائع ہوا۔ یہ دونوں مقالے "کمان اور زخم" کا حصہ ہیں۔ فضیل جعفری کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ "چٹان اور پانی" (تنقیدی مقالات) اور "رنگ شکستہ" (غزلیات)۔ "کمان اور زخم" ان کی تیسری کتاب ہے، جو پچھلے مہینے بمبئی سے شائع ہوئی ہے۔

فضیل جعفری بمبئی میں رہتے ہیں، ایک کالج میں انگریزی پڑھاتے ہیں، لیکن شاعری اُردو میں

ہی کرتے ہیں۔ غزلوں میں ان کا اپنا ایک رنگ ہے۔ اس قسم کے خوبصورت شعر ان کے دیوان میں بکثرت ملتے ہیں:

آخر چراغ درد محبت بجھا دیا
سر سے کسی کی یاد کا پتھر گرا دیا
اندھیرے کمروں سے جیسے گزری ہو حیات
بچھڑ کے تجھ سے یہ احساس بار بار ہوا
گھر سے باہر نہیں نکلا جاتا
روشنی یاد دلاتی ہے تری

اور ایسے مزے دار شعر بھی انھوں نے خوب جی بھر کے کہے ہیں:

برسوں سے جلتی ریت پہ ہیں اہل دل کھڑے
بیٹھے ہیں کرسیوں پہ منافق بڑے بڑے
ہوتے نہ لکچرر تو کئی لوگ ، جعفری!
ساحل پہ بیچتے کہیں چھولے وہی بڑے

اپنے پیشے کی رعایت سے انھوں نے کئی یاد رکھنے کے لائق شعر کہے ہیں۔ ایک تو آپ نے پڑھ لیا۔ ایک اور سُن لیجیے:

سب ہمیں معلوم ہے پڑھنا پڑھانا ، جعفری!
نام پر لکچر کے چلیے کچھ تماشا کیجیے

فضیل جعفری لیکچرر ہی نہیں، نقاد بھی ہیں، اس لیے نقادوں کے بارے میں بھی ان کی رائے اچھی نہیں:

ناقدریٔ ادب میں جلاتے تو ہیں چراغ
بہتات عقل کی ہو تو کھاتے ہیں گھاس بھی

موصوف کی شاعری کے بارے میں اور بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، لیکن ہمارا موضوع ان کی تازہ تنقیدی کتاب ہے، اس لیے باقی کالم میں سنجیدہ گفتگو ہوگی۔ فضیل جعفری کا تو کیا، غالبؔ کا بھی کوئی شعر پیش کر کے سنجیدگی کی فضا کو مجروح نہیں کیا جائے گا۔

"کمان اور زخم" ۱۹۶۰ء کے بعد کی جدید تنقید کا جائزہ ہے۔ یہ کوئی "تاریخ تنقید" قسم کی چیز نہیں، جس میں نقادوں کی مردم شماری کی گئی ہو۔ صرف ایسے نقادوں کو موضوع بحث بنایا گیا ہے، جو گزشتہ چوتھائی صدی کے اہم ترین نقاد ہیں۔ ابتدا میں جدید تنقید کے پیشرووں فراق، کلیم الدین احمد، میراجی اور محمد حسن عسکری کے تنقیدی نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے بعد باقر مہدی، وارث علوی، سلیم احمد، ڈاکٹر وزیر

آغا، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمن فاروقی پر فرداً فرداً مفصل گفتگو کی گئی ہے۔ بیچ بیچ میں ترقی پسند تحریک، جدیدیت اور ہیئتی تنقید وغیرہ پر فکر انگیز مباحث ہیں، نیز بعض پروفیسر نقادوں یا نقاد نما پروفیسروں کے تذکرے ہیں۔

اس کتاب کی سب سے پہلی اور بڑی خوبی یہ ہے کہ فضیل جعفری نے پہلے سے یہ طے نہیں کیا کہ انھیں کس کے ساتھ کیا سلوک کرنا ہے۔ انھوں نے ہر طرح کے شخصی اور نظریاتی تعصبات سے بلند ہو کر جدید اردو تنقید کے خدوخال اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ جہاں کوئی معقول اور اچھی بات نظر آئی ہے، اس کی تعریف کی ہے اور جہاں غلطیاں یا غلط کاریاں نظر آئی ہیں، ان کی مذمت کی ہے۔ تعریف بھی مدلل ہے اور مذمت بھی مدلل، لیکن فضیل جعفری کا اصل مقصد تعریف یا مذمت نہیں، بلکہ ان رجحانات کی نشان دہی ہے، جو گزشتہ چوتھائی صدی میں ہماری تنقید کے غالب رجحانات رہے ہیں۔ ظاہر ہے، اس مقصد کے لیے اہم نقادوں ہی کو موضوع بنا کر بحث کی جا سکتی تھی، سو فضیل جعفری نے یہ کام کیا اور نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ۔ فضیل جعفری کی باخبری کا یہ عالم ہے کہ گزشتہ چوتھائی صدی کی تمام تنقیدی تحریریں، اہم ہوں یا غیر اہم، ان کی نظر میں ہیں۔ حد تو یہ ہے کہ انھوں نے عبادت بریلوی کو بھی پڑھا ہے۔ حیرت ہے کہ انھوں نے ایسی ثقیل چیزیں اتنی بڑی تعداد میں کیسے پڑھ ڈالیں اور پھر انھیں ہضم بھی کر لیا۔ سنا ہے کہ ثقیل چیزیں کھانے سے دنیا اور ثقیل چیزیں پڑھنے سے عاقبت خراب ہوتی ہے۔

فضیل جعفری کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ انھیں اُردو لکھنی آتی ہے۔ آج کل کے نقادوں کا یہ حال ہے، انھیں اور سب کچھ آتا ہے، اردو ہی نہیں آتی۔ ان کی کتابیں، تنقید سے زیادہ علم جفر کی کتابیں معلوم ہوتی ہیں، لیکن فضیل جعفری کو علم جفر سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ اپنے خیالات کے اظہار پر پوری طرح قادر ہیں اور بہت اچھی نثر لکھتے ہیں۔

''کمان اور زخم'' یوں تو نہایت سنجیدہ قسم کی کتاب ہے، لیکن اس کی سنجیدگی کا یبوست سے کوئی تعلق نہیں۔ کہیں کہیں بوقتِ ضرورت فضیل جعفری طنز و مزاح سے بھی کام لیتے ہیں۔ مثلاً آج کل کے رسالوں اور ایڈیٹروں کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

''ہر قسم کی بکواس کے لیے رسائل کے صفحات حاضر رہتے ہیں۔ جبھی تو بھٹیچر سے بھٹیچر رسالہ اپنے پہلے شمارے سے ہی مخصوص مزاج کا حامل اور اُردو رسائل کی تاریخ میں سنگ میل بن جاتا ہے اور مدیر محترم، جو کل تک ایک گم نام شہری تھے، راتوں رات نقاد، شاعر اور افسانہ نگار بن جاتے ہیں۔ خطوط کی شکل میں بے ضمیر ادیبوں اور شاعروں کی طرف سے تحفتہً ملے ہوئے اونچی ایڑی کے جوتے پہن کر یوں اتراتے پھرتے ہیں، جیسے یہی ان کا حقیقی قد ہو۔''

فضیل جعفری پروفیسر نقادوں کے سخت خلاف ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''بیشتر پروفیسر حضرات جس قسم کی تنقید لکھتے ہیں، وہ عام قارئین اور خصوصاً طلبہ میں نہ صرف بدذوقی، بلکہ ادب سے نفرت پیدا کرنے کے لیے بھی کافی ہوتی ہے۔''

مزید ارشاد ہوتا ہے:

''ہمارے یہاں اُردو کے بیشتر اساتذہ کی عمر تو پروفیسر شپ کے خواب دیکھنے اور اس خواب کو عملی جامہ پہنانے کے لیے جوڑ توڑ کرنے میں گزر جاتی ہے اور باقی عمر ساتھی اساتذہ کے خلاف گم نام خطوط لکھنے اور امتحان کی کاپیاں دیکھنے میں۔''

افتخار جالب اور احمد ہمیش دو مظلوم ترین ادیب ہیں۔ ان دونوں کا ذکر جہاں کہیں ہوتا ہے، برنگ دیگر ہوتا ہے۔ شاید اسی وجہ سے افتخار جالب، مدت ہوئی، لکھنے لکھانے کا شغل ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر چکے ہیں۔ فضیل جعفری پہلے نقاد ہیں، جنھوں نے افتخار جالب سے دلی ہمدردی، بلکہ تعزیت کا اظہار کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''افتخار جالب ان بدقسمت شاعروں میں ہیں، جن پر نیکی کر دریا میں ڈال والی مثل صادق آتی ہے۔ جب ہمارے روایتی نقاد افتخار جالب کو ایک ادبی خبیث روح کے طور پر پیش کرتے ہیں تو مجھے ان پر تعجب ہوتا ہے نہ افسوس، لیکن جب باقر مہدی انھیں ورسی شاعر کہتے ہیں یا بلراج کومل Freak کے لقب سے نوازتے ہیں تو یقیناً تعجب بھی ہوتا ہے اور افسوس بھی۔''

فضیل جعفری نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے، ہم ان کی دل سے قدر کرتے ہیں، لیکن صورت حال یہ ہے کہ افتخار جالب نے نیکی نہیں کی، شاعری کی ہے اور اگر اسے انھوں نے یا دوسروں نے دریا برد کر دیا تو اس پر افسوس کی ضرورت نہیں، کیوں کہ نیکی کی طرح کبھی کبھی شاعری بھی دریا میں ڈالنے کے لائق ہوتی ہے۔

احمد ہمیش کا معاملہ قدرے مختلف ہے۔ فضیل جعفری نے انھیں ہمدردی یا تعزیت کا مستحق نہیں سمجھا بلکہ یہ لکھا ہے:

''احمد ہمیش جب تک ہندوستان میں رہے، بے چارے مارے مارے تو بہت پھرے، لیکن زیادہ تر الہ آباد، بلیا اور غازی پور کی طرف۔ آخری زمانہ حیدر آباد میں بے حد پر اسرار انداز میں کسی مالدار بیوہ کے کنج عافیت میں گزارا۔''

احمد ہمیش کو جس جرم کی یہ سزا دی گئی ہے، وہ جرم دراصل باقر مہدی کا تھا۔ باقر مہدی نے اپنے ایک مقالے میں لکھا تھا کہ جدید شاعری صرف بڑے صنعتی شہروں میں پیدا ہو سکتی ہے۔ پھر اپنے ایک دوسرے مقالے میں اپنے پسندیدہ جدید شاعروں کی فہرست میں احمد ہمیش کا نام بھی شامل کر دیا۔ فضیل جعفری نے مذکورہ سطروں میں یہ کہنا چاہا ہے کہ احمد ہمیش کا تعلق کبھی کسی بڑے صنعتی شہر سے نہیں رہا، اس لیے وہ باقر مہدی کے نارمولے کے مطابق جدید شاعر نہیں ہو سکتے۔ فضیل جعفری کو شاید معلوم نہیں کہ گزشتہ

دس بارہ برسوں سے احمد ہمیش کا قیام کراچی جیسے بڑے صنعتی شہر میں ہے۔ اس شہر میں آ کر انھوں نے شاعری ترک کر دی ہے۔ گویا باقر مہدی کے فارمولے کے برعکس یہ ثابت کر دکھایا کہ صنعتی شہروں میں جدید شاعری نہیں ہو سکتی۔

فضیل جعفری کو تنقید کے ساتھ ساتھ تحقیق سے بھی خاصی دلچسپی معلوم ہوتی ہے۔ اس کی ایک دلچسپ مثال ملاحظہ کیجیے۔ میراجی نے بودلیئر پر اپنے مشہور مضمون میں کسی غلط فہمی کی بنا پر لکھ دیا تھا کہ ۱۸۴۱ء میں بودلیئر کلکتہ آیا تھا اور یہاں کے سانولے سلونے حسن بنگال سے متاثر ہوا تھا۔ میراجی کی یہ بات کئی نقادوں نے اس اعتماد کے ساتھ دہرائی ہے، جیسے بودلیئر کلکتے میں انھیں کا مہمان تھا۔ فضیل جعفری نے انکشاف کیا ہے کہ بودلیئر نے کلکتہ دیکھا تک نہیں اور نہ کبھی بنگال کے سفر کا ارادہ کیا تھا۔ ہمارے خیال میں فضیل جعفری نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ بودلیئر کے سفر کلکتہ کی روایت ہمارے بعض نقادوں کی وجہ سے اتنی عام ہو چکی ہے کہ اب اس کی تردید کرنا مسلمات کی تردید کے مترادف ہے۔

فضیل جعفری نے اپنی کتاب میں ڈاکٹر وحید اختر اور علی سردار جعفری کے دو ایسے معنی خیز جملوں کا حوالہ بھی دیا ہے، جو ہماری نظر سے پہلی بار گزرے ہیں۔ یہ جملے اس لائق ہیں کہ اردو والے انھیں گرہ سے باندھ لیں۔ ڈاکٹر وحید اختر کا جملہ یہ ہے:

"جدید شاعری کی تنقید کے لیے میرا بنیادی معیار میری اپنی شاعری ہے۔"

اگر تمام جدید شاعر اس طرز عمل کو اپنا لیں تو جدید اُردو شاعری پیشہ ور نقادوں کی چیرہ دستیوں سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو سکتی ہے۔ ہر شاعر کے لیے اُس کی شاعری اُس کا معیار تنقید بن جائے گی۔

سردار جعفری کا جملہ، جو باقر مہدی کے بارے میں ہے، یہ ہے:

"انھیں ترقی پسندوں کی کردار کشی پر مامور کیا گیا ہے۔"

باقر مہدی کو اس کام پر جس نے بھی مامور کیا، بہت غلط کیا، کیوں کہ یہ کام باقر مہدی کے تو کیا، کسی کے بھی بس کا نہیں۔ کردار کشی خلا میں نہیں کی جاتی، وہاں کی جاتی ہے، جہاں کوئی کردار ہو۔

(۸/اگست ۱۹۸۶ء)

☆............☆............☆

شعر سنا کر کبابوں کی بے حرمتی نہ کی جائے

جناب عالم تاب تشنہ کے بارے میں ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ ایک خوش فکر شاعر ہیں۔ ان کے دو مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں، جن میں بہت سے ایسے شعر ہیں، جو دل اور دماغ پر بیک وقت اثر کرتے ہیں، بشرطیکہ قاری کے پاس یہ دونوں چیزیں ہوں۔ تشنہ صاحب سے مفصل تعارف ان کے ایک انٹرویو کے ذریعے ہوا ہے۔ اس سے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ وہ عام شاعروں کے برعکس پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ ان کے پاس جو تعلیمی اسناد ہیں، وہ خاصی مرعوب کن ہیں، یعنی ایم کام، ایف سی آئی ٹی لندن، اور ایم کنکیٹی کٹ یونیورسٹی امریکہ۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ جس شخص کے پاس اتنی بہت سی تعلیمی اسناد ہوں، اسے شعر کہنے کی کیا ضرورت ہے۔

جب بھی ہمیں کوئی ایسا شخص نظر آتا ہے، جو اعلیٰ درجے کی تعلیمی یا فنی صلاحیت رکھنے کے باوجود شعر کہتا ہے تو ہمیں تعجب ہوتا ہے۔ شعر کہنا تو بے کاروں اور بے روزگاروں کا مشغلہ ہے۔ حبیب جالب اور احمد فراز پر ہمیں کبھی تعجب نہیں ہوا، کیوں کہ یہ دونوں کوئی اور کام کر ہی نہیں سکتے۔ اس بات کی وضاحت کے لیے ہم ایک مثال پیش کریں گے۔ کچھ عرصہ ہوا مشہور شاعر مظفر علی خان مظفر نے بہاری کبابوں کی دعوت کی۔ کباب انھوں نے خود تیار کیے تھے، جو ایسے عمدہ اور لذیذ تھے کہ دعوت کے بعد جب شعر و شاعری کا دور شروع ہوا تو حاضرین نے شعر سننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ کبابوں کی بے حرمتی نہیں ہونی چاہیے۔ اس پر ہم نے مظفر صاحب سے عرض کیا:

"جب آپ اتنے عمدہ کباب بنا لیتے ہیں تو پھر شعر کیوں کہتے ہیں؟"

مذکورہ انٹرویو سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تشنہ صاحب صرف اُردو ہی میں نہیں، انگریزی میں بھی لکھتے ہیں۔ اس زبان میں ان کی دو کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں سے ایک کا نام "حادثات کی روک تھام" ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ تشنہ صاحب نے انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں کو خیالات کے اظہار کا

ذریعہ بنایا ہے۔ اُردو میں شعر کہتے ہیں، یعنی یہ بتاتے ہیں کہ حادثے کس طرح ہونے چاہئیں اور انگریزی میں ان کی روک تھام کے طریقے بیان کرتے ہیں۔

یہ انگریزی دا شعور نے لیا ہے۔ انھوں نے عالم تاب تشنہ صاحب سے پوچھا۔ ''آپ نے اپنی شاعری کے کیا معیارات مقرر کیے ہیں۔''

تشنہ صاحب نے فرمایا کہ وہ ابھی تک اپنی شاعری سے مطمئن نہیں ہیں۔ اُن کا ارادہ ہے کہ وہ اپنے دس مجموعے شائع کرنے کے بعد انھیں رد کر دیں گے اور پھر گیارہواں مجموعہ تیار کریں گے، جو ان کا نمایندہ مجموعہ ہوگا۔

ہمیں تشنہ صاحب سے اسی جواب کی توقع تھی، کیوں کہ ہر بڑا شاعر اپنے کلام سے مطمئن نہیں ہوتا، لیکن ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے کہ وہ اپنے دس مجموعے رد کرنے کے بعد گیارہویں مجموعے سے مطمئن ہوں۔ اگر گیارھواں مجموعہ دوسروں نے رد کر دیا تو کیا ہوگا۔ ویسے بھی بات معقول نظر آتی ہے کہ جب دس مجموعوں کو رد کرنے کا حق آپ نے استعمال کر لیا تو کم از کم ایک مجموعے کو رد کرنے کا حق دوسروں کو بھی ملنا چاہیے، اس لیے ہماری گزارش ہے کہ کلام جیسا بھی ہے، اسے رد نہ کیجیے۔ یہ کام آنے والے زمانے پر چھوڑ دیجیے۔ وہ اسے بہتر طور پر انجام دے سکتا ہے۔

سوال کیا گیا۔ ''ادب کے لیے پبلک ریلیشنگ کی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ اسے کس حد تک ضروری سمجھتے ہیں؟''

تشنہ صاحب نے فرمایا:

''پی آر کے لیے آدمی کو بڑا پتہ مارنا پڑتا ہے۔ آدمی کو اپنے آپ کو پروجیکٹ کرنے کے لیے یا تو بغاوت پر آمادہ کرنا پڑتا ہے یا اپنے مقام سے گرنا پڑتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاعر کے لیے اس کا ابلاغ بہت ضروری ہے اور اس کے لیے پی آر کرنا چاہیے، لیکن پی آر کے لیے نہ تو اپنے مقام سے گرنا چاہیے اور نہ تو صیف باہمی میں لگنا چاہیے۔''

جواب بہت معقول ہے، لیکن اپنے مقام سے نہ گرنے کی جو شرط لگا دی ہے، وہ ہمارے خیال میں بہت سخت ہے، کیوں کہ اکثر شاعروں کے پاس کوئی مقام نہیں ہوتا، ان کے لیے بہت مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ جب وہ نہ گرنا چاہیں گے تو ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ کہاں سے نہ گریں اور کہاں جا کر نہ گریں۔

پی آر کے لیے پتہ مارنے والی بات بہت اچھی ہے اور اس پر ہم نے آج کل کے شاعروں کو عمل کرتے بھی دیکھا ہے۔ یہ شاعر، شاعری پر اتنا وقت صرف نہیں کرتے، جتنا اپنی شاعری پر دوسروں کی رائے لکھوانے پر صرف کرتے ہیں۔ آج کل ہر دیوان پر آٹھ دس افراد کی آرا ضرور ہوتی ہیں۔ یہ آرا

لکھوانے کے لیے شعرائے کرام در بدر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ سو آدمیوں سے ملتے ہیں تو کب کہیں دس رائے لکھ کر دیتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک شاعر صاحب ہمارے پاس بھی چلے آئے۔ ہم نے عرض کیا کہ ہم نقاد نہیں ہیں، اس لیے ہم سے رائے لکھوانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ کہنے لگے، آپ کالم نگار تو ہیں۔ ہم نے کہا تو پھر کالم لکھ دیں گے۔ کہنے لگے، وہ تو آپ اپنی مرضی کا لکھیں گے، رائے تو ہم اپنی مرضی کی لکھوانا چاہتے ہیں۔ ان کے شدید اصرار پر ہم نے فلیپ کے لیے چند سطریں لکھ دیں، جن میں شاعر مذکور کو میر و غالب کے قبیلے کا شاعر بتایا گیا تھا۔ کتاب چھپ کر آئی تو ہم نے کالم بھی لکھ دیا اور اس میں عرض کیا کہ ایک عدد رائے دہندہ نے شاعر مذکور کو غالب و میر کے قبیلے کا شاعر قرار دیا ہے، جس کا مقصد شاعر کا درجہ بڑھانا نہیں، میر و غالب کا مرتبہ کم کرنا ہے۔ یہ کالم پڑھ کر شاعر صاحب دوبارہ ہمارے پاس آئے اور ہمارا شکریہ ادا کیا اور فرمایا:

''آپ نے میری کتاب پر فلیپ لکھ کر میر و غالب کی عزت افزائی کی تھی، آپ کے کالم سے میری عزت افزائی ہوئی ہے۔''

تشنہ صاحب نے بتایا ہے کہ انھوں نے ۵۹ء میں شاعری ترک کر دی تھی۔ ۷۲ء میں جب دوبارہ شاعری شروع کی تو......

''میں نے دیکھا کہ دو نسلیں گزر چکی ہیں۔ شاعری کا انداز بدل چکا ہے، مجھے بڑی دشواری ہوئی کہ کس طرح اپنی شاعری کو جاری رکھ سکوں گا۔ پوری ایک نسل کھڑی تھی بام عروج پر، جس میں سحر انصاری اور محسن بھوپالی وغیرہ تھے۔ اسی دوران میں میں نے اپنے اندر جد و جہد کی، رنگ اتارا، چیلنج کیا اور اب آپ دیکھ رہے ہیں، میں کہیں نہ کہیں ان شعرا کے قریب کھڑا ہوں۔''

حیرت ہے کہ اتنی جد و جہد اور محنت کے بعد جناب تشنہ کو سحر انصاری اور محسن بھوپالی کے قریب کھڑے ہونے کی جگہ ملی، حالاں کہ ان دونوں کو تو خود اس جگہ تک پہنچنے کے لیے کسی قسم کی جد و جہد اور محنت نہیں کرنی پڑی، کیوں کہ یہ دونوں شاعری شروع کرنے سے پہلے بھی اسی جگہ کھڑے تھے۔

جناب تشنہ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا:

''آج کل میں جو شاعر کے طور پر اسٹیبلش ہوں تو مجھے فخر حاصل ہے کہ میں اپنے ملک کے ان چند شعرا میں سے ہوں، جنھیں دنیا کے ہر کونے میں مشاعرے کے لیے بلایا جاتا ہے۔''

جناب تشنہ کو اس صورتِ حال سے بددل نہیں ہونا چاہیے۔ کراچی کے مشاعروں میں صرف وہی شاعر بلائے جاتے ہیں، جن کے پیشِ نظر مشاعروں میں شمولیت کے سوا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ تشنہ صاحب کے سامنے تو خدا کے فضل سے ایک بڑا مقصد ہے۔ گیارہ میں سے صرف دو دیوان مکمل ہوئے ہیں، باقی نو

کا کام باقی ہے۔ اگر مقامی مشاعروں کی مصروفیات بڑھ گئیں تو یہ کام کون کرے گا؟

ہم نے یہ دیکھا ہے کہ ہر ادیب کے انٹرویو میں پروین شاکر کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ اس انٹرویو میں بھی یہ موجود ہے۔ سوال تھا:

"پروین شاکر کی مقبولیت میں کس حد تک دوسرے محرکات کارفرما ہیں؟"

تشنہ صاحب کا جواب یہ ہے:

"وہ بہت زیادہ لکھنے کی وجہ سے اچھے اور برے کی تمیز نہیں کر پاتیں۔ ان کی مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ انھیں ایک خاص وقت میں ایک خاص لابی ملی۔ جتنی ان کی شہرت ہے، وہ اتنے اچھے شعر نہیں کہتیں۔"

سوال بھی غلط ہے اور جواب بھی غلط۔ ہمارے خیال میں پروین شاکر کو اچھے اور برے شعروں ہی کی نہیں، اچھے اور برے شاعروں کی بھی تمیز ہے۔ ان کی مقبولیت سے ہمارے اکثر شعرا خوش نہیں ہیں اور اسی لیے ایک عرصے سے ان کے خلاف یہ مہم چلائی جا رہی ہے کہ ان کے شاعرانہ مرتبے کو گھٹایا جائے۔ ان کی شہرت کو غیر ادبی بنیادوں پر استوار دکھایا جائے، مگر سچی بات یہ ہے کہ پروین شاکر جیسی بھی شاعرہ ہوں، وہ اپنے ہم عصروں میں سب سے بہتر ہیں۔ وہ خوش قسمت ہیں کہ وہ حاسد نہیں، محسود ہیں اور یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔

(۱۵/اگست ۱۹۸۶ء)

☆............☆............☆

الزاموں اور افواہوں کی بنیاد پر تنقید

ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ جاذب قریشی خوش گو شاعر ہیں اور ان کی شاعری ایک عالم سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے، لیکن یہ پہلی بار معلوم ہوا ہے کہ وہ بالغ نظر نقاد بھی ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ "آنکھ اور چراغ" کے نام سے حال ہی میں شائع ہوا ہے، جس میں عہدِ حاضر کے نو اہم شاعروں کے فکر و فن پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ شاعروں کے نام تو ہم بعد میں بتائیں گے، پہلے یہ ملاحظہ فرمائیے کہ جاذب قریشی نے اس دعوے کے ساتھ دنیائے تنقید میں قدم رکھا ہے...... "میں بہت کم علم آدمی ہوں۔ فلسفہ، مذہب اور نفسیاتی علوم وغیرہ میں نے نہیں پڑھے۔"...... اگر جاذب صاحب کے بارے میں یہی دعوے کوئی اور شخص کرتا تو ہم نہایت شدومد سے اس کی تردید کرتے، لیکن جاذب صاحب کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ وہ آرائشِ بیان سے کام نہیں لیتے، ببانگِ دہل سچ بولتے ہیں، اس لیے اس دعوے کی تردید کی نہیں، تصدیق کی ضرورت ہے، لیکن افسوس کہ ہم اس دعوے پر مہرِ تصدیق ثبت نہیں کر سکتے، کیوں کہ ہم خود بھی خاصے کم علم ہیں۔ در اصل یہ کام فرمان فتح پوری، انجم اعظمی اور سحر انصاری جیسے اہلِ علم کے کرنے کا ہے، جو ان نو شاعروں میں شامل ہیں، جن پر جاذب قریشی نے مضامین لکھے ہیں۔

جناب جاذب نے بلاوجہ فلسفہ، مذہب اور نفسیاتی علوم سے اپنی لاعلمی کی تشہیر کی ہے۔ نقاد کے لیے ان علوم کو تو کیا، ان تحریروں کو بھی پڑھنا ضروری نہیں ہوتا، جن پر اُسے اظہارِ خیال کرنا ہوتا ہے، کیوں کہ تنقید لکھنے کے لیے خالی الذہن ہونا پہلی شرط ہے۔ جو نقاد خالی الذہن ہو کر تنقید نہیں لکھتے، وہ عموماً تعصبات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ذاتی پسند اور ناپسند کو معیار بنا کر ایک شاعر کو دوسرے شاعر پر ترجیح دیتے ہیں، جس سے شاعروں کے باہمی تعلقات ہی نہیں، ان کا مستقبل بھی خراب ہوتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب میں، جن میں نو شاعروں پر مضامین ہیں، ان میں سے تین کے نام تو آپ کو معلوم ہو چکے ہیں، باقی چھ یہ ہیں:...... عزیز حامد مدنی، منیر نیازی، محشر بدایونی، ظفر اقبال، رئیس فروغ اور

سلیم احمد۔ .... دورِ حاضر کے نو سو شاعروں میں سے صرف نو شاعروں کو جاذب قریشی نے قابلِ توجہ سمجھا ہے۔ ممکن ہے، بعض لوگ یہ کہیں کہ جاذب قریشی نے شاعروں کا انتخاب خالی الذہن ہو کر نہیں کیا، شاعری کے علاوہ بعض دیگر امور کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے، ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ اس کتاب میں اہم شاعروں کے دوش بدوش ایسے شاعروں کو بھی جگہ دی گئی ہے، جن کے شاعر ہونے کی اطلاع کا واحد ذریعہ یہی کتاب ہے، لیکن ہمیں اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ جاذب صاحب نے اپنی تنقیدی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے جن شاعروں کا انتخاب کیا ہے، ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی اعتبار سے بہت اہم ہے، البتہ ہمیں یہ شکایت ہے کہ جاذب صاحب نے اس کتاب میں اپنے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ یہ بڑی ناانصافی ہے کہ عہدِ جدید کے اہم شاعروں پر کتاب لکھی جائے اور اس میں جاذب قریشی کا تذکرہ نہ ہو۔ جاذب صاحب اگر اپنے بارے میں خود لکھنا پسند نہیں کرتے تھے تو انھیں انجم اعظمی کا وہ مضمون اپنی کتاب میں شامل کر لینا چاہیے تھا، جو ایک اخبار میں شائع ہو چکا ہے اور جس میں جاذب کو دورِ حاضر کا اہم ترین شاعر قرار دیا گیا ہے۔ اس کا ایک ضمنی فائدہ یہ ہوتا کہ کتاب کے قارئین کو بیک وقت انجم کے بارے میں جاذب کی رائے اور جاذب کے بارے میں انجم کی رائے معلوم ہو جاتی۔

جاذب قریشی نے یہ کتاب بڑی محنت سے لکھی ہے۔ دو ایک شاعروں پر لکھتے ہوئے تو انھوں نے اتنی زیادہ محنت کی ہے کہ اگر اتنی محنت یہ شاعر خود کرتے تو ان کا شاعرانہ مقام جاذب صاحب کے متعین کردہ مقام سے کہیں زیادہ بلند ہوتا۔

جاذب قریشی کے ہاں صرف تنقید نہیں، تحقیق بھی پائی جاتی ہے، جس کی وجہ سے قاری کی معلومات میں خاصا اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً قمر جمیل کے بارے میں انھوں نے اس قسم کے انکشافات کیے ہیں:

☆ ان کو بولتے ہوئے دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ یونانی اساطیری کردار کی کوئی زخمی روح ان کی آواز میں اتر آئی ہے۔

☆ قمر جمیل ایک بڑے حسب و نسب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں ان کی خاندانی عظمت کا ہونا ضروری ہے۔

☆ انھوں نے جوش کی نقل میں شاعری شروع کی، کیوں کہ ان کے بولنے کی، گفتگو کرنے کی قوت بہت زیادہ تھی، خطابت بہت تھی، اس لیے جوش کی شاعری کی نقل انھیں بہت زیادہ آسان معلوم ہوئی، لیکن بعد میں شرمندہ ہوئے۔ (جاذب نے یہ نہیں بتایا کہ کون شرمندہ ہوا ..... قمر جمیل یا جوش؟)

اسی طرح انجم اعظمی کے بارے میں جاذب قریشی نے اس طرح دادِ تحقیق دی ہے:

''ان کے ہم عصروں میں خلیل الرحمٰن اعظمی، مصطفیٰ زیدی، باقر مہدی ..... وغیرہ اپنی فنی اور شخصی اہمیتوں کے ساتھ خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ اگر انجم اعظمی کے زمانے کے کچھ پہلے

کے شاعروں کو تلاش کرنے کی کوشش کی جائے تو ان میں جوش، فراق، یگانہ، جگر، فانی، حسرت، اصغر، راشد، میراجی، فیض سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ ان کے علاوہ انجم اعظمی کے بعد آنے والوں میں زہرہ نگار، شکیب جلالی، ساقی فاروقی نے اپنے تخلیقی چراغوں کو بہت آب و تاب دی ہے۔ ان مختلف لکھنے والوں سے جو شعری تناظر بنتا ہے، اس میں انجم اعظمی نے اپنی تخلیقی زندگی گزاری ہے۔''

جاذب قریشی نے بہت اچھا کیا کہ انجم اعظمی کے ہم عصروں اور ان سے پہلے اور بعد کے شاعروں کی فہرستیں مرتب کر دیں، ورنہ آیندہ کے محقق کے لیے بڑی دشواریاں پیدا ہوتیں۔ اُسے معلوم ہی نہ ہوتا کہ انجم اعظمی کن شاعروں کے ساتھ، کن کے پیچھے اور کن سے آگے کھڑے ہیں۔ جاذب قریشی کا یہ احسان بھی ہے کہ انھوں نے انجم اعظمی سے کچھ پہلے کے شاعروں یعنی جوش، فراق اور یگانہ وغیرہ کو تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اگر وہ انھیں تلاش نہ کرتے تو ان کا شمار گمشدگانِ ادب میں ہوتا۔

اس کتاب کا آخری حصہ سلیم احمد کے بارے میں ہے۔ اس حصے میں پانچ مضمون ہیں۔ پہلا سلیم احمد کی شخصیت پر ہے۔ اس میں جاذب قریشی نے اپنے حوالے سے بعض دلچسپ باتیں لکھی ہیں۔ مثلاً:

''ایک دن ہمدانی صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تم نے کبھی سلیم احمد کو برا بھلا کہا ہے اور گالیاں وغیرہ دی ہیں؟ حیرت زدہ ہو کر میں یہی کہہ سکا تھا کہ ''میں ان کی بڑی عزت کرتا ہوں۔'' کراچی میں یہ پہلی غلط بیانی تھی اور یہ پہلا الزام تھا اور یہ پہلی افواہ تھی، جو مجھ پر چسپاں کی گئی۔''

زیرِ نظر کتاب میں اسی قسم کی غلط بیانیوں، الزاموں اور افواہوں کی خاصی تعداد نظر آتی ہے، جس سے یہ کتاب بڑی دلچسپ ہو گئی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بعض الزاموں اور افواہوں کا تعلق مصنف کی تنقیدی آرا سے بھی ہے۔

سلیم احمد سے متعلق حصے کا آخری مضمون ''ایک شہر تعلقات'' ہے۔ اس میں ان لوگوں کا ذکر ہے، جن سے سلیم احمد مرحوم کے تعلقات تھے یا جنھوں نے دو چار مرتبہ سلیم احمد کے گھر پر حاضری دی تھی۔ قدیم تذکروں کے انداز میں افراد کا ذکر حروفِ تہجی کے اعتبار سے کیا گیا ہے اور کہیں کہیں تو صرف حروفِ تہجی ہی کا ذکر کیا گیا ہے، مثلاً چار الف اور چار جیم کے عنوانات کے تحت چار چار افراد کا ذکر ہے۔ بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ کتاب کا سب سے دلچسپ مضمون ہے۔ کچھ اقتباسات ملاحظہ فرمائیے:

انجم اعظمی: سلیم بھائی کی علمی و ادبی عظمت کو تسلیم کرتے، مگر ان سے جزوی اختلاف رکھتے۔ ایک اختلاف تو یہی تھا کہ سلیم احمد کے گرد منافق اور غیر ادبی لوگ جمع رہتے ہیں، جو انھیں بہت سی حقیقی صورتوں تک پہنچنے نہیں دیتے۔

ضمیر علی بدایونی: ریڈیو کے ساتھی...... سلیم بھائی ریڈیو آ کر انھیں کے کمرے میں بیٹھتے۔ ایک بار جب ضمیر صاحب کا ٹرانسفر ہو گیا تو سلیم بھائی نے ہی جائز طور پر ان کا ٹرانسفر رکوایا تھا۔

کشور ناہید: سلیم بھائی انھیں پنجابی لہجے میں ''کی شے'' کہتے۔ جب وہ لاہور سے آتیں تو باتیں، ملاقاتیں، قربتیں اور محبتیں ایسی ہوتیں کہ نیا آدمی دیکھے تو شاید دھوکہ کھا جائے۔ سلیم بھائی نے ''ملاقاتوں کے درمیان'' کو اکادمی ادبیات کے انعام کا مستحق قرار دیا تھا۔

مجتبیٰ حسین: سلیم بھائی سے اکثر ملاقات رہتی اور طویل بحثیں ہوتیں۔ سلیم بھائی کہتے کہ مجتبیٰ صاحب جتنا اچھا بولتے ہیں، اتنا اچھا لکھتے نہیں ہیں۔

محبوب خزاں: سلیم بھائی اکثر ان کا ذکر کرتے اور ان کی ذہانت کی تعریف کرتے اور کہتے کہ ..... ''محبوب خزاں کو قمر جمیل نے بگاڑا ہے۔ ..... میں ان دونوں حضرات سے ملتا ہوں تو اس فقرے کی معنویت پر غور کرنے لگتا ہوں۔

نظیر صدیقی: سلیم بھائی نظیر صاحب کی تعریف یوں کرتے تھے کہ وہ لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتے ہیں۔ رہی ان کی تنقید، تو اس میں لفظوں کی طویل قطاروں کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

جاذب قریشی نے اس کتاب کو دلچسپ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی، یہاں تک کہ ایک [illegible] ایک طویل خواب بھی بیان کر دیا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے:

''میرا جسم پتھر ہو گیا ہے اور گھر کے صحن میں پڑا ہوا ہے۔ میرے اردگرد آوازوں کا شور ہے ..... میں اپنے جسم سے باہر ہوں اور سب کچھ دیکھ رہا ہوں۔ پھر مجھے لوگوں نے اپنی چیخوں میں آخری بار پکارا اور کسی انجانی سمت کو رخصت کر دیا..... انھوں نے میرے برفانی جسم کو زمین کے سپرد کر دیا.....''

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد، ممکن ہے، بعض قارئین کو یہ محسوس ہو، جیسے یہ واقعہ جاذب قریشی کے ساتھ نہیں، اُن کے ساتھ گزرا ہے۔ ایسے قارئین سے ہمیں دلی ہمدردی ہے۔

پروفیسر کرار حسین نے اس کتاب کا فلیپ لکھا ہے، جس کے آخری جملے کا مفہوم یہ ہے کہ جاذب قریشی نے یہ کتاب کیا لکھی ہے، اپنے زمانہ کی آبِ حیات لکھ دی ہے۔ کرار صاحب ہمارے بزرگ ہیں، ان کی رائے سر آنکھوں پر، لیکن ہمیں ڈر ہے کہ بعض خوش گمان لوگ اس رائے سے یہ نتیجہ نہ نکال بیٹھیں کہ محمد حسین آزاد نے اپنے زمانے کے جاذب قریشی تھے۔ ہمیں محمد حسین آزاد سے بھی دلی ہمدردی ہے۔

(۲۹ راگست ۱۹۸۶ء)

☆..........☆..........☆

عہد ساز یا زمانہ ساز

علم کے معاملے میں ہم خاصے فضول خرچ واقع ہوئے ہیں، ایک ہاتھ سے آتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے ہم لٹا دیتے ہیں۔ بعض لوگ دولت کو ہاتھ کا میل سمجھتے ہیں، ہمارے نزدیک علم بھی کچھ اسی قسم کی چیز ہے۔ ہاتھ میلے ہوں تو جس چیز کو بھی ہاتھ لگایا جائے، وہ میلی ہو جاتی ہے، اس لیے صفائی، نیز حفظانِ صحت کے خیال سے ہاتھوں کو صاف ستھرا ہی رکھنا چاہیے۔ آج کل کے اہلِ قلم تو ہم سے بھی زیادہ نفاست پسند ہیں۔ وہ ہاتھوں ہی کو نہیں، ذہن کو بھی صاف رکھتے ہیں، جس کا اندازہ ان کی تصانیف سے ہوتا ہے۔ آج کل جو کتابیں چھپتی ہیں، انھیں پڑھ کر معلوم ہی نہیں ہوتا ہے کہ اُن کے لکھے جانے کا سبب کیا ہے اور اگر معلوم ہو بھی جائے تو یہ راز نہیں کھلتا کہ آخر ہم نے ایسا کون سا جرم کیا ہے، جس کی سزا کے طور پر یہ کتابیں ہمیں پڑھنی پڑتی ہیں۔ تاہم کبھی کبھار ایک آدھ ایسی کتاب بھی ہاتھ لگ جاتی ہے، جسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے کچھ کھویا نہیں، حاصل کیا ہے۔ ہمارے علم میں اضافہ ہوا ہے۔ ایسے ہی موقعوں پر ہم کشادہ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حاصل شدہ علم کو دوسروں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ جو چیز ضرورت کی نہ ہو، اُسے اپنے پاس رکھنے کا کیا فائدہ؟ مستحقوں اور ضرورت مندوں میں اسے تقسیم کر دینا چاہیے۔ اس وقت ہم کچھ اسی قسم کی نیکی کرنے کے موڈ میں ہیں۔

یہ تمہید ہم نے اس لیے باندھی ہے کہ حال ہی میں ڈاکٹر انور سجاد کی نئی کتاب ''تلاشِ وجود'' ہم نے پڑھی ہے۔ کتاب کے نام سے ہم یہ سمجھتے تھے کہ یہ بھی کوئی ایسی کتاب ہوگی، جس میں خطابت اور نثری نظم کے امتزاج سے وہ ادب تخلیق کیا گیا ہوگا، جو قاری کے صبر اور حوصلے کا امتحان لیتا ہے، لیکن کتاب پڑھ کر معلوم ہوا کہ انور سجاد اپنی ہی قائم کردہ روایتوں سے انحراف کرنے کا فن جانتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے کے دوران قاری یہ محسوس نہیں کرتا کہ وہ اپنی زندگی کی آخری کتاب پڑھ رہا ہے، بلکہ یہ کتاب اس میں مزید مطالعے کی خواہش پیدا کرتی ہے، تاکہ یہ کتاب اس کی زندگی کی آخری سے پہلی کتاب ثابت ہو۔

"تلاشِ وجود" متفرق مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے چار حصے ہیں، جو ادب، مصوری، ڈراما اور نظریاتی تنقید سے متعلق ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے کئی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں۔ مثلاً انور سجاد کے کثیر الاشغل اور قلیل الاوقات ہونے کی وجہ سے ہمارا خیال تھا کہ اُردو کے عام ادیبوں کی طرح وہ بھی کم[illegible] الرحمٰن قسم کا ادیب ہوگا، لیکن اس کتاب کے حوالے سے ایک ایسا انور سجاد سامنے آتا ہے، جس کی ادب ہی نہیں، بہت سے علوم و فنون پر گہری نظر ہے۔ دوسری غلط فہمی ہمیں یہ تھی کہ افسانہ نگار جب تنقید لکھنے پر آتے ہیں تو تنقید کو بھی افسانہ بنا دیتے ہیں۔ انور سجاد نے ایسا نہیں کیا، بلکہ وہ بھی نہیں کیا، جو پیشہ ور نقاد کرتے ہیں، یعنی تنقید کو ادب کی تجہیز و تکفین کا وسیلہ نہیں بنایا۔

انور سجاد نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ تنقید ایک شیطانی کام ہے۔ "تلاشِ وجود" کی اشاعت کے بعد یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انور سجاد نے یہ شیطانی کام اتنے سلیقے سے انجام دیا ہے کہ خود شیطان بھی اس سلسلے میں اس سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ شیطان اپنے معروفِ زمانہ "انکار" کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے مردود ہو گیا، لیکن انور سجاد بے شمار مسلمات سے انکار کے باوجود اُس مقام پر نہیں پہنچا، جہاں اُس کا نام سنتے ہی لاحول پڑھنے کی ضرورت ہو۔ وجہ یہ ہے کہ انور سجاد اتنے سلیقے سے انکار کرتا ہے کہ اس کے انداز بیان کا حسن، انکار کی تلخی پر غالب آ جاتا ہے۔ مثلاً:

"ناول کی ضخامت؟ علی پور کا ایلی، دیکھنے میں ہمارے ادب کا شاید سب سے صحت مند اور بھاری بھرکم ناول نظر آتا ہے، لیکن ذیابیطس کے بعض مریض بھی ایسے ہی نظر آتے ہیں۔"

"کاش اُداس نسلیں، آگ کا دریا کے بعد نہ لکھا جاتا۔"

جب انور سجاد اس قسم کی باتیں کرتا ہے تو ممتاز مفتی، عبداللہ حسین اور انتظار حسین کے ہم جیسے عقیدت مندوں کے جذبات کو ٹھیس ضرور لگتی ہے، لیکن پھر بھی انور سجاد کو اس کے انداز بیان کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ داد دینے کے معاملے میں ہم بہت فراخ دل ہیں، کیوں کہ اس لین دین میں کسی کے ہاتھ سے کچھ جاتا ہے نہ کسی کے ہاتھ میں کچھ آتا ہے۔

انور سجاد کے ہاں صرف "انکار" نہیں، "اثبات" بھی ہے، خصوصاً ان موقعوں پر، جہاں اس کی اپنی ذات زیر بحث ہوتی ہے۔ مثلاً شمس الرحمٰن فاروقی نے ایک مرتبہ کہیں لکھا تھا کہ انور سجاد نئے اردو افسانے کا معمارِ اعظم ہے۔ انور سجاد نے بڑے انکسار کے ساتھ اس رائے سے حرف بحرف اتفاق کرتے ہوئے کہا:

"اس سے رائے دینے والے کی کشادہ دلی ثابت ہوتی ہے اور میں اس حوصلہ افزائی کا احترام کرتا ہوں۔"

انور سجاد نے فاروقی کے جملے کا احسان تو انھیں "کشادہ دل" کہہ کر چکا دیا، لیکن باقر مہدی کو اس سے زیادہ اعزاز کا مستحق سمجھا ہے۔ زیر نظر کتاب اسی کے نام منسوب کی گئی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ باقر

مہدی نے اپنے ایک مضمون میں انور سجاد کو "معمارِ اعظم" سے بھی بڑا درجہ دیا تھا۔

باقر مہدی اور شمس الرحمٰن فاروقی جیسے نقادوں کی کشادہ دلی کا یہ نتیجہ نکلا کہ انور سجاد اپنے آپ کو عہد ساز شخصیت سمجھتا ہے:

"ایک عرصے سے میری یہ خواہش رہی ہے کہ میں اپنے عصر کی کم از کم اور زیادہ سے زیادہ بھی، تین عہد ساز شخصیتوں پر ایک زبردست پر مغز مضمون لکھوں۔ ان کی ذاتی زندگی اور ان کے فن کی تفصیلات و جزئیات کا ایسا زبردست تجزیہ احاطۂ تحریر میں لے آؤں کہ ان کی ذاتی زندگی اور تخلیقات کے درمیان دوئی کے نقش مکمل طور پر مٹا دوں یا مکمل طور پر واضح کر دوں اور یوں ان سے اپنی عقیدت کا اظہار کروں۔ ان تین شخصیتوں میں ایک عہد ساز شخصیت تو میں خود ہوں، لیکن جب بھی اس سلسلے میں قلم اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں تو میری روایتی کسر نفسی آڑے آ جاتی ہے۔ دوسری عہد ساز شخصیت میرا دوست بلراج مین را ہے کہ جس کا میں نے ہمیشہ بھلا چاہا ہے۔ تیسری عہد ساز شخصیت کشور ناہید کہ جس کا میں دوست ہوں اور جس نے ہمیشہ میرا بھلا چاہا ہے......"

ممکن ہے، بعض لوگ اس اقتباس کو پڑھ کر یہ کہیں کہ انور سجاد نے "عہد ساز" کی ترکیب کو "زمانہ ساز" کے معنوں میں استعمال کیا ہے، لیکن ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔ انور سجاد کی تینوں پسندیدہ شخصیات فی الحال تن سازی کے مرحلے میں ہیں، عہد سازی یعنی زمانہ سازی کی منزل ابھی بہت دور ہے۔

اور آخر میں اس کتاب کے بارے میں ایک لطیفہ۔ مظفر علی سید سے "تلاشِ وجود" کا ذکر آیا تو انھوں نے کہا:

"اس کتاب میں آٹھ دس صفحے بہت کام کے ہیں۔"

جب ان صفحات کی نشان دہی کے لیے کہا گیا تو انھوں نے فرمایا:

"ہر مضمون کے بعد ایک صفحہ خالی ہے۔ ایسے صفحات کی تعداد آٹھ دس سے زیادہ نہیں ہے۔"

اور داد دینے میں اس لیے کوئی مضائقہ نہیں کہ اس لین دین میں کسی کے ہاتھ کچھ جاتا ہے نہ کسی کے ہاتھ میں کچھ آتا ہے۔

(۵ر ستمبر ۱۹۸۶ء)

☆......☆......☆

غالب پر بعد از وفات قاتلانہ حملے

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے شاعری نہیں کی، کوئی جرم کیا تھا جس کی سزا انھیں مسلسل مل رہی ہے۔ نقادوں، محققوں، شارحوں اور فلم سازوں نے غالب کے ساتھ جو سلوک کیا ہے، اسے دیکھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جرم کے مقابلے پر سزا کا تناسب کچھ زیادہ ہو گیا ہے، ہر نقاد تنقید میں ہاتھ صاف کرنے کے لیے غالب کو تختۂ مشق بناتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ غالب کی فکر سے لے کر بے فکری تک جو موضوعات پر ہزاروں صفحات سیاہ ہو چکے ہیں، جن کے سامنے غالب کے نامۂ اعمال کی سیاہی بھی ماند پڑتی نظر آتی ہے۔ محققوں کے ہاتھ زیادہ لمبے ہیں، اس لیے انھوں نے غالب تو غالب، غالب کے اہل محلہ پر بھی تحقیقی مقالے لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگریاں اس طرح حاصل کی ہیں جس طرح لوگ رائٹرز گلڈ اور اکادمی ادبیات کے انعام حاصل کرتے ہیں۔ شارحوں نے غالب کے شعروں میں وہ معنی تلاش کیے ہیں، جن کا خود غالب کو بھی علم نہیں تھا۔ یہ شرحیں اگر غالب کی زندگی میں چھپ جاتیں تو وہ خودکشی کر لیتے۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ غالب نے خودکشی نہ کی، ورنہ ان کی خودکشی کے اسباب پر بھی تین چار درجن کتابیں لکھ کر اتنے ہی محقق ماہرین غالبیات کی صف میں کھڑے ہو جاتے۔ فلم سازوں نے بھی غالب کے ساتھ جو مثالی سلوک کیا ہے، اسے بعد از وفات قاتلانہ حملے کا نام دیا جا سکتا ہے۔

یہ سب کچھ ہونے کے بعد توقع نہیں تھی کہ غالب کو اس کے اعمال کی سزا اسی دنیا میں دینے کا کوئی ذریعہ باقی رہ گیا ہوگا، لیکن خدا خوش رکھے ڈاکٹر شاہد الوری کو کہ ان کی طبع جدت پسند نے "چراغ سے چراغ" شائع کر کے یہ ثابت کر دکھایا کہ:

راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں

نقادوں، محققوں، شارحوں اور فلم سازوں کے کارناموں کی "چراغ سے چراغ" کے سامنے وہی حیثیت ہے، جو سورج کے سامنے چراغ کی۔ اس اجمال کی تفصیل تو ہم آگے چل کر پیش کریں گے، پہلے یہ

بتا دینا مناسب ہوگا کہ ڈاکٹر شاہد الوری کون ہیں۔ گویا یہاں بھی:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

والا معاملہ درپیش ہے۔ شاہد صاحب مشہور شاعر ہیں، کیوں کہ ہر شاعر مشہور پہلے ہوتا ہے اور شاعر بعد میں۔ ان میں عام شاعروں والوں کی کوئی برائی نہیں۔ اپنے بارے میں کسی قسم کی کوئی غلط فہمی نہیں۔ نہایت مرنجاں مرنج، منکسر المزاج، بلکہ بے ضرر قسم کے انسان ہیں۔ صرف شاعری سے، یعنی اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور اگر کام بگڑ بھی جائے تو اس کی پروا نہیں کرتے۔ عام شاعر تو صورت سے مریض دکھائی دیتے ہیں، لیکن شاہد صاحب ڈاکٹر ہیں اور ڈاکٹر بھی ہومیوپیتھی کے، جس کے اثرات ان کی شاعری میں بھی ملتے ہیں، یعنی ہومیوپیتھی کی دواؤں کی طرح ان کا کلام شیریں ہوتا ہے۔ ان کے مصرعے صاف ستھرے ہوتے ہیں اور وزن میں ہوتے ہیں اور بعض مصرعے تو اتنے وزنی ہوتے ہیں کہ انھیں اٹھانا ہر کس و ناکس کے بس کا کام نہیں۔

ہم نے شاہد الوری کو مصرعوں کا شاعر کہا ہے، شعروں کا نہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ "چراغ سے چراغ" میں انھوں نے غالب کے مصرعوں پر مصرعے لگائے ہیں، بالکل اسی طرح، جس طرح مارشل لا کے زمانے میں کوڑے لگائے جاتے تھے۔ ایک مصرع غالب کا ہے اور تین مصرعے شاہد الوری کے۔ پوری کتاب میں سو قطعے ہیں۔ گویا سو مصرعے غالب کے ہیں اور تین سو شاہد صاحب کے، اس لیے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کتاب میں شامل ایک چوتھائی کلام نہایت اعلیٰ معیار کا ہے۔ باقی تین چوتھائی کلام کے بارے میں ہمارا کچھ عرض کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی، کیوں کہ یہ کلام شاہد الوری کا طبع زاد ہے۔

اس بات کی وضاحت کے لیے اگر دو چار مثالیں پیش کر دی جائیں تو نامناسب نہ ہوگا۔ غالب کا شعر ہے:

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

شاہد الوری فرماتے ہیں:

تحسین کی ہوس نہ تمنا ہے واہ کی
"کیا خوب" اور "واہ" کی حسرت نہیں مجھے
میرا یہ شوق کچھ نہیں بجز خدمتِ ادب
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

جناب شاہد الوری نے غالب کے مصرعے کو نئی معنویت عطا کی ہے۔ غالب شاعری کو اس لیے

ذریعۂ عزت نہیں سمجھتے تھے کہ انھیں اپنے خاندانی پیشے سپہ گری پر فخر تھا۔ شاہد الوری کسی خاندانی پیشے پر فخر کرنے کی وجہ سے نہیں، بلکہ ادب کی خدمت کے جذبے میں سرشار ہو کر شاعری کو ذریعۂ عزت نہیں سمجھتے۔ خدمتِ ادب کا یہ جذبہ اتنا قوی ہے کہ شاعری ان کے لیے ذریعۂ عزت بنتی ہے اور نہ وہ خود شاعری کے لیے: غالب کا شعر ہے:

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا، سو پریشان نکلا

شاہد الوری نے غالب کے مذکورہ مصرعِ اول کی جگہ تین مضمون دار تو انا مصرعے تخلیق کیے ہیں:

کوئی بردوش ہوا، وا کوئی صد چاک لیے
کوئی لرزاں تو کوئی چاک گریباں نکلا
نامہ بر، نامۂ غم، نامہ نویسِ دل ریش
جو تری بزم سے نکلا، سو پریشان نکلا

غالب کے شعر میں محبوب کی محفل کا ذکر تھا، شاہد الوری نے محبوب کی محفل کو ڈاک خانہ بنا دیا ہے، جہاں ڈاکیے بھی ہیں، خطوط بھی ہیں اور وہ لوگ بھی، جو ڈاک خانوں کے سامنے فٹ پاتھ پر بیٹھ کر ان پڑھ لوگوں کے خطوط تحریر کرتے ہیں۔ یہ نامہ نویس عموماً ''باریش'' ہوتے ہیں۔ ''دل ریش'' اگر کتابت کی غلطی نہیں ہے تو شاہد الوری کا کمالِ سخن یہ ہے کہ انھوں نے غالب کے مصرعے کے ساتھ نامۂ غم لکھنے والے کے دل کو بھی زخمی کر دکھایا ہے۔ اردو شاعری میں ''نامہ بر'' کا کردار تو ملتا ہے، لیکن ''نامہ نویس'' کو پہلی بار شاہد الوری نے متعارف کرایا ہے۔ اگر کوئی عاشق یا شاعر پڑھا لکھا نہ ہو اور وہ خط یا شعر لکھنے پر قادر نہ ہو تو وہ نامہ نویس کی خدمات سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ غالب کا شعر ہے:

عشق نے غالب نکما کر دیا
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

شاہد الوری بھی غالب کی طرح خاصے کام کے آدمی ہیں۔ فرماتے ہیں:

آہ اے کم فہم! محسن کش! دنی!
کس طرف ہیں رخ ترے الزام کے
تو نے سمجھا ہی نہیں ہم کو کبھی
ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

غالب کو عشق نے نکما کیا تھا، شاہد الوری کسی کم فہم، محسن کش اور دنی کی وجہ سے اس منصب تک پہنچے۔ کاش وہ ایسے لوگوں سے میل ملاقات نہ بڑھاتے!

غالب نے کہا تھا:

گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

شاہد الوری فرماتے ہیں:

اے دشت! تو ہی منزلِ مقصود تھا مری
یہ کیا کہا کہ در خورِ منزل نہیں رہا
مانا کہ تھا اسیرِ طلسمِ بہار میں
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا

غالب نے ایک پیش پا افتادہ بات کہی ہے کہ وہ زمانے کے ستم رسیدہ ہونے کے باوجود محبوب کے خیال سے غافل نہیں رہے۔ شاہد الوری نے اس مضمون کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ شہر سے دشت میں پہنچا دیا ہے۔ ستم رسیدہ تو مجبوراً دوسروں کو یاد کرتا ہے، لیکن کسی اسیرِ طلسمِ بہار کا کسی کو یاد کرنے کے لیے وقت نکالنا احسان کرنے کے مترادف ہے۔

غالب کا شعر ہے:

نہ ستایش کی تمنا، نہ صلے کی پرواہ
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

شاہد الوری نے اس مضمون کو یوں ترقی دی ہے:

آپ سے تو نہیں میں داد کا خواہاں بخدا
نہ کہیں، شاعرِ خوش گو، بہت اچھا، نہ سہی
سن کے اشعار مرے جھوم تو جاتے ہیں عوام
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی، نہ سہی

غالب عوام اور خواص دونوں سے مایوس تھے، لیکن شاہد الوری کو غالب پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ عوام ان کا کلام سن کر جھوم جاتے ہیں۔ اشعار میں معنی نہ ہونے کے باوجود عوام کا یہ حال ہے، اگر خدانخواستہ معنی ہوتے تو معلوم نہیں کیا حال ہوتا۔

مذکورہ چند مثالیں دیوانِ حافظ سے فال نکالنے کے انداز میں حاصل کی گئی ہیں، ورنہ اس کتاب میں کوئی قطعہ ایسا نہیں، جس میں غالب کا ایک مصرع شاہد الوری کے تین مصرعوں کے بوجھ تلے دب کر نہ رہ گیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب کے مصرعے غالب کے دیوان ہی میں اچھے لگتے ہیں۔ انھیں دیوان سے الگ کر کے اور ''چراغ سے چراغ'' میں شامل کر کے پڑھا جائے تو غالب کی اصل حقیقت معلوم

ہو جاتی ہے۔

شاہد الوری نے اپنی کتاب کا نام "چراغ سے چراغ" رکھا ہے۔ مطلب یہ کہ انھوں نے غالبؔ کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنا چراغ تو جلالیا، لیکن غالبؔ کا چراغ گل کر دیا۔

کتاب کے فلیپ پر "مشاہیر" کی آرا درج کی گئی ہیں۔ ایک درجن "مشاہیر" نے دیباچے لکھے ہیں۔ کتاب کے ساتھ ہمیں ایک بروشر بھی ملا ہے، جس کی ضخامت اصل کتاب سے دگنی ہے۔ اس میں بھی چار درجن سے زاید "مشاہیر" کے ارشادات اور پیغامات شامل ہیں۔ گویا مجموعی طور پر ایک سو کے قریب "مشاہیر" نے شاہد الوری کی کاوش کو سراہا ہے۔ شاہد الوری خوش قسمت ہیں کہ انھیں ایک سو سے زیادہ قاری مل گئے، ورنہ بقول شخصے آج کل اتنی تعداد میں کسی مصنف کو ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے۔

یہ کتاب جن "مشاہیر" کی آرا سے مزین ہے، ان میں ہمارے کرم فرما منظر علی خاں منظر بھی شامل ہیں۔ انھوں نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ ...... "غالبؔ کے چراغ پر شاہد الوری کا حق یوں بنتا ہے کہ الور ان کی جاے پیدائش ہے اور غالبؔ کے والد کی جاے وفات۔" ...... اگر منظر صاحب مزید تحقیق فرماتے تو انھیں غالبؔ کی جاے وفات نہ سہی، سببِ وفات اسی کتاب میں مل جاتا۔

(۱۲ر ستمبر ۱۹۸۶ء)

☆......☆......☆

عشق کے بغیر عشقیہ شاعری

ہمیں یہ دعویٰ تو نہیں ہے کہ ہمارا ادبی مذاق نہایت اعلیٰ درجے کا ہے، لیکن اتنا ہم ضرور جانتے ہیں کہ بعض اعلیٰ درجے کے شاعر ہمارے ادبی مذاق کی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں، بلکہ ہمارے ہی ادبی مذاق کی کسوٹی پر پورے اترے ہیں۔ ایسے شاعروں میں سرفہرست جناب محسن بھوپالی ہیں۔ یہ وہی محسن بھوپالی ہیں، جن کے بارے میں فیض احمد فیض نے بھوپال کی ایک تقریب میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ بھوپال کے ہم پر بڑے احسانات ہیں، اس شہر نے ہمیں محسن بھوپالی جیسا شاعر اور ثریا بھوپالی جیسا کردار دیا، جس پر فلم بنائی گئی۔ یہ دوسری بات ہے کہ فلم چل گئی اور شاعر رہ گیا۔

بعد میں تحقیق سے معلوم ہوا کہ فلم کے چلنے اور شاعر کے رہ جانے والی بات یاروں کا اضافہ ہے۔ فیض صاحب نے صرف یہ کہا تھا کہ بھوپال کے ہم ممنون ہیں کہ اس شہر نے علامہ اقبال کی مہمان نوازی کی اور محسن بھوپالی جیسا اچھا شاعر ہمیں دیا۔ قطع نظر اس سے کہ فیض صاحب نے علامہ اقبال اور محسن بھوپالی کو برابر کا درجہ دے کر شیر اور بکری کو ایک ہی گھاٹ پانی پلایا ہے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ فیض صاحب بڑے ظرف کے آدمی تھے، کسی کے ذرا سے بھی احسان کو ممنونیت کے جذبے کے ساتھ یاد رکھتے تھے۔ مرحوم کی سوانح عمری میں جب اُن کی اعلیٰ ظرفی کا ذکر آئے گا تو محسن بھوپالی کا حوالہ ضرور دیا جائے گا کہ فیض صاحب نے انھیں بھوپال کے احسانات میں شمار کیا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں، محسن بھوپالی آیندہ چل کر اسی حوالے سے پہچانے جائیں گے۔ ان کی شناخت کے لیے اُن کی شاعری کافی ہے، بلکہ ایک ہی شعر کافی ہے، جو یہ ہے:

نیرنگیِ سیاستِ دوراں نہ پوچھیے
منزل انھیں ملی، جو شریکِ سفر نہ تھے

کون ہے، جس نے یہ شعر نہیں سنا۔ محسن بھوپالی کے لیے یہ اعزاز کم نہیں ہے کہ ان کا یہ زائیدہ فکر

اُردو زبان کے مشہور ترین اشعار میں سے ہے۔ ممکن ہے حاسد یہ کہیں کہ محض ایک شعر کی بنیاد پر شاعر کہلانا فخر کی بات نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کی اطلاع، بلکہ تنبیہ کے لیے عرض ہے کہ ہمارے درمیان بے شمار ایسے شاعر موجود ہیں، جن کے دیوانوں میں کام کا ایک شعر بھی موجود نہیں ہے اور پھر محسن بھوپالی کے لیے وجہ اعزاز ایک ہی شعر نہیں اور بھی کئی شعر ہیں۔ افسوس کہ وہ شعر مشہور نہیں ہو سکے، اُن کے مجموعہ ہائے کلام میں دب کر رہ گئے۔ یہ بھی مقام شکر ہے، کیوں کہ آج کل کے شاعر تو خود ہی اپنے مجموعہ ہائے کلام کے بوجھ تلے دب کر رہ جاتے ہیں۔

محسن بھوپالی کا ایک کارنامہ یہ بھی ہے کہ وہ ایک صنفِ سخن ''نظمانے'' کے بانی ہیں۔ انھوں نے بے مثال نظمانے لکھے ہیں اور لفظ ''نظمانہ'' بھی انھی کی اختراع، بلکہ ایجاد ہے۔ اُردو میں مضامین نو کے انبار لگانے والے نئے نئے اسالیبِ سخن ایجاد کرنے والے شاعر ہر دور میں مل جاتے ہیں، لیکن ایسا کوئی شاعر نظر نہیں آتا، جس نے کوئی لفظ ایجاد کیا ہو۔ اسی بنا پر افسانہ نگار ابوالفضل صدیقی نے کہا تھا کہ لفظ ''نظمانہ'' اس قابل ہے کہ اسے اردو ڈکشنری بورڈ کی زیرِ تدوین ڈکشنری میں شامل کرلیا جائے۔ ہم اس تجویز کی تائید کرتے ہیں۔ یہی ایک لفظ نہیں، محسن بھوپالی کا پورا کلام اس لائق ہے کہ اسے مذکورہ ڈکشنری میں شامل کرلیا جائے۔ اس طرح یہ کلام حالات کی دستبرد سے محفوظ ہو جائے گا۔ یہ الگ بات ہے کہ ڈکشنری غیر محفوظ ہو جائے گی۔

محسن بھوپالی صرف شاعری تک محدود نہیں، نثر کو بھی انھوں نے ذریعۂ اظہار بنایا ہے۔ حال ہی میں اُن کی کتاب ''قومی یک جہتی میں ادب کا کردار'' شائع ہوئی ہے۔ ہمیں حیرت ہے کہ اس کتاب کو وہ شہرت نہیں ملی، جس کی یہ مستحق ہے۔ اس استحقاق کی وجہ یہ ہے، پوری کتاب میں محسن بھوپالی کی صرف چند سطریں ملتی ہیں، باقی جو کچھ ہے، وہ ''ادبی مشاہیر'' کا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہ ایک درجن ادیبوں کے انٹرویوز کا مجموعہ ہے۔ یہ انٹرویو کراچی کے ایک اخبار میں ابوراشد کے نام سے شائع ہوئے تھے۔ محسن بھوپالی نے کتاب کے دیباچے میں بتایا ہے کہ ''ابوراشد'' انھیں کا قلمی یا فرضی نام تھا۔ ہمارے پاس محسن بھوپالی کے اس دعوے کو رد کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے، اس لیے ہم یہ تسلیم کیے لیتے ہیں کہ ابوراشد انھی کا فرضی نام تھا، تاہم موصوف سے ہم یہ سوال ضرور کریں گے کہ مفید کام فرضی نام سے اور شاعری خود اپنے نام سے چھپوانے کی جو روایت اُنھوں نے قائم کی تھی، اس سے انحراف کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اگر یہ کتاب ابوراشد ہی کے نام سے چھپتی تو زیادہ بہتر تھا، تاکہ لوگ سنجیدگی سے اس کی طرف توجہ کرتے۔

کتاب کا بنیادی موضوع وہی ہے، جو اس کا نام ہے، یعنی محسن بھوپالی نے ایک درجن ادیبوں سے اس سوال کا جواب حاصل کیا ہے کہ قومی یک جہتی میں ادب کیا کردار ادا کرسکتا ہے۔ ہر ادیب نے اپنی

بساط کے مطابق جواب دیا ہے اور بڑے بڑے دعوے کیے ہیں کہ ادب یہ کرسکتا ہے، وہ کرسکتا ہے، لیکن ڈاکٹر اختر حسین رائپوری نے اس سوال کی جڑ ہی کاٹ دی ہے۔ انھوں نے جو کچھ فرمایا ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں ادب کوئی مؤثر قوت نہیں ہے۔ اوّل تو پورے ملک میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بہت کم ہے اور ان پڑھے لکھوں میں ادب سے دلچسپی لینے والے اور بھی کم ہیں۔ ادب کی رسائی شہری آبادی کے ایک چھوٹے سے حصے تک ہے، اس لیے ادب قومی یک جہتی کے لیے کوئی مؤثر ذریعہ نہیں بن سکتا۔

ڈاکٹر صاحب کے اس جواب کے بعد اگرچہ باقی گیارہ ادیبوں کو زحمت دینے کی ضرورت نہیں تھی، تاہم بعض ضمنی سوالات کی وجہ سے کتاب خاصی دلچسپ بن گئی ہے۔ مثلاً محشر بدایونی سے سوال کیا گیا کہ بہت دنوں سے آپ نے کوئی قومی و ملی نظم نہیں لکھی، اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کے جواب میں محشر صاحب نے فرمایا:

''اس سوال کا جواب تو میرے ذہن میں وسعت سے موجود ہے۔ میں نے ۱۹۳۸ء سے باقاعدہ شاعری شروع کی۔ زیادہ مطالعہ میر، غالب، اقبال اور حسرت کا رہا۔ شعر گوئی کے معاملے میں میں نے اپنے دل میں کوئی چنگاری ایسی محسوس نہیں کی، جو مجھے غزل کے تقاضے پورے کرنے میں مدد دیتی۔ پتا نہیں کیوں، عشق کی ایسی واردات سے میری زندگی کا دامن ہمیشہ تہی رہا، بلکہ ابتدا میں سخت کشمکش سے دوچار بھی رہا کہ غزل، جو ادب کی نہایت اہم صنف ہے، میں کس طرح اس تک دسترس حاصل کروں۔''

''سوال از آسماں و جواب از ریسماں'' شاید ایسے ہی موقعوں پر بولتے ہیں۔ محشر صاحب سے اُن کی قومی و ملی شاعری کی خیریت پوچھی گئی تھی، لیکن اُنھوں نے غزل گوئی کے معاملات بیان فرما دیے۔ بہرحال اس جواب سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ محشر صاحب اپنے ابتدائی زمانے میں کسی عشقیہ واردات سے محرومی کی وجہ سے غزل گوئی کی طرف توجہ نہ کرسکے، مگر اب تو وہ غزلوں کے کئی مجموعوں کے مصنف ہیں اور ان کا ہر مجموعہ عشقیہ اشعار کی کثرت کی وجہ سے اچھی خاصی ''جائے واردات'' نظر آتا ہے۔ کسی عشقیہ واردات کے بغیر اتنی عمدہ شاعری کرنا تو پیشہ ور عاشقوں کے بس کی بات بھی نہیں۔

(۲۶ر ستمبر ۱۹۸۶ء)

☆......☆......☆

ہماری دیگر کتابیں

ناممکن کی جستجو	حمید نسیم
منزلیں گرد کے مانند	خلیق ابراہیم خلیق
شخصیات و مشاہدات	گیان چند
تشریحی لسانیات	ڈاکٹر سہیل بخاری
سوالات و خیالات	پروفیسر کرار حسین
منتخب مضامین	وارث علوی
جوش ملیح آبادی (تحقیق اور تنقید کی زد میں)	شفقت رضوی
اولین اُردو سلینگ لغت	ڈاکٹر رؤف پاریکھ
اُردو کی زبان	ڈاکٹر سہیل بخاری
بلبلیں نواب کی	شاہ محی الحق فاروقی
شکنجہ	ابوالفضل صدیقی
ڈار سے بچھڑے	سید محمد اشرف
فائر ایریا	الیاس احمد گدی

Rs. 250/=